

روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

سُورَةُ مَلِكٍ

تا

سُورَةُ مُحَمَّدٍ

جلد

۱۹

افاداریت

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی
خطیب جامع مسجد نور، گوجرانوالہ

چودھواں ایڈیشن

(جملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

نام کتاب	معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ ملک تا سورہٴ مرسلات) جلد ۱۹
افادات	حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ
مرتب	الحاج لعل دین۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار ٹاؤن لاہور
تعداد طباعت	پانچ سو (۵۰۰)
سرورق	سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی مدظلہ
کتابت	محمد امان اللہ قادری گوجرانوالہ
ناشر	مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ
قیمت	۱۸۰/- ایک سو اسی روپے
تاریخ چودھواں ایڈیشن	رمضان المبارک ۱۴۲۸ھ بمطابق اکتوبر ۲۰۰۷ء

ملنے کے پتے

- (۱) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ (۵) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی
- (۲) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور
- (۳) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور
- (۴) مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار، لاہور
- (۵) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان
- (۶) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی
- (۷) مکتبہ اسلامیہ کتب خانہ اڈا گامی، ایبٹ آباد
- (۸) مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ
- (۹) مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور
- (۱۰)

بِسْمِ اللَّهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى

پیش لفظ (طبع دوم)

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى - آمَنَّا بِعَدُوِّ

زیر نظر "معالم العرفان فی دروس القرآن" سورۃ ملک تا سورۃ مرسلات یعنی پورے انیسویں پارہ پر مشتمل ہے۔ پہلی اشاعت میں اس کو دو حصوں میں شائع کیا گیا تھا۔ پہلا حصہ سورۃ ملک تا سورۃ نوح اور دوسرا حصہ سورۃ جن تا سورۃ مرسلات تھا، لیکن اب طبع دوم میں بہت سے احباب کے تقاضا پر ان دونوں جلدوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اور دونوں جلدوں کی فہرستوں کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ فہرستیں اور پیش لفظ وغیرہ کو شروع میں ہی رکھ دیا گیا ہے۔ اور صفحات کے نمبروں کو بھی مسلسل کر دیا گیا ہے۔ نیز اس ایڈیشن میں زیر در آیت کے اوپر خط کھینچ دیا گیا ہے اور بقایا آیات کو قوسین " " میں رکھا گیا ہے تاکہ زیر در آیت کا دوسری آیات سے اور قرآن پاک کا احادیث سے امتیاز عام آدمی کی سمجھ میں بھی آجائے۔

اغلاط کی بھی اصلاح کر دی گئی ہے۔ طباعت اور کاغذ جلد بندی وغیرہ کا معیار بھی انشاء اللہ پہلے سے زیادہ بہتر ہوگا۔ وَاللَّهُ الْمُوفقُ وَالْمُعِینُ۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ مُحَمَّدٍ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ
وَازْوَاجِهٖ اُمَّہَاتِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاتَّبَاعِهٖ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

احقر عبد الحمید سواتی

خادم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔ ۷۷ جہادی الاخری ۱۴۰۷ھ

فہرست مضامین مع عالم العرفان فی دروس القرآن جلد نمبر ۱۹

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۲۹	دوزخ کا غیظ و غضب	۲۹	سورة الملك
"	دوزخ والوں سے سوال و جواب	۳۰	درس اول (آیت ۱ تا ۵)
۳۰	کفار کا اظہار افسوس	۳۱	وجہ تسمیہ اور کوائف
"	نجات کے دوزخ	"	دیگر سورتوں سے مناسبت
۳۱	بے عقل مکلف نہیں	"	فضائل سورة
"	اجتناد اور تقلید	۳۲	موضوع سورة
"	کفار کا اعتراف معصیت	"	برکت کا مفہوم
۳۲	ایمان بالغیب والوں کے لیے انعام	۳۳	فلسفہ موت و حیات
"	خوف خدا پر حکمت ہے	"	موت و حیات کی تخلیق کا مقصد
"	اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے	۳۴	صفات الہی
۳۳	اللہ تعالیٰ لطیف و خبیر ہے	"	سات آسمان
۳۴	درس سوئم (آیت ۱۵ تا ۲۲)	۳۵	اللہ کی پیدا کردہ اشیا نقص سے پاک ہیں
۳۵	گزشتہ سے پیوستہ	"	ستارے۔ آسمان دنیا کی زینت
"	دلالت قدرت۔ تسخیر الارض	۳۶	شہاب ثاقب
۳۶	اللہ ہی رازق ہے	"	ستاروں کے ذریعے راہنمائی
۳۷	قیامت کی آمد	"	حاصل کلام
"	خوف خدا	۳۷	درس دوم (آیت ۶ تا ۱۴)
"	فی السماء سے مراد بلندی ہے	۳۸	گزشتہ سے پیوستہ
۳۸	خدا خوفی کی مثال	"	شیاطین اور کفار جہنم کے سزاوار ہیں

۶۲	قیامت کب آئے گی	۴۸	اللہ تعالیٰ عرش پرستوی ہے
"	تواریخ قیامت کا علم صرف اللہ کو ہے	۴۹	زمین کا دھنس جانا
"	قیامت اچانک وارد ہوگی	"	پتھروں کے ذریعے عذاب الہی
"	حدیث جبریل	۵۰	جھٹلانے والوں کا حشر
۶۳	قیامت کی نشانیاں	"	پرندوں کی مثال
"	قیامت میں کفار کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے	۵۱	عذاب الہی کو کوئی ٹال نہیں سکتا
"	اس دن اللہ کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔	"	رازق صرف خدا تعالیٰ ہے
۶۴	قیامت کے لیے تیاری	"	الٹی اور سیدھی چال
"	کفار عذاب سے نہیں بچ سکیں گے	۵۳	درس چہارم (آیت ۲۳ تا ۲۴)
۶۵	گمراہ کون ہیں	"	انسانی وجود کی نعمت
"	شفاعت پانی کی بہر سانی نعمت عظمیٰ ہے	"	کان، آنکھ اور دل
۶۶	ایک فلسفی کا انجام	"	حواس خمسہ
"	اختتام آیت پر اللہ رُبُّ الْعَالَمِينَ	۵۴	حصولِ علم کے ذرائع
۶۷	سورۃ القلم	"	قلبِ حسیم کا مرکز ہے
۶۸	درس اول (آیت ۱ تا ۷)	۵۵	کان اور آنکھ کی اہمیت
"	وجہ تسمیہ اور کوائف	۵۶	شکر گزاری اور ناشکری
"	مضامین سورۃ	۵۷	زمین انسان کے لیے قرار گاہ ہے
۶۹	زمانہ نزول	"	انسان کے بنیادی حقوق
"	نماز کی ابتداء	۵۸	دینی تعلیم کی اہمیت
"	کفار کا اعتراض	"	خلاصہ کلام
"	تفہیم توحید سے انحراف	۵۹	خدا کے حضور پیش ہونا پڑے گا
۷۰	توحید کی رمق	۶۰	درس پنجم (آیت ۲۵ تا ۳۰)
"	کفار کے طعن کا جواب	"	گزشتہ سے پیوستہ

۸۱	دشمنان دین کی ذلت و خواری	۷۰	حرف ن کے مختلف معانی
۸۲	درس سوئم (آیت ۱ تا ۳۳)	۷۱	قلم عام اور خاص معانی میں
۸۳	گزشتہ سے پیوستہ	۷۲	قسم اور اس کا جواب
"	مال کی فراوانی مقبولیت کی علامت نہیں	"	حضور کا ہر فرمان علم و حکمت کا خزانہ ہے
"	مال و اولاد ذریعہ آزمائش ہیں	"	حجر اسود کی تنصیب کا کا نام
۸۴	باغ والوں کی مثال	۷۳	حضور کے لیے بے انتہا اجر
"	باغ کے مالک کی فیاضی	"	آپ کا خلق عظیم
"	حضرت جعفر طیارؓ	۷۴	حضور سے قرب کا مدار اچھے اخلاق پر ہے
۸۵	باغ والے کے بیٹوں کا بخل	"	امت محمدیہ کا فتنہ مال ہے۔
"	بیٹوں کا منصوبہ	"	مفتون کون ہے؟
۸۶	انشاء اللہ کی اہمیت	۷۵	درس دوم (آیت ۸ تا ۱۶)
"	غریبوں کی حق تلفی	"	گزشتہ سے پیوستہ
"	عذاب الہی	۷۶	مشرکین کی پیش کش
۸۷	بیٹوں کی محرومی	"	مداہنت حرام ہے۔
"	درمیانی اشیاء کی افضلیت	"	حسن اخلاق اور مداہنت کا فرق
"	اللہ تعالیٰ فراخی اور تنگی رزق پر قادر ہے	۷۸	دین کے معاملے میں سودے بازی نہیں ہو سکتی
۸۸	اسلام کا نظام معیشت	۷۹	مجنون کہنے والے کی مذمت
۸۹	غریب پروری سے مجتنب سوسائٹی ذلیل ہوگی	"	جھوٹی قسمیں کھانے والا اور ذلیل
۹۰	غیر مسلم اقوام کی غریب پروری	"	طعنہ باز، عیب جو اور چغل خور
"	مسلمان قوم کی غفلت	۸۰	نیکی سے روکنے والا اور تعدی کرنے والا گنہگار
"	باغ والوں کا اعتراف معصیت	"	اکٹرفوں اور متمم
۹۱	باغ کا نعم البدل	"	مال اور اولاد پر فخر
"	حاصل کلام	"	پیسے لوگوں کی کمائیاں

درس چہارم (آیت ۳۴ تا ۴۱)

گزشتہ سے پیوستہ

مشرکین کی خوش فہمی

حضرت جناب کا واقعہ

عذابِ آخرت

متقین کے لیے انعامات

متقی کون ہیں؟

تقوے کا مضمون

درع کے برابر کوئی چیز نہیں

جزا کا مدار تقوے پر ہے

مسلمین اور مجرمین برابر نہیں

مشرکین سے دلائل کا مطالبہ

مشرکین کے لیے شرکار کی امداد

علامہ زحشری کی تفسیر

درس پنجم (آیت ۴۲ تا ۴۷)

گزشتہ سے پیوستہ

عبادت کا اثر اس کی صحت پر منحصر ہے

ساق کے حقیقی معنی

ساق کے مجازی معنی

خدا کی ذات پر نیٹلی کا اطلاق

ساق خدا کے کمال کی ایک بہت ہے

کشفِ ساق سے مراد تجلی کا ظہور ہے

مومن سجدہ ریز ہو جائیں گے۔

کشفِ ساق سے مراد انکشافِ حقیقت ہے

صحتِ عبادت کا انحصار معرفتِ الہی پر ہے

عقیدہ تشبیہ اور شرک

حجابِ سوء معرفت

استدراج کیا ہے؟

خیر خواہوں کی نصیحت سے اعراض

آج کے دولت مند کل کے قلاش

درس ششم (آیت ۴۸ تا ۵۴)

گزشتہ سے پیوستہ

صبر کی تلقین

صبر اور اطاعت لازم و ملزوم ہیں

صبر و صلوٰۃ کے ذریعے استعانت

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ

انبیاء کی معمولی سی لغزش پر بھی گرفت ہوتی ہے

رفع مصیبت کا بہترین وظیفہ

یونس علیہ السلام کی پریشانی

کدو کے خواص

یونس علیہ السلام کی واپسی

یونس علیہ السلام کی بزرگی

نبی کی لغزش کا بلا وجہ بیان کرنا مکروہ تحریمی ہے

تبلیغ جاری رکھنے کا حکم

نظرِ بد بردہ حق ہے

قرآن پاک نصیحت ہے

سورة الحاقة

درس اول (آیت ۱ تا ۱۲)

کوالف سورة

سابقہ سورة کے ساتھ ربط

مضامین سورة ہذا

الحاقہ کا مفہوم

جوائے عمل کا معین وقت

الحاقہ کیا ہے؟

قوم ثمود اور عاد کی سرکشی

سزا کی دو قسمیں

قوم ثمود اور عاد کی ہلاکت

ہلاکت کے بیان میں تقدیم و تاخیر

فرعون اور قوم لوط کی ہلاکت

قوم عاد کا حال

قوم ثمود کا حال

دنیا کی ترقی یافتہ اور ترقی پذیر اقوام

فرعون اور اکیس بستیوں والے

طوفان نوح

حاصل کلام

درس دوم (آیت ۱۳ تا ۲۲)

گزشتہ سے پیوستہ

صورہ اسرافیل

زمین و آسمان ریزہ ریزہ ہو جائیں گے

قیامت برپا ہو جائے گی

حاملین عرش فرشتے

۱۲۱ نظام کائنات کے لیے اللہ کی آٹھ صفات

۱۲۲ عرش الہی پر تجلی اعظم

۱۲۳ مخلوق کی پیشی خالق کے دروبرو

"

۱۲۵ دایم ہاتھ دالے

"

جنت کا یاسورٹ

"

جنت کی نعمتیں

"

جنت میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی

"

جزائے عمل

درس سوم (آیت ۲۵ تا ۳۷)

۱۲۵ گزشتہ سے پیوستہ

۱۲۶ یائیں ہاتھ دالے

"

اٹھارہ افسوس

"

مال کچھ کام نہیں آئے گا

"

اقتدار بھی جاتا ہے گا

"

امت محمدیہ کا فتنہ مال ہے

"

مخصوص اخلاق حیا ہے

"

مال و جاہ کا غلط استعمال

"

مجرمین کا جہنم رسید ہونا

"

خدا کے عظیم انکار

"

اطعام مسکین سے اعراض

"

دین کا خلاصہ

"

حقوق اللہ اور حقوق العباد

"

یا عزت روٹی انسان کا بنیادی حق ہے

۱۳۳

۱۳۴

"

۱۳۵

"

"

"

"

"

۱۳۶

"

۱۳۷

"

۱۳۸

"

"

۱۳۹

"

۱۴۰

"

"

"

"

"

۱۴۱

"

"

"

"

۱۴۲

۱۵۷	عذاب کا مطالبہ	۱۴۲	گداگری حرام ہے
۱۵۸	کیا سائل سے مراد پیغمبر خدا ہے؟	۱۴۳	غریب کی دستگیری مسلمان سوسائٹی کا فریضہ ہے
"	سائل سے مراد کافر اور مشرک ہیں	"	دوزخی بے یار و مددگار رہ جائیں گے
۱۵۹	لفظ معارج کی تشریح	۱۴۵	درس چہارم (آیت ۳۸ تا ۵۲)
"	عروج ملائکہ	"	گزشتہ سے پیوستہ
۱۶۰	پچاس ہزار سال کا دن	۱۴۶	لَا تَاکِیْدِیْ یَا لَا نَفْیْ
"	مسلمانوں کا عروج و زوال	۱۴۷	غیر اللہ کے نام کی قسم کھانا شرک ہے
۱۶۱	غیر اقوام کی رختہ اندازی	"	اللہ تعالیٰ خود مخلوق کی قسم اٹھاتا ہے
"	مسلمانوں کے زوال کی وجہ	۱۴۸	مبصرات اور غیر مبصرات
۱۶۲	مومن کے لیے لمبا عرصہ بھی مختصر ہوگا	۱۴۹	کلام الہی، زبان رسول
"	صبر کی تقین	"	قرآن پاک شاعر کا کلام نہیں
۱۶۳	قیامت قریب ہے	۱۵۰	قرآن پاک کاہن کا کلام نہیں
"	سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا	"	قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے
"	دوست، دوست کو نہیں پوچھے گا۔	"	قرآن پاک کی مثل لانے کے لیے چیلنج
۱۶۴	بیٹے کسی کام نہیں آئیں گے	۱۵۱	رسول خود کلام بنا کر اللہ کی طرف منسوب نہیں کر سکتا
"	بیوی اور بھائی بھی فدیہ نہیں بنیں گے	۱۵۲	قرآن پاک متقین کے لیے نصیحت ہے
"	خاندانی بڑائی ناکام ہو جائے گی	"	منکرین جھوٹے ہیں
۱۶۵	روئے زمین کا کوئی قدر قابل قبول نہیں ہوگا	"	قرآن پاک حق الیقین ہے
۱۶۶	درس دوم (آیت ۱۵ تا ۲۸)	"	تبسح بیان کرنے کا حکم
"	گزشتہ سے پیوستہ	۱۵۵	سورۃ المعالج
۱۶۷	دوزخ مجرم کو خود طلب کرے گی	۱۵۶	درس اول (آیت ۱ تا ۱۴)
"	مجرمین پر فرد جرم	۱۵۷	کوائف اور مضامین
۱۶۸	کسب حلال اور کسب حرام	"	سابقہ سورۃ سے ربط

۱۷۹	شہادت کی درستگی	۱۷۹	جمع مال میں حلال و حرام کی تمیز
"	انگریزی قانون شہادت	"	جائز اور ناجائز اخراجات
"	اللہ کے ہاں پسندیدہ عمل	۱۸۰	رفاہیت بالغہ
۱۸۰	قبولیت نماز کے لیے شرائط	"	حصہ کا اسوۂ حسنہ
"	نماز مقرب الی اللہ ہے	"	انسانی فطرت
"	نمازی کے لیے بشارت	۱۸۱	جائز ضروریات کے لیے خرچ کر نیکی اجازت
۱۸۱	درس چہارم (آیت ۳۶ تا ۴۴)	"	نمازی بخیل نہیں ہوتا
"	گذشتہ سے پیوستہ	"	نماز میں مداومت
۱۸۲	انسان کی فطری بے صبری پر اشکال	۱۸۲	سائل و محروم کی حق رسی
"	جواب - انسانی ترقی کا انحصار بے صبری پر ہے	"	سائل اور محروم کون ہیں؟
۱۸۳	دو چیزوں میں حمد جائز ہے	"	روز قیامت کی تصدیق
۱۸۴	قرآن و سنت کی بعض اصطلاحات	۱۸۳	ایمان خوں اور امید کے درمیان ہے
"	کفار کی گروہ بندی	۱۸۴	درس سوم (آیت ۲۹ تا ۳۵)
"	کفار کی خم خیالی	۱۸۵	شرمگاہ کی حفاظت
۱۸۵	حقیر قطرہ آب سے پیدائش	"	جائز ذرائع - نکل اور ملک یمن
"	مشرکین - نجاست در نجاست	"	شرعی لونڈی کون ہے؟
"	تزکیہ مار فلاح ہے	۱۸۶	لونڈی کے لیے بعض شرائط
۱۸۶	تمام تصرفات قبضہ قدرت میں ہیں	"	اس دور میں واحد ذریعہ نکل ہے
"	کفار مکہ کا نعم البدل انصار مدینہ	۱۸۷	نکل کے لیے بعض شرائط
"	کفار کو ان کے حال پر چھوڑ دیں	"	منعہ اور نکل میں فرق
۱۸۷	قبروں سے نکلیں گے تو دوڑتے ہوئے جائیں گے	"	اسلام اور لونڈی غلام
"	کفار کی ذلت و رسوائی	"	لونڈی غلام بنانا فرض واجب نہیں
		۱۸۸	امانت اور غمہ کی حفاظت

سورة نوح

درس اول (آیت ۱ تا ۷)

کوالف اور مضامین

سابقہ سورۃ سے ربط

حضرت آدم سے حضرت نوح تک

حضرت نوح کے حالات زندگی

طوفان نوح کی کیفیت

کیا طوفان ساری دنیا پر آیا تھا

پہلے صاحب شریعت رسول

پورے سال کے روزے

عروج بن عقیق

موجودہ نسل انسانی حضرت نوح کی اولاد سے ہے

حضرت نوح کی بعثت اور انذار

انذار کا تقدم

حضرت نوح کی تعلیم

ما فوق الاسباب استمداد غیر اللہ سے شکر ہے

عبادت صرف اللہ کی رہا ہے

عبادت الہی کا صلہ

حضرت نوح کی شب و روز دعوت

دعوت حق سے بیزاری

باطل عقیدے پر اصرار اور تکبر

درس دوم (آیت ۸ تا ۹)

گزشتہ سے پیوستہ

۱۸۹ بر ملا دعوت

۱۹۰ علی الاعلان دعوت

۱۹۱ پوشیدہ طور پر دعوت

تبلیغ کے پانچ اصول

تبلیغ کے یہ اصول ہر زمانے میں کار آمد ہیں

۱۹۲ لا وڈ سپیکر کا غلط استعمال

۱۹۳ عبادت میں غفل

عناد و تعصب دین نہیں

۱۹۴ نمازی کے آگے سے گزرنا سخت گناہ ہے

دین قیامت تک قائم ہے گا۔

اسوۂ حسنہ پر عمل کا فقدان

۱۹۵ قول و فعل میں تضاد

اسلام کے نام پر الجاد کی تبلیغ

۱۹۶ درس سوم (آیت ۱۰ تا ۲۰)

گزشتہ سے پیوستہ

استغفار کی ترغیب

۱۹۷ استغفار کی برکات

بارش کے لیے استغفار

نماز استغفار کی حقیقت

۱۹۸ ہر پریشانی کا حل استغفار

ایک اشکال اور اس کا جواب

۲۰۰ استغفار سے روحانی خوشی

استغفار کی کثرت کا حکم

۲۰۱

"

"

۲۰۲

"

"

۲۰۳

"

۲۰۴

"

"

۲۰۵

"

۲۰۶

"

۲۰۸

"

"

۲۰۹

"

"

۲۱۰

"

۲۲۳	درس پنجم (آیت ۲۲ تا ۲۴)	۲۱۰	فوت شدہ والدین کے لیے استغفار
"	گزشتہ سے پیوستہ	۲۱۱	استغفار گناہوں کی میں دور کرتا ہے
"	قوم نوح کے داؤ پیچ	"	ہرنی کا وظیفہ - استغفار
۲۲۴	نبوت میں شبہات پیدا کرنا	"	ولائی توحید
"	اللہ تعالیٰ کی الہیت سے انکار	۲۱۲	تخلیق انسانی
۲۲۵	منظہر خدا کا عقیدہ	۲۱۳	آسمانوں کی تخلیق
"	اپنے علم پر تکبر	"	شمس و قمر کی ضیا پاشیاں
۲۲۶	معبودانِ باطلہ پر اصرار	۲۱۴	انسان ہر حالت میں زمین سے وابستہ ہے
۲۲۹	معبود کیسے بنے	"	آسمانی راستے
۲۳۰	گمراہی کی طرف دعوت	۲۱۶	درس چہارم (آیت ۲۱)
۲۳۲	درس ششم (آیت ۲۵ تا ۲۸)	"	گزشتہ سے پیوستہ
۲۳۲	گزشتہ سے پیوستہ	"	نام اور لقب
۲۳۳	انسان کے اندرونی معبود	"	اتباع رسول فرض ہے
۲۳۴	قوم نوح کی غرقابی کا سبب	۲۱۷	صاحب مال و دولت کا اتباع
۲۳۵	تمام منکرین غرق ہو گئے	۲۱۸	سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام معیشت
۲۳۶	آگ کی سزا	"	سوسائٹی کے اعضاء فاسدہ
"	حضرت نوح کی بد دعا	۲۱۹	لائسنس یافتہ رنڈیاں
۲۳۷	حضرت نوح کی دعائے مغفرت	"	حلال و حرام کی تمیز
۲۳۸	ظالموں کے لیے تباہی کی بد دعا	۲۲۰	شادی بیاہ کی رسوم
۲۴۱	سورۃ الجن	"	فوتیگی کی رسوم
"	درس اول (آیت ۱ تا ۵)	۲۲۱	مال اچھا ساکتی ہے
"	کوالف سورۃ	"	اسلامی نظام معیشت
۲۴۲	لفظ جن کا معنی	۲۲۲	معیار اتباع

۲۴۱	صراط مستقیم پر چلنے والوں کے لیے انعامات	۲۴۲	جنات کی حقیقت
۲۴۳	یاد الہی سے اعراض کرنے والوں کے لیے وعید	"	مخلوق کی مختلف قسمیں
"	مساجد میں غیر اللہ کو پکارنے کی ممانعت	۲۴۴	جنات بھی حضور علیہ السلام کے امتی ہیں
۲۴۴	آداب مسجد	۲۴۵	سابقہ سورۃ سے ربط
۲۴۵	غیر اللہ کے لیے رکوع بھی جائز نہیں	۲۴۶	طائف کا تبلیغی سفر
"	بزرگوں کی قبروں کے ساتھ معاملہ	۲۴۷	جنات کا واقعہ کہاں پیش آیا
۲۴۶	مستحق عبادت صرف اللہ ہے۔	۲۴۸	جنات کا قرآن پاک سن کر ایمان لانا
۲۴۷	عبد اللہ سے مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں	"	قرآن پاک عجیب کتاب ہے
"	حضور علیہ السلام کا اعلان توحید	۲۵۰	اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک ہے
۲۴۸	نفع اور نقصان نبی کے اختیار میں نہیں ہے	۲۵۱	درس دوم (آیت ۶ تا ۱۵)
۲۴۹	محاسبہ کے عمل سے انبیاء علیہم السلام بھی متشنی نہیں	"	آیات اور ترجمہ
۲۵۰	نبی کا کام پیغام الہی پہنچا دینا ہے	۲۵۲	گزشتہ سے پیوستہ
۲۵۱	درس چہارم (آیت ۲۴ تا ۲۸)	"	جنات سے استعاذہ
"	آیات اور ترجمہ	۲۵۳	استعاذہ کا باطل طریقہ
"	گزشتہ سے پیوستہ	"	استعاذہ کا صحیح طریقہ
۲۵۲	نصرت الہی ہی کامیابی کی دلیل ہے	۲۵۴	قیامت کا انکار
۲۵۳	انعقاد قیامت کا وقت نبی کے علم میں نہیں تھا	۲۵۵	جنات پر سختی
۲۵۴	سزا کا مقررہ وقت بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے	"	جنات میں فرقہ بندی
"	علم غیب خاصہ خداوندی ہے	۲۵۸	جنات کی حق شناسی
۲۵۵	انبیاء علیہم السلام کا علم اپنے غیب ہوتا ہے۔	۲۵۹	نیک و بد جنات
۲۵۶	انبیاء علیہم السلام کے عطائے علم کی حقیقت	۲۶۰	درس سوم (آیت ۱۶ تا ۲۳)
۲۵۷	نبی اور رسول میں فرق	"	آیات اور ترجمہ
"	انبیاء کو تمام شرعی علوم سے نوازا جاتا ہے	۲۶۱	گزشتہ سے پیوستہ

۲۹۴	درس دوم (آیت ۱۰)	۲۷۸	شعر گوئی منصب نبوت کے خلاف ہے
"	آیت اور ترجمہ	"	دنیوی علوم منصب نبوت سے خارج ہیں
"	گزشتہ سے پیوستہ	۲۷۹	علم غیب کا باطل عقیدہ
۲۹۶	صبر کی تقنین	"	بنی کا علم محدود ہوتا ہے
۲۹۷	صبر کے پین مانے	۲۸۰	انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے علم میں فرق
۲۹۸	مخالفین کی الزام تراشیاں	۲۸۱	محیط کل اللہ کی ذات ہے
"	مخالفین کی ایذا رسانیاں	۲۸۳	سورة المزمل
"	مخالفین سے قطع تعلقی	۲۸۴	درس اول (آیت ۱ تا ۹)
۲۹۹	جماعتی تنظیم کی اہمیت	"	آیات اور ترجمہ
۳۰۰	درس سوم (درس سوم (آیت ۱۱ تا ۱۴))	"	کوالف اور مضامین
۳۰۲	آیات اور ترجمہ	۲۸۵	زمانہ نزول
"	گزشتہ سے پیوستہ	"	اسلام کا انقلابی پروگرام
"	مکذبین کے لیے مہلت	۲۸۶	انقلاب کے لیے معیاری تربیت کی ضرورت ہے
۳۰۳	اولی النعمۃ کی تفسیر	۲۸۷	لفظ منزل کے معانی
"	دولت مند ہر زمانے میں اولین مکذبین رہے ہیں	"	قیام ایل کا حکم
۳۰۴	اولین متبعین غریب لوگ ہوتے ہیں۔	۲۸۸	قیام ایل کی فضیلت
"	سرماہ پرستانہ ذہنیت	"	ترتیل قرآن
۳۰۵	حقوق العباد	۲۸۹	قیام ایل تعلق باللہ کا ذریعہ ہے
۳۰۷	انسان کے بنیادی حقوق	"	ثقل قرآن
۳۰۸	ظلم کا سد باب	۲۹۰	قیام ایل کی حکمت
۳۰۹	انسانی ہمدردی کا پروگرام	۲۹۱	ذکر الہی کے ذریعے تجلی الہی سے تعلق قائم ہوتا ہے
"	مکذبین کے لیے سزا	"	باطل قوتوں کے مقابلہ میں جماعت حقہ
۳۱۱	درس چہارم (آیت ۱۵ تا ۱۹)	۲۹۲	معبود اور کار ساز اللہ کی ذات ہے

۲۲۶	درس ششم (لغیہ آیت ۲۰)	۳۱۱	آیات اور ترجمہ
"	آیت اور ترجمہ	"	گذشتہ سے پیوستہ
"	گذشتہ سے پیوستہ	"	شاہ رسول
"	نماز پنجگانہ کی فرضیت	۳۱۲	موسیٰ علیہ السلام سے مماثلت
۳۲۷	زکوٰۃ کی فرضیت	۳۱۲	جماعتی تنظیم کی ضرورت
۳۲۸	نماز کی برکات	۳۱۲	قومی اوبین الاقوامی بنی
"	قرض حسن	"	غلبہ اسلام بذریعہ اسلامی فتوحات
۳۲۹	اہم عظیم کا تقویٰ	۳۱۶	ارتکار دولت
"	قرض حسن کا دوسرا اجر	"	سود کی ممانعت
۳۳۰	قرض کے لین دین میں مشکلات	۳۱۷	فرعون کی ہلاکت
"	سود قطعی حرام ہے	۳۱۸	دوزخیوں کی غالب اکثریت
۳۳۱	نیکی کا اجر عظیم	"	قرآن پاک نصیحت ہے
"	استغفار کی برکات	۳۲۰	درس پنجم (آیت ۲۰ تقریباً نصف آیت)
۳۳۲	سورة الممدثر	"	آیات اور ترجمہ
۳۳۳	درس اول (آیت ۴۱)	"	کیا نماز تہجد فرض ہے؟
"	آیات اور ترجمہ	۳۲۱	قیام لیل کی تصدیق
"	کوائف سورة	۳۲۲	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا انقلاب کردہ
"	زمانہ نزول	"	نماز تہجد میں تخفیف
۳۳۵	وجہ تسمیہ	۳۲۳	قیام لیل شیوہ سلف صالحین ہے۔
"	پہلی منزل - ذاتی تہیکل	"	شیطانی وسوسہ
۳۳۷	قول و فعل میں مطابقت	۳۲۴	مطلق قرأت فرض ہے
۳۳۸	دوسری منزل - اصلاح عالم	"	تخفیف کی وجوہات
۳۳۹	رب کی بڑائی	۳۲۵	فرضیت جہاد

۳۵۶	درس چہارم (آیت ۲۶ تا ۳۱)	۳۴۰	لباس کی پاکیزگی
"	آیات اور ترجمہ	۳۴۱	ماحول کی پاکیزگی
"	گزشتہ سے پیوستہ	"	خوراک کی پاکیزگی
۳۵۷	مکذہ بن کے لیے منزا	۳۴۲	درس دوم (آیت ۱۰ تا ۱۵)
"	سفر کی حقیقت	"	آیات اور ترجمہ
۳۵۸	منز کے لیے انیس فرشتے	"	گزشتہ سے پیوستہ
"	انیس کی حکمت	"	اخلاق کی پاکیزگی
۳۶۰	انسانی مشین کو چلانے والے فرشتے	۳۴۳	ظاہری طہارت
۳۶۱	شاہ ولی اللہ کی توجیہ	"	باطنی طہارت
۳۶۵	انیس کا عدد ایمان کی آزمائش کے لیے ہے	۳۴۴	گندگی سے پرہیز
۳۶۸	یہ انسانوں کے لیے باعث نصیحت ہے	۳۴۵	احسان
۳۶۹	درس پنجم (آیت ۳۲ تا ۴۲)	"	دین کا خلاصہ
"	آیات اور ترجمہ	"	ظلم کی بیخ کنی
"	گزشتہ سے پیوستہ	۳۴۶	صبر کی تقنین
۳۷۰	اسلام کی کامیابی پر گواہی	۳۴۷	قیامت کی ہولناکیاں
"	اسلام کا سیاسی غلبہ	۳۴۸	درس سوم (آیت ۱۱ تا ۲۵)
۳۷۱	اسلام کی روشنی	"	آیات اور ترجمہ
"	جہنم کی ہولناکی	"	گزشتہ سے پیوستہ
۳۷۲	تاریخ انسانی کا بڑا واقعہ	۳۴۹	سابقہ سورق سے مطابقت
۳۷۳	پوری نوع انسانی کے لیے دعوت	۳۵۰	ولید ابن مغیرہ
"	دین کے لیے قربانی	"	مال کی کثرت
۳۷۴	اعمال کی جزا و سزا	۳۵۱	ولید کے بیٹے
۳۷۶	درس ششم (آیت ۴۳ تا ۴۸)	۳۵۲	مال و دولت کی حرص
		۳۵۳	ولید کی بدبختی
		۳۵۴	اسلام کے خلاف پراپیگنڈا

۳۹۲	سورة القيمة	۳۷۶	آیات اور ترجمہ
"	درس اول آیات ۱ تا ۱۵	"	گزشتہ سے پیوستہ
۳۹۳	کوائف اور مضامین	"	اصحاب الیمین کا دوزخیوں سے سوال
"	پہلی سورة کے ساتھ ربط	۳۷۷	جرم کے بغیر سزا نہیں دی جاتی
۳۹۴	لفظ لا کی تشریح	۳۷۸	دوزخیوں کا جواب
۳۹۵	نفس کی تین حالتیں	"	نماز کی اہمیت
۳۹۶	بعث بعد الموت	۳۷۹	نماز کے ذریعے تعلق باللہ
۳۹۷	وقوع قیامت	۳۸۰	نماز کے دنیوی فوائد
"	اعمال نامہ پیش کیا جائے گا۔	"	قرآن پاک کا کل عالمی پروگرام
۳۹۸	درس دوم (۱۶ تا ۳۰)	۳۸۱	مساکین کو کھانا کھلاتا
"	گزشتہ سے پیوستہ	۳۸۲	یہودہ باتوں میں شمولیت
۳۹۹	حفاظت قرآن کی ذمہ داری	"	انکار آخرت
"	وقوع قیامت اور حفاظت قرآن میں مناسبت	۳۸۳	محاسبے کا تصور
۴۰۰	قبول ہدایت میں جلدی کی خواہش	۳۸۴	شفاعت کا تصور
۴۰۱	حفظ قرآن کے ذرائع	"	درس ہفتم (آیت ۴۹ تا ۵۶)
۴۰۲	تشریح قرآن کے ذرائع	"	آیات اور ترجمہ
"	حب دنیا یا حب آخرت	"	گزشتہ سے پیوستہ
۴۰۳	روحیت الہی	"	نصیحت سے اعراض
۴۰۴	منکرین قیامت کی مایوسی	۳۸۵	قرآن پاک یاد دہانی کرتا ہے
"	راق کا مفہوم	"	اعراض کی وجوہات
۴۰۵	مجرمین کی زندگی کے آخری لمحات	۳۸۶	کفار کی ہٹ دھرمی
۴۰۶	درس سوم (آیات ۳۱ تا ۴۰)	"	ہر شخص پر کتاب نہیں اتاری جاتی
"	گزشتہ سے پیوستہ	۳۸۷	ہدایت کا مدار طلب پر ہے
		"	اہل تقویٰ اور اہل مغفرت

۴۲۵	ابراہیم کی صفات	۴۰۷	صدق کا مضمون
"	نذر کا معنی	۴۰۸	صدقہ اور نماز کی اہمیت
۴۲۶	نذر کا مسئلہ	۴۰۹	مکزیب اور اعراض
"	نا جائزہ اور حرام منت	"	منکرین کی اکثریت
۴۲۷	جائزہ منت	"	منکرین کی ہلاکت
"	ابراہیم کی پہلی صفت - نذر پورا کرنا	۴۱۰	قیامت کے روز لازماً باز پرس ہوگی۔
۴۲۸	دوسری صفت - خوفِ آخرت	"	انسان کی تخلیق حقیر قطرہ آب سے
"	تیسری صفت - کھانا کھانا	۴۱۱	انسانی نشوونما کے مختلف مدارج
۴۲۹	مسکین	۴۱۲	مقام غور و فکر
"	یتیم	۴۱۳	سورۃ النھر
"	اسیر	۴۱۴	درس اول (۶ تا ۱۰)
۴۳۰	اطعام طعام وسیع معنوں میں	"	وجہ تسمیہ
۴۳۱	چوتھی صفت	۴۱۵	کوائف
"	{ خالص الشکر رضا کی طلب	"	موضوع اور پہلی سورۃ کے ساتھ ربط
"	خوفِ خدا اور اس کے بدلے انعامات	۴۱۶	فضیلت سورۃ
۴۳۳	درس سوئم (آیات ۱۳ تا ۲۲)	۴۱۷	انسان کی حیثیت
۴۳۴	گزشتہ سے پیوستہ	۴۱۸	انسانی جسم کے عناصر
"	ابراہیم تختوں پر بڑے آرام سے بیٹھنے والے ہونگے	"	مقصدِ تخلیقِ انسانی
۴۳۵	دھوپ اور سخت سردی سے محفوظ ہوں گے	۴۲۰	انسان کے لیے ہدایت کی فراہمی
"	اُن پر سایہ ہوگا	۴۲۲	اشرار کا انجام
۴۳۶	اُن پر پھل جھکے ہوئے ہوں گے	"	ابراہیم کے لیے انعامات
"	چاندی کے برتن	۴۲۴	درس دوم (آیات ۱ تا ۱۲)
۴۳۷	زنجبیل کے مشروب	"	گزشتہ سے پیوستہ

۴۵۴	بڑے لوگوں کے بدلے اچھے لوگ	۴۳۸	خدمت گارنکے
۴۵۵	انسانی شکلوں کی تبدیلی	"	ملک اور حکومت
۴۵۶	قرآن پاک یاد دہانی ہے	۴۳۹	روحانی نعمتیں
"	غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے	"	ریشمی لباس
۴۵۸	قرآن پاک کا خلاصہ	۴۴۰	چاندی کے کنگن
"	انسان کا اختیار اور اضطراب	"	جزائے عمل
۴۵۹	نیک و بد کا انجام	۴۴۱	درس چہارم (آیات ۲۳ تا ۲۷)
۴۶۱	سورة المرسلات	"	گزشتہ سے پیوستہ
۴۶۲	درس اول (آیات ۱ تا ۱۵)	۴۴۲	تنزیل قرآن
۴۶۳	وجہ تسمیہ، نزول اور کوائف	۴۴۳	بتدریج نزول کی حکمت
"	موذی جانور کو مارنے کا حکم	۴۴۴	قرآن پاک ذریعہ ہدایت ہے
۴۶۴	حضرت عبداللہؓ اور حضرت عباسؓ	"	حدیث، قرآن پاک کی تشریح ہے
"	ام فضلؓ	۴۴۵	اشاعت قرآن الثانی فریضہ ہے
۴۶۵	اگلی اور پچھلی سورتوں کا آپس میں ربط	۴	لکھ لکھ پر صبر کریں
۴۶۶	سورة کا موضوع	۴۴۶	منکرین کی بات نہ مانیں
"	مختلف اعتبارات سے قیامت کا ذکر	"	صبح و شام ذکر الہی
"	ہوا کی اہمیت	۴۵۰	دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔
۴۶۷	ہوا کے عناصر	۴۵۱	درس پنجم (آیات ۲۸ تا ۳۱)
۴۶۸	ہوا کے خواص	"	گزشتہ سے پیوستہ
۴۶۹	ہوا اور قیامت میں باہمی ربط	۴۵۲	اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے
"	تند و تیز ہوائیں	۴۵۳	انسانی جسم کی جوڑ بندی
"	آیات کا مضمون ایک دو سگرا انداز سے	"	انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ ہے
۴۷۰	عذر کا ارتقاع	۴۵۴	بعث بعد الموت

۲۷۷	میتھا پانی نعمت ہے	۲۷۰	وقوع قیامت
۲۷۸	میں شاخوں والا سایہ	۲۷۱	یوم الفصل
۲۷۹	یوم الفصل	۲۷۲	درس دوم (آیات ۱۶ تا ۴۰)
۲۸۱	درس سوئم (آیات ۴۱ تا ۵۰)	۲۷۳	تکذیب کا مفہوم
"	متقین کے لیے انعامات	"	ہلاکت کی مختلف صورتیں
۲۸۲	سنتے کا مفہوم	۲۷۴	پیدائش کے مختلف مدارج
۲۸۳	مکذبین کی مذمت	۲۷۵	زمین کے فوائد
"	یہ لوگ بے نماز تھے	۲۷۶	مردے کو دفن کرنا فطرت کے عین مطابق ہے
۲۸۴	رکوع اور سجدے کی حقیقت	۲۷۷	جنات کے شر سے حفاظت
۲۸۵	قرآن پاک اللہ کی آخری کتاب ہے۔	"	پہاڑوں کے فوائد

نوٹ

یہ تفسیر بحمد اللہ تعالیٰ — رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ میں
بیس ضخیم جلدوں میں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے
فیاض

حصہ اول

سورۃ ملک تانوح

پیش لفظ

طبع اول

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی عَلَّمَ الْقُرْآنَ ، وَعَمَّرَ الْإِحْسَانَ عَلَى نَوْحِ الْإِنْسَانِ ، لَا یَبِیِّنُ عَلَى الْمُسْلِمِیْنَ
أَهْلَ الْإِیْمَانِ ، وَالصَّلَاةَ وَالسَّلَامَ عَلَى أَفْضَلِ الْأَنْبِیَاءِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ
وَأَصْحَابِهِ وَأَزْوَاجِهِ وَاتَّبَاعِهِ أَجْمَعِیْنَ . آمَنَّا بِكَ

قرآن کریم خدا تعالیٰ کے نور و حکمت کا خزانہ ہے۔ جو شخص بھی اس سے جس قدر فیضیاب ہوگا۔ اسی قدر
اس کو خدا تعالیٰ کا تقرب، اور آخرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و رفاعت نصیب ہوگی۔ اسی خیال سے
قرآن کریم کی تعلیمات اور فیض کو عام کرنے کے لیے قرآن کریم کا درس، ترجمہ اور مطلب غوام کے سامنے بھی بیان
کیا جاتا ہے تاکہ عام لوگ بھی اس کے فیض سے محروم نہ رہیں، ہماری حقیر کوشش بھی یہی رہی ہے کہ ہمارا تعلق
اور رشتہ آخر دم تک قرآن کریم کے ساتھ قائم رہے۔ اور اس کی اشاعت و تعلیم میں ہماری حقیر کوششیں بھی شامل
ہوں۔ گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں جامع مسجد نور میں متعدد بار قرآن کریم کا درس، ترجمہ، مسائل، احکام بیان
ہوتے رہے ہیں۔ لیکن گذشتہ سال سے ایک نیک نخت نوجوان بلال احمد صاحب ناگی کے دل میں اللہ تعالیٰ
نے یہ خیال ڈال دیا کہ اس نے احقر کے درس قرآن کو ٹیپ کے ذریعہ کیسٹ میں محفوظ کرنا شروع کر دیا۔
چنانچہ سورۃ حشر سے آخر تک یہ مکمل طور پر محفوظ کر لیا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے الحاج لعل دین صاحب (ایم اے اسلامیات)
جیسے نیک اور اہل دل کو اس کی توفیق بخشی کہ انہوں نے اپنی حسن عقیدت اور قرآن کریم کے ساتھ گہرے لگاؤ اور
محبت سے اس کو کیسٹ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کرنا شروع کیا، انہ صرف یہی کیا بلکہ مناسب سرخیاں اور موزوں عنوان
لگانے کی توفیق ارزانی بھی ہوئی، چنانچہ سب سے پہلے سورۃ فاتحہ کا حصہ شائع ہو کر عام و خاص سے خارج عقیدت

وصول کر چکا ہے۔ اب پارہ ۲۹ سورۃ ملک سے سورۃ نوح تک پانچ سورتوں کے دروس کا حصہ پیش خدمت ہے۔ تاکہ قرآن کریم سے استفادہ کرنے والے عوام و خواص اس سے مستفید ہوں۔

اللہ تعالیٰ الحاج بابو غلام حیدر صاحب اور الحاج منیر احمد نارو صاحب اور ان کے رفقا کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ وہ اس سلسلہ کی اشاعت کے لیے تگ و دو فرما رہے ہیں۔

قرآن کریم کی آسان تفہیم اور عام فہم اردو زبان میں مختصر تشریح اور ضروری تفسیر کا بیان۔ اور سلف صالحین اور اکابر مفسرین کے مقرر کردہ اصولوں کی روشنی میں وضاحت۔ باطل اور گمراہ فرقوں۔ اور آزاد خیال خود رو مفسرین کی تفاسیر سے اجتناب و گریز اس کا خاص امتیاز ہوگا۔ اور ولی اللہی فکر کی چھاپ اس پر نمایاں ہوگی۔ ضروریات وقت پر خاص نظر۔ اور اکابر علماء حق کی علمی تحقیقات کی روشنی میں بقدر ضرورت تفصیل خاص نمایاں ہوگی۔

اس خیال سے کہ عوام بھی قرآن کے فیضان سے محروم نہ رہیں۔ اور قرآنی فکر کو سمجھ کر اپنا دستور العمل بنائیں اور قرآن کی تفسیر یعنی سنت خیر الانام سے بھی مانوس ہوں۔ اور صحابہ کرامؓ اور اہل بیتؓ جو قرآن اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ مبارکہ اور آپ کے طور طریقوں کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے، ان سے اور ان کے علوم و معارف سے بھی باخبر ہوں اور ان کو اپنا پیشوا و مقتدا بنالیں۔

قرآن کریم چونکہ تمام دینی اصولوں کا مجموعہ ہے خیر کثیر، اور حکمت کا مکمل کورس ہے۔ انسانیت کے لیے ایسا کمال کہ اس سے بڑھ کر کوئی کمال نہیں۔ ایسا پروگرام کہ اس سے بہتر کوئی پروگرام نہیں ہو سکتا۔ اس کی تعلیم و اشاعت کا انتظام انسانیت کا ہر دور میں سب سے اہم ترین تقاضا ہے جو قوم بھی قرآن کریم کے پروگرام کو نہیں اپنائے گی اس کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔

اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق فَاتَّخِذُوهُ ذِكْرًا وَذَادًا (الحديث) کہ قرآن کریم کو ہی ذخیرہ آخرت اور زاد راہ بنالو۔ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔

وَعَلَّمَہُ کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہمارے لیے بھی ذریعہ نجات و فلاح بنائے اور خیر کو مَن تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہُ کا مصداق بنے۔ اور جو حضرات بھی اس کی اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں تاکہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا و آخرت میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔ وَاللّٰهُ عَلٰی مَا نَقُولُ وَكِيلٌ

احقر عبد الحمید سواتی خادم مدرسہ نصرۃ العلوم و جامع مسجد نور

نزد گھنٹہ گھر شکر گوہر انوالہ (پاکستان) (۳۰ ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ - ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۵ء)

پیش لفظ

(طبع اول)

(از - محترم الحاج محل دین صاحب ایم اے علوم اسلامیہ)

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ۔ اَمَّا بَعْدُ
قرآن پاک کی تفسیر و تشریح اور توضیح گذشتہ چودہ صدیوں سے پیش کی جا رہی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت پر
نبوت کا دروازہ بند ہونے کے بعد اشاعت قرآن و سنت کا کام العلماء و ورثۃ الکتب کے مصداق ہر زمان و مکان کے
علماء و فقہاء سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ تا قیام قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

قرآن حکیم کا خود اپنا بیان ہے وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ یعنی ہر خشک و تر چیز کا بیان اصولی طور
پر مقدس کتاب میں موجود ہے۔ اب یہ متلاشیان حق کا کام ہے کہ حسب ضرورت اس باغ کی خوشہ چینی کرتے رہیں
اور اپنے دلوں کو قرآن پاک کے علوم سے منور کرتے رہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت
عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔

جَمِيعُ الْعِلْمِ فِي الْقُرْآنِ لَكِنْ لِقَاصِي عَنْهُ أَفْهَاهُ الْجِبَالِ

تمام علوم کا ذخیرہ قرآن پاک میں موجود ہے مگر عام لوگوں کے ذہنوں کی اس تک سائی نہیں

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عام طالبان علم کو دعوت دی ہے کہ اگر انسانوں نے کوئی علم حاصل کرنا ہے تو قرآن کریم میں
غور و فکر کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر علم صحیح کا حاصل کرنا ناممکن ہے۔ فرماتے ہیں ”مَنْ أَرَادَ عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ
فَلْيَتَدَبَّ فِي الْقُرْآنِ“ (یعنی جو شخص اولین و آخرین کے علم سے واقف ہونا چاہتا ہے وہ قرآن میں تدبر کرے)
الغرض قرآن پاک علم و حکمت کا وہ خزانہ ہے جس میں غور و تدبر کرنا سیکھنے کو ہر وہ چیز میسر آتی ہے جس کا وہ متلاشی
ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک کو چھوڑ کر نوع انسانی کبھی بھی منزل مراد تک نہیں پہنچ سکتی۔ علامہ اقبالؒ نے خوب کہا ہے
گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

ایک مسلمان کی زندگی محض قرآن سے وابستہ ہے۔ اس کے بغیر کوئی زندگی نہیں۔ اگر اسے کامیابی کی ضرورت ہے۔
تو اسے قرآن کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ ورنہ راہ ہدایت کی اساس و بنیاد سے بہرہ ور نہیں ہو سکے گا۔

اس بنیادی اصول کے پیش نظر مفسرین کرام اپنے اپنے زمانے میں قرآن پاک میں تدبر کرتے رہے ہیں اور پیش آمدہ
مسائل کا حل پیش کرتے رہے ہیں۔ جب بھی ضرورت پیش آئی قرآن حکیم سے ہی راہنمائی حاصل ہوئی۔

اب قرآن پاک کی ہزاروں تفسیریں مختلف زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں۔ روزانہ درس قرآن کا سلسلہ بھی آج کل عام ہے شہروں اور قصبوں سے نکل کر دیات تک پہنچ چکا ہے۔ بہت سے علماء کرام اپنے اپنے حلقہ اثر میں علم و عرفان کے موتی بکھیر رہے ہیں۔ اور راہ حق کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔

”معالم العرفان فی دروس القرآن“ کا زیر نظر نسخہ بھی اس سلسلہ کی کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ صوفی عبدالحجید سواتی کی عمر دراز کرے اور انہیں صحت و تندرستی سے نوازے جو عرصہ اکیس سال سے جامع مسجد نور گدہ جرنوالہ میں درس قرآن و حدیث دے رہے ہیں اور موجودہ زمانے میں نت نئے ابھرنے والے مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کر کے تشنگان علم کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اگر کوئی متلاشی حق خالی الذہن ہو کر ان دروس کا مطالعہ کرے گا تو امید واثق ہے کہ قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی اس کو نظر آئے گی اور خدا تعالیٰ کے قرآن پاک کا مقصد و مدعا اس کو سمجھ آنے لگے گا۔ دروس القرآن کی غرض اصلی بھی یہی ہے۔ کلام پاک کے ساتھ ہر ایک مسلمان کا تعلق قائم ہو جائے۔ کسی انسان کی تعداد کی سب سے بڑی علامت یہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام پاک کو صحیح خطوط پر سمجھ کر اس کے مطابق اپنے فکرو عمل کی اصلاح کا پروگرام اخذ کر سکے اور اپنی ترقی و فلاح کا سر و سامان مہیا کر سکے۔ ماحول کی آلودگی اور مختلف افکار و آراء کا تضاد اور گمراہ فرقوں کی کثرت۔ تعصب و عناد کی فراوانی۔ مغربیت کی زہر آلود غریباں ذہنیت اور اشتراکی الحاد کی تباہ کاریاں کا سیلاب جہاں ہر طرف پھیلا ہوا ہو تو انسانی افکار و آراء کے اندر استقرار و سکون کی کیفیت کب پیدا ہو سکے گی۔ بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام پاک اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی اسکی تفسیر و توضیح اور کلام پاک کے اولین سامعین صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عظام کا عمل و بیان سامنے ہو تو فلاح و سعادت کی راہ متعین ہو سکے گی۔ اسی لیے دروس القرآن میں ان سب باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اور ان سب حضرات کی جو ان دروس کی اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں نجات کا ذریعہ بنائے اور سب کو سعادت دارین سے ہمکنار ہونا اور فائز المرام ہونا نصیب فرمائے۔ آمین

لعل دین (ایم اے علوم اسلامیہ)

شالامار ٹاؤن لاہور۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۸۲ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

نخباتِ گفتنی

(طبع اول)

(حصہ دوم سورۃ جن تا مرسلت)

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ
خَاتَمِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَتْبَاعَهُ أَجْمَعِينَ۔ آمَّا بَعْدُ

معالم العرفان فی دروس القرآن کی تیسری جلد سورۃ جن تا مرسلت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ دروس کا یہ سلسلہ قرآن پاک کے معانی و مطالب کی حفاظت کا ایک پاکیزہ سلسلہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے پیش آمدہ جدید مسائل کا قرآن و سنت کے مطابق بہترین حل۔

دروس القرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحب دامت برکاتہم منہم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے وہ دروس ہیں جو وہ نماز فجر کے بعد جامع مسجد نور گوجرانوالہ میں ارشاد فرماتے ہیں جس میں علوم بھی شریک ہوتے ہیں اور خواص یعنی تعلیم یافتہ حضرات بھی۔

حضرت صوفی صاحب دامت برکاتہم ہندوستان کی عظیم دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الفقہ والادب حضرت مولانا مفتی اعزاز علی۔ شیخ المحقول والمنقول حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی اور امام اہلسنت مناظر اسلام حضرت مولانا عبد الشکور لکھنوی وغیرہم اکابر و اساطین علم و حکمت کے تلامذہ میں سے ہیں۔ تلمذ کے علاوہ حضرت شیخ مدنی سے سلسلہ بیعت و نسبت بھی ہے۔ اسی سلسلہ ظاہری علوم کی طرح باطنی علوم سے بھی آپ کو مناسبت ہے۔

عرصہ اکتیس سال سے مدرسہ نصرت العلوم کے اہتمام کے ساتھ تدریس کے فرائض بھی برابر سرانجام دے رہے ہیں۔ درس نظامی میں پڑھاتے جانے والے دیگر علوم و فنون کی مختلف کتابوں کے علاوہ حدیث شریف کی متعدد کتابیں سینکڑوں علماء و طلباء کو بار بار پڑھا چکے ہیں اور عرصہ اکتیس سال سے جامع مسجد نور میں خطابت کے علاوہ صبح کی نماز کے بعد درس بھی دیتے ہیں۔ اس مرتبہ سے قبل تقریباً چار پانچ دفعہ قرآن پاک بھیج کے درس عام میں ختم ہو چکا ہے۔ فجر کی نماز کے بعد ہونے والے درس میں چار دن قرآن پاک اور دو دن حدیث شریف کا درس ہوتا ہے۔ تمام صحاح ستہ، مشارق الانوار، الترغیب والترہیب، موطا امام مالک درس میں مکمل ختم ہونے کے بعد اب

سید احمد جلد اول کا درس شروع ہے حضرت صوفی صاحب دامت برکاتہم کی دیگر علوم و فنون کے علاوہ حدیث تفسیر پر بھی گہری نظر ہے۔ اس کے علاوہ فلسفہ ولی اللہی سے آپ کو خصوصی لگاؤ ہے۔ مسلمانوں کے لیے اپنے دل میں خلوص و سچی ہمدردی اور ان کی زبوں حالی اور پستی پر درد دل اور تڑپ رکھنے والے انسان ہیں۔ آپ کے مقاصد عظیم، اور فکر بلند ہے۔ ماضی کی تاریخ میں مسلمانوں کے عروج و زوال اور عصر حاضر میں مسلمانوں کو پیش آنے والے مسائل و حوادث پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کو دروس القرآن میں جہاں تفسیری نکات، فقہی مسائل اور غیر اسلامی نظامات حکومت سرمایہ داری سوشلزم کمیونزم وغیرہ باطل نظامات پر بے لاگ تبصرہ ملے گا اور ان کی بنیادی خرابیوں کی نشاندہی اور اسلام کے بنیادی عقائد کی توضیح، کفر و شرک و بدعات کا نہایت اچھے اور عام فہم انداز میں رد، اور عصر حاضر میں مسلمانوں کی معاشی۔ سیاسی۔ اقتصادی۔ تعلیمی اور اخلاقی طور پر پستی اور تنزل اور اس کے اصلی اسباب و محرکات کی واضح نشاندہی بھی ملے گی،

بڑی بڑی ضخیم تفسیروں کے متعدد صفحات پر پھیلے ہوئے مضامین کو مختصر مگر انتہائی عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں جہاں واقعات اور قصص بیان ہوئے ہیں ان میں سے اکثر شروع سے آخر تک ایک جگہ بیان کر دیے گئے ہیں۔ ایک واقعہ کو مختلف جگہوں سے تلاش نہیں کرنا پڑتا۔ اور ذہن مشوش نہیں ہوتا۔ گویا قصص کا سلسلہ بھی مربوط ہے اور قصص کی غرض اصلی کو پوری طرح واضح کیا گیا ہے۔

خطباء، علماء، طلباء اور دیگر صاحب علم حضرات کے لیے جس طرح یہ دروس مفید ہیں اسی طرح عظیم الشان کاروباری و ملازمت پر مشبہ حضرات کے لیے بھی ان کا مطالعہ انتہائی ضروری اور بے حد مفید ہو گا۔ یہ چونکہ عوامی دروس ہیں اس لیے ان میں لفظی بحثیں اور صرف و نحو کے قواعد کی بحث کم ملے گی بایں ہمہ کمزور طبقات کو اٹھا کر بلندی پر پہنچانے کے لیے یہ دروس مرہم دلہائے ریش کا کام دیں گے۔

دروس القرآن کا مطالعہ وقت کا ایک اہم ترین تقاضا بھی ہے۔ اس لیے کہ موجودہ زمانہ میں جہاں مسلمان اخلاقی اور عملی طور پر تباہ ہو رہے ہیں۔ وہاں علمی طور

پر بھی مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ عوام کی بات چھوڑیے ایسے خطباء کی تعداد میں دین بدن اضافہ ہو رہا ہے جن کو تفسیر حدیث، فقہ وغیرہ علوم سے دور کا بھی واسطہ نہیں جن میں استعداد ہے ہی نہیں۔ عالمانہ وضع قطع جبہ قبہ، سر ملی آواز چند غیر مستند حکایات اور نظموں کے کچھ مجبوعوں کے علاوہ علم نام کی کوئی چیز بھی ان کے پاس

نہیں۔ لیکن نمبر رسول پر بیٹھ کر قوم کی راہنمائی کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں، اور وعظ و نصیحت کے نام پر توحید و سنت سے دور کرنے، رسومات و بدعات و شرک کی ترویج کے درپے ہیں۔ جو تحریر و تقریر میں قرآن و سنت و سلف صالحین کے مزاج و طریق کی پابندی کرنے پر کسی طرح تیار نہیں، تفریق بین المسلمین۔ مگر وہ بندی۔ تعصب۔ مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خلاف منافرت پھیلا نا جن کا مشن ہے اور مسلمانوں کی تھخیر جن کا محبوب مشغلہ ہے۔

مسلمانوں کی رہی سہی عقیدے کی دولت جس پر نجات آخرت کی مدار ہے کہ دنیوی زندگی نہ سہی چلو بالآخر آخرت ہی بہتر ہو جائے۔ مشائخ طریقت اور بزرگان دین کے نام کی اڑے کمر وہ بھی ان سے چھیننے کی کوشش کی جا رہی ہے حالات کا مشائخ طریقت یا بزرگان دین و سلف صالحین نے ہمیشہ ان باطل عقائد سے براہ مٹ ظاہر کی ہے لیکن عوام چونکہ سادہ لوح اور سخی ذہن کے مالک ہوتے ہیں، اپنی اس سادگی کی وجہ ان کی عالمانہ وضع قطع آواز کا اتار و چڑھاؤ اور غلط پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر رسومات و بدعات کو کار خیر سمجھنے لگتے ہیں ایسے دور کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ۔

قرب ہے کہ لوگوں پر ایسا زمانہ آجائے گا کہ اسلام کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن کے نقوش ہی رہ جائیں گے ان کی مساجد آباد ہوں گی لیکن ہر بیت سے خالی ہونگی ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے سبے بڑے لوگ ہونگے ان میں سے فتنے نکلیں گے اور ان میں ہی لوٹ کر لیٹیں گے

يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقَى مِنْ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ وَلَا يَبْقَى مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رُسْمُهُ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدَىٰ عُلَمَاؤُهُمْ شَيْءٌ مِّنْ تَحْتِ أَدِيمِ السَّمَاءِ مِّنْ عِنْدِهِمْ تُخْرَجُ الْفِتْنَةُ وَفِيهِمْ نَعُودٌ۔ (بیہقی شعب الایمان)

لہذا قرآن و سنت کی صحیح تعلیمات سے آگاہ ہونے کے لیے بھی دروس القرآن کا ہر گھر اور لائبریری میں موجود ہونا وقت کا ایک اہم ترین تقاضا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا تمام مواد سلف صالحین اور علمائے محققین کے فہم و مزاج کے موافق ہے۔

اس کے مطالعہ سے انشاء اللہ ان لوگوں کی خود بخود ترمیم و ترمیم ہو جائے گی۔ جو مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ یا اس کے پراپیگنڈے سے مرعوب ہیں یا اپنے کسی بھی حقیر جذبے کو تسکین دینے کے لیے حدت اور تحقیق کے نام پر قرآن پاک کے معانی و مطالب میں تحریف کی کوششیں کرتے ہیں اور سلف صالحین کے طریق سے ہٹ کر اسلام

کی نہی نہی تعبیریں کرتے ہیں۔ جیسا کہ آجکل کے خود رو مفسرین کا شیوہ ہے اور ان کی تفسیروں میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔ جن کو نہ قرآن و سنت سے گہرا لگاؤ ہے اور نہ ہی ماہر اساتذہ کے سامنے زانو اتکڑے کئے ہیں۔ نہ حصول علم کے لیے کچھ عرق ریزی کی ہے۔ محض ادیب ہیں یا صرف مغربی طرز تعلیم کے کالجوں، یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہے ہیں اور اب قرآن پاک کی تفسیر و تشریح کرتے پر کمر بستہ ہو گئے ہیں۔ جن کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح طور پر فرمان موجود ہے۔

فَافْتُوا بَعِیْہِمْ فَاَصْلَحُوا
کہ وہ بغیر علم کے مسائل بتائیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (بخاری ص ۱۰۰)

حسب سابق اس حصہ میں بھی دروس القرآن کو کیٹ سے کاغذ پر منتقل کرنے کا کام محترمی و محرمی جناب الحاج لعل دین ایم اے علوم اسلامیہ نے کیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ عنوانات پر نہایت مفید سرخیاں بھی قائم کی ہیں سرخیوں کو ایک جانب حاشیے پر لکھا گیا ہے تاکہ دروس کا تسلسل اور اصل دروس سے امتیاز قائم رہے۔ دروس القرآن چونکہ مستقل تصنیف تو ہے نہیں بلکہ دروس کو کیٹ سے کاغذ پر منتقل کیا گیا ہے اس لیے اس میں کتابوں کے حوالجات اور صفحات لکھنا تو ضروری نہیں۔ تاہم اہل علم حضرات کی سہولت کے لیے رقم الحروف نے اکثر بیشتر مقامات پر نیچے حاشیے میں کتابوں کا نام اور صفحہ نمبر لکھ دیا ہے تاکہ اگر کوئی اصل کتاب اور ماخذ کی طرف رجوع کرنا چاہے اسے آسانی ہے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ یہ سلسلہ مفید ثابت ہوگا۔

دروس کے شروع میں آیات کے بعد درج شدہ ترجمہ حضرت صوفی صاحب مظلہ کا اپنا ترجمہ ہے۔

آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس اور اس کی اشاعت میں حصہ لینے والے جملہ حضرات کی بخشش کا ذریعہ بنائے اور نہ یادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے فیض یاب ہو سکی تو فیق سعطاف فرمائے آمین :-

فقط محمد اشرف (فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم)

(۱ ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ ۵ اکتوبر ۱۹۸۲ء)



سُورَةُ الْمَلِكِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلَاثُونَ آيَةً فِيهَا الْكُفْرُ عَانِ

سورۃ ملک مکی ہے اور یہ تیس آیات اور اس میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ①
خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ
الْعَزِيزُ الْغَفُورُ ② الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا مَا تَرَى فِي
خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَوُّتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ ③
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ ④
وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ وَ
اعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ⑤

ترجمہ : وہ بڑی ہی برکت والی ذات ہے۔ جس کے قبضے میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز

پر قدرت رکھتا ہے ① جس ذات نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ

تم میں سے اچھے اعمال کون کرتا ہے۔ اور وہ کمال قوت کا مالک بہت بخش کرنے والا ہے

② وہ اللہ تعالیٰ جس نے سات آسمانوں کو تہ بہ تہ پیدا کیا ہے۔ رحمن کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے

انداز میں کوئی تفاوت (بے ضابطگی) نہیں دیکھ پاؤ گے، پھر نگاہ اٹھا کر دیکھو کیا تمہیں کوئی شکاف یا

دراڑ نظر آتی ہے؟ ③ پھر دوبار (یعنی بار بار) نگاہ اٹھا کر دیکھو تمہیں کوئی دراڑ یا شکاف نظر نہیں آئے

گا۔ بلکہ تمہاری نگاہ تمہاری ہی طرف لوٹ آئے گی ذیل ہو کر اس حالت میں کہ وہ تھکی ہوئی ہوگی ④

اور البتہ تحقیق ہم نے آسمان دنیا کو چہرہ اخوں (ستاروں) کے ساتھ زینت دی ہے اور ہم نے ان

ستاروں کو شیطانوں کو ماننے والا بنایا ہے۔ اور ہم نے ان شیاطین کے لیے دروزخ کی سزا

بھی تیار کی ہے ⑤

درجہ تسمیہ
اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ ملک ہے۔ اس کی پہلی آیت میں لفظ "ملک" آیا ہے۔ اسی لفظ سے
اس سورۃ کا نام لیا گیا ہے۔ ملک سے مراد اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اور حکومت ہے۔

حدیث میں اس سورۃ کے اور بھی نام آئے ہیں۔ اس کا ایک نام سورۃ واقعہ ہے یعنی نجات دلا
والی سورۃ اور بچانے والی۔ اور ایک نام سورۃ مانعہ یعنی اللہ کے عذاب سے روکنے والی ہے۔ اس کا ایک نام
سورۃ منجیہ ہے عذاب سے نجات دلانے والی، اور سورۃ ملک بھی ہے۔

یہ مکی سورۃ ہے، ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ اس میں تیس آیات دو رکوع، ۳۳۵ الفاظ
اور ۱۳۱۳ حروف ہیں۔

دیگر سورتوں سے
مناسبت (ربط)

یہ سورۃ اور اس کے بعد والی سورۃ مکی سورتیں ہیں۔ اس سے پہلی سورۃ تحریم میں حضور نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کا ذکر تھا۔ آپ کی ازواج مطہرات سے معمولی سی لغزش ہو گئی تھی، اس پر
اللہ تعالیٰ نے سخت تنبیہ فرمائی۔ اور نبی علیہ السلام کے حقوق کا خیال رکھنے کا حکم دیا، اور دیگر باتوں
کا ذکر فرمایا۔ اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی توحید کے حقوق کا ذکر ہے۔ تو گویا اس طریقے سے ان
سورتوں کو آپس میں مناسبت ہے۔

فضائل سورۃ

اس سورۃ مبارکہ کی فضیلت کے سلسلہ میں حضور نبی کریم نے فرمایا کہ ایک سورۃ تیس آیات پر
مشتمل ہے۔ اور اس سورۃ نے کسی شخص کے لیے اللہ کے ہاں سفارش کی (شَفَعَتْ) تو اللہ تعالیٰ
نے اس شخص کو نجات دی۔ اور اس کی سفارش کو قبول فرمایا۔ وہ تیس آیتیں اسی سورۃ مبارکہ کی ہیں۔
ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام کسی سفر پر تھے۔ انہوں نے
ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ اور خیمہ لگایا۔ اور انہیں معلوم نہیں تھا کہ جس جگہ خیمہ لگا ہے ہیں، اس کے نیچے قبر
ہے۔ تو اس صحابی نے اس قبر والے کو اس سورۃ مبارکہ کی تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ صحابی کو بڑا تعجب
ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اس صحابی نے اس واقعہ کا ذکر جب نبی علیہ السلام کے سامنے کیا۔ تو آپ نے
فرمایا: **هِيَ الْمُنَجِّیَّةُ** ھٰی الْمُنَجِّیَّةُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ یعنی یہ سورۃ انسان کو نجات
دلانے والی ہے اور عذاب قبر سے بچانے والی ہے۔ تو اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ بتلادیا۔
کہ اس سورۃ کے پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ
اللہ تعالیٰ جب چاہے کسی کو کوئی بات سنا دے۔ اس لیے اس سورۃ کا نام منجیہ اور مانعہ ہے۔

یعنی اللہ کے عذاب سے اور قبر کے عذاب سے بچانے والی سورۃ۔

اہم باقرہ، اہم زین العابدینؑ کے فرزند اور اہم ابوحنیفہؒ کے اُستاد اور پیر ہیں۔ ان کی عادت تھی کہ عشاء کے بعد نفل بیٹھ کر پڑھتے تھے، اور ان میں اس سورۃ مبارکہ کو تلاوت فرماتے تھے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق حضور نبی کریمؐ سونے سے پہلے سورۃ تَبٰرَكَ الَّذِي اور سورۃ السجۃ ضرور تلاوت فرماتے تھے۔

موضوع سورۃ

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور توحید کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ آیات قدرت یعنی اُس کی نشانیوں کا بیان ہے۔ اور اس کے بعد سزا کی منزل اور قیامت کا حال بھی مذکور ہے۔ لیکن مرکزی مضمون اس کا توحید ہے۔

اس سورۃ کی ابتدا برکت کے لفظ سے ہوئی ہے تَبٰرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ۔ برکت اُس سے زیادتی کو کہتے ہیں، جس میں پاکیزگی، طہارت اور تقدس کا مفہوم پایا جائے۔ اور جن اذکار کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے، اسی بہت سی صورتیں ہیں۔ جیسے بِسْمِ اللّٰهِ، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ، سُبْحَانَ اللّٰهِ، الْحَمْدُ لِلّٰهِ، اللّٰهُ اَكْبَرُ۔ اور انہیں اذکار میں ایک تَبٰرَكَ اللّٰهُ ہے۔ تَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِينَ "تَبٰرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ" ایسے ہی اور بھی کئی اذکار ہیں، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے۔

برکت کا مفہوم

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے، کہ برکت مینے والا صرف خدا ہے۔ مگر مشرک لوگ دوسروں سے برکت کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ تو اس کا رد ہے یہ مضمون اور بھی کئی سورتوں اور آیات کے اندر آیا جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن پاک میں موجود ہے۔ جَعَلَنِي مُبَارَكًا یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بابرکت بنایا۔ یعنی برکت اللہ تعالیٰ نے عطا کی۔ اسی طرح تَبٰرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهِ یعنی وہ ذات بڑی برکت والی ہے۔ جس نے اپنے بندہ کامل پر قرآن حکیم نازل فرمایا۔ اس سورۃ میں ارشاد ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ یعنی وہ بڑی ہی برکت والی ذات ہے۔ جس کے قبضے میں بادشاہی ہے۔ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور سب اختیارات اُسی کے پاس ہیں۔ ساری عظمت اُسی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کوئی کام کرنا چاہے، تو کوئی اُسے روک نہیں سکتا۔ نہ اس کے سامنے کوئی ٹھہر سکتا ہے۔ اُس کے ارادے اور مشیت کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ وہ قادر مطلق ہے۔

فلسفہِ مودیت

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ جس ذات نے موت اور زندگی کو پیدا کیا۔ اور پھر یہ بھی فرمایا اُنْجِي وَيُمِيتُ وہ زندہ کرتا اور موت دیتا ہے۔ ان کو پیدا کرنے والا خدا ہے۔

موت کی حقیقت کے متعلق دو نظریات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اسے عدمی چیز مانتے ہیں جب کہ بعض دوسرے اسے وجودی تسلیم کرتے ہیں۔

موت کے ساتھ چونکہ تخلیق کا ذکر آیا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ یہ ایک وجودی چیز ہے نہ کہ عدمی۔ حدیث پاک میں آتا ہے۔ اُتِيَ بِالْمَوْتِ كَالْبُكْشِ الْمَلْحِ یعنی قیامت کے روز حساب کتاب ہو جانے کے بعد موت کو لایا جائے گا۔ اس کی شکل و صورت سیاہ رنگ کے مینڈھے کی ہوگی پھر اسے جنت اور دوزخ کے درمیان ایسی جگہ لا کر کھڑا کیا جائیگا۔ جہاں سب لوگ اسے دیکھیں گے اور پھر ہر ایک سے پوچھا جائے گا، یہ کیا ہے؟ سب کہیں گے یہ موت ہے۔ پھر سب کے سامنے اُسے ذبح کر دیا جائے گا۔ اور اہل جنت سے کہا جائے گا خُودٌ وَلَا مَوْتُ یعنی اب تم ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہو گے تمہیں موت نہیں آئے گی۔ اسی طرح اہل دوزخ بھی ہمیشہ دوزخ میں ہی رہیں گے، انہیں بھی موت نہیں آئے گی۔ ایسے لوگ جن کے متعلق قرآن پاک میں قطعی فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور قرآن پاک نے انہیں دوزخ میں روک دیا ہے حَبَسَهُ الْقُرْآنُ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ یہ دن مومنوں کے لیے بڑی خوشی کا، کافروں کے لیے بڑی حسرت کا دن ہو گا، یہ سارا ذکر صحیح احادیث میں موجود ہے۔

موت و حیات کی تخلیق کا مقصد

موت و حیات کی تخلیق کا مقصد یہ بیان فرمایا کہ لِيُبْذَرَكُمْ اَيْكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے اعمال کون کرتا ہے۔ اگر موت کا تصور نہ ہوتا تو کوئی شخص نیکی کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ یہ موت کا تصور ہی ہے۔ جو انسان کو نیکی کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایک نہ ایک دن اُسے مرنا ہے۔ اور یہ دنیا فانی ہے۔ یہی تصور انسان کو اچھے اعمال پر آمادہ کرتا ہے۔ تاکہ دوسرے جہان پہنچ کر اُسے پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ تو گویا موت نیکی کے لیے بمنزلہ شرط ہے۔ اور حیات تو خود ایک ظرف ہے۔ جس کے اندر رہ کر انسان کام کرتا ہے۔ اور نیکی کی طرف راغب کرنے والی چیز صرف موت ہی ہے۔

متنبی کہتا ہے وَلَا فَضْلَ فِيهَا لِلشَّجَاعَةِ وَالنَّدَى وَصَبْرٍ الْفَتَى لَوْلَا لِقَا شُعُوبِ

یعنی اگر موت سے ملاقات نہ ہوتی تو کسی نوجوان کے صبر اور کسی سخی کی سخاوت کو کوئی فضیلت حاصل نہ ہوتی۔ موت سے ملاقات ہی ان چیزوں کی قدر و قیمت سے روشناس کراتی ہے۔ اعمال صالحہ کو اپنانے اور دولت ایمان کے حصول کے لیے موت ایک بڑی حقیقت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔
تو گویا موت اور حیات کی تخلیق کا مقصد اللہ تعالیٰ نے یہی بیان فرمایا کہ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کہ تم میں سے اعمال صالحہ کون کرتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اچھا انسان وہ ہے جس نے لمبی عمر پائی اور اچھے اعمال کر کے لمبی عمر سے فائدہ اٹھایا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ اچھا انسان وہ انسان ہو سکتا ہے جو اچھی عفت رکھنے والا، اللہ کی صرام کردہ چیزوں سے بچنے والا، اور اللہ کی اطاعت میں سبقت حاصل کرنے والا ہو۔ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو برکتیں دیتے والا ہے۔ قادر مطلق ہے، اس نے موت و حیات کو پیدا کیا۔ تاکہ انسان کی آزمائش ہو کہ کون اچھے عمل کرتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ یعنی خدا تعالیٰ کمال قدرت کا مالک ہے وہ عزیز ہے، غالب ہے۔ اور عزت دینے والا ہے اور الغفور ہے یعنی لغزشوں کو معاف کرتا ہے۔ اگرچہ وہ نافرمانی پر گرفت کرتا ہے، مگر لغزشوں اور غلطیوں کو معاف بھی کرتا ہے۔ بسا اوقات مجرموں کو سنبھلنے کا وقت دیتا ہے۔ یہ بھی اس کی بخشش کا ایک ذریعہ ہے۔

صفات الہی

موت و حیات کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کا بیان ہے ارشاد ربانی ہے الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا یعنی اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کو تہہ پر تہہ پیدا کیا حدیث میں ایسا ہی ذکر آتا ہے کہ آسمانوں کو تہہ پر تہہ یعنی اوپر نیچے پیدا کیا۔ پھر ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک اتنا ہی فاصلہ ہے۔ جتنا زمین سے پہلے آسمان تک۔ اس کے بعد بشت آتی ہے۔ جیسا کہ نبی علیہ السلام کے واقعہ معراج میں مذکور ہے۔ تو گویا سارے آسمانوں کو طے کرنے کے بعد جنت آتی ہے۔ جیسے فرمایا عِنْدَ هَاجَتِ الْمَاوِی۔ اور اسی جگہ سدرۃ المنتہیٰ والا مقام بھی آتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ آسمانوں کی یہ تہیں کیسی ہیں تو اس جگہ ہمارا تصور کام نہیں کرتا۔ ہمیں صرف اس بات پر ایمان رکھنا چاہیے کہ آسمان سات ہیں اور اوپر نیچے ہیں۔

سات آسمان

ایک مقام پر سَبْعًا شَدَادًا کا لفظ آیا ہے۔ یعنی وہ آسمان بڑے مضبوط ہیں۔ پھر ان آسمانوں

میں دروازوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ جیسا کہ معراج والی حدیث میں دروازے کھولنے کا ذکر ہے۔ اور آپ کا وہاں سے گذر کر آگے جانا معلوم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اشیا
نقص سے پاک ہیں

موت و حیات اور سات آسمانوں کی تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا مَا تَرَىٰ فِي خُلُقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَقْوَاتٍ یعنی رحمان کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے اندر تم کوئی فرق نہیں دیکھ پاؤ گے۔ یہاں پر تفاوت سے مراد چھوٹا بڑا ہونا نہیں، بلکہ نقص مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں کوئی نقص نہیں ہے اس نے ہر چیز کو اپنی حکمت کے ساتھ کمال درجے پر پیدا کیا۔ آسمان ہوں یا کرتے، زمین ہو یا اس کی کوئی چیز، کسی میں تم کوئی نقص نہیں پاؤ گے۔

اسی طرح انسان کی پیدائش، حیوانات اور نباتات اور دیگر عناصر کو اللہ تعالیٰ نے کمال حکمت اور بصیرت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ان میں تم کوئی نقص نہیں پاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو خود دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں کہ ذرا نگاہ اٹھا کر دیکھو فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ کیا تمہیں کوئی شکاف یا دراڑ نظر آتی ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کی دلیل ہے۔ پھر نگاہ اٹھا کر دیکھو ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ دوبار یعنی بار بار نگاہ اٹھا کر دیکھو تمہیں کوئی دراڑ یا شکاف نظر نہیں آئے گا۔ بَلْكَ يَنْقَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ تمہاری ہی طرف لوٹ آئے گی ذلیل ہو کر اس حالت میں کہ تھکی ہوئی ہوگی مگر اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں کوئی نقص تلاش نہیں کر سکی۔

ستارے آسمان دنیا
کی زینت

اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا ایک اور شاہکار آسمان دنیا کو ستاروں سے زینت دینا ہے۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ اور البتہ تحقیق ہم نے آسمان دنیا کو چہر انگوں کے ساتھ زینت دی۔ اگر یہ نہ ہوتے تو آسمان بالکل بے رونق دکھائی دیتا۔ اب رات کے وقت جب فضا صاف ہوتی ہے۔ تو آسمان میں کمال درجہ کی رونق معلوم ہوتی ہے۔ جگہ جگہ چراغ جل رہے ہیں۔ کوئی چھوٹا، کوئی بڑا، عجیب و غریب قسم کی زینت اور رونق ہے

ستاروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے تین باتیں صراحت کے ساتھ بیان کی ہیں۔ اول یہ کہ آسمان دنیا کی زینت ہیں۔ دوسری یہ کہ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ یعنی شیطانوں کو مارنے کے آلات ہیں۔ شیطان فرشتوں کی باتیں سننے کے لیے جب اوپر جاتے ہیں تو اوپر سے شہاب پڑتے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے کمانت کی حقیقت دریافت کی گئی۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان اوپر جا کر فرشتوں کی گفتگو سنتے ہیں۔ اور کوئی ایک آدھ بات ان کے کان میں پڑھاتی ہے تو وہ اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور آگے سے ان پر شباب ثاقب پڑتے ہیں۔ جو کلمہ وہ فرشتوں سے سُن پاتے ہیں اسے وہ اپنے کاہن کے کان میں پھونک دیتے ہیں اور وہ اس کے ساتھ سینکڑوں جھوٹ ملا کر آگے چلا دیتا ہے۔ یہی کمانت کی حقیقت ہے۔

کاہن سے واقعات اور خبریں معلوم کرنا شرک میں شمار کیا گیا ہے وہ غیب دان تو ہیں نہیں۔ عالم الغیب تو صرف خدا ہے۔ لہذا کاہن کے پاس نہیں جانا چاہیے۔

یہ سائے تو ابتدائے آفرینش سے ہی ٹوٹا کرتے تھے۔ مگر جیسا کہ سورۃ جن میں مذکور ہے جنور کی بعثت کے بعد یہ سلسلہ بہت زیادہ ہو گیا۔ کیونکہ نزول قرآن کے بعد جو شیطان گفتگو سننے کے لیے اوپر جاتے ہیں، انہیں مارنے کے لیے ستاروں کے ٹوٹنے کا عمل بھی تیز تر ہو گیا ہے۔

ستاروں کے متعلق تیسری بات اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ (پارہ ۱۴- سورۃ فصل) یعنی انسان ستاروں کے ذریعے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ سینکڑوں اور ہزاروں میلوں پر پھیلے ہوئے سمندروں، جنگلوں اور بیابانوں میں سفر کے دوران صحیح سمت کی طرف صحیح راہنمائی ستاروں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ چودہ کروڑ مربع میل میں پھیلے ہوئے سمندروں، بڑے بڑے صحراؤں اور جنگلوں میں سفر کے دوران بھٹک جانا معمولی بات ہے۔ ایسے میں رستے کے تعین کے لیے یہ ستارے ہی کارآمد ثابت ہوتے ہیں، اور مسافر اپنی منزل تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

ستاروں کے ذریعے راہنمائی

فرمان خداوندی ہے۔ کہ ہم نے آسمان دنیا کو چرخوں کے ساتھ زینت بخشی۔ اور ان ستاروں کو شیطانوں کو ماننے والا بنایا۔ اور پھر وَاعْتَدْنَا لَهُمُ عَذَابَ السَّعِيرِ ان شیاطین کے لیے دوزخ کی سزا بھی مقرر کی کہ اس میں انہیں ڈالا جائے گا۔

حاصل کلام

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٦﴾
 إِذَا أُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا وَهِيَ تَفُورُ ﴿٧﴾ تَكَادُ تَمَيَّزُ
 مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ
 يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ﴿٨﴾ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ ۖ فَكَذَّبْنَا
 وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ ؕ إِنَّا أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ ﴿٩﴾
 وَقَالُوا لَوْلَا كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿١٠﴾
 فَأَعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ ۖ فَمَقًّا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿١١﴾
 الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ ۖ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿١٢﴾
 وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ ۖ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿١٣﴾
 لَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿١٤﴾

ترجمہ: اور جو لوگ اپنے رب کے منکر ہوئے ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور
 بہت بُرا ٹھکانا ہے ﴿۶﴾ جب ان لوگوں کو اس دوزخ کے اندر ڈالا جائے گا
 تو اس کی خوفناک آوازیں گے اور وہ جوش مار رہی ہوگی ﴿۷﴾ قریب ہے کہ غصے
 کی وجہ پھٹ پڑے۔ جب کوئی گمراہ دوزخ میں ڈالا جائے گا تو اس کے داند غے
 پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا ﴿۸﴾ وہ جواب دیں گے
 کیوں نہیں تحقیق ہمارے پاس ڈرانے والا آیا مگر ہم نے اس کو جھٹلایا اور ہم
 نے کہہ دیا اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز نازل نہیں کی تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو ﴿۹﴾
 اور وہ کہیں گے کاش ہم سنتے یا ہم سمجھتے تو ہم دوزخ والوں میں نہ ہوتے ﴿۱۰﴾
 وہ اپنے گناہوں کا اقرار کریں گے پس جہنم والوں کے لیے دوری ہے۔ ﴿۱۱﴾
 بیشک جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں بن دیکھے ان کے لیے مغفرت ہے
 اور (ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں) بہت بڑا اجر ہے ﴿۱۲﴾ اور تم اپنی بات

کو چھپا دیا ظاہر کر دیکھ خدا سینے کے رازوں کو بھی جانتا ہے (۱۳) کیا وہ نہیں جانے گا جس نے خود پیدا کیا اور اللہ تعالیٰ بہت باریک بین ہر ایک کی خبر رکھنے والا (۱۴) گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اور حکومت کا ذکر ہوا۔ کہ تمام برکات اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ قادر مطلق بھی وہی ہے۔ جس نے موت و حیات کو انسانوں کی آزمائش کے لیے پیدا کیا۔ تاکہ اس بات کو ظاہر کرے کہ اچھا عمل کون کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ عزیز اور بخشنے والا ہے۔ اُس نے سات آسمانوں کو تہ بہ تہ پیدا کیا۔ اس کی پیدا کی ہوئی چیز میں تم کسی قسم کا نقص نہیں دیکھو گے، تم بار بار اپنی نگاہ اٹھا کر دیکھو۔ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں کوئی دراڑ، شکاف یا نقص نظر نہیں آئے گا۔ نگاہ تھکی ہوئی واپس لوٹ آئے گی۔ دیکھو! آسمان دنیا کو ہم نے زینت بخشی ہے ستاروں کے چرخوں کے ساتھ اور ان ستاروں سے دوسرا کام یہ لیا جاتا ہے۔ کہ یہ شیاطین کو مارنے کا ذریعہ ہیں۔ جو شیطان ملا را علی یا ملائکہ کی گفتگو سننے کے لیے اوپر جاتے ہیں۔ ان کو آگ سے شہاب مارتے ہیں۔ شیاطین دوزخ کی سزا کے مستحق ہیں۔ یہ اغوا اور اضلال کرتے ہیں۔ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور بے راستے پر ڈالتے ہیں۔ اس لیے وہ جہنم کے سزاوار ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے عذاب سعیر یعنی بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب بھی تیار کر رکھا ہے۔

گذشتہ سے پورے

جو لوگ شیاطین کے اغوا اور دوسو سول میں آئیں گے، ان کی باتوں پر عمل کریں گے، ان کا اثر قبول کریں گے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اُس کے نازل کردہ احکام اور شرائع کا انکار کریں گے، وہ بھی جہنم کے سزاوار بنیں گے۔ شیاطین تو ظاہر ہے۔ کہ اپنے اغوا اور گمراہ کرنے کے فعل کی وجہ سے دوزخ کے سزاوار ہیں، مگر جو لوگ کفر کا راستہ اختیار کریں گے اور شیطانوں کے اغوا میں آئیں گے تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا" یعنی جو لوگ اپنے رب کے منکر ہوئے یعنی خدا کی توحید، یا صفت یا اُس کے احکام یا شرائع یا اُس کے فرشتے یا رسول کسی کا بھی انکار کریں گے وہ درحقیقت خدا تعالیٰ کی رُبوبیت کا انکار کریں گے۔ اور رُبوبیت کا انکار الوہیت کا انکار ہے۔ یہ ساری چیزیں اُن میں مربوط ہیں۔ تو فرمایا۔ جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا عَذَابُ جَهَنَّمَ اُن کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ وَبَشَى الْمُصِیْرُ اور بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ یعنی جس جگہ یہ گمراہ کرنے والے شیطان حاکم ہو گئے اُس جگہ اُن کا اثر قبول کرنے والے لوگ بھی جائیں گے۔ اور یہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

شیاطین اور کفار جہنم کے سزاوار ہیں

دوزخ کا غیظ
وغضب

اس کی مختصر سی کیفیت اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔ اِذَا الْقَوُوفُ فِيهَا جَبَّ اَنْ لُّوْلُوں کو اُس دوزخ کے اندر ڈالا جائے گا۔ سَمِعُوا لَهَا شَهِيْقًا تَوَّاسٌ كِي خَوْفَنَّا كِ آواز شہیں گے شہیق گدھے کی آواز کو بھی کہتے ہیں۔ وہ ابتدائی حصے میں زور کی آواز نکالتا ہے۔ تو اس سے مراد ہے جوش کی آواز۔ وَهِيَ تَفُوْرٌ اور وہ اچھل ہی ہوگی بغور کا معنی جوش مارنا۔ ابلنا۔ اس میں انتہا کا جوش ہوگا۔ تَكَادُ تَمِيْزٌ مِّنَ الْغِيْظِ قَرِيْبٌ ہے کہ غصے کی وجہ سے پھٹ پڑے۔ دوزخ کا یہ حال ہو گا۔ اس کی آواز نہایت کہ یہ اور خوفناک ہوگی۔

دوزخ والوں
سے سوال و جواب

كُلَّمَا اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ جَبَّ كُوْنِيْ كِرُوْه دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ سَالَهُمْ خَزَنَتُهُمْ تَوَّابًا پَر مقرر داروغے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہاں انتظام و انصرام کرتے ہیں وہ پوچھیں گے اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيْرٌ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا، تنبیہ کرنے والا، سمجھانے والا نہیں آیا تھا۔ جو تمہیں بتاتا کہ جس کفر و شرک کے راستے پر تم چل رہے ہو، اس کا نتیجہ خراب ہوگا، خطرناک ہوگا، اس راستے پر مت چلو۔ نذیر کا معنی ڈرانے والا، سمجھانے والا، تنبیہ کرنے والا ہے۔

قَالُوْا بَلٰی وَه جَوَاب دِیْں گے کیوں نہیں۔ قَدْ جَاءَنَا نَذِيْرٌ تَحْقِیْق ہمارے پاس ڈرانے والے آئے۔ فَكَذَّبْنَا مگر ہم نے اُن کو جھٹلایا۔ اُن کی بات نہیں مانی۔ اور انہیں کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو کہ دوزخ ہوگا۔ سزا میں مبتلا ہوں گے اور پکڑ ہوگی۔ ہم نے ان کی تکذیب کر دی وَقُلْنَا اور ہم نے کہہ دیا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ یُّعْنٰی اللّٰہ تعالیٰ نے کوئی چیز نازل نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے نہ کوئی وحی نازل کی ہے، نہ کتاب نازل کی ہے۔ اے ڈرانے والو! تم جھوٹ کہتے ہو۔ جیسے عام طور پر شرک کہتے تھے۔ اِفْتَرٰی عَلٰی اللّٰهِ كَذِبًا۔ خدا پر جھوٹ بولتا ہے۔ کہاں خدا نے وحی نازل کی ہے۔ مَا نَزَّلَ اللّٰهُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ خُذْ تَعْلٰی نے کسی انسان پر کوئی وحی یا کتاب نازل نہیں کی۔ یہ اپنے پاس سے بنا کر لاتا ہے۔ محض چوہدری بننے کے لیے، بڑا بننے کے لیے خدا پر افترا کرتا ہے۔ تو وہاں کہیں گے کہ ہم نے تو کہا تھا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ خُذْ تَعْلٰی نے کوئی چیز نازل نہیں کی۔ سب انکار کیا اور ہم نے نذیروں کو جھٹلایا اور یوں کہا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِی ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ اسکا تعلق ان کافروں سے بھی ہو سکتا ہے اور الگ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر پہلے کلام کے ساتھ جوڑا جائے تو یہ معنی ہوگا کہ دوزخ میں جانوروں کو لے کر آکر بیٹھے کہ ہمارے پاس ڈرانے والے آئے ہم نے ان کو جھٹلایا اور کہا کہ خدا نے کوئی چیز نازل نہیں کی تم جھوٹ کہتے ہو اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا

فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ یعنی تم بڑی گمراہی میں پڑے ہو، جو لوگوں کو بھٹانے اور اپنے ساتھ ملانے کے لیے ایسی باتیں

کہتے ہو۔ تو گویا انہوں نے نبیوں کو ڈرانے والوں کو کہا کہ تم گمراہی میں پڑے ہو، جو لوگوں کو کہتے ہو کہ ہم پر وحی آتی ہے۔ خدا نے حکم نازل کیا ہے۔ یا کتاب نازل کی ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں کو ساتھ ملانے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہو۔ تو یہ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ — کے ساتھ مربوط ہے۔

اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ مَا نَزَّلَ اللَّهُ لَكُمْ شَيْءٌ بِمَشْرَكِينَ کی بات ختم ہو گئی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز نازل نہیں کی۔ آگے اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ نہیں ہو تم مگر کھلی گمراہی میں۔ جو ایسی باتیں کرتے ہو۔ یہ فرشتوں کا کلام بھی ہو سکتا ہے۔ جو باز پرس کر رہے ہوں گے۔ وہی کہیں گے اِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے، تمہارے پاس خدا تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والے بھی آئے۔ مشرعت بھی آئی، دین بھی آیا۔ وحی الہی بھی آئی۔ مگر تم نے کسی چیز کو نہیں مانا۔ لہذا تم ہی کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ تو کفر کرنے والے افسوس، حسرت اور مذمت کا اظہار کریں گے وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ

کفار کا خطاب
افسوس

کاش ہم سنتے اَوْ نَعْقِلُ یا ہم سمجھتے مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ تو ہم دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔ افسوس! نہ ہم نے سنا، نہ عقل سے سوچا۔ دوسری جگہ ہے۔ غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ۔ افسوس کہ ہم پر ہماری بد بختی غالب آئی اور ہم گمراہ ثابت ہوئے۔ رسول آئے۔ ڈرانے والے آئے۔ سمجھانے والے آئے مگر افسوس کہ ہماری بد بختی غالب آئی۔ یہاں اس مقام پر ہے کہ کاش ہم نصیحت کرنے والوں کی بات کو سنتے۔

انسان کی فلاح کے لیے دو چیزیں ہیں۔ یا تو خیر خواہ کی بات سن کر (نَسْمَعُ) آدمی اس پر عمل پیرا ہو جائے، تو اس کی نجات ہے۔ اَوْ نَعْقِلُ یا عقل سے خود غور و فکر کرے، یا یہ دوسری چیزیں ہیں۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں جیسا کہ دوسری جگہ موجود ہے۔ کہ یہ کافر بہرے، اندھے اور گونگے ہیں۔ اِنْ شَرَّ أَلْدَابِ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (انفال) یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل میں کمال درجے کا جوہر عطا کیا ہے۔ مگر یہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سورۃ ال عمران میں الفرقان کا جو لفظ آیا ہے اس سے مراد جوہر عقل ہے۔ قرآن کا الگ ذکر ہے۔ تورات اور انجیل کا الگ اور فرقان کا الگ

نجات کے
دو ذرائع

ایک درجے تک یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اچھائی اور برائی میں امتیاز صرف عقل سے ہی کیا جاسکتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو فرمایا اَقْبِلْ اَکْثَرَ اَوْدَهِ لَکَ بَعَثْنَا مِنْهُ لَیْسَ لَکَ فِیْہِ حَیْثُ حَیْثُ وَہِیْہِ حَیْثُ حَیْثُ۔ پھر ارشاد فرمایا بِکَ اَعْطٰی فِیْکَ اَمْنٌ لِّیْ تِیْرٰی وَجْہَہِ فِیْ دُؤْلِہِ اَوْرَہِ تِیْرٰی وَجْہَہِ فِیْ دُؤْلِہِ کَ۔ تمہارے استعمال پر ہی سارا دار و مدار ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل نہیں دی، اُس کو مکلف بھی نہیں بنایا۔ تمام پاگل لوگ غیر مکلف ہیں۔ بسا اُم بے عقل ہیں، اس لیے غیر مکلف ہیں۔ بچے بھی جب تک اُن میں عقل نہیں آتی مکلف نہیں ہوتے تو گو اللہ تعالیٰ نے نجات کا مدار دوسری چیزوں پر رکھا یعنی خیر خواہ کی بات کو سُن کر اُس پر عمل کرنا یا خود اپنی عقل سے کام لے کر اچھائی اور برائی میں تمیز پیدا کرنا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ایک اجتہاد ہے اور ایک تقلید۔ تقلید اسی کو کہتے ہیں کہ کسی اچھے شخص سے بات سُن کر اس کو مان لیا جائے۔ تقلید سے لوگ بدکتے ہیں، اس کو غلط معنی پہنچاتے ہیں۔ یہاں جاہلوں کی تقلید مراد نہیں ہے۔ اس کی تو اللہ تعالیٰ نے مذمت کی ہے۔ مشرک اور کافر اپنے اباؤ اجداد کی تقلید کرتے تھے۔ غلط اور شرکیہ رسوم میں اپنے بڑوں کی تقلید کرتے تھے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے بے عقلی کی بات فرمایا۔ ہاں اگر کوئی اچھی بات سُن کر اُس پر عمل کرتا ہے۔ تو یہ تقلید ہی ہے۔ اس پر بھی نجات ہے۔ یا انسان خود بحیثیت مجتہد عقل کو ٹھیک ٹھیک استعمال کرے۔ غور کرے اور پھر نتیجے پر پہنچے۔ یہ دونوں باتیں ہیں۔

کافر لوگ افسوس کا اظہار کریں گے اور کہیں گے ہم نے دونوں باتیں ہی نہیں کیں۔ خیر خواہ کی بات سُن کر بھی عمل نہیں کیا۔ اور عقل کو بھی ٹھیک ٹھیک استعمال نہیں کیا۔ غلط ہی استعمال کیا۔ اگر ہم دونوں میں سے ایک بات پر بھی عمل کرتے تو دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔

فَاعْتَبُوا یٰ ذٰلِکَ لَعَلَّہُمْ یَرْجِعُوْنَ اِلٰی سَبِیْلِہُمْ۔ افسوس ہو جاؤ، دُور ہو جاؤ، سختی کا معنی دُور اور بعد ہوتا ہے بعض فرماتے ہیں کہ دوزخ میں صحر کا نام بھی ہے جیسے دہل جہنم میں ایک وادی کا نام ہے صحر و ایک پہاڑ کا نام ہے جب یہ کافروں کو چڑھایا جائے گا۔ اور نیچے اتار دیا جائے گا۔ ایسا ہی سخت بیابان ہے اسمیں کافروں کو ڈرایا جائے گا۔

جائے گا۔ بعض فرماتے ہیں سحوق کا معنی دوری ہے۔ ممکنہ سحوق۔ تو گویا جہنم والوں کے لیے دوری ہے خدا کی رحمت اور مہربانی سے۔ اب اس جہنم میں جلتے رہو۔

یہ تو تھا کافروں کا حال اور ان کا انجام۔ اب تم میرے ساتھ ترغیب بھی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغُیْبِ۔ بیشک جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں بن دیکھے ہوئے۔ یہ ہے ایمان بالغیب۔ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغُیْبِ۔ بالغیب کے معنی بغیر دیکھے ہوئے۔ نہ دوزخ نہ جنت ہے، نہ جنت نہ اس کی وحی اترتے دیکھی ہے۔ نہ خدا کی ذات۔ تو جنت بھی برحق ہے۔ دوزخ بھی برحق ہے حساب بھی برحق ہے۔ یہ ساری چیزیں برحق ہیں۔ باطل کوئی نہیں، کفر کا بڑا انجام سامنے آئے گا۔ اور ایمان کا اچھا انجام بھی سامنے ہوگا۔ ان تمام چیزوں پر بن دیکھے ایمان لانا ایمان بالغیب ہے۔

ایمان بالغیب
والوں کیلئے
الغام

سورۃ بقرہ کی ابتداء میں یُؤْمِنُوْنَ بِالْغُیْبِ اور اخیر میں اَمِنَ الدَّسُّوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ اُس وحی پر جو خدا نے اتاری ہے اس پر رسول بھی ایمان رکھتا ہے اور مومن بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اور اس کتاب پر، خدا کے رسولوں پر، بعثت بعد الموت پر، تقدیر پر، ملائکہ پر تمام نبیوں پر، اور جو آگے حالات پیش آنے والے ہیں، اُن سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ایمان بالغیب ہے۔

تو جو لوگ اللہ تعالیٰ پر، اس کی صفات پر بن دیکھے ایمان لاتے ہیں۔ اس سے لرزتے ہیں ان پر خوف طاری رہتا ہے، ایسے لوگوں کا بدلہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ رَأْسُ الْحُكْمَةِ مَخَافَةُ اللَّهِ یعنی حکمت کی جڑ اور بنیاد ہی اللہ کا خوف ہے۔ اللہ کا خوف مشاہرے سے نہیں آیا بلکہ رسولوں کے بتلانے اور کتاب کو پڑھنے سے یقین آتا ہے۔ تو بڑا حکیم وہی ہوگا جس میں خوف خدا زیادہ ہوگا۔

خوف خدا کا
حکمت ہے

فرمایا جو لوگ اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں لَہُمْ مَغْفِرَةٌ اَنْ کَیْلَے بخشش اور مغفرت ہے۔ اسی خطائیں اور گناہ ڈھانپ دیے جائیں گے وَ لَجُوْا کَیْدُوْا اور اُن کے لیے اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ کہ وہ ایمان لائے۔ بن دیکھے خدا سے ڈرتے ہیں، اطاعت کرتے ہیں۔ کفر و شرک سے ہزار ہیں۔ ان کے لیے اللہ نے بہت بڑا ثواب تیار کیا ہے۔

آگے فرمایا وَ اَسْرُوْا قَوْلَکُمْ اَوْ اَجْسُوْا بِہِ اَوْ اٰمِنُوْا بِہِ اَوْ اٰمِنُوْا بِہِ اَوْ اٰمِنُوْا بِہِ

اللہ تعالیٰ
عالم الغیب ہے

کہو یا بلند کہو، ہر حالت میں اِنَّہٗ عَلَیْہِمْ ذَاتِ الصُّدُورِ خدا سینوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔ کفر، شرک، نفاق کی بات کو پوشیدہ رکھو گے یا ظاہر کرو گے۔ برائی اور ناسے اور ناپاڑی سے بڑی، چھپاؤ یا ظاہر کرو، ہر حالت میں خدا تو سینوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ لطیف و خبیر ہے

فرمایا کیوں نہیں جانے گا۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ کیا وہ نہیں جانے گا جس نے خود پیدا کیا وہ نہیں جانے گا تو اور کون جانے گا وہ تو خالق ہے اور خالق ہونیکے علاوہ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ اسی صفات لطیف و خبیر بھی ہیں۔ لطیف یعنی بہت باریک بین۔ لطیف کا معنی مہربان بھی ہوتا ہے اللہ لَطِیْفٌ بَعِبَادِہِ اللہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑی مہربانی کرتا ہے۔ اور۔ الْخَبِیْرُ یعنی ہر ایک کی حالت سے واقف اور ہر ایک کی خبر رکھنے والا ہے۔

لہذا کوئی بھی چیز خواہ نیکی کی ہو یا برائی کی۔ تم اُسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، ہر حالت میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اور اسی کے مطابق آگے چل کر انسان کو اس کا جھگٹا کر ناپڑے گا۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذُلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَيْهِ الدُّشُورُ ①۵
 ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲
 الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُودُ ①۶ أَمْ أَمِنْتُمْ مِّنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ ①۷
 الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ①۸ أَوَلَمْ يَدْرُوا إِلَى الطَّيْرِ
 فَوْقَهُمْ صَفْتٍ وَيَقْبِضْنَ مَا يُسْكِنُ إِلَّا الرَّحْمَنُ إِنَّهُ بِكُلِّ
 شَيْءٍ بَصِيرٌ ①۹ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ
 مِّنْ دُونِ الرَّحْمَنِ ط إِنَّ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي غُرُوبٍ ②۰ أَمَّنْ هَٰذَا
 الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ بَلْ لَّجَوُا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ②۱
 أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ
 مُسْتَقِيمٍ ②۲

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنائی ہے۔ زمین تابع، چلو اس کے اطراف میں اور
 اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی میں سے کھاؤ اور (ایک دن) خدا کی طرف دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے
 ①۵ کیا تم نڈر ہو گئے ہو اس ذات سے جو آسمان میں ہے کہ تم کو زمین میں دھنسا دے اور زمین لہر نہ
 لگے ①۶ کیا تم اس بات سے بے فکر ہو گئے ہو اس ذات سے جو آسمانوں میں ہے کہ وہ تم پر
 پتھر برسانے والی ہو بھیج دے پس عنقریب جان لو گے تم کہ میرا ڈرانا کیسا تھا ①۷ اور البتہ تحقیق جھٹلایا
 ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں، پھر ان پر میری گرفت کیسی ہوئی ①۸ کیا انہوں نے
 پسندوں کی طرف نہیں دیکھا اپنے اوپر (کیسے) صف بستہ پر کھولے ہوئے ہیں اور سیکڑتے بھی
 ہیں ان (پسندوں) کو سوائے رحمان کے اور کوئی نہیں روکتا بیشک وہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھ رہا
 ہے ①۹ بھلا خدا کے سوا وہ کون ہے جو تمہارا لشکر بن کر تمہاری مدد کر سکے۔ کافر
 لوگ محض دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں ②۰ اگر خدا تعالیٰ اپنی روزی کو روک دے تو تمہیں روزی
 پہنچانے والا کون ہے بلکہ (یہ کافر لوگ) اصرار کرتے ہیں سرکشی میں، اور بدکنے میں پڑے ہوئے
 ہیں ②۱ بھلا وہ آدمی زیادہ ہدایت والا ہے جو اندھے منہ چل رہا ہے یا وہ جو سیدھا چلتا ہے

گزشتہ پرستہ
(ربط)

پہلے توحید، قیامت، رسالت اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر ہوا۔ پھر آگے جزائے عمل کا ذکر تھا۔ مجرمین کی سزا کا ذکر ہوا۔ قدرت کی نشانیاں ذکر فرمائیں۔ اب اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے چند دلائل اور نشان بیان فرماتے ہیں۔ البتہ زیادہ تر مضمون توحید اور معاد کا ہے۔ پہلے رسالت کا بیان بھی ہو گیا جیسے: "قَالُوا ابْلُوا بِكُمُ الْقُرْآنَ فَإِن كُنْتُمْ سَاءَ فِتْنَةٍ سَاءَ مَا كُنْتُمْ بِمَعْلُومِينَ"۔ فرشتے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ لوگ اقرار کریں گے کہ ہمارے پاس ڈرانے والے ضرور آئے مگر ہم نے ان کی تکذیب کی۔ اور پھر افسوس کا اظہار کریں گے: "كُونُوا لَنَا حَلَالًا حَلَالًا"۔ اگر ہم خیر خواہوں کی بات کو سنتے یا عقل سے کام لیتے تو کبھی دوزخ میں داخل نہ ہوتے۔ مگر ہم نے یہ دونوں باتیں نہ کیں۔ نہ ہم نے خیر خواہوں کی بات کو سنا اور نہ عقل سے کام لیا۔

دلائل قدرت
تسخیر الارض

اب یہاں دلائل قدرت کا بیان ہے۔ جن سے دو چیزوں کا اثبات ہوتا ہے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور دوسری طرف قیامت کا ذکر ہے ارشاد ہوتا ہے: "هُوَ الَّذِي اللَّهُ تَعَالَىٰ كِي فَا ت و ه ي ه ي جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ حَرْشًا لَّيْلًا وَنَارًا نَّارًا لَّيْلًا وَنَارًا نَّارًا لَّيْلًا"۔ یعنی تابع۔ ذلول کا معنی تابع اور ہموار۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے تصرف کے لیے زمین کو تمہارے تابع بنا دیا ہے۔ تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ کہ ہر قسم کے کام زمین میں کر سکو۔ اگر اللہ تعالیٰ زمین کو ایسا نہ بناتا تو سخت دشواری ہوتی۔ دلدلی بنا دیتا یا پانی جیسی ہوتی یا لوہے اور پتھر جیسی سخت ہوتی تو زراعت مشکل ہو جاتی۔ مکان بنانا دشوار ہوتا۔ زمین کو کھود کر اس میں سے چیزیں نکالنا ناممکن ہوتا۔ نہریں چلانا مشکل ہو جاتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایسا مسخر کر دیا کہ ہر قسم کا کام آسانی سے ہو سکے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ یہی چیز اللہ تعالیٰ سمجھانا چاہتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا: "لَا تَجْعَلِ الْاَرْضَ حَرْشًا لَّيْلًا وَنَارًا نَّارًا لَّيْلًا وَنَارًا نَّارًا لَّيْلًا"۔ نہیں کیا کہ ہم نے زمین کو سمیٹنے والی بنایا زندوں کو بھی سمیٹتی ہے، مردوں کو بھی سمیٹتی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: "وَلَا تَجْعَلِ الْاَرْضَ مَرَحًا لَّيْلًا وَنَارًا نَّارًا لَّيْلًا وَنَارًا نَّارًا لَّيْلًا"۔ زمین میں عاجزی ہے کہ ہر چیز اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ تم زمین پر چلتے ہو۔ کام کرتے ہو۔

زمین کو کھودتے ہو اس پر نجاست پھینکتے ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کو کیا مستعد اور سخر بنا دیا ہے خدا کی نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے۔
 اسی لیے فرمایا فَاْمْسُوْا فِیْ مَنَاکِبِہَا منکب کندھے کو کہتے ہیں۔ یعنی زمین سے
 کندھوں پر چلو۔ کندھوں سے مراد اطراف زمین ہیں۔ بعض اس سے پہاڑ مراد لیتے ہیں۔
 جیسے کندھے اونچے ہوتے ہیں اسی طرح پہاڑ بھی اونچے ہوتے ہیں تو اونچی جگہ پر چلو۔ اونچی جگہ پر
 چلنے کا سامان بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دیا۔ پہاڑوں پر جانے کے لیے راستے مقرر کر دیے
 وہاں بھی کاروبار سرانجام دیتے ہو۔

ہموار زمین پر چلنا آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احسان جلاتے ہوئے قوم ثمود سے فرمایا۔
 دیکھو! اللہ نے زمین بنائی ہے۔ پہاڑ بنائے ہیں۔ پہاڑوں کو کمرید کر مکان بنا لیتے ہو۔ ہموار
 زمین پر بڑے بڑے مملات تعمیر کرتے ہو۔ تو فرمایا چلو اس کے اطراف میں وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِہٖ
 اور کھاؤ اس کی دی ہوئی روزی۔ یہ زمین بھی اللہ نے پیدا کی اور اسے تمہارے لیے سخر بنا دیا۔
 اس میں ٹہمی آسانیاں پیدا کر دیں۔ ذرا سوچو اگر زمین میں دشواریاں ہوتیں تو سب کاروبار رک جاتے
 اللہ تعالیٰ نے زمین کو مسخر کر کے کتنا احسان فرمایا ہے۔

خدا نے روزی کے اسباب بھی مہیا کیے ہیں۔ یہ چنا پھرنا

بسا اوقات روزی حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ جیسے وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ اِنَّہٗ اَنّٰنٌ عَلٰی مَنۡ یَّحْسُنُ
 ہے۔ انسان کیلئے یہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ رزق حلال تلاش کرنا فرض کے بعد ایک فریضہ ہے۔

آگے معاذ کا ذکر ہے۔ اس میں دونوں باتیں سمجھا دیں۔ زمین کو خدا نے تمہارے غلہ
 کے لیے بنایا۔ تاکہ تم زمین میں کاروبار کر سکو۔ جَعَلَ لَّکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوًا اور پھر اللہ کی پیدا
 کی ہوئی روزی میں سے کھاؤ۔ جو بھی تمہارے حصے میں آئے گی۔

روزی بھی اللہ نے دی، زمین کو بھی اللہ نے پیدا کیا۔ کوئی روزی مینے والا نہیں ہے۔
فَابْتَغُوا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ رزق خدا کے ہاں سے تلاش کرو۔ اللہ ہی رزق کے اسباب

مہیا کرتا ہے۔ تمام جانداروں کو روزی کی ضرورت ہے۔ جو اللہ ہی مہیا کرتا ہے۔ تمام اسباب انہی کے تصرف میں ہیں۔ اس کے سوا کوئی روزی نہیں دیتا۔ کوئی کسی کو ایک جہہ بھی نہیں دے سکتا۔ اب وہ انسان کس قدر یوقوت اور جہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس کے تابع بنایا ہے۔ اس کی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔ مگر وہ زمین کو ہی اپنا معبود بناتے۔ دنیا میں ایسے مشرک لوگ بھی ہیں جو زمین کو معبود مانتے ہیں۔ اور ایسے بھی ہیں جو خدا کے سوا دوسروں کے ہاں سے روزی تلاش کرتے ہیں۔ یہاں دونوں باتوں کی نفی کی گئی ہے۔

پھر فرمایا، زمین پر چلتے ہوئے، کاروبار کرتے ہوئے، خدا کی روزی کھاتے ہوئے یہ نہ سمجھو کہ ہم آزاد ہیں۔ وَالْيَوْمِ الثَّوْرُ ایک دن خدا کی طرف اکٹھا بھی ہونا ہے۔ جزائے اعمال بھی لازم ہے اور معاد کا آنا بھی ضروری ہے۔ انسان اٹھاتے جائیں گے اور خدا کے حضور پیش کیے جائیں گے انہیں اپنے اپنے اعمال کا محاسبہ پیش کرنا پڑے گا یہ بات نہیں ہے کہ زمین پرست ہو جاؤ قیامت بھی کوئی نہیں آئے گی۔ بلکہ قیامت تو آنے والی ہے۔ تو اس طرح گویا توحید کا مسئلہ بھی سمجھا دیا اور معاد کا مسئلہ بھی سمجھا دیا۔

آگے تخویف ہے۔ انسانوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ثُمَّ يَأْتِي الْيَوْمَ الْقِيَامَ فی السَّعَاءِ کیا تم نڈر ہو گئے ہو بے فکر ہو گئے ہو اس سبب جو آسمانوں میں ہے أَنْ يَخْشِفَ بِكُمْ الْأَرْضُ کہ تم کو زمین میں دھنسا دے۔ انسان مغرور ہوتا ہے، اتر کر زمین پر چلتا ہے۔ فرمایا اگر آسمان والا تم کو زمین میں دھنسا دے۔ جیسا کہ کئی واقعات پیش آتے ہیں فَإِذَا هِيَ تَكُونُ زَمْزَمَ لَزَزَتْ لگے۔ جیسے زلزلہ ہوتا ہے بعض اوقات ہزاروں انسان زلزلے میں تباہ ہو جاتے ہیں۔ شہر اور بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ بزرگ (جو الجہاز میں ہے) کی بارہ ہزار کی آبادی یکدم فنا ہو کر رہ گئی تھی۔ ابھی دس پندرہ سال کی بات ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔

۱۹۲۳ء میں جاپان میں جو زلزلہ آیا تھا، اس میں تین لاکھ آدمی فنا ہو گئے تھے۔ زمین میں ہزاروں گڑھے نظر آتے تھے۔ دریا میں پیدا ہو گئیں تھیں۔

تو فرمایا کیا تم اس سے بے فکر ہو گئے ہو، جو آسمانوں میں ہے۔

فی السماء سے کیا مراد ہے۔ یہ مشکل لفظ ہے۔ خدا کی ذات آسمان میں نہیں ہے۔ نہ ہی زمین

فی السما سے مراد
بلندی ہے

پر ہے۔ یہ اعتقاد درست نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ تو مکان و زمان سے مبرا ہے۔ فی السما سے مراد آسمانوں سے اوپر ہے۔ کہ آسمانوں کے اوپر بھی اسی کی حکومت اور تسلط ہے کسی اور کا نہیں۔ اور اس سے بندی مراد ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ ایک صحابی نے معمولی غلطی پر ایک لونڈی کو تھپڑ مار دیا۔ حضور علیہ السلام ناراض ہوئے۔ آپ نے لونڈی کو بلایا۔ اُس سے پوچھا، اللہ کمال ہے، اُس نے کہا آسمانوں میں۔ پھر فرمایا، میں کون ہوں عرض کیا آپ اللہ کے رسول ہیں۔ حضور نے فرمایا یہ مومنہ ہے۔ اس کو آزاد کر دو۔ آسمان کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ عام آدمی کی عقل آسمان تک پہنچتی ہے۔ تو اس سے مراد بندی ہوتی ہے۔ پڑھا لکھا آدمی ایسا نہیں کہہ سکتا۔ مگر عام لوگوں سے اللہ تعالیٰ ان کے فہم کے مطابق مواخذہ کرے گا۔

خوف خدا کی مثال

بخاری شریف میں اُس شخص کا حال ذکر کیا گیا ہے۔ جس نے کہا تھا کہ میں نے نیچی تو کوئی بھی نہیں کی۔ تو اس نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے بیٹوں سے کہا تم کو وراثت تب دوں گا کہ تم میری ایک بات پوری کرو۔ پوچھا کیا شرط ہے۔ کہا کہ جب میں مرجاؤں تو میری لاش کو جلا کر راکھ بنا دینا پھر اُس آدمی راکھ کو خشکی میں اڑا دینا اور آدھی پانی میں بہا دینا۔ بیٹوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مرنے والے کو برزخ میں اٹھا کر پوچھا تم نے یہ کام کیوں کیا تھا۔ کہنے لگا پروردگار! میں نے ایسا کام تیرے خوف کی وجہ سے کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کو بخش دو، معاف کر دو۔ اب اس کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ وہ سمجھتا تھا کہ راکھ اڑا دینے سے وہ معذور ہو جائے گا، اور خدا اُس پر قادر نہیں ہوگا۔ مگر خدا تو پھر بھی قادر ہے۔ اس کا فہم ہی اس قدر تھا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ نے اس کی گرفت کی اور اسی پر اس کا فیصلہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ عرش پرستوی ہے

الغرض اللہ تعالیٰ آسمان میں تو ہے نہیں۔ مگر آسمانوں میں بھی اس کا تصرف ہے۔ ورنہ اس سے مکانیت لازم آئے گی۔ اور مطلقاً انکار بھی اچھا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں اگر کوئی کوئی یوں کہے میں تو نہیں جانتا کہ میرا خدا آسمان میں ہے یا زمین میں تو وہ آدمی کافر ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَللّٰهُ حَسْبُ الْعَرْشِ اَسْتَوٰی یعنی خدا عرش پرستوی ہے۔ عرش تو ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے۔ آسمانوں کے اوپر بہشت ہے اور پھر عرش الہی ہے۔ اس پر استوی کیا ہے۔ یہ ہماری عقل میں نہیں آتا۔ شاہ ولی اللہ آسان بات کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں اَسْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ

سے سرلوہیہ ہے کہ عرش الہی پر اللہ تعالیٰ کی تجلی اعظم پڑتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات بہت بلند اور برتر ہے۔ جب اُس کی تجلی اعظم عرش پر پڑتی ہے۔ تو وہ سارا رنگین ہو جاتا ہے اور اس کے اثرات سارے جہاں پر چھا جاتے ہیں پھر دوبارہ اس کے اثرات واپس لوٹتے ہیں۔ اس طرح اس پر تجلی اعظم پڑتی رہتی ہے۔

زمین کا دھنس جانا

تو فرمایا کیا تم بے فکر ہو اُس ذات سے جو آسمان میں ہے کہ دھنسائے تم کو زمین میں خاذا ہی نمودر۔ اور وہ لرزنے لگے۔ ضلع فیروز پور کا ۱۹۴۹ء کا واقعہ اخبار میں پڑھا تھا کہ کسی سکول میں بچے پڑھ رہے تھے کہ اچانک سارا سکول زمین میں دھنس گیا اسی طرح اخیر زمانہ میں بھی دھنسے والے واقعات آئیں گے اھنور نے فرمایا کہ کعبے کو گرانے والا جو لشکر آئے گا، اللہ تعالیٰ اس کو بھی زمین میں دھنسا دے گا۔ اُن کا کوئی اکاؤنٹ آدمی ہی بھاگ کر بچ سکے گا۔ ورنہ اول آخر سارے کے سارے ہی دھنسائے جائیں گے۔ ایسا ہی قارون کے باسے میں بھی ذکر ہے۔ بخاری شریف میں اُس آدمی کا حال بھی موجود ہے جو رنگین تر بند پہن کر زمین پر اکڑ کر چلتا تھا۔ اُسی گردن بھی اکڑی ہوئی تھی۔ خدا نے زمین میں دھنسا دیا۔ وہ قیامت تک زمین میں دھنسا ہی چلا جا رہا ہے۔ جب قیامت کا بگل بجے گا تو وہ کہیں رُکے گا۔

چنانچہ فرمایا کیا تم بے فکر ہو گئے ہو۔ انسان کو غرور نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو تابع بنایا ہے۔ اکڑ کر مت چلو۔ بے فکر مت ہو۔ کہیں خدا تم کو زمین میں نہ دھنسا دے۔ زمین لرزنے لگے۔

پتھروں کے ذریعے
عذاب الہی

اس کے بعد فرمایا اَمِنْتُ مَنْ فِي السَّمَاءِ اَنْ يُسَلَّ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا یعنی کیا تم اس بات سے بے فکر ہو گئے ہو کہ وہ خدا تعالیٰ جس کا تصرف آسمانوں اور زمین میں ہر جگہ ہے، تم پر پتھروں کا مینہ برسائے۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ اودار میں مجرمین کے ساتھ ایسا بھی کیا۔ شرق اردن کے رہنے والوں پر اللہ تعالیٰ پتھروں کا مینہ برساتا۔ حِجَارَةٌ مِنْ سَبْجٍ مَنُصُودٍ تہ بہ تہ پتھر برس رہے تھے اور پھر یہ بھی کہ مَسُومَةُ جس کے سر پر وہ پتھر پڑا اس پر اس کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ مَسُومَةُ کے معنی نشان لگے ہوئے۔ جس قوم کو اللہ تعالیٰ نے یہ سزا دی تھی، زمین کو بھی الٹ دیا تھا کیونکہ وہ الٹے کام کرتے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ اب جہ کے لشکر پر بھی اللہ تعالیٰ نے پتھر ہی برسائے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پتھر ہندوں کے ذریعے

برسائے تھے۔ اور ان کو ہلاک کر دیا تھا۔ یہ چھوٹے سنگمیز پرندوں کے ہاتھوں میں ایٹم بم سے زیادہ خطرناک تھے جس کے سر پر لگا ہلاک ہو گیا۔ اور جس کی ساڈ پر لگا، ایسی بیماری لگی کہ وہ کبھی تندرست ہی نہ ہوا۔ ایسا چھپک سالاحق ہو گیا۔ یا اللہ تعالیٰ بڑے پتھر برساوے، جیسے قوم لوط پر برسائے تھے۔ فَتَعْلَمُونَ پس تم جان لو گے۔ کَيْفَ نَذِيرٍ کہ میرا ڈر سنانے والا کیسا ہے۔ یا وہ عذاب کیسا ہے جس کے بارے میں تم کو ڈرا دیا گیا تھا خیر وار کر دیا گیا تھا۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ اَنْ سِپے لوگوں کو دیکھ لو جنہوں نے جھٹلایا فِكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ میری گرفت کیسی ہوئی۔ سابقہ جھٹلانے والوں کی تاریخ بھی تم قرآن پاک میں پڑھتے ہو۔ کہ جھٹلانے والوں کا کیا حشر ہوا۔ آج بھی اگر جھٹلاؤ گے تو تمہیں محسوس کرنا چاہیے کہ ہمارا بھی ایسا ہی حال نہ ہو۔ یہ دلائل قدرت اور انداز ہے۔

جھٹلانے والوں کا حشر

اس کے بعد فرمایا اَوَكُم مِّنْ اِلٰی الطَّيْرِ کیا یہ شرک کرنے والے لوگ نہیں دیکھتے۔ معاویہ کے منکر خدا تعالیٰ کی صفت کو نہیں سمجھتے، ایمان نہیں لاتے، توحید کو قبول نہیں کرتے۔ کیا انہوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا۔ فَوْقَهُمْ صَفٌّ اَنْ کے اوپر کیسے پر بکھولے ہوئے ہیں وَ يَقْبِضُنَّ اور سیکڑتے بھی ہیں۔ دیکھو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملہ پرندوں کو فضا میں کس طریقے سے روکتی ہے۔ ان کا پروں کو پھیلا نا اور سیکڑنا اللہ کی قدرت سے ہے۔ خدا تعالیٰ نے پرندوں کے پروں میں یہ طاقت دی ہوئی ہے کہ وہ اڑتے ہیں۔ ان پرندوں کو فضا میں کون روکتا ہے۔ مَا يُسَبِّحُ اِلَّا الرَّحْمٰنُ۔ سوائے رحمان کے اور کون روکتا ہے۔ اللہ ہی نے یہ چیز پرندوں کے اندر رکھی ہے۔ یعنی طاقت رکھی ہے کہ وہ اڑتے ہیں۔ پروں کو سیکڑتے ہیں۔

پرندوں کی مثال

چنانچہ انسانوں نے بھی پرندوں کے نمونے پر اڑنے والی چیزیں اور آلات بنائے ہیں۔ اس میں بڑی محنت اور مشقت کی ہے۔ آٹھ سو سال کے بعد اڑان کا سکھ طے ہوا۔ پہلا آدمی تو ہلاک ہو گیا تھا جس نے اپنے بازوؤں کے ساتھ گدھ کے پر باندھ کر ایک محل سے دوسرے محل تک اڑنے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ وہ ہلاک ہو گیا مگر ایک راستہ بنا گیا۔ اس کے آٹھ سو سال بعد ۱۹۰۱ء میں پہاڑ ان شروع ہوئی۔ یہ وہی پرندوں کا نمونہ تھا۔ دیکھو! پرندوں کو فضا میں سوائے رحمان کے کون روکتا ہے۔ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اپنی نگاہ میں رکھتا ہے۔ ہر چیز اس کے سامنے ہے۔

عذاب الہی کو کوئی ٹال
نہیں سکتا

فرمایا، اَمَنْ هَذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ اِگر
اللہ تعالیٰ تم پر اپنی گرفت ڈال دے تو تمہارا کونسا لشکر ہے جو خدا تعالیٰ کے سامنے تمہاری حفاظت
کمرے کرے فرمایا اِنَّ الْكَافِرُونَ لَا فِيْ غُرُوْبٍ كَافِرٌ لَّوْكَ دَهْوُكَ مَن مِّنْهُمْ يَمُوتُ يَمُوتُ مَن مِّنْهُمْ يَمُوتُ يَمُوتُ
کہتے ہیں سمجھتے نہیں اور معبودانِ باطلہ کی پرستش کرتے ہیں۔ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ فرضی اولیاء
بلتے ہوئے ہیں۔ اگر خدا کا عذاب آجائے تو کوئی چھڑانے والا نہیں ہے۔ یہ لوگ آنے والی مصیبت
سے اپنا بچاؤ نہیں کر رہے ہیں۔

رازِ صورتِ خدا

اَمَنْ هَذَا الَّذِي يَزِدُّكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهُ اِگر خدا تعالیٰ تمہاری روزی کو روک
دے تو روزی پہنچانے والا کون ہے۔ کیا کوئی ہے؟ ایک جبہ بھی نصیب نہ ہو۔ خدا تعالیٰ بسا اوقات قحط
ڈال دیتا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ جب قحط پڑتا ہے تو دس دینار میں ایک روٹی
بھی نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ اسباب میں تغیر پیدا کرے اور روزی کو روک دے تو کوئی ہے تمہارے لیے روزی
لانے والا؟

فرمایا حقیقت یہ ہے بَلْ لَّجَوُا لِّلْعِزِّ اصرار کرتے ہیں فِيْ عُتُوٍّ وَنُفُوْرٍ سرکشی اور بدکنے
میں پڑے ہوئے ہیں۔ محض شرارت اور سرکشی کی وجہ سے خدا کی وحدانیت کو نہیں مانتے۔ اور اس کی
صفت پر ایمان نہیں لاتے۔ اگر اللہ چاہے تو سب دروازے بند کر دے، روزی کو روک دے تو کوئی
کسی کو ایک دانہ بھی نہیں پہنچا سکتا۔

یہ سب دلائل توحید ہیں۔ ساتھ ساتھ معاد کا مسئلہ بھی سمجھایا گیا۔

الطیاری

اس کے بعد فرمایا اَفَمَنْ يَّمْكِبُ عَلٰی وَجْهِهِ اَهْدٰی اَمَّنْ يَّمْشٰی سَوِيًّا عَلٰی
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ بھلا وہ آدمی اچھا ہے جو اوندھے منہ چل رہا ہے یا وہ جو سیدھا چلتا ہے۔ سیدھا
چلنے والا آدمی مومن ہے۔ اس کا اعتقاد صحیح ہے اور وہ اعمال بھی اچھے کرتا چلا جاتا ہے۔ اور جو
آدمی اوندھے منہ جاتا ہے، اس کا عقیدہ فاسد ہے، شرک اور کفر والا ہے، اُس نے ضرور گمراہی
میں گرا ہے۔ ایسا شخص کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ سیدھا چلنے والا ہی صراطِ مستقیم پر ہے۔ تو یہ گویا
مومن اور کافر کی مثال بیان کی گئی ہے۔ جو لوگ آج ہدایت کی طرف سے اوندھے منہ چل رہے ہیں
کل قیامت کے دن دوزخ میں اوندھے منہ جائیں گے۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا، قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کافروں کو منہ کے بل دوڑائیں گے
لوگوں نے تعجب کا اظہار کیا کہ منہ کے بل کس طرح دوڑیں گے، فرمایا اِنَّ الَّذِیْ اَمْشٰی عَلَی الْقَدَامِ
یعنی جو خدا تعالیٰ پاؤں پر دوڑا سکتا ہے، وہ سر کے بل بھی دوڑائے گا۔ سر کے بل دوڑتے ہوئے جہنم میں
جا کریں گے۔

توحید اور معاد دونوں کا بیان اللہ تعالیٰ نے فرمادیا۔ اور مزید قدرت کی بہت سی نشانیاں بیان فرمائی
تو گویا توحید، معاد اور رسالت تینوں مسائل سمجھا چکے۔

قُلْ هُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ
 قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۲۳ قُلْ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاكُمْ فِی الْاَرْضِ وَاِلَیْهِ
 تُحْشَرُوْنَ ۝۲۴

ترجمہ: اے پیغمبر علیہ السلام آپ کہہ دیجئے اللہ کی ذات وہی ہے جس نے تم کو بنایا ہے اور تمہارے لیے
 کان آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت ہی کم شکریہ ادا کرتے ہو ۝۲۳ آپ فرمایا دیجئے کہ خدا کی ذات وہ ہے
 جس نے تم کو زمین میں بکھیر دیا۔ تم سب اس کی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے۔ ۝۲۴

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی چند نشانیاں بیان کی گئی ہیں اور ان کو توحید اور قیامت پر دلیل بنایا گیا ہے۔
 اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی دلیل کے طور پر اور بھی کئی نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔
 ساتھ ساتھ انسان سے یہ مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے۔ کہ وہ خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرے۔ فرمایا قُلْ
 اے پیغمبر علیہ السلام آپ کہہ دیجئے هُوَ الَّذِی الَّذِی ذات وہ ہے اَنْشَاَكُمْ جس نے تم
 کو بنایا ہے۔ انشاء کا معنی ایجاد کرنا، بنا کر کھڑا کر دینا۔ یعنی وجود کی نعمت عطا فرمائی۔ تمہارا وجود
 ذاتی نہیں ہے۔ تم کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ تمہارا وجود اور جسم اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ اسی
 نے بنایا ہے۔

وجود کی نعمت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ
 تمہارے لیے کان آنکھ اور دل بنائے۔ ان تین چیزوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کیا۔ انسان
 کے جسم میں یہ تینوں چیزیں بڑی نعمت ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے خاص احسانات میں سے ہیں۔ کہ وجود
 کے بعد انسان کو کان، آنکھ اور دل عطا فرمائے۔

حواس خمسہ تو پانچ ہیں مگر اس مقام پر ان میں سے صرف دو کا ذکر کیا۔ حواس خمسہ میں سننے
 دیکھنے، سونچنے، چکھنے اور ٹٹولنے کی طاقت شامل ہے، چھونے کی طاقت اللہ تعالیٰ نے جسم کے
 سارے حصوں میں رکھی ہے۔ جسم کے جس حصے کے ساتھ چاہے، انسان چھو کر، ٹٹول کر معلوم کر
 سکتا ہے۔ اور سختی اور نرمی کا پتہ چلا سکتا ہے۔ چکھنے کی طاقت اللہ تعالیٰ نے صرف زبان

میں رکھی ہے کہ منہ اور زبان کے ذریعے انسان کچھ کر کسی چیز کا ذائقہ معلوم کر سکتا ہے۔ کہ کڑوا ہے یا میٹھا ہے۔ اسی طرح ناک کے ذریعے انسان سونگھ کر خوشبو یا بدبو والی چیز معلوم کر سکتا ہے۔ یہ قوت اللہ تعالیٰ نے صرف ناک میں رکھی ہے۔

تو اس خمسہ میں سے مذکورہ تین چیزیں چھوڑ کر یہاں صرف کان اور آنکھ کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ دونوں چیزیں حصول علم کا ذریعہ ہیں۔ حواس خمسہ میں سے یہ کان اور آنکھیں ہی ہیں جو حصول علم کا بڑا ذریعہ ہیں، انسان کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ کان اور آنکھوں کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہیں۔ باقی رہا دل، تو اس میں اللہ تعالیٰ نے بڑے کمالات اور حکمتیں رکھی ہیں یہ حصہ جسم انسانی کا مرکز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قلب کی شراکت دماغ کے ساتھ جوڑی ہے۔ لیکن بہر حال قوت اور اخلاق کا مرکز قلب ہے۔ انسان جو بھی اعمال سرانجام دیتا ہے۔ اسی میں قلب کے عزائم، ارادے اور نیت کا رخ رہا ہوتا ہے۔

حصول علم کے ذرائع

قلب جسم کا مرکز ہے

حضور علیہ السلام نے قلب کو تمام انسانی جسم کا مرکز قرار دیا، فرمایا کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹوٹھڑا ہے۔ اِذَا فَسَدَ فَسَدَ كُلُّهُ وَاِذَا صَلَحَ صَلَحَ كُلُّهُ جب وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہوتا ہے۔ اگر وہ بگڑا ہوا ہو تو سارا جسم بگڑا ہوا ہوتا ہے۔ اَلَا وَهِيَ الْقُلْبُ وہ ٹوٹھڑا قلب ہے اگر قلب کے اندر فساد ہو تو سارا جسم فاسد ہوگا جسم کا کوئی حصہ صحیح نہیں رہیگا اور اگر قلب کی حالت صحیح ہے تو سارا جسم درست ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے قلب کو مرکز قرار دیا ہے۔ انسان جو بھی اعمال کرتا ہے تمام قوتوں کا مرکز قلب ہے۔

تو یہ دو چیزیں یعنی کان اور آنکھ حصول علم کا ظاہری ذریعہ ہیں۔ اور قلب بحیثیت مرکز ہے ایمان اور محبت بھی اس میں ہوتی ہے، اور کفر، شرک اور نفاق بھی اسی میں ہوگا۔ اسی طرح نفرت اور عداوت بھی دل میں ہوگی۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں سزا کا ذکر فرمایا وہاں یہ فرمایا کہ جہنم کی آگ بڑی سخت ہوگی۔ تَطَّلِعُ عَلَى الْآفِئِدَةِ یعنی سب سے پہلے وہ دلوں پر چڑھے گی۔ کیونکہ مرکز تو دل ہے۔ اور اسی دل میں انسان نے کفر، شرک، نفاق یا بڑے عقیدے کو جگہ دی ہوئی ہے۔ تو سب سے پہلے آگ کا اثر دل پر ہوگا۔ اس کے بعد جسم پر ہوگا۔ تو قلب مرکز اخلاق اور مرکز اعمال ہے۔ اور کان اور آنکھ حصول علم کے

ذرائع ہیں۔ ان کے ذریعے جو چیز حاصل ہوتی ہے۔ وہ مرکز کے اندر پہنچتی ہے۔ مرکز اس کے مطابق سوجتا ہے اور پھر اعمال اور اخلاق ظاہر ہوتے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا اُنشَاْكُمْ یعنی تم کو پیدا کیا، تم کو جسم عطا کیا، یہ خدا کا کتنا کرم اور احسان ہے اور پھر وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ تمہیں کان اور آنکھیں دیں۔ سمع کو مقدم بیان فرماتے ہیں بھی مصلحت ہے کہ انسان آنکھ کی نسبت کان کے ذریعے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ اکثر بیشتر معلومات سماعت کے ذریعے ہوتی ہیں۔ اس کی زیادہ اہمیت کی بنا پر اسے پہلے بیان فرمایا۔

اس ظاہرہ کے اعتبار سے دوسری اہم ترین چیز انسان کے جسم میں آنکھیں ہیں۔ ترمذی شریف کی حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ مَنْ سَكَبَتْ كَرِيمَتُهُ قَصَبَ فَلَمَّ اَرْضَ لَهُ ثَوَابًا دُونَ الْجَنَّةِ یعنی جس آدمی کے جسم سے یہ دو چیزیں یعنی آنکھیں میں نے اٹھالیں اور اس نے صبر کیا تو اس کو بہشت تک پہنچانے کے بغیر کسی چیز پر اکتفا نہیں کروں گا۔ میں ضرور اُس کو جنت تک پہنچاؤں گا۔ آنکھیں انسان کے جسم میں نہایت ہی عزت والی چیزیں ہیں۔

اور ہدایت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جہاں یہ بیان فرمایا کہ تم نے گمراہی کیوں اختیار کی ہے۔ وہاں یہ بھی فرمایا اَلَوْ فَجَعَلْنَاهُ عَيْنَيْنِ کیا ہم نے تمہیں آنکھیں نہیں دی تھیں۔ اگر تمہارے پاس علم نہیں تھا۔ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ تو ہم نے تمہیں زبان اور ہونٹ عطا کیے تھے۔ تم کسی سے پوچھ لیتے جیسے عام قانون ہے۔ فَسَلُّوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی اگر نہیں جانتے تو خود مفتی، قاضی بن کر مت بیٹھو، علم والوں سے دریافت کرو۔ وہ تم کو صحیح چیز بتائیں گے۔ صحیح چیز پر عمل پیرا ہو کر نجات حاصل ہوگی۔ تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی نعمت کا ذکر فرمایا۔ اَلَوْ فَجَعَلْنَاهُ عَيْنَيْنِ ہم نے تمہیں دیکھنے کے لیے آنکھیں نہیں دی تھیں کہ ان کے ذریعے شب و روز کو دیکھ لو۔ اور اس سے بڑھ کر حصول علم کا ذریعہ کان ہیں۔ ان کے ذریعے انسان علم حاصل کر سکتا ہے۔

لہذا قلب تو مرکز ہے۔ اور کان اور آنکھ دو اہم چیزیں ہیں۔ باقی تین چیزیں حصول علم کے

اعتبار سے کمزور ہیں، لہذا ان کا ذکر نہیں فرمایا اور اپنی جگہ وہ بھی خدا کی بڑی نعمتیں ہیں۔ جس کے جسم سے لمس کی حس ختم ہو جائے۔ اس کے لیے بڑی تکلیف کا باعث ہو گا۔ کیونکہ اس سے ٹوٹنے کی طاقت ہی سلب ہو گئی۔ خدا تعالیٰ بعض لوگوں کے اعصاب اس طرح خراب کر دیتے ہیں کہ اُن کو ناک میں بدبو ہی آتی ہے۔ خوشبو نہیں آتی۔ یہ بھی عذاب ہے۔ اسی طرح جس کے آواز کے اعصاب خراب ہو جائیں وہ بول نہیں سکتا۔ تو انسان میں کتنا نقص معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ اور قدرتِ تامہ کے ساتھ کیسی کیسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ اور یہ بڑے بڑے انعامات ہیں۔

ان انعامات کا ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ کہ تم بہت ہی کم شکریہ ادا کرتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں عطا کیں تاکہ تم اس کا شکریہ کر دو مگر الیا کرنے والے بہت ہی تھوڑے ہیں۔

شکر گزاری
اور ناشکری

اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکریہ کس طرح ادا ہو، اس سلسلہ میں امام رازی، قاضی شہار اللہ صاحب پانی پتی اور دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت کا شکریہ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے۔

الہی میں صرف کرے اگر ایسا نہیں کرے گا تو ناشکری ہوگی۔ تو مطلب یہ ہے کہ اپنی آنکھ، کان، زبان اور جسم کو خدا تعالیٰ کی رضا کے کام میں لگاؤ، ناراضگی کے کام میں مت لگاؤ۔ عکلاء عام طور پر یہی تعریف کرتے ہیں کہ نعمت کو اس کام میں لگاؤ جس مقصد کے لیے وہ دی گئی ہے۔ مگر آنکھ، کان اور دل جیسی نعمت پر بہت تھوڑے لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اکثر و بیشتر ان نعمتوں کو خدا کی ناراضگی کے کام میں صرف کرتے ہیں۔ اگر انسان کے کان محض باتیں، لغو گانے، کفر کی باتیں اور یہود و باتیں سنیں گے تو اس سے بڑھ کر اور کیا ناشکری ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ آنکھ جیسی نعمت کو ناجائز باتوں پر لگاتے ہیں کسی اجنبی عورت کی طرف نگاہ اٹھانے سے منع کیا گیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ پہلی نگاہ اچانک ہوتی ہے۔ یہ معاف ہے۔ دوسری نگاہ معاف نہیں ہے۔ دوسری نگاہ کا مطلب یہ ہے کہ تم عمداً ایک غیر محرم عورت کو دیکھ رہے ہو، جس کی اجازت نہیں۔ اسی لیے ارشاد خداوندی ہے۔ قُلْ

لِّلْمُؤْمِنِينَ يَفُضُّوْنَ اَبْصَارَهُمْ مِّنْ اَبْصَارِهِمْ مِّنْ اَبْصَارِهِمْ مِّنْ اَبْصَارِهِمْ مِّنْ اَبْصَارِهِمْ
اور غور توں کو بھی حکم ہے یَفُضُّوْنَ مِّنْ اَبْصَارِهِمْ کہ وہ اپنی نگاہیں پست رکھیں۔

اگر آنکھ ان کاموں میں صرف ہوگی تو یہ ناشکر گزاری ہوگی۔ افسوس ہے کہ آنکھ ناراضگی کے کاموں میں لگ رہی ہے۔ کان کے ذریعہ فحش گانے اور بیہودہ باتیں سنی جا رہی ہیں۔ اللہ اور اللہ کے رسول کا کلام نصیحت کی بات، اچھی بات کان میں نہیں آرہی ہے۔ تو یہ ناشکری ہی تو ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ تم ان نعمتوں کو صحیح مصرف میں نہیں لاتے لہذا تم بہت کم ہی شکر یہ ادا کرتے ہو۔

زمین انسان کیلئے
قرار گاہ ہے

اس کے بعد پیغمبر علیہ السلام کو خطاب ہے۔ قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ کہ آپ فرمادیکئے: خدا کی ذات وہ ہے جس نے تم کو زمین میں بکھیر دیا کہیں یَذْرَؤُكُمْ فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان ہوا پر نہیں رہ سکتا۔ انسان جسم رکھتا ہے اس کو مکان کی ضرورت ہے، جگہ کی ضرورت ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ یعنی قیامت تک تمہارے لیے زمین ہی ٹھکانا اور قرار گاہ ہے۔ انسان ہوا پر زندگی بسر نہیں کر سکتا اگر وہاں جائے گا بھی تو عار منی طور پر۔ اصل قرار گاہ زمین ہی ہے۔ تو فرمایا کہ پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں زمین پر بکھیر دیا۔ جس کا معنی یہ ہے کہ انسان کو جگہ کی ضرورت ہے۔

انسان کے
بنیادی حقوق

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے چار چیزوں کو خاص طور پر انسان کے بنیادی حقوق میں شمار فرمایا ہے۔ یعنی کھانے کے لیے خوراک کہ اس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ پینے کا پانی کہ یہ بھی انسان کے لیے ضروری ہے، جسم ڈھانپنے کے لیے لباس اور ٹھہرنے کے لیے جگہ۔

اس کے علاوہ دو چیزیں اور ہیں جو آج بھی دنیا میں بنیادی حقوق کے طور پر تسلیم کی جاتی ہیں ان میں سے ایک صحت ہے کہ یہ بھی ایک ضروری چیز ہے۔ تندرستی کے بغیر عبادت ہو سکتی ہے نہ محنت مزدوری اور نہ ہی جہاد ہو سکتا ہے۔ دوسری چیز علم ہے۔ یہ بھی بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان نہ فرائض ادا کر سکتا ہے۔ اور نہ خالق اور مخلوق کے حقوق ادا کر سکتا ہے۔

تو گویا یہ چھ چیزیں ہیں۔ جنہیں آج بھی دنیا کی متمدن قومیں انسان کے بنیادی حقوق (Basic Rights) میں شمار کرتی ہیں۔ یونیسکو (UNESCO) اور دیگر عالمی ادارے سب ان کو

تعلیم کرتے ہیں۔

یہ بنیادی حقوق تو قرآن نے بتائے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بنیادی چیزیں ہر آدمی کو اپنے اپنے درجے میں ضرور ملنی چاہئیں۔ سر چھپانے اور گرمی سردی سے بچنے کے لیے اگر عالیشان بلڈنگ نہ بھی ہو تو چھوٹا موٹا مکان تو ضرور ہونا چاہیے۔ بالکل کھلی جگہ تو نہیں ہونی چاہیے۔ اسی طرح خوراک ایسے بھی ہو مگر میسر تو ہو۔ اسی طرح اڑا بھی ایسا تو ہونا چاہیے۔ جو جسم کو ڈھانپ لے اور گرمی سردی سے بچائے۔

انسان کے لیے تعلیم بھی ضروری ہے۔ خصوصاً ایسی تعلیم جس کے بغیر انسان فرائض ادا نہیں کر سکتا۔ آج کل تعلیم عام ہے مگر بہت قلیل حد تک۔ ہمارے ملک میں چونکہ تعلیم لازمی نہیں ہے۔ اس لیے تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بیس پچیس فیصد سے زیادہ نہیں۔ ستر پچھتر فیصد لوگ آج بھی بغیر تعلیم کے ہیں۔ اور یہ جو پچیس فیصد تعلیم ہے بھی، یہ بھی دنیاوی تعلیم ہے، ایس لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب۔ دینی تعلیم تو ایک فیصد ہی بھی مشکل ہوگی۔ جس کے ذریعے انسان فرائض ادا کر سکتا ہے۔ انسانی دماغ کی صحیح ضرورت دینی تعلیم ہے لہذا یہ مقدم ہونی چاہیے۔

دینی تعلیم
کی اہمیت

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے تعلیم پر تبصرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہماری عورتوں کو پہلے دینی تعلیم دلائی چاہیے اس کے بعد ایسی تعلیم جو ان کو امور خانہ داری میں مفید ہو۔ اس کے بعد تاریخ، جغرافیہ اور سائنس وغیرہ کی تعلیم دلاؤ۔ الغرض دینی تعلیم کے فقدان کی وجہ سے اصل بنیاد تو موجود نہیں۔ لہذا لوگوں کو اصل فرائض کا علم نہیں۔ اس لیے دینی تعلیم کو اولیت حاصل ہونی چاہیے تاکہ انسان اپنے اصل فرائض کو سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہو سکے۔

تو ہر حال ارشاد فرمایا: **هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ** خدا کی ذات وہ ہے جس نے تم کو زمین میں بکھیر دیا۔ اور یہ انسان کے لوازمات ہیں۔ جیسا ابتداء میں فرمایا: **الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ** یعنی خدا تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے موت و حیات کو پیدا کیا، **لِيَبْلُوَكُمْ** تاکہ تمہیں آزمائے **أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا** کہ تم میں اچھا عمل کون کرتا ہے۔ یعنی موت و حیات کو انسان کے امتحان کے لیے پیدا فرمایا۔ یہاں فرمایا دیکھو! انسان کو اللہ نے پیدا کیا، علم کے ذرائع عطا کئے، کان آنکھیں اور قلب دیا۔ اور پھر زمین میں بکھیر دیا۔ انسان کو ٹھکانا مہیا کیا۔

خلاصہ کلام

خدا کے حضور پیش
ہونا پڑے گا

ان تمام العبادات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اے انسان اس بات کو مت بھولنا کہ وَالْيَوْمَ
تُحْشَرُونَ ۵ تمہیں خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ معاد برحق ہے۔ قیامت برحق ہے۔ ایک نہ
 ایک دن خدا کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا جائزہ پیش کرنا ہے۔ لِيَبْلُوَكُمْ
أَحْسَنُ عَمَلًا ۶ اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے کہ اچھا کام کون کرتا ہے۔
 اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ میں نے یہ سب ذرائع تم کو دیے ہیں کہیں ان میں منہمک ہو کر معاد
 کو ہی نہ بھول بیٹھنا بلکہ وَالْيَوْمَ تُحْشَرُونَ۔ تم سب اسکی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے۔ ایک نہ ایک
 دن امتحان ہو کر رہے گا۔ اور میرے عمل ضرور واقع ہوگی۔

درس پنجم ۵

آیت ۲۵ تا ۳۰

وَلَيَقُولُنَّ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۲۵﴾ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ
عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۲۶﴾ فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سَيِّئَتْ
وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هَٰذَا الَّذِي كُنتُمْ بِهِ تَدَّعُونَ ﴿۲۷﴾
قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكَنِيَ اللَّهُ وَمَن مَّعِيَ أَوْ رَحِمَنَا ۖ فَمَن يُجْبِرُ
الْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ إِلَيْهِ ﴿۲۸﴾ قُلْ هُوَ الرَّحْمَنُ أَمَنَّا بِهِ وَعَلَيْهِ
تَوَكَّلْنَا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ مَن هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۲۹﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ
إِنْ أَصْبَحَ مَاءُكُمْ غَوْرًا فَمَن يَأْتِيكُم بِمَاءٍ مَّعِينٍ ﴿۳۰﴾

ترجمہ :- اور وہ کہتے ہیں کہ قیامت والا وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم اپنے دعوے
میں سچے ہو، ﴿۲۵﴾ اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے بیشک یہ علم اللہ تعالیٰ
کے پاس ہے اور تحقیق میں تو صرف کھول کر ڈر سنانے والا ہوں ﴿۲۶﴾ پس
جب وہ (منکرین معاد) قیامت کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھیں گے، اس
دن کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے، اور کہا جائیگا یہ وہی چیز ہے جسے تم
خود طلب کرتے تھے ﴿۲۷﴾ اے پیغمبر (علیہ السلام) ان سے فرما دیجئے کہ فرض کرو اگر اللہ تعالیٰ
مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے یا وہ ہم پر رحم کر دے تو کافروں کو عذاب الیم سے
کون بچائے گا ﴿۲۸﴾ اے نبی (علیہ السلام) ان سے کہہ دیجئے کہ وہ ہی (اللہ تعالیٰ کی ذات)
رحمان ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اس پر ہمارا بھروسہ ہے پس تمہیں جلدی پتہ
چل جائیگا کہ کھلی گمراہی میں کون ہے ﴿۲۹﴾ اے پیغمبر (علیہ السلام) ان سے فرما دیجئے
فرض کرو کہ وہی ذات خداوندی اس پانی کو اگر زیادہ گہرائی میں لیجائے تو کون ہے جو

تمہیں صاف و شفاف پانی مہیا کرے ﴿۳۰﴾

گذشتہ پوچھ (ربط)
پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان العنات کا ذکر فرمایا جو انسانوں پر کئے۔ انسان کو وجود بخشتا
اور اس وجود میں تین بڑی نعمتیں کان، آنکھ اور دل عطا کئے۔ کان سے سُن کر انسان معلومات حاصل
کرتا ہے۔ یہ علم کا بہت بڑا ذریعہ ہے، آنکھوں کے ذریعے انسان دیکھتا ہے اور اسے بہت سی

معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دل اخلاق اور تمام عزائم کا مرکز ہے قوت عملیہ یہیں سے اٹھتی ہے اور ایمان یہاں ہی ہوتا ہے۔ کفر و شرک کا تعلق بھی دل کے ساتھ ہے۔ یہ نعمتیں عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ تم بہت حقوڑا شکریہ ادا کرتے ہو۔ شکر یہ تو تب ادا ہو جب ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں صرف کرتے۔ اُن کاموں میں لگاتے جن سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ اور ان کاموں سے بچاتے جن میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے۔

فرمایا دیکھو! اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تم کو ذرا کُھ فی الارض زمین میں بکھیر دیا ہے۔ پہلے فرمایا اَنْشَاكُمْ یعنی تم کو پیدا کیا۔ اور پھر ذرا کُھ تم کو بکھیر دیا۔ پرگندہ کر دیا۔ مشرق مغرب شمال جنوب میں نسل انسانی کو پھیلا دیا۔ تمہیں زمین پر رہائش اور دیگر ضروریات اللہ تعالیٰ نے مہیا کیں۔ لہذا اس بات کو مت بھولنا وَالْيَوْمُ تُحْشَرُونَ کہ اُسی کے سامنے اکٹھے کئے جاؤ گے یہاں سے ابتدا ہوئی اور ادھر انتہا ہوگی۔ جس خدا نے تم کو پیدا کیا، اُسی کے سامنے تمہارا حشر ہوگا۔

پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ موت و حیات کی پیدائش اس لیے کی کہ انسان کو اُس کے اعمال کے اعتبار سے آزمایا جائے کہ اچھے عمل کون کرتا ہے اور بُرے کون۔ تو اس طرح گویا جزائے عمل واقع ہو۔ جس طرح انسان کی پیدائش یقینی امر ہے اسی طرح جزائے عمل کا واقع ہونا بھی لازمی ہے۔ جس کا موقع اور محل قیامت ہے۔ جزائے عمل حشر کے بعد واقع ہوگا۔ اگر اس سے پہلے ہوگا تو وہ صرف تمہیدی اور ابتدائی طور پر اس کا نمونہ ہوگا بحقیقی طور پر جزا اور جزاؤں سے حشر کے بعد ہی ہے۔

یہ بھی فرمایا کہ توحید پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر کامیابی نہیں ہے۔ اسی طرح رسالت کا ذکر بھی فرما دیا۔ کہ رسول کے بتلائے بغیر قوانین معلوم نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ لہذا رسالت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح ایمان کے اجزاء میں قیامت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توحید، رسالت اور قیامت ایمان کے اہم ترین اجزاء ہیں۔ اس کے علاوہ آسمانی کتب، ملائکہ اور صفات الہی جن میں تقدیر بھی شامل ہے، اُن پر ایمان لانا بھی اسی درجہ کا ضروری ہے۔ البتہ وہ باتیں سب سے زیادہ ضروری ہیں جن کا تصور انسان ہر وقت اپنے سامنے رکھتا ہے۔ اور رکھنا بھی چاہیے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَالْيَوْمُ تُحْشَرُونَ تم سب اسی ذاتِ خلد وندی کی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے۔

قیامت کب
آئے گی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے معجزین قیامت کا حال بیان فرمایا۔ وَلَقُولُوا نَحْنُ كُنَّا هَذَا وہ کہتے ہیں کہ قیامت والا وعدہ کب پورا ہوگا۔ اے اہل ایمان ان کُنْتُمْ صَادِقِينَ اگر یہ وعدہ سچا ہے تو پورا کیوں نہیں ہوتا۔ قیامت کیوں نہیں آتی۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو قیامت کو لا کر دکھاؤ قرآن پاک میں دیگر مقامات پر بھی کفار کا یہ اعتراض مذکور ہے کہ اگر یہ وعدہ سچا ہے تو اسے پورا ہونا چاہیے۔ آخر یہ کب پورا ہوگا۔

وقع قیامت کا
علم صرف اللہ کو ہے

جواب میں ارشاد ہوا قُلْ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّى یہ علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے مجھے وقوع قیامت کا علم نہیں ہے مجھے تو اللہ نے صرف اتنا علم دیا ہے کہ قیامت آنے والی ہے۔ میں اس کے متعلق تم کو ڈراتا ہوں، خبردار کرتا ہوں۔ رہا وقت کا تعین تو وہ میرے علم میں نہیں۔ وہ اللہ کے پاس اور اُس نے کسی کو نہیں بتایا۔ ہمارے لیے اتنی ہی بات کافی ہے کہ قیامت آنے والی ہے جس کی ہمیں فکر کرنی چاہیے۔

قیامت اچانک
دارد ہوگی

دوسری جگہ فرمایا ثَقُلْتُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمُ الْاَبْغَثَةُ اور بوجھل خبر ہے اور یہ تمہارے پاس اچانک ہی آئے گی۔ لوگ غفلت میں پڑے ہوں گے اور قیامت اچانک (بغتہ) آجائے گی۔ ایک اور جگہ فرمایا هُوَ نَبُوْا عَظِيْمٌ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ عظیم خبر ہے اور تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو تمہیں غفلت میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اور کہیں ارشاد ہوتا ہے مَعَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ایک بڑی خبر کے متعلق۔ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ جس کے متعلق یہ اختلاف کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ قیامت کوئی نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے، شاید آجائے۔ فرمایا وَيَذَلُّ الْمُكَذِّبِيْنَ دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی اور بربادی ہے۔

جبریل

حدیث جبریل میں آتا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے حضور علیہ السلام سے ایمان، اسلام اور احسان کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے تینوں سوالوں کا جواب دیا۔ پھر چوتھا سوال کیا مَتَى السَّاعَةُ حضور! یہ فرمائیے قیامت کب آئے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ یعنی یہ بات جیسا سائل کو معلوم نہیں ایسے ہی مسؤل کو بھی معلوم نہیں اس کا علم نہ میرے پاس ہے، نہ میرے پاس، بلکہ صرف اللہ کے پاس ہے اور اس نے کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ عِنْدَهُ

عِلْمُ السَّاعَةِ قیامت کا علم صرف خدا تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہ خاص چیزوں میں سے ہے۔ اس کے وقوع کی گھڑی کسی کو نہیں بتائی۔

قیامت کی نشانیاں

ہاں قیامت کی بعض نشانیاں بتا دیں جو قیامت سے پہلے واقع ہوں گی۔ خود پیغمبر علیہ السلام کا وجود مبارک قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ میں اور قیامت اس طرح آگے پیچھے ہیں جیسے یہ دو انگلیاں ایک تھوڑی سی آگے بڑھی ہوئی ہے اور ایک ذرا پیچھے ہے۔ مراد یہ ہے اب کوئی اور شریعت نہیں آئیگی بلکہ قیامت ہی آئے گی۔ دوسری جگہ ہے کہ آپ فرمادیجئے میں نہیں جانتا اَقْرَبُ امُّ بَعِيدٌ مَّا تُوْعَدُونَ مجھے معلوم نہیں کہ وہ قریب ہے یا بعید یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ہمیں تو اتنا ہی علم ہے کہ وہ یقیناً آنے والی ہے۔ الغرض نبی علیہ السلام کو ارشاد ہے۔ اَبْ فَرَادِیْجُ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ کہ وقوع قیامت کا علم اللہ کے پاس ہے۔ اور اس سلسلے میں وَ اِنَّمَا اَنَا نَذِيرٌ مُّبِیْنٌ میں تو صرف کھوکھوڑے سنانے والا ہوں میرا فریضہ اتنا ہی ہے کہ قیامت کے آنے کی خبر دے دوں، اس کے وقت کا تعین میرے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ اللہ کے پاس ہے۔ وہی اس کو جانتا ہے۔

قیامت میں کفار کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً مُّتَمَرِّیْنَ معاد جب قیامت کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھیں گے۔ سِیِّئَتْ وُجُوهُ الذِّیْنَ کَفَرُوْا اس دن کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے۔ جیسا کہ درج بالا آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ ہوں گے۔ نیز فرمایا وُجُوهُ یُّوْمٍ ذٰلِكَ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ اس دن چہرے غبار آلود ہوں گے۔ تَرٰهُمْ فَاَقْتَرَبَتْ ان پر سیاہی چڑھی ہوئی ہوگی۔ اور بعض چہرے بڑے خوش خوش ہوں گے مُسْتَبْشِرَةٌ نورانی ہوں گے سفید ہوں گے چمکدار ہوں گے اور خوشی کرنے والے ہوں گے۔ بعض دوسرے چہروں پر کفر کی سیاہی نمایاں ہوگی اور ان پر خوف طاری ہوگا۔

اُس دن اللہ کا وعدہ پورا ہو جائے گا

وَقِيلَ اٰلَیْهِ رُجِعُوْا اور کہا جائے گا۔ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدْعُوْنَ یہ وہی چیز ہے جسے تم خود طلب کرتے تھے۔ لو! یہ قیامت آگئی ہے تو اس طرح قیامت کے روز اللہ کا وعدہ پورا ہو جائیگا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے توحید کا ذکر کیا۔ صفات الہی کو بیان فرمایا، بنیادی عقائد بمجملہ رسالت اور قیامت کا بیان فرمایا۔ اور پھر اعتراض کرنے والے لوگوں کا جواب دیا اور ان کے انجام کو واضح کیا

ان کی گندی ذہنیت کا تجزیہ بھی کیا۔ اب کفار الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی۔ حضور نبی کریمؐ سے ایک دیہاتی نے سوال کیا کہ حضرت یہ فرمائیں مَتَى السَّاعَةُ قِيَامَتِ کَب آئے گی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا وَفِيكَ مَا أَعْدَدْتُ لَهَا افسوس ہے تو نے قیامت کے لیے کیا تیاری کی ہے۔ کہ اُس کے متعلق دریافت کرنا ہے۔ عرض کیا حضور! میں نے کوئی زیادہ سامان تو تیار نہیں کیا، صرف فرائض وغیرہ ہی ادا کرتا ہوں۔ عبادت و ریاضت کا کوئی اور سامان تو میرے پاس نہیں ہے یعنی میرے نامہ اعمال میں نفلی عبادت اور نفلی روزے وغیرہ کا ذخیرہ تو نہیں ہے۔ البتہ ایک بات ضرور ہے۔ اِنِّیْ اُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت ضرور رکھتا ہوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا تَمَّ بے فکر ہو جاؤ اَنْتَ مَعَ مَنْ اُحْبِبْتَ جن کے ساتھ تم محبت رکھتے ہو۔ تمہارا حشر انہیں کے ساتھ ہوگا۔ خصوصی اعمال میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت بڑی خوشی کی بات ہے۔

فارغ عذاب نہیں
بچ سکیں گے

توحید، رسالت اور معاویہ ایمان لانے کی بجائے کفار کہتے تھے کہ یہ محض شور و غوغا ہے۔ چند دن بعد یہ سب ہلاک ہو جائیں گے، مزید کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ان کی موت کے ساتھ ان کا دھند ابھی ختم ہو جائے گا۔ قیامت وغیرہ کچھ نہیں آئے گی۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ اَیُّتُمْ اِنْ اَہْلَکْنِیَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِیْ اے پیغمبر علیہ السلام ان سے فرما دیجئے فرض کرو اگر اللہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے جیسا کہ تمہارا خیال ہے اَوْ رَحِمْنَا یَا وہ ہم پر رحم کر دے جیسا کہ ہمارا اعتقاد ہے۔ فَمَنْ یُجِیْدُ الْکَافِرِیْنَ مِنْ عَذَابِ الْیَوْمِ تو کافروں کو عذاب الیم سے کون بچائے گا۔

کفار کہتے تھے شَاعِرٌ تَرْتَبِّیْ بِہ رَیْبِ الْمُنُوْنِ شاعری کرتے ہیں ہم چند دن اور انتظار کریں گے جیسے پہلے شاعر مر کھ پ گئے۔ اور ان کا مشن چلانے والا کوئی نہیں ہے اسی طرح یہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ اور ان کا مشن کامیاب نہیں ہوگا۔ جواب میں فرمایا کہ فرض کرو اگر ایسا بھی ہو جائے تو اس سے کافروں کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ ہمارے ہلاک ہوجانے سے یا ہم پر رحم کئے جانے سے کفار کے عذاب میں کوئی فرق نہ پڑے گا بہر حال انہیں عذاب کا پھر ملنے والا اور پناہ دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔

آگے ارشاد فرمایا، اے نبی علیہ السلام! قُلْ هُوَ الرَّحْمَنُ اِن سَعِیْہِ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ تعالیٰ
 کائنات ہی ہے جو رحمان ہے۔ وہ ہم پر رحم کرے گا۔ کیونکہ اٰمَنَّا بِہِ ہم اس پر ایمان لائے ہیں،
 اسکی صفات اور اسکی وحدانیت پر ہمارا ایمان ہے وَعَلٰیہِ تَوَكَّلْنَا اس پر ہمارا بھروسہ ہے اسی کے ہاتھ میں
 نسیب ہے۔ وہ یقیناً ہمیں کامیابی عطا کرے گا۔ فَسَتَعْلَمُوْنَ پس تمہیں جلدی ہی پتہ چل جائیگا۔
مَنْ هُوَ فِی ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ کہ کھلی گمراہی میں کون ہے۔ کیا ہم ہیں جو ایمان لائے یا تم جو جنہوں نے
 کفر کا راستہ اختیار کیا اور توحید و معاد کا انکار کیا۔ عنقریب اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، ایمان مدار نجات، مدار سعادت اور مدار فلاح ہے۔ ہم تو خدا کی ذات
 پر ایمان لائے ہیں، اُسی پر توکل اور بھروسہ ہے۔ اہل ایمان کو اسی اعتقاد کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

شفاف پانی کی بہت سی
 نعمت عظمیٰ

اس کے بعد اللہ جل جلالہ نے دلائل قدرت میں سے ایک اور دلیل کا ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوا
 کہ وہ اللہ تعالیٰ جس نے تمہیں وجود بخشا، زمین بخشی، جگہ دی، تمام ضروریات مہیا کیں، وہ اگر اس پانی
 کو جس پر تمہاری زندگی کا دار و مدار ہے "زمین کی گہرائی میں لے جائے قُلْ اَرَايْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ
مَآؤُكُمْ غَوْرًا حالانکہ اس نے اپنی کمال قدرت اور حکمت نامہ کے ساتھ اس پانی کو بارش کی
 صورت میں برسا کر زمین کے اندر چلا دیا ہے۔ اور انسان تھوڑی سی محنت کر کے زمین کھود کر پانی حاصل
 کر لیتا ہے۔ کہیں کنواں ہے۔ کہیں نلکا ہے کہیں تالاب ہیں۔ نہریں جاری کر دیں۔ کہیں چشمے چھوٹ
 پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے پانی جیسی نعمت کو بغیر پائپ لائن کے زمین کے اندر خال کی صورت میں پھیلا
 دیا کہ انسان جہاں سے چاہے کھود کر پانی حاصل کرے۔ یہی نہیں بلکہ فَسَلٰکَہٗ یٰۤاٰیُّہٗ فِی الْاَرْضِ
 زمین میں چشمے جاری کر دیے، اسے گلے سڑنے سے محفوظ کر دیا۔ تو فرض کرو کہ وہی ذات خداوندی
 اس پانی کو اگر وہ زیادہ گہرائی میں لیجائے جو تمہاری دسترس سے باہر ہو تو بتلاؤ فَنَنْیِّاۤتِکُمْ
بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ تو کون ہے جو تمہیں صاف و شفاف پانی مہیا کرے۔

تجربات شاہد ہیں کہ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں پانی حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ کھدائی
 کرنی پڑتی ہے۔ عرب کے بعض خطوں میں پانی حاصل کرنے کے لیے سخت محنت اور بہت زیادہ خرچ کرنا
 پڑتا ہے۔ یہاں بھی کئی مقامات ایسے ہیں جہاں پانی کئی کئی سو فٹ گہرا ہے۔ ہمارے ہاں تو دس بیس
 فٹ پر پانی مل جاتا ہے۔ زمین بھی نرم ہے۔ مگر جہاں زمین سخت پتھر ملی اور پانی دور ہو وہاں بہت زیادہ

محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ صاف و شفاف پانی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمتِ عظمیٰ ہے جو اس نے فری عطا کی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کو زمین میں چار پانچ میل کی گہرائی تک دھندا دے تو تمہارے معبودوں میں سے کون ہے جو تمہیں پانی مہیا کر دے۔ دوسری جگہ یہ اللہ تعالیٰ نے روشنی کا بھی اسی طرح ذکر فرمایا کہ اگر وہ سورج کو روک دے تو تمہارے پاس کوئی ہے جو روشنی کو لے آئے۔

تفسیر جلالین دو بزرگوں نے لکھی ہے۔ پندرہ پائے جلال الدین سیوطیؒ نے اور پندرہ پائے جلال الدین محلیؒ نے۔ جناب محلیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں ایک فلسفی سائنس دان کا واقعہ نقل کیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ کون پانی لائے گا تو اس فلسفی نے کہا کہ ہم کہتے ہیں، ہمارا کدال پانی لائے گا، یہ بیلچہ پانی لائے گا۔ ہم ان کی مدرسہ زمین کھود کر پانی حاصل کر لیں گے۔ تو مولانا جلال الدین محلیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس فلسفی کو اندھا کر دیا اور اس کی قوت ظاہری سبب کر لی کیونکہ اس نے غرور و تکبر کیا تھا۔ اگرچہ سزا کا اصل موقع تو حشر ہے مگر بعض اوقات اللہ تعالیٰ عبرت کے طور پر دنیا میں بھی ایسے مغروروں کو نمونہ کے طور پر سزا کا کچھ حصہ دے دیتا ہے۔

ایک فلسفی کا انجام

حدیث شریف میں آتا ہے۔ جب یہ آیت پڑھی جائے **فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَّعِينٍ** تو اس کے بعد کہنا چاہیے **اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ**۔ اگر آدمی نماز کی حالت میں ہو تب بھی اہمیت سے یہ الفاظ کہہ لے **اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ** آیت کے اختتام پر پڑھنا مستحب ہے گویا یہ اس آیت پاک کا جواب ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے کہ کون ہے جو تمہارے پاس پانی لے آئے تو پڑھنے والا یا سننے والا یوں کہے کہ وہ اللہ رب العالمین ہی ہے۔ جو پانی جیسی نعمتِ عظمیٰ کو مہیا کر سکتا ہے۔

اختتام آیت پر
اللہ رب العالمین

(وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)



سُورَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اثْنَتَانِ وَخَمْسُونَ آيَةً وَفِيهَا رُكُوعَانِ

سورۃ قلم مکی ہے۔ یہ باون آیات اور اس میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

۱ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۱ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةٍ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ۲ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ۳ وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ ۴ فَسَبِّحْ وَبِصِرُونَ ۵ بِأَيِّكُمْ الْمُفْتُونَ ۶ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۷

ترجمہ :- قسم ہے قلم کی اور جو کچھ قلم کے ساتھ لکھتے ہیں ۱ اے نبی (علیہ السلام) آپ اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں ۲ اور بیشک آپ کے لیے انتہا اور کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے ۳ اے شک آپ بہت بڑے اخلاق پر ہیں ۴ آپ بھی عنقریب دیکھ لیں گے اور یہ معترفین بھی دیکھ لیں گے ۵ کہ تم میں سے کون فتنے میں ڈالا گیا ہے ۶ بیشک تیرا رب خوب جانتا ہے جو اس کے راستے سے بہک گیا اور وہ خوب جانتا ہے ان لوگوں کو بھی جو ہدایت کے راستے پر چل رہے ہیں ۷

اس سورۃ کی پہلی آیت میں قلم کا لفظ مذکور ہے۔ اور اسی وجہ سے اس سورۃ کا نام سورۃ قلم ہے۔ اس سورۃ کی باون آیات، تین سو الفاظ اور ایک ہزار دو سو چھپن حروف ہیں۔ اس سے پہلی سورۃ ”ملک“ کی تیس آیات تھیں اور اس کی باون آیتیں ہیں۔

وجہ تسمیہ اور
کوائف

اس سے پہلی سورۃ میں توحید ذات خداوندی، دلائل توحید، جزائے اعمال اور ضمانت رسالت کا ذکر تھا۔ اس سورۃ میں زیادہ تر رسالت کا تذکرہ ہے۔ جزائے اعمال اور قیامت کا ذکر بھی ہے۔ پہلی سورۃ میں توحید کے دلائل زیادہ تھے، اس میں نبوت اور رسالت پر اعتراضات کے جواب

ضمین سورۃ
(رابط)

دیے گئے ہیں۔ اُن کا رد کیا گیا ہے اور تنبیہ کی گئی ہے۔ خاص طور پر مکے کے خوشحال لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے۔ ایک خوشحال باغ والوں کا ذکر ہے جن کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عطا کردہ نعمت اُن سے چھین لی۔

دوسری طرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ طعن کرنے والوں کی وجہ سے زیادہ پریشان نہ ہوں، بلکہ صبر کریں اور برداشت سے کام لیں۔ آخر میں مچھلی والے نبی کا ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا تھا لہذا وہ آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ اس مثال سے نبی علیہ السلام کو صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ قیامت اور اس میں پیش آنے والے بعض حالات کا بیان بھی ہے۔

یہ سورۃ اُن سورتوں میں سے ہے، جو ابتدائے نبوت میں نازل ہوئیں بعض فرماتے ہیں کہ نزول کے لحاظ سے اس کا تیسرا نمبر ہے۔ پہلے نمبر پر سورۃ علق کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں۔ اس کے متصل بعد سورۃ فاتحہ نازل ہوئی، اور جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو وضو کا طریقہ بتایا۔ اور آپ نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ دوسرے نمبر پر سورۃ منزل کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ اس کے بعد تیسرا نمبر اس سورۃ مبارکہ کا ہے اگر سورۃ فاتحہ کو الگ شمار کریں تو اس کا چوتھا نمبر ہوگا۔

پہلی وحی کے بعد دوسرے روز آپ نے نماز ادا کی۔ اس نماز میں آپ کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ، حضورؐ کے منہ بولے بیٹے زیدؓ اور آزاد کردہ لونڈی ام ایمنؓ تھے۔ یہ آپ کے والد ماجد کی لونڈی تھی جسے آپ نے آزاد کر دیا تھا۔ اس نے آپ کو گود میں کھلایا تھا اور آپ کے لیے بمنزلہ ماں کے تھی۔ آپ اس کا بڑا احترام فرماتے تھے بچوں میں حضرت علیؓ بھی حضورؐ کے ساتھ نماز میں شریک تھے۔

مکہ کے اکثر و بیشتر لوگ جاہل تھے۔ حضور علیہ السلام کا نماز پڑھنا ان کے لیے عجیب بات تھی وہ اسے عجیب و غریب حرکات خیال کرتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے شروع میں ہی یہ طعنہ دیا کہ یہ لوگ پاگل اور مجنون ہو گئے ہیں جو ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ آپ کو مجنون کا خطاب اسی دور میں دیا گیا۔ شاہ ولی اللہؒ اپنی مشہور کتاب ”الفوز البکیر“ میں لکھتے ہیں، اگرچہ نماز اور طہارت کا طریقہ عربوں میں معروف تھا۔ مگر عام لوگ جاہل تھے۔ ان کا عقیدہ بگڑ چکا تھا۔ حضور علیہ السلام کی بعثت

زمانہ نزول

نماز کی ابتداء

کفار کا اعتراض

عقیدہ توحید سے انحراف

سے چار سو سال پہلے تک لوگ مؤید تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین پر تھے۔ یہ قریش کے جد امجد قصی ابن کلاب کا زمانہ تھا۔ اُس کے بعد عربوں کے ایک شخص عمرو بن لُحیؓ نے بت پرستی سیکھی اور یہاں آکر رائج کی۔ اور پھر عقیدہ توحید میں ایسا بگاڑ پیدا ہوا کہ سائے عرب میں توحید پرست کوئی اکاؤڈ کا آدمی ہی نظر آتا تھا۔

توحید کی رتق
مکہ کی اتنی بڑی آبادی میں صرف ایک شخص ورقہ بن نوفل کا نام ملتا تھا۔ اس نے پہلی کتابوں کا علم سیکھا تھا اس لیے کسی حد تک توحید پرست تھا۔ اس کے علاوہ زید بن عمرو بن نفیل کا نام ملتا ہے۔ زید حضرت سعیدؓ کے والد تھے جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ حضور علیہ السلام نے دس آدمیوں کو ایک ہی مجلس میں بستی ہونے کی بشارت دی تھی۔

یہ زید ابن عمرو بن نفیل خانہ کعبہ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ ہر طرف بت ہی بت تھے۔ بتوں کا طواف ہو رہا ہے، صفار مردہ کے درمیان بت رکھے ہیں، مثل کے مقام پر بڑے بڑے بت تھے۔ کعبے کی دیواروں پر، چھت پر، مقام ابراہیم پر، الغرض چاروں طرف بت ہی بت تھے۔ اس حالت میں زید بن عمرو حقیقت سے توبہ خبر تھے۔ مگر کہتے تھے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، غلط ہے۔ شرک ہو رہا ہے۔ مگر وہ شرک سے بیزار تھے۔ مشرکوں کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا بھی نہیں کھاتے تھے۔ کہتے تھے یہ غیر اللہ کے نام پر، لات وغریٰ کے نام پر کاٹے ہیں، لہذا میں اسے نہیں کھاؤں گا۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام بھی مشرکین کا ذبیحہ نہیں کھاتے تھے۔ ہاں اگر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو تو استعمال کر لیتے تھے۔

تو گویا اس کے گزے زمانے میں بھی ایسے اکاؤڈ کا آدمی نظر آتے تھے۔ جن میں توحید کی رتق کسی حد تک باقی تھی، ورنہ ۹۹۹ آدمی مشرک ہی تھے

کنار کے طعن کا جواب
ان حالات میں جب مشرکین مکہ حضور علیہ السلام کو وضو کرتے، کھڑے ہوتے، رکوع کرتے، سجدہ کرتے دیکھتے تھے تو کہتے تھے فلاں آدمی پاگل ہو گیا ہے۔ اُس کے ساتھ دوسرے بھی شریک ہو گئے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں کفہ مکہ اور مخالفین کے اعتراض کا رد فرمایا ہے۔ اس سورۃ کوئن کے حرف سے شروع کیا۔ جیسے اللہ، کھیلے بعض سورتوں کی ابتدا میں یہ حروف آتے ہیں، اور حروف مقطعات کہلاتے ہیں اس مقام پر ان سے درمغانی مراد

حرف ن کے مختلف معانی

یہ لے لے ہیں۔ ن کا ایک معنی مچھلی ہے اور اس سورۃ کے آخر میں مچھلی والے پیغمبر کا ذکر ہے۔ اور ان کے حال کو سامنے رکھ کر تسلی دی گئی ہے کہ بے صبری نہ کرو وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیں صبر و اطمینان سے کام لیں یہ کفار طعن کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے آپ اپنا کام کرتے رہیں۔

دوسری جگہ سورۃ انبیاء میں اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرمایا وَذَا النُّونِ اِذْ ذُهِبَ مُغَاضِبًا اور مچھلی والے پیغمبر کا حال بھی سنو جب وہ ناراض ہو کر چلے گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم گرفت نہیں کریں گے مگر ہم نے ان کو آزمائش میں ڈال دیا۔ پھر اُن کے ساتھ مچھلی کے پیٹ میں چلے جانے کا جو واقعہ پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا۔ اس سورۃ میں آگے چونکہ مچھلی والے پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہے۔ لہذا حرف ن کو شروع میں لانے میں شاید اسی واقعہ کی طرف اشارہ مقصود ہو ن کا دوسرا معنی اس مقام پر دوات بھی ہو سکتا ہے۔ عربوں میں ن کا اطلاق دوات پر بھی کیا جاتا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ

اِذَا مَا الشُّوقُ بَدَّحَ لِي إِلَيْهِمْ اَلْقَتِ النُّونُ بِالْذَّمِّ مَعَ السَّجُومِ
جس وقت مجھے شوق ان کی طرف ساتا ہے۔ تو پھر دوات اپنے آنسو مسلسل بہانے لگتی ہے
یعنی جب میں قلم لے کر خط لکھتا ہوں تو دوات اپنے آنسو مسلسل بہاتی ہے۔ تو گویا قلم کے کناروں سے جو سیاہی گرتی ہے اُسے آنسوؤں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تو گویا اس ن سے مراد دوات بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ قلم کا قریبی رابطہ دوات سے ہی ہوتا ہے۔

ن وَالْقَلَمِ قَسَمٌ قَلَمٌ كِيَوْمَ تَنْفُخُ النُّفُوسُ اور جو کچھ قلم کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اس جگہ قلم کا معنی عام بھی ہو سکتا ہے اور خاص بھی اگر اس سے خاص قلم مراد لیا جائے تو وہ تقدیر کا قلم ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور حکم دیا اُكْتُبْ مَا كَانَ وَمَا يَكُونُ یعنی جو واقعات ہونے والے ہیں، سب لکھ دو، یہ قلم تقدیر ہے۔

عام قلم وہ ہے جسے لاکھوں، کروڑوں لوگ استعمال کرتے ہیں۔ یہ قلم بھی اللہ تعالیٰ کا انعام ہے عَلَّمَ بِالْقَلَمِ یعنی اللہ تعالیٰ نے قلم کے ذریعے لوگوں کو علم سکھایا۔ اس لحاظ سے قلم کو بڑی حیثیت حاصل ہے حکومت کا مدار دو چیزوں پر ہے یعنی قلم اور تلوار۔ اور ان دونوں میں

قلم عام و خاص
معانی میں

قلم کو غلبہ حاصل ہے۔ قلم جو کچھ تحریر کرتی ہے، تلوار اس کے مطابق عمل کرتی ہے یعنی طاقت کا استعمال قلم کے حکم کے تابع ہے۔ اسی طرح دفتروں کے دفتر قلم سے لکھے جاتے ہیں علوم و معارف اور فنون وغیرہ سب قلم ہی سے احاطہ تحریر میں آتے ہیں۔

تو یہاں پر وَمَا يَسْطُرُونَ سے وہ تحریر مراد ہے، جو عام لوگ لکھتے ہیں۔ اور جس کے ذریعے لوگوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھیں یعنی عام قلم۔ یہاں پر قلم سے مراد خاص قلم یعنی تقدیر کا قلم مراد نہیں ہے پہلی آیت میں قلم اور اُس کے ذریعے جو لکھا جاتا ہے اُس کی قسم کا ذکر ہے۔ اگلی آیت میں اس قسم کا جواب ہے مَا أَنْتَ بِمُعْجِزٍ لِّكَ بِمُجْنُونٍ یعنی اے نبی علیہ السلام! آپ اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں۔ قلم اور اس سے لکھی جانے والی ہر چیز اور ساری مخلوق اس بات پر گواہ ہے کہ آپ دیوانے نہیں ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جس نے جو بھی قلم سے لکھا ہے۔ اُسے ایک طرف رکھ دیں اور خاتم النبیین کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ ایک طرف رکھ دیا جائے تو یہ ایک جملہ ہر چیز پر بھاری ہو گا، اور پتہ چل جائے گا کہ کیا یہ پاگلوں کا کلام ہے؟

قسم اور اس کا جواب

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک بچے کے ساتھ دل لگی کے لیے بطور مزاح ایک جملہ فرمایا تھا، تو اس ایک ازراہ مزاح فرمودہ جملے سے محدثین اور فقہائے کرام نے ایک سو مسائل کا استنباط کیا۔ سوچو تو سہی کہ ایک بچے کا دل خوش کرنے کے لیے فرمائے گئے ایک جملے سے اگر اس قدر مسائل اخذ ہو سکتے ہیں تو کیا حضور علیہ السلام کا کوئی بھی فرمان بھلا پاگلوں کی باتیں ہو سکتی ہیں؟ یہ حیثیت تو نبی علیہ السلام کے اپنے کلام کی ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کا کلام قرآن پاک اپنی زبان سے ادا فرماتے ہیں، اس کا مقام کیا ہو گا۔ بھلا ایسی باتیں پاگلوں کی زبان سے نکلا کرتی ہیں؟ پھر فرمایا کہ مجنون آدمی تو کوئی صحیح کام نہیں کر سکتا۔ مگر آپ کے افعال ایسے ہیں کہ دوست اور دشمن سب ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ جس وقت تک آپ کو نبوت نہیں ملی تھی، اس وقت بھی آپ کے حالات اتنے مستقیم تھے۔ اور آپ کی ذات اقدس کو اس قدر حکمت و دانائی عطا کی تھی جس کی مثال مٹی کی شکل ہے۔

حضور علیہ السلام کا ہر فرمان علم و حکمت کا خزانہ ہے

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ابھی پینتیس (۲۵) سال کی تھی، نبوت عطا ہونے

حجر اسود کی تصویب کا نام

میں ابھی پانچ سال باقی تھے کہ کعبہ کی تعمیر میں تنازعہ پیدا ہو گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ حجر اسود کو اپنے مقام پر کون رکھے ہر قبیلے کا سردار اس سعادت کے حصول کا خواہشمند تھا۔ آپس میں جھگڑا فساد شروع ہو گیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ دنیا فساد ٹھیک نہیں ہے اس معاملہ میں کسی کو اپنا فیصلہ مقرر نہ کرو اور اس کے فیصلے کو سارے تسلیم کر لو۔ چنانچہ طے پایا کہ جو شخص کل صبح سب سے پہلے حرم شریف میں داخل ہو، وہی فیصلہ ہوگا دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ حرم پاک میں سب سے پہلے داخل ہونے والے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ سب نے آپ کو اس تنازعہ میں فیصلہ تسلیم کر لیا۔

حضور علیہ السلام نے بطور فیصلہ ایسا فیصلہ صادر فرمایا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جب حجر اسود کی تنصیب کا وقت آیا تو آپ نے اپنی چادر مبارک نکچھائی، اپنے ہاتھ سے حجر اسود اس میں رکھا اور تمام قبائل کے سرداروں سے کہا کہ وہ چادر کے کونے پکڑ لیں اور اسے تنصیب کی جگہ تک لے جائیں۔ جب وہ اُس مقام پہنچے تو حضور علیہ السلام نے اپنے دست مبارک سے پتھر کو اٹھا کر تنصیب کی جگہ پر رکھ دیا۔

اس فیصلے سے سب لوگ راضی ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ نے کمال کر دیا یعنی کمال درجے کا فیصلہ کیا۔ حکمت و دانائی سے چادر کے کونے سارے سرداروں کو پکڑا دیے اور کسی کو اعتراض کا موقع نہیں دیا۔ سب کہنے لگے رَضِیْنَا رَضِیْنَا ہم راضی ہیں، ہم خوش ہیں یہ خوب فیصلہ ہے تو فرمایا کہ اے نبی علیہ السلام! یہ پاگلوں کے کام نہیں ہیں بلکہ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرُ مَحْضُونٍ یعنی آپ کے لیے بے انتہا اور کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ آپ کے اپنے اعمال اور آپ کے علم سیکھ کر آگے سرانجام دیے جانے والے سب اعمال کا اجر آپ کو ملتا چلا جائے گا۔ پیغمبر کے اجر کی کوئی انتہا نہیں۔ تمام لوگ پیغمبر کے واسطے سے جو بھی اچھی بات سیکھیں گے اُس کا اجر پیغمبر علیہ السلام کو برابر ملتا ہے گا۔ تو گویا اس طرح پیغمبر کا اجر بے انتہا ہے۔ یہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

حضور علیہ السلام کے لیے بے انتہا اجر ہے

اس پس منظر میں کہ کفار آپ کو مجنوں اور پاگل کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ مَا وَدَّعَیْکَ لَعَلَّیْ خُلِقَ عَظِیْمٌ بیشک آپ بہت بڑے اخلاق پر ہیں۔ آپ کا اخلاق بہت عظیم ہے۔ یہ کفار و مشرکین حماقت، جہالت اور تعصب کی بنا پر آپ کی ذات پر اعتراض کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ آپ سب سے بڑے اخلاق پر ہیں۔ کائنات میں آپ کے

بڑا اخلاق ہے ہی نہیں۔

حضرت عبید بغدادی فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کو سب سے بڑا اخلاق اس لیے کہا گیا کہ لَمْ تَكُنْ لَهُ هَمَّةٌ سِوَى اللَّهِ یعنی آپ کے دل میں رضائے الہی کے سوا کوئی اور مقصد ہی نہیں ہے۔ اور مخلوق کے ساتھ آپ کمال درجے کے اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔

اب ظاہر میں آپ مخلوق کے ساتھ ہیں اور باطن میں اللہ کے ساتھ، اسی لیے لوگوں کے ساتھ کمال درجے کا معاملہ کرتے ہوئے بھی بے گناہ ہی ہیں، کیونکہ اندر کا معاملہ اللہ کے ساتھ چل رہا ہے خدا تعالیٰ کے سوا آپ کا کوئی مقصد نہیں۔ تو ظاہر آپ کا مخلوق کے ساتھ تھا اور باطن حق کے ساتھ اسی لیے آپ کا اخلاق، خلق عظیم یعنی بڑا اخلاق ہے۔ حضور علیہ السلام نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا بُعِثْتُ لَكُمْ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ یعنی خدا نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ اچھے اخلاق کی تکمیل کروں حضور کے اخلاق کی کوئی مثال نہیں۔ تمام نبیوں اور انسانوں میں آپ کا اخلاق سب سے بلند ہے۔ اور اسی اخلاق کو معیار مقرر کیا گیا ہے۔

حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن تم میں سے مجھ سے زیادہ قریب وہ ہوگا جس کا اخلاق اچھا ہوگا۔ اور فرمایا جنت میں بھی وہ لوگ کثیر تعداد میں جائیں جن کے اخلاق اچھے ہونگے منافق کے بارے میں فرمایا اس کا اخلاق کبھی اچھا نہیں ہوگا۔ اور اسے دین کی سمجھ کبھی حاصل نہیں ہوگی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہر امت کا کوئی فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔ یہ مال میں تباہ ہوگی۔ اور ہر امت کا کوئی خاص اخلاق ہوتا ہے۔ اور میری امت کا خاص اخلاق حیا ہے۔ جب تک الی کے اندر حیا موجود رہے گی، یہ بالکل ٹھیک رہیں گے جب حیا کا خلق ضائع ہو گیا، خرابی آجائے گی۔ بے حیائی پیدا ہو جائے گی۔“

حضور علیہ السلام
قرب کا مدار اچھے
اخلاق پر ہے

امت محمدیہ کا
فتنہ مال ہے

اخلاق محمدی کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ربانی ہے، فَتَنْبِصُوا وَبَصُرُوا یعنی آپ

مفتون کو

بھی غشریب دیکھ لیں گے اور یہ معترضین بھی دیکھ لیں گے بِأَيِّكُمْ الْمُفْتُونُ کہ تم میں سے کون فتنے میں ڈالا گیا ہے۔ یہ خود پاگل ہیں جو ایسی باتیں کرتے ہیں حالانکہ ان

رَبِّكَ هُوَ اعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ تیرا رب خوب جانتا ہے۔ جو اس کے راستے سے ہٹ گیا ہے۔ وَهُوَ اعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ اور وہ خوب جانتا

سے ان لوگوں کو بھی جو ہدایت کے راستے پر چل رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔ آپ
 ان لوگوں کے اعتراض سے نہ گھبرائیں۔
 آگے مزید تسلی اور بہت سی باتیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہیں۔

فَلَا تَطْعَمُ الْمُكْذِبِينَ ۝ ۸ وَذُوقُوا الْعَذَابَ فِي دُحْنُونَ ۝ ۹ وَلَا تَطْعَمُ كُلَّ حَلَاظٍ مَّهِينٍ ۝ ۱۰ هَآؤُنَا مَشَآءُ بَنِيهِمْ ۝ ۱۱ مَنَآعٌ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝ ۱۲ عُسْلِمَ بَعْدَ ذَلِكَ فَنِيهِمْ ۝ ۱۳ اِنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۝ ۱۴ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيرُ الْاَوَّلٰیْنَ ۝ ۱۵ سَنَسِفُهُ عَلٰی الْخُرُطُوْمِ ۝ ۱۶

پس آپ ان مکذبین کی بات تسلیم نہ کریں ۸ یہ چاہتے ہیں کہ آپ (پسے) بخش میں (ڈھیلے ہو جائیں تو وہ بھی ڈھیلے ہو جائیں ۹ اور (بات بات پر) جھوٹی قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کا کہنا نہ مانیں ۱۰ طعنہ دینے والا پھغلیاں کرنا ۱۱ نیکی کے کاموں سے روکنے والا تعدی کرنا ۱۲ اگنا ۱۳ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مال اور بیٹے دے سکھے ہیں؟ ۱۴ جب اس پر ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ پڑانے زمانے کے قصے کہانیاں ہیں ۱۵ عنقریب ہم اس کی سوند پر داغ لگائیں گے ۱۶

جب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت اور رسالت عطا فرمائی اور آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے وضو کرنا شروع کیا، نماز پڑھنا شروع کیا، تو مکہ کے مشرک سرداروں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ العیاذ باللہ یہ لوگ مجنون ہو گئے ہیں، پاگلوں کی سی حرکتیں کرتے ہیں۔ ان مشرکین میں لید بن مغیرہ، ابو جہل، احنس بن شریح وغیرہ زیادہ پیش پیش تھے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مجنون کا لفظ استعمال کرتے تھے کہ انکے دماغ ٹھکانے نہیں ہے، عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں۔

شروع سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اس الزام کا جواب دیا اور ثابت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے فضل و احسان سے دیوانے نہیں ہیں۔ بلکہ آپ تو بلند سے بلند اخلاق پر ہیں۔ اور صفحہ بات سمجھا دی کہ دیوانے اور مجنون حضرات کی حرکات اور ان کے کام مشوش ہوتے ہیں۔

گذشتہ سے پیوستہ
(ربط)

اور حضور نبی کریمؐ تو لوگوں کے سامنے علم، حکمت اور معرفت کی بلند ترین باتیں پیش کر رہے ہیں۔ ایسی باتیں جن کا مقابلہ کرنے سے انسان عاجز رہے۔ آپؐ کا اخلاق بھی بہت عالی ہے تو ایسے شخص کو دیوانہ کہنا انتہائی تعصب کو ظاہر کرتا ہے۔

مشرکین کی
پیش کش

نبی علیہ السلام کو اپنے مشن سے ہٹانے کے لیے کئی پیش کشیں کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ اگر آپؐ پسند کریں تو ہم آپؐ کے لیے اچھی سے اچھی اور حسین سے حسین عورت پیش کر سکتے ہیں۔ اگر آپؐ مال و دولت کے خواہشمند ہوں، تو مال مہیا کر سکتے ہیں۔ اگر آپؐ عمدہ خوراک اور عمدہ لباس پسند فرمائیں، تو یہ سب چیزیں پیش کر سکتے ہیں۔ اگر آپؐ سردار بننا پسند کریں تو ہم سب آپؐ کے بھائی بن جائیں، آپؐ کے خاندان کے لوگ ہیں، ہم آپؐ کو اپنا سردار تسلیم کرتے کو تیار ہیں، بشرطیکہ آپؐ اپنے مشن سے ہٹ جائیں۔ آپؐ بیشک اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں، ہم اس میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ بات صرف اتنی ہے۔ کہ جن معبودوں کی ہم عبادت کرتے ہیں، آپؐ ان کو بڑا بھلا نہ کہیں، ہمیں ان کی عبادت سے نڈر روکیں، ہمارا مطالبہ صرف اتنا ہے اور اس کے بدلے ہم آپؐ کو تمام مراعات دینے کو تیار ہیں۔

مداہنت حرام ہے

مشرکین کے مذکورہ بے ہودہ خیالات اور فضول پیش کش کے جواب میں یہ آیات نازل فرمائیں ارشاد ہوا، فَلَا تَقْطِعِ السُّكَّارَ بَيْنَ يَدَيْهِ یعنی آپؐ ان مکذبین کی بات کو تسلیم نہ کریں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قیامت اور رسالت کو جھٹلانے والے ہیں، ان کی بات نہ مانیں، کیونکہ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ یہ چاہتے ہیں کہ آپؐ اپنے مشن میں ڈھیلے ہو جائیں تو وہ بھی ڈھیلے ہو جائیں گے۔ یہ لوگ آپؐ سے مداہنت چاہتے ہیں۔ جو کہ قطعی حرام ہے۔ لہذا آپؐ ان کی بات نہ مانیں۔

حسن اخلاق اور
مداہنت میں فرق

حسن اخلاق اور مدارات الگ چیز ہے، جبکہ مداہنت الگ۔ اول الذکر بہت اچھی چیز ہے اور مؤخر الذکر حرام ہے۔ حسن اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہر موافق اور مخالفت کے ساتھ مدارات اور حسن اخلاق کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے فرمایا خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ یعنی لوگوں سے اچھے اخلاق کے ساتھ میل جول رکھو۔ تو گویا مدارات اور حسن اخلاق مطلوب ہے اور اس پر کامیابی کا مدار ہے۔ قیامت کے روز حسن اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہ ہوگی۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اقْرَبُكُمْ إِلَيَّ أَحْسَنُكُمْ اخْلَاقًا قیامت والے دن میرے قریب وہ لوگ ہوں گے، جن کے اخلاق اچھے ہیں۔ یہاں پر آپؐ کو

صاف فرمادیا کہ مکذبین کی بات نہ مانیں۔ یہ آپ کو ورغلانا چاہتے ہیں۔ — مشن سے ہٹنا چاہتے ہیں۔ مدامہنت پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں جو کہ حرام ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت کر دی کہ مدامہنت دین کے حقوق میں ہوتی ہے۔ جبکہ حسن اخلاق انسان کے اپنے حقوق سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص دوسرے کی عزت نہیں کرتا، اکرام نہیں کرتا تو یہ درگزر کیا جاسکتا ہے۔ کہ اس کا تعلق انسان کے اپنے حقوق سے ہے۔ برخلاف اس کے کہ اگر کوئی شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے روکنا چاہتا ہے، تو یہ دین کا معاملہ ہے اور یہی مدامہنت ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ کسی نے مارا، بڑا بھلا کہا، گالی دی، ملامت کی، آپ نے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ یہ بھی آتا ہے کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا سوائے جہاد کے کہ امیہ بن خلف کو اس کی گردن پر نیزہ مارا تھا جس سے اس کی موت واقع ہوئی اور نہ آپ نے اپنی کسی بیوی کو، کسی خادم کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ اور اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ یہ آپ کا حسن اخلاق ہے ہاں اگر دین کے معاملہ میں کوئی شخص خلل انداز ہوتا تھا۔ تو آپ ناراض ہو جاتے تھے۔ اور ایسے ناراض ہوتے تھے۔ کہ آپ کے غصے کے سامنے کوئی چیز نہ ٹھہر سکتی تھی۔ جب تک کہ اس چیز کو پورا نہ کر دیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی حرمتوں میں سے کسی چیز کی بے ادبی ہو رہی ہے، یا شریعت اور دین کے خلاف کوئی بات ہو رہی ہے، تو آپ سخت غصے میں ہوتے تھے۔ تو گویا حسن اخلاق اور مدامہنت میں یہی فرق ہے۔

تو فرمایا کہ یہ لوگ چاہتے ہیں۔ کہ آپ مشرکین کے شرک اور ان کے معبودان باطلہ کا رد نہ کریں، یہی تو مدامہنت ہے۔ جو کہ حرام ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو گا بلکہ لوگوں کو بتایا جائے گا کہ شرک قبیح چیز ہے، اس سے بچو۔ صرف اللہ کی عبادت کرو، اس کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ بناؤ۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں اور یہ اپنے معبودان باطلہ کی۔ اور ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ نہیں یہ سوئے بازی نہیں ہو سکتی یہ دین کا معاملہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پورا پورا حق ادا کیا جائے گا۔ اس معاملہ میں وَلَا تَطْعَمُ السُّكَّانُ

دین کے معاملہ میں
سوئے بازی نہیں
ہو سکتی

یعنی اے نبی علیہ السلام ان مکذبین کی بات ہرگز نہ مانیں۔ منکرات کے خلاف سینہ سپر ہیں۔

یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ کوئی کہے کہ بدعات اور دیگر برائیوں سے نہ روکو، جیسے کوئی کرتا ہے کرنے دو۔ کوئی سینما دیکھتا ہے، دیکھنے دو، کوئی جوار کھیتا ہے، کھیلنے دو، کسی کو کچھ نہ کہو نہیں یہ درست نہیں ہے، منکرات منہیات اور ممنوعات کے خلاف آواز اٹھانا ضروری ہے۔ اسی طرح اچھی باتوں کی طرف رغبت دلانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ مدامت ہوگی، جو کہ دین میں حرام ہے۔

مجنوں کہنے والے
کی مذمت

ولید بن مغیرہ جس نے نبی علیہ السلام کو مجنوں کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس ایک لفظ کے بدلے دس الفاظ سے اس کی مذمت بیان کی۔ حدیث شریف میں آتا ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص مجھ پر ایک دفعہ درود پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس دفعہ رحمت نازل فرماتا ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے جس شخص نے حضور کو ایک لفظ مجنوں کا خطاب دیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت میں دس الفاظ استعمال کئے۔

جھوٹی قسمیں کھانے
والا اور ذلیل

فرمایا وَلَا تَطْعُ كُلَّ حَلْفٍ مِّمَّيْنِ یعنی بات بات پر جھوٹی قسمیں کھانے والے اور ذلیل شخص کا کہنا نہ مانیں۔ زیادہ قسمیں اٹھانا ویسے بھی مکروہ ہے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اگر قسم کھانا ضروری ہی ہو تو اللہ کے نام کی قسم کھانا چاہیے ”وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ“ یعنی خدا کے نام کو اپنی قسموں کا نشانہ ہی نہ بنا رکھو۔ یہ بھی قبیح فعل ہے۔ ہاں جب بعض حالات میں انسان مجبور ہو جاتا ہے، گواہ موجود نہیں ہوتا اور دوسرے کو یقین دلانے کے لیے قسم اٹھانا ہی پڑے تو اللہ کے نام کی ہی اٹھانا چاہیے۔ تو فرمایا یہ شخص حلاف ہے یعنی جھوٹی قسمیں کھاتا ہے اور اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے مہینین یعنی ذلیل بھی ہے۔

طعنہ باز، عیب جو
اور پھیل خور

یہ شخص ہمائین یعنی طعنہ دینے والا ہے، ہمز کے معنی توڑنا اور طعنہ دینا جیسے ”وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ“ ہماز طعنہ دینے والا اور لماز عیب جوئی کرنے والا۔ طعنہ بھی کسی کو نہیں دینا چاہیے۔ یہ بھی ممنوع ہے اور مَشَاءُ كِبْنَسِيْمٍ یعنی چغلیاں کرتا ہے۔ نیمہ کے معنی چغلی کھانا ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا تاکہ آپس میں جھگڑا ہو۔ اس کو قات بھی فرمایا لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاتًا یعنی چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ فساد برپا کرنے کے لیے بات ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دو قبر والوں کا حال حضور علیہ السلام پر منکشف فرمایا۔ آپ نے فرمایا ان کو سزا ہو رہی ہے۔ ان میں سے ایک آدمی پیشاب سے نہیں بچتا تھا۔ خواہ کپڑوں پر پھینکے پڑ جائیں یا جسم پر مگر یہ پروا نہیں کرتا تھا۔ اس جرم میں سزا ہو رہی ہے۔ اور دوسرا شخص چغلی کیا کرتا تھا۔ ان دونوں عیبوں سے بچنا ضروری ہے۔ انسان چغلی سے بچ سکتا ہے۔ اور پیشاب کی نجاست سے بھی محتاط رہ سکتا ہے، کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

اس شخص کی دوسری صفات یہ بیان فرمائیں کہ یہ مَنَاعٌ لِّلْخَيْرِ یعنی نیکی کے کاموں سے روکتا ہے اور مُعْتَدٍ یعنی تعدی کرتا ہے لوگوں کے حق ضائع کرتا ہے نیز اِثِمٌ یعنی گنہگار ہے۔ شراب بھی پی لی اور کاری بھی کر لی۔ اور جو کچھ بھی آیا کرتا چلا گیا۔

نیکی سے روکنے والا
اور تعدی کرنے والا
گنہگار

یہ شخص عُتْلٌ یعنی اکڑ والا بھی ہے۔ مغرور ہے۔ بَعْدُ ذَٰلِكَ زَيْنٌ اور مستم بھی ہے نسل کے اعتبار سے بھی اس پر اتہام ہے۔ کہ صحیح النسل نہیں ہے۔

اکڑوں اور مستم

آگے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص اس لیے اکڑ دکھاتا ہے کہ اِنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِيْنٍ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مال اور بیٹے دے رکھے ہیں۔ اس کے دس بیٹے تھے۔ ان میں سے تین نے اسلام قبول کیا، خالد بن ولید، اور ہشام جب یہ مجلس میں آتے تھے بڑی رونق ہوتی تھی۔ دس جوان بیٹے اور مال کی فراوانی تھی۔ مال تجارت میں لگا ہوا تھا۔ ایک لاکھ اشرفیاں تجارت میں لگی ہوئی تھیں۔ جانوروں میں اونٹ اور بکریاں بھی بہت تھیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے انعامات فرمائے تو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ مگر یہ شخص الٹا اکڑ دکھاتا تھا۔

مال اور اولاد پر فخر

اس شخص کی ایک مزید صفت یہ بیان کی کہ اِذَا تُلِّيَ عَلَيْهِ اٰيَاتُنَا جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، قال اساطیر الاولین تو کہتا ہے یہ پرانے زمانے کے قصے کہانیاں ہیں۔ کبھی کہتا تھا کہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں پرانے زمانے کے عاد اور ثمود کی کہانیاں سناتا ہے۔

پہلے لوگوں کی
کہانیاں

اؤ میں تمہیں بہمن و اسفندیار کے قصے سنائوں۔ جیسے بہمن اور اسفندیار کے قصے مشہور ہیں یعنی ایہ اینوں کے قصے۔ اسطورہ یونانی لفظ ہے۔ عربی میں بطور جمع اساطیر استعمال ہوا۔ قصے کہانیاں، جسے انگریزی میں سٹوری (STORY) کہتے ہیں۔

اس دشمنِ دین کی تمام تر مذمت بیان کرنے کے بعد سزا کے طور پر فرمایا سَنَسِمُهُ عَلَى
الْحَرْطِ ہم اس کی سونٹھ پر داغ لگائیں گے۔ یہ اونچی ناک یعنی سونٹھ والا اور بڑا باعزت بنا
 پھرتا ہے۔ ہم اس کو ذلیل و خوار کر دیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے مفسرین بیان
 فرماتے ہیں کہ میدانِ بدر میں انصار کے ایک شخص نے اس کی ناک پر زخم لگایا تھا۔ یہ بچ کر بھاگ
 نکلا۔ واپس مکہ میں آکر علاج کرتا رہا۔ زخم ٹھیک نہیں ہوتا تھا۔ آکلہ بن گیا۔ جیسا غانِ عزائم
 (JANGRIN) ہوتا ہے۔ اور پھر اسی تکلیف سے مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو خرطوم یعنی ہاتھی
 سے تشبیہ دی۔ خرطوم کا اطلاق خنزیر پر بھی ہوتا ہے تو اس شخص کا یہ انجام ہوا۔

دشم
 وا

اِنَّا بَلَوْنَهُمْ كَمَا بَلَوْنَا اَصْحَابَ الْجَنَّةِ ۚ اِذَا قُسِمُوا لِيَصْرُمْنَهَا
 مُصْبِحِينَ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسْتَشْنُونَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّنْ
 رَبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿۱۹﴾ فَاصْبَحْتُ كَالْصَّرِيمِ ﴿۲۰﴾ فَتَنَادَوْا
 مُصْبِحِينَ ﴿۲۱﴾ اِنْ اَعْدُوْا عَلٰی حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَارِمِينَ
 ﴿۲۲﴾ فَانْطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَفَتُونَ ﴿۲۳﴾ اِنْ لَا يَدُخُلُهَا الْيَوْمَ
 عَلَيْكُمْ مَّسْكِينٌ ﴿۲۴﴾ وَغَدُوْا عَلٰی حَرْدٍ قَادِرِينَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا
 رَاَوْهَا قَالُوْا اِنَّا لَضَالُّونَ ﴿۲۶﴾ بَلْ نَحْنُ مُحْرَقُونَ ﴿۲۷﴾ فَتَالَ
 اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْ اَنْتُمْ سَابِقُونَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَا
 اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ يَّتَلَوْنَهُ
 ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰی رَبُّنَا اَنْ يُبَدِّلَنَا
 خَيْرًا مِّنْهَا اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا رَاغِبُونَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَئِنَّ
 الْاٰخِرَةَ اَكْبَرُ مِنْ الْاَوَّلٰتِ ۚ اَلَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۳﴾

وقت لازم

۳۳

ترجمہ: بیشک ہم نے ان کو آزمایا ہے، جیسے ہم نے باغ والوں کو آزمایا۔

جب انہوں نے قسم اٹھائی کہ ضرور باغ کے پھل کو علی الصبح کاٹیں گے ﴿۱۷﴾ اور

انہوں نے انشاء اللہ بھی نہ کہا ﴿۱۸﴾ پس پھر گیا اس باغ پر پھر نے والا تیرے

رب کی طرف سے اور وہ سوئے ہوئے تھے ﴿۱۹﴾ صبح تک ایسا ہو گیا جیسے

کٹی ہوئی فصل ہو ﴿۲۰﴾ پس وہ صبح سویرے ایک دوسرے کو آوازیں دینے

لگے ﴿۲۱﴾ کہ سویرے چلو اپنی کھیتی کی طرف چلیں اگر تمہیں پھل توڑنا ہے ﴿۲۲﴾

پس وہ چلے آپس میں چپکے چپکے کہتے تھے ﴿۲۳﴾ کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس نہ آنے

پائے ﴿۲۴﴾ وہ صبح سویرے چلے کہ (بزع غم خویش) نہ دینے پر قادر ہیں ﴿۲۵﴾ پس جب

انہوں نے (موقع پر پہنچ کر) اس کو دیکھا تو کہنے لگے ہم راستہ بھول گئے ہیں ﴿۲۶﴾

بلکہ ہم محروم ہو گئے ﴿۲۷﴾ منجملے بھائی نے کہا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ

کی تسبیح کیوں نہیں کرتے (۲۸) پکار اٹھے ہمارا رب بیشک ہم ہی تھے ظالم (۲۹) پھر متوجہ ہوئے، بعض بعض پر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے (۳۰) ساتھ یہ بھی کہنے لگے، افسوس! بیشک ہم ہی سرکشی کرنے والے ہیں (۳۱) امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب اب ہمارے لیے اس سے بہتر باغ تبدیل کر دے گا۔ کیونکہ ہم اپنے رب کی طرف راغب ہوتے ہیں (۳۲) سزا اسی طرح ہوا کرتی ہے، اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے اگر یہ لوگ سمجھ جاتے (۳۳)

گزشتہ سے پیوستہ

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان انعامات کا ذکر فرمایا، جو پیغمبر علیہ السلام پر کئے اور توحید الہی، رسالت اور معاد کے مکتبہ میں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ان کی کسی بات کو تسلیم نہ کریں کیونکہ ان بے ہودہ لوگوں نے نبی جیسے عقل مند، ذہین اور سب سے بلند اخلاق والی ہستی کو العبادہ باللہ مجنون کا خطاب دیا۔ یہ مشرکین آپ کو مدائمت پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی دس الفاظ کے ساتھ مذمت بیان کی۔ پھر فرمایا کہ یہ بے غرور و تکبر کہتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے مال و اولاد سے نوازا ہے۔ یہ انعامات تو شکر گزاری کا سبب بننا چاہئیں نہ کہ تکذیب و نافرمانی کا۔ ان کے غرور کا حال بیان فرماتے ہوئے کہا کہ جب ان کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں، ان میں کیا دھڑا ہے، یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ستر کے طور پر فرمایا کہ ہم ایسے لوگوں کو ذلیل کریں گے۔ ان کی ناک پر ذلت کا نشان لگا دیں گے۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے جھوٹی قسمیں کھانے والے، ذلیل، عجیب جو، چغل خور، نیکی سے روکتے والے، حد سے بڑھنے والے، پاپی اور متکبر جیسے برے الفاظ سے یاد کیا، اور فرمایا کہ یہ صحیح النسب بھی نہیں ہیں، ان پر یہ انعامات کیوں کئے۔ مال و دولت اور اولاد کی نعمت سے مالا مال کیوں کیا۔ یہ تو اس اچھے سلوک کے لائق نہ تھے، پھر ان کو ریاست اور سرداری کیوں عطا کی۔

مال کی فراوانی مقبولیت کی علامت نہیں

اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ اِنَّا بَلَوْنَهُمْ یعنی ہم نے ان کو محض آزمایا ہے۔ مال و اولاد کی فراوانی ان کی محبوبیت اور مقبولیت کی علامت ہرگز نہیں ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبولیت اور محبوبیت کی نشانی ایمان اور اعمال صالحہ ہیں نہ کہ مال و دولت۔ اکثر و بیشتر انبیائے کرام کے حالات دنیا میں کیسے رہے۔ کیا ان کے پاس مال و دولت

مال و اولاد ذریعہ آزمائش ہیں

یا حضرات کی فراوانی تھی؛ بیشک بعض کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اور خلافت بھی عطا کی، مگر اکثریت کی دنیوی حالت کمزور ہی رہی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب اور محبوب رسول اور نبی ہیں اور پھر ان کے ساتھ ملنے والے لوگ۔

تو یہ مال و دولت اور جاہ و جلال ان کے اچھا ہونے کی علامت نہیں بلکہ یہ اقتدار اور ریاست اور نعمتیں محض امتحان کے لیے ہیں۔ ان کی آزمائش کا ذریعہ ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ ہم نے یہ مال و دولت ان لوگوں کو دے کر اُسی طرح آزمائش میں مبتلا کیا ہے کَمَا بَلَدْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ جیسے ہم نے باغ والوں کو آزمایا۔ جنت کا معنی بہشت بھی ہے جو اہل ایمان کو آخرت میں نصیب ہوگی، ویسے جنت کا عام معنی باغ ہے یہاں پر جنت سے مراد دنیوی باغ ہے۔ جس باغ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ان باغ والوں کو آزمایا تھا۔

باغ والوں
کی مثال

یہ باغ کہاں تھا۔ اس ضمن میں مفسرین کرام کی مختلف رائیں ہیں۔ حضور علیہ السلام کے ارشاد گرامی میں کوئی صحیح اور مرفوع روایت موجود نہیں ہے۔ زیادہ مشہور یہ ہے کہ حبشہ میں تھا، یا مین کے مرکز می شہر صنعاء سے چند میل کے فاصلے پر یہ باغ وادی ضروان میں تھا۔

باغ کا مالک مومن اور ایماندار آدمی تھا۔ باغ کی پیداوار میں سے اپنی ضروریات کے علاوہ غریب پروری بھی کرتا تھا۔ چنانچہ فصل کی کٹائی کے موقع پر غراب اور مساکین جمع ہو جاتے تھے۔ اور باغ کا مالک انہیں کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرتا تھا۔ اسی طرح جب کھلیاں تیار ہوتا تھا۔ تو اس کے ناپنے کے موقع پر بھی مستحقین کو ان کا حصہ دیتا تھا پھر جب آٹا پسوا کر روٹی تیار ہوتی تھی، جب بھی وہ مساکین کا حق ادا کرتا تھا۔

باغ کے مالک
کی فیاضی

حضرت جعفر طیارؓ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ ایسا کوئی سوار کسی سواری پر سوار نہیں ہوا، اور کسی نے جوتا نہیں سلوایا،

اور ہینا، جو حضورؐ کے بعد حضرت جعفرؓ کے برابر ہو۔ وجہ یہ ہے کہ آپ بڑے مسکین پر در تھے۔ اول تو یہ کہ غراب اور مساکین کے پاس خود بیٹھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ کبھی سواری پر سوار نہیں ہوتے تھے، جب تک کوئی مسکین بھی سوار نہ ہو۔ اسی طرح جب اپنے لیے جوتا بنواتے تھے تو کسی غریب کے لیے بھی تیار کر داتے تھے۔ آپ اُس وقت تک جوتا نہیں پہنتے تھے، جب تک کسی مسکین کو بھی

ساتھ شریک نہ کر لیں۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے آپ کا لقب ابوالمساکین رکھ دیا تھا۔ مسکینوں کا باپ یعنی بڑا شفیق۔ یہ حضور کے چچا زاد یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی تھے۔ جنگ موتہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ ان کے متعلق حضور نے فرمایا کہ میں نے بہشت میں دیکھا کہ جعفر بن فرشتوں کے ہمراہ پروں کے ساتھ پرواز کر رہا ہے۔ آپ کے دونوں بازو جنگ موتہ میں کٹ گئے تھے مگر اس کے باوجود آپ نے جھنڈا دانتوں کے ساتھ تھامے رکھا۔ حضور نے آپ کا نام جعفر طیار رکھ دیا۔

باغ والے کے بیٹوں کا بخل

جیسا کہ مذکور ہے باغ کا مالک سلمان مومن اور غریب پرور تھا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ بعض روایات میں تین کا ذکر آتا ہے۔ یہ بیٹے باپ کی طرح فیاض نہیں تھے۔ جب باپ فوت ہو گیا اور باغ بیٹوں کی ملکیت میں آ گیا تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمارا باپ تو ہر موقع پر غریب اور مساکین کو دے دیتا تھا جس کی وجہ سے ————— ہماری بہت سی آمدنی چلی جاتی تھی۔ ہمارا باپ کوئی عقلمند آدمی نہ تھا جو اپنی آمدن کو اس طرح ضائع کرتا تھا۔ ہم بال بچے دار ہیں، ہمیں اپنی ضرورت کے لیے سب کچھ خود رکھ لینا چاہیے۔ کسی غریب مسکین کو دینے کی ضرورت نہیں۔ مگر وہاں کا رواج اور دستور یہ تھا کہ پھل توڑنے کے وقت، فصل کی کٹائی کے وقت اور گسائی وغیرہ کے موقع پر مساکین وہاں پہنچ جاتے تھے تو کھیت کا مالک کسی کو مالوس نہیں کرتا تھا۔

بیٹوں کا منصوبہ

اپنی فصل کو غریب اور مساکین میں تقسیم سے بچانے کے لیے بیٹوں نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ پھل ایسے وقت اتارا جائے جس وقت کسی کو پتہ نہ چلے۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ صبح بہت سویرے جا کر پھل اتارنا چاہیے جب کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ نہ کسی کو معلوم ہوگا۔ نہ کوئی موقع پر پہنچے گا اور نہ ہمیں کسی کو کچھ دینا پڑے گا۔

پانچ بھائیوں میں سے درمیانے بھائی کی رائے مختلف تھی۔ وہ کہتا تھا کہ مساکین کا حق نہ ملدو، ان کا حق انہیں ملنا چاہیے۔ مگر دوسرے بھائی اُسے ڈانٹ پلا کر خاموش کر دیتے تھے۔ اور وہ بیچارہ بھی مجبوراً ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے یہی مثال مکے والوں کی بیان کی کہ جس طرح باغ والے کے بیٹے تھے اسی طرح مکے والے بھی نافرمان ہو گئے۔

الغرض انہوں نے اِذَا قَسَمُوا قَسَمًا لَّيْسَ مِنْهَا مَصِيبٌ لِّأَحَدٍ كَرِهَ اللَّهُ لَهَا

علی الصبح کاٹیں گے۔ تاکہ اس وقت کوئی غریب مسکین وہاں موجود نہ ہو۔

یہ فیصلہ کرتے وقت وَلَا يَسْتَشْنُونَ انہوں نے انشاء اللہ بھی نہ کہا۔ حالانکہ کسی کام کا ارادہ کرنے وقت اگر ساتھ انشاء اللہ کہہ جایا جائے تو کام کے پایہ تکمیل تک نہ پہنچنے کی صورت میں بھی آدمی گنہگار نہیں ہوگا۔ کیونکہ انشاء اللہ کہنے سے اس کام کو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر چھوڑ دیا گیا۔ اس طرح نہ تو آدمی جھوٹا ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی قسم اٹھانے کی صورتیں حانت (قسم کو توڑنے والا) ہوتا ہے یہ کلمہ کہنے والا وعدہ خلاف بھی نہیں ہوتا۔ الغرض انشاء اللہ کہہ کر اپنا کام کو اللہ تعالیٰ کو سونپنے والی بات ہے اور ایمان کی نشانی ہے۔

انشاء اللہ
کی اہمیت

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ يَسْتَشْنُونَ کا معنی انشاء اللہ نہیں بلکہ اس سے مراد استثنیٰ کرنا ہے۔ مثلاً غریبوں کا حق مستثنیٰ کر دیا جائے الگ کر کے ان کو دے دیا جائے۔ مگر انہوں نے تو ارادہ کیا وَلَا يَسْتَشْنُونَ کہ غریبوں کو ہرگز نہیں دیں گے۔ اگر باپ دیتا تھا تو اب ہم کسی کو نہیں دیں گے۔ پھل کا ایک ایک دانہ خود کاٹیں گے۔

غریبوں کی
حق تلفی

اُدھر وہ اپنا منصوبہ بنا رہے تھے اور ہوا یہ کہ فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ پس پھر گیا اس باغ پر پھرنے والا مِنْ رَبِّكَ تِرْءِی رب کی طرف سے وہ وَهُمْ نَائِمُونَ اور وہ تو گھروں میں سوئے ہوئے تھے۔ یعنی بیٹے تو رات کو منصوبہ بنا کر سو گئے کہ صبح سویرے اٹھ کر پھل توڑ لیں گے مگر راتوں رات عذاب الہی پہنچ گیا اس حالت میں کہ وہ ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔

عذاب الہی

عذاب الہی کس صورت میں نازل ہوا مفسرین کرام دو روایتیں بیان کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ راتوں رات ڈاکو آئے اور پکا پکایا پھل توڑ کر لے گئے اور درختوں کو کاٹ دیا اور جلا دیا۔ اور باقی کوئی چیز نہ رہنے دی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ کوئی آسمانی آفت نازل ہوئی جس نے سارے باغ کو جلا کر خاکستر کر دیا، نہ کوئی درخت رہا نہ پھل، اناج کا ایک دانہ تک باقی نہ بچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فَاصْبَحَتْ كَالصَّیْبِ صبح تک ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔ سارا باغ ایسا ہو گیا جیسا کہ گھاس کاٹ دی گئی ہو اور ساری جگہ ویران ہو گئی۔

ادھر باغ کی حالت تو راتوں رات یہ ہو گئی اور دوسری طرف فَتَنَادُوا مُصْبِحِينَ بیٹے صبح سویرے اٹھ کر ایک دوسرے کو آوازیں مینے لگے، إِنْ اَعْدُوْا عَلٰی حَرْثِكُمْ

چلو اپنی کھیتی کی طرف چلیں، اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ اگر تمہیں چل توڑنا ہے۔ فَاَنْطَلِقُوا وَهُمْ يَخَافُونَ۔ پس وہ چپکے چپکے سے چل دیے۔ اَنْ لَا يَدْخُلَهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مَسْكِينٌ تاکہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس نہ آنے پائے۔ اور نہ کسی کو کچھ دینا پڑے۔

بیٹوں کی محرومی

وَعَدُوا عَلَىٰ حَرْدٍ قَدَرِينَ۔ عَلَىٰ حَرْدٍ کے دو معنی ہو سکتے ہیں یعنی تیز تیز چلنا اور منع کرنا، روک دینا۔ تو اس مقام پر دونوں معانی لگ سکتے ہیں۔ یعنی وہ صبح سویرے تیز تیز چلے یا وہ اس ارادہ سے چلے کہ کسی کو کچھ نہیں دینا ہے۔ نیز وہ سمجھتے تھے کہ وہ قَدَرِينَ ہیں۔ یعنی وہ اس بات پر قادر ہیں کہ پروگرام کے مطابق صبح سویرے جا کر چل توڑ سکیں گے۔ اور کسی غریب مسکین کو کچھ نہیں دیں گے۔

فَلَمَّا رَاَوْهَا پس جب انہوں نے موقع پر پہنچ کر دیکھا، تو سمجھے قَالُوا اِنَّا لَضَالُّونَ کہ ہم تو راستہ بھول گئے ہیں۔ یہ ہمارا باغ تو نہیں ہے، ہم کسی اور جگہ آگئے ہیں۔ کیونکہ وہاں پر تو اُن کے باغ کی کوئی چیز باقی نہ رہی تھی۔ پھر جب انہوں نے اچھی طرح غور کیا اور معلوم ہو گیا کہ ہم راستہ نہیں بھولے بلکہ اپنے ہی باغ میں آئے ہیں۔ تو پکار لٹھے بِلَا نَحْنُ مُحْرَمُونَ ہم محروم ہو گئے، ہماری قسمت پھوٹ گئی، ہمارا تو باغ ہی تباہ ہو گیا ہے۔

جب اُن کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنے باغ سے محروم ہو گئے ہیں، تو قال اَوْسَطُهُمْ درمیانے یا منجھلے بھائی نے کہا اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَّ کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم اللہ کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔ تم نے تو انشاء اللہ بھی نہ کہا۔ اور خدا تعالیٰ کی مشیت پر نہ چھوڑا نتیجہ یہ ہوا کہ تم باغ سے بالکل محروم ہو گئے۔ اگر مساکین کا حق ادا کرتے تو ایسا نہ ہوتا۔

درمیانے بھائی
کی افضلیت

ان بھائیوں میں سے صحیح مشورہ سننے والا درمیانے بھائی تھا۔ اُس نے پہلے بھی کہا تھا۔ کہ غریب مساکین کا حق تلف نہ کرو، مگر دوسرے بھائیوں نے اُسے ڈانٹ پلا کر اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ تو گویا اُن سب میں سے درمیانے بھائی افضل تھا کہ خَيْرُ الْأُمُورِ اَوْسَطُهَا یعنی درمیانے چیز بہتر ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام کی امت کو اُمَّةٌ وَسَطًا کہا گیا یعنی یہ امت باقی امتوں سے افضل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرخانی اور تنگی
رزق پر قادر ہے

رزق کی فرخی اور تنگی اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ چاہے تو کسی کو بے حد شمار

عطا کر دے، اور چاہے تو تنگی مسلط کر دے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ امام مہدی کا ظہور ہو گا تو ایسا دور بھی آئے گا کہ صدقہ قبول کرنے والا کوئی نہیں ملے گا۔ اس قدر مال کی فراوانی ہوگی۔ زمین سونا اگلے گی، مگر کوئی لینے والا نہیں ہوگا۔ صدقہ دینے والا جا کر کہے گا کہ ابھی یہ زکوٰۃ یا صدقہ ہے، اسے قبول کر لو۔ آگے سے جواب آئے گا، اگر کل لے آتے تو میں قبول کر لیتا کل تک میں محتاج تھا، مگر آج مجھے ضرورت نہیں ہے۔ مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو رزق میں ایسی فراخی پیدا کر سکتا ہے۔

مگر یہ قانون قدرت ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں سب کو ایک جیسا نہیں رکھتا۔ ”رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ“ یعنی اللہ نے بعض کو بعض پر فوقیت دی۔ کسی کو مال دے کہ از مالش میں مثال دیا۔ مال عطا کر کے حکم دیا کہ اس مال سے زکوٰۃ دو، حج کرو، صدقہ و خیرات بھی کرو۔ اس میں عزیز و اقربا کا حق بھی ہے۔ ان تمام حقوق کو پورا کرو۔ جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ مال کوئی عذاب تو نہیں ہے۔ بلکہ اچھا سامتی ہے مگر اس کے لیے لِمَنْ اَدٰی حَقَّ اللّٰهِ جو اللہ کا حق ادا کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق ادا کرنے کے بعد کوئی شخص سرمایہ دار نہیں رہ سکتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے کہ سارے حقوق ادا کرنے کے بعد دیکھیں کسی کے پاس دو درہم بھی بچتے ہیں؟

اس وقت دنیا کے بیشتر حصے پر سرمایہ داری نظام کی لعنت پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا رد عمل اشتراکیت ہے، اور وہ غیر فطری ہے۔ لہذا یہ دونوں نظام لعنتی ہیں۔ نظام سرمایہ داری کیا ہے جس طریقے سے چاہو دولت جمع کرو، اور جس طریقے سے چاہو خرچ کرو، نہ جمع کرنے پر کوئی پابندی ہے اور نہ خرچ کرنے میں۔ امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی، فرانس اور ان کے حواری ممالک میں یہی نظام رائج ہے۔ مال جمع کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ صرف لائسنس ہونا چاہیے۔ خنزیر اور شراب کی تجارت ہوتی ہے۔ لائسنس کے ذریعے زنا کا کاروبار ہوتا ہے۔ الغرض جس طرح بھی ہو سکے، دولت جمع کر لو، کوئی پابندی نہیں ہے۔ اسی طرح خرچ کرنے میں بھی آزاد ہیں، کسی بلڈنگ پر لگا دو سیٹھا بنا ڈالو، جو خانہ تیار کر لو۔ غرض کوئی بھی کام کر لو، سرمایہ داری نظام میں کوئی پابندی نہیں۔

ہاں! اسلام کا نظام معیشت ہی پاکیزہ نظام ہے۔ اسلام کہتا ہے۔ فَاجْتُلُوا فِي الطَّلَبِ

اسلام کا نظام
معیشت

یعنی روزی طلب کرنے میں اچھا راستہ اختیار کرو۔ حرام ذرائع سے روزی کھانا جائز نہیں ہے اور پھر ”مَكَارِزُ قَوْمٍ يَنْفِقُونَ“ ہم نے جو کچھ دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو۔ خرچ کی ساری باتیں درست ہیں۔ کوئی فرائض ہیں، کوئی واجب ہیں، کوئی سنت اور مستحب ہیں ان سب پر خرچ کرنا ضروری ہے۔ برخلاف اس کے ناجائز، حرام اور شتبہ جگہ پر مال خرچ کرنا منع ہے۔ مسلمان کسی حرام جگہ اور ناجائز رسوم پر دولت نہیں لٹاتا یہ حرام ہے۔ تو یہ ہے اسلام کا نظام معیشت۔

سرمایہ دارانہ نظام کی ایک بنیادی خامی یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس مال کے مالک ہم ہیں۔ جیسا کہ قارون نے کہا ”إِنَّمَا أُوْتِيتُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي“ یعنی مجھ پر کسی کا کیا احسان ہے؟ میں تو فن جانتا ہوں۔ ماہر ہوں، اس ٹیکنیک سے واقف ہوں جس کے ذریعے مال کمایا گیا ہے یہ تمام کارخانہ دار، بڑے بڑے دکاندار سب اسی ذہنیت کے مالک ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے دماغ کی کھائی ہے۔ اپنے ہنر اور کمال کا عطیہ ہے۔ من جانب اللہ نہیں ہے۔ دنیا کو چکر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سارا مال اللہ تعالیٰ نے عطا کر کے ساتھ حکم دیا ہے کہ اس میں سے خرچ بھی کرو ”وَأَتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ“ یعنی قرابت داروں، ماں باپ، بہن بھائی، رشتہ داروں کو ان کا حق ادا کرو۔ مساکین اور مسافروں کی خیر گیری کرو، نادار اور مفلس لوگوں کی مدد کرو ”وَلَا تُبْذِرْ تَبْذِيرًا“ اور فضول خرچی نہ کرو۔ مال دے کر تمہیں آزمایا گیا ہے۔ اس پر امین بنایا گیا ہے۔ مالک حقیقی تم نہیں ہو بلکہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اُس نے تمہیں حکم دیا ہے۔ ”أَحْسِنُ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ“ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دیکر تم پر احسان کیا ہے، اسی طرح تم بھی اس کے حکم کے مطابق خرچ کر کے مخلوق کے ساتھ احسان کرو۔

غریب پروری سے
مجتنب ہونا
ذیل ہوگی

مسلمان سوسائٹی میں غریب مساکین اور نادار اسی سوسائٹی کا جزو ہیں اور سوسائٹی کا فرض ہے کہ وہ ان حاجت مندوں کو اپنے پاؤں پر بٹھرا ہونے میں مدد دے۔ جو سوسائٹی اپنے نادار بھائیوں کے لیے روزگار کا بندوبست نہیں کرتی، ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کی معیشت کو سہارا نہیں دیتی، وہ باعزت سوسائٹی نہیں بلکہ لعنتی ہے ایسی سوسائٹی کو عزت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ وہ ذلیل ہو کر رہے گی۔ انہیں ذرہ احساس نہیں کہ ان کے بھائی بھوکوں مر رہے ہیں اور وہ ٹس سے مس تک نہیں ہوتے سورۃ یٰسین میں ایسی ہی مثال بیان کی گئی ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ

کے عطا کردہ رزق میں سے خرچ کرو، تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں اَلْطَّعْمُ مِّنْ لَّدُنَّا وَاللَّهُ اَطْعَمَهُ
 کیا ہم اُن لوگوں کو کھلائیں کہ اگر اللہ چاہتا تو خود اُن کو کھلا دیتا۔ فرمایا یہی حال اس سوسائٹی کا ہے
 جو محتاج کی خبر گیری نہیں کرتی۔ یہ بھی۔ کہتے کہ جب خدانے انہیں محتاج رکھا ہے تو ہم ان کی مدد
 کیوں کریں۔ فرمایا یہ جھوٹ کہتے ہیں۔ خدانے تمہیں حکم دیا ہے کہ ان پر خرچ کرو، کوئی بھوکا ننگا نہ
 ہے۔ اگر غریب و مساکین تمہارے سامنے ذلیل ہوتے رہے تو یاد رکھو، تم کو بھی عزت نصیب نہیں ہوگی،
 ساری سوسائٹی ذلیل ہو جائے گی غریبوں سے چشم پوشی برتی تو دنیا میں بھی عزت حاصل نہیں ہوگی۔

غیر مسلم اقوام کی
 غریب پروری

عیسائی ممالک میں برطانیہ کو دیکھو۔ اتنے بڑے زوال کے بعد بھی اُس کی ساکھ قائم ہے۔ برطانیہ
 میں کوئی شخص بے روزگار نہیں ہے حکومت ہر شخص کے روزگار کی ذمہ دار ہے اور جب تک کسی
 کو روزگار نہیں ملتا، حکومت اُسے گزارہ الاؤنس دیتی ہے۔ کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو اس کا فری علاج
 کرتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ عیسائی قومیں جلدی ترقی کرتی ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنے
 غریب و مساکین کا خیال رکھتی ہیں۔ انہوں نے طرح طرح کے طریقے اختیار کر رکھے ہیں جن سے غریب کی
 مدد کرتے ہیں۔

مسلمان قوم کی
 غفلت

برخلاف اس کے مسلمان ممالک میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہاں دولت کی کمی ہے یا وسائل
 کی کمی ہے۔ نہیں بلکہ یہاں صرف ایمان، دین اور فہم کی کمی ہے۔ مسلمان قوم کی گراؤٹ اُن کے
 گندے نظام اور جہالت کی وجہ سے ہے۔ یہ اپنے آپ کو مالک و مختار سمجھ بیٹھے ہیں یہ اپنی
 مرضی سے جس طرح چاہیں خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ رسم و رواج میں چاہے لاکھوں روپے خرچ
 کر ڈالیں مگر غریب و مساکین اور صرف کرنے کے دیگر کاموں پر دو پیسے بھی خرچ کرنے کو تیار نہیں
 الغرض جب بیٹوں کو اپنے باغ کی تباہی کا یقین ہو گیا، تو پکار اُٹھے قَالُوا سُبْحٰنَ رَبِّنَا

باغ والوں کا
 اعترافِ معصیت

اِنَّا كُنَّا ظَالِمِيْنَ پاك ہے ہمارا رب، بیشک ہم ہی ظالم ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ہم
 بہت انعام کیا تھا مگر ہم ہی ظالم ثابت ہوئے کہ اس کے عطا کردہ مال میں سے غریب کا حق ادا نہ
 کیا۔ ہم مسکینوں کا حق مارنا چاہتے تھے جبکی سزا ہمیں مل گئی۔ کیونکہ قرآن پاک میں موجود ہے۔
 ”فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ“ یعنی تمہارے مال میں سائلوں اور محروموں کا حق
 ہے۔ یہ بھی ادا کرو۔ یہ آیت قرآن پاک میں متعدد جگہ آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے مال میں

مساکین کا حق رکھا ہے۔ یہ حق ادا کرنا ان پر احسان کرنا نہیں ہے یہ مال تو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے دیا ہے۔

اعترافِ معصیت کے بعد ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے فَاقْبَلْ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَلَامُؤْنَ اور ساتھ یہ بھی کہنے لگے قَالُوا يُونُسُ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ۔ افسوس! بیشک ہم سرکشی کرنے والے ہیں۔ غربا کا حق مارنا سرکشی ہی تو ہے۔ یہ حد سے بڑھنا ہے۔ لیکن اب ہم توبہ کرتے ہیں۔ عَسَى رَبُّنَا اَنْ يُبَدِّلَ لَنَا خَيْرًا مِّنْهَا اور امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب اب ہمارے لیے بہتر باغ تبدیل کر دے گا۔ کیونکہ ہم خدا کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اِنَّا اِلَى رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ یعنی توبہ کرتے ہیں۔

باغ کا نعم البدل

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو باغ والوں کی یہ ادالپند آگئی۔ انہوں نے اعتراف کر لیا کہ ہم جھوٹے ہیں اور سرکشی سے تائب ہو گئے اور اقرار کیا کہ مالک حقیقی خدا ہی ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں باغ کا بہتر نعم البدل عطا کر دیا اور وہ اس طرح کہ اس وقت کے بادشاہ کو پتہ چلا کہ ان لوگوں کا باغ ضائع ہو گیا۔ تو اُس نے اپنا ذاتی باغ ان کو دے دیا۔ اس باغ میں کمال درجے کا پھل آتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس باغ کے انگور کی ایک بیل کے ساتھ ایک گچھا اتنا بڑا ہوتا تھا۔ جس کو ایک جانور پر لاد کر لے جاتے تھے۔ یہ تفصیل تفسیری روایات میں آتی ہے کسی مرفوع حدیث میں نہیں ہے۔

حاصل کلام

باغ والوں کی مثال بیان کر کے مکے والوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ مال و دولت پر اکر کر حضور نبی کریم کو العیاذ باللہ پاگل اور دیوانہ کا خطاب دینے والو یاد رکھو تمہارا بھی وہی حشر ہو سکتا ہے جو باغ والوں کا ہوا۔ اور ایسی صورت میں پھر کَذٰلِكَ الْعَذَابُ منہا اسی طرح ہوا کرتی ہے کہ کس طرح دنیا کا مال و دولت تباہ کر دیا گیا۔ یہ تو دنیا کا عذاب ہے، مگر آخرت میں جو عذاب ملنے والا ہے، وہ بہت بڑا ہے۔ وَكَعَذَابِ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ جو شخص اس دنیا سے کفر و شرک، توحید، رسالت اور معاد سے انکار کی لعنت لے جائیگا اُس کے لیے بہت بڑا عذاب آخرت میں ہو گا۔ فرمایا لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ اگر یہ لوگ سمجھ جائیں۔ اور بے ہودہ باتوں سے باز آجائیں۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتِ النَّعِیْمِ ۝۳۲ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ
كَالْمُجْرِمِیْنَ ۝۳۵ مَا لَكُمْ قَدْ كُفَّتُمْ عَنْ حُكْمِی ۝۳۶ اَمْ لَكُمْ كِتَابٌ
فِیْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝۳۷ اِنَّ لَكُمْ فِیْهِ لَمَّا تَخِیْرُوْنَ ۝۳۸
اَمْ لَكُمْ اٰیٰتٌ عَلٰیْنَا بِالْفَنَاءِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَمَةِ لَا اِنَّ لَكُمْ لَمَّا
تَحْكُمُوْنَ ۝۳۹ سَلِّمُوْا اَیُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِیْمٌ ۝۴۰ اَمْ لَهُمْ
شُرَكَاءُ فَلَیَّا تُوَابِعْهُمْ كَاِیْمِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ ۝۴۱

ترجمہ: بیشک متقیوں کے لیے ان کے رب کے پاس نعمتوں کے باغ ہیں ۳۲ کیا (تم خیال کرتے ہو کہ) ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے ساتھ برابر کر دیں گے؟ ۳۵ تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ ۳۶ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو ۳۷ بیشک تمہارے لیے اس کتاب میں وہی کچھ ہے جو تم چاہتے ہو ۳۸ یا (پھر کیا ایسا ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے قیام تک قسمیں اٹھا رکھی ہیں کہ تمہارے لیے وہی کچھ ہو گا جو تم فیصلہ کر دو گے ۳۹ آپ ان سے پوچھیں کہ اس کے لیے ان کا کون ذمہ دار ہے ۴۰ کیا ان کے کوئی شریک ہیں تو لائیں اپنے شریکوں کو اگر یہ

سچے ہیں ۴۱

گزشتہ آیات میں مشرکین مکہ کو تنبیہ کی گئی۔ ان کو مال و دولت، اقتدار، ریاست پر بڑا فخر تھا اللہ تعالیٰ نے ایک مثال کے ذریعہ ان کو سمجھایا کہ یہ سب چیزیں اللہ نے ان کو امتحان کی خاطر دی ہیں۔ یہ چیزیں اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پسندیدہ اور اس کے محبوب ہیں بلکہ یہ تو مکذب اور بری خصلتوں کے مالک ہیں۔ ان میں تکبر، گناہ، حدود کو توڑنا، پھلنا، قسین کھانا، حق کی مخالفت، رسالت سے انکار، اللہ کی وحدانیت سے انکار، جزائے عمل اور معاد کا انکار پایا جاتا ہے۔ تو باغ والوں کی مثال بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے سمجھایا کہ ان کو نعمتیں عطا کی گئی تھیں مگر انہوں نے ظلم اور سرکشی کی تو اللہ نے وہ نعمت چھین لی۔ ان باغ والوں کو تو توبہ کی توفیق نصیب ہو گئی اور اللہ نے انہیں بہتر نعم البدل عطا کر دیا۔ اسی طرح مکے والے بھی اگر ظلم و زیادتی سے

گزشتہ سے
پیوستہ (ربط)

جائیں تو اللہ ان پر اسی طرح مہربانی فرمائے گا جیسی باغ والوں پر کی تھی۔

مشرکین کی خوش فہمی

مشرکین مکہ مختلف قسم کی یہودہ باتیں کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ابتدائی دور کے غریب مسلمانوں کے ساتھ ٹھٹھا اور تسخر کیا کرتے تھے اور اپنی بڑائی کا اظہار کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ جس طرح آج ہم تم سے اچھے ہیں اسی طرح اگر بالفرض کل کو قیامت بھی آگئی تو وہاں بھی ہم ہی اچھے ہوں گے۔ آج مسلمان کہتے ہیں کہ ہم اللہ کی عبادت کرنے والے اور صعوبتیں برداشت کرنے والے ہیں۔ اور اس کے بدلے میں قیامت کو ہماری حالت اچھی ہوگی، یہ غلط ہے بلکہ وہاں بھی ہم ہی اقتصادی طور پر بہتر ہوں گے اور یہ مسلمان وہاں بھی ایسے ہی رہیں گے۔ ان کی اقتصادی حالت وہاں بھی خراب ہی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سابقہ مشرکوں اور کافروں کا حال بھی بیان فرمایا ہے۔ کہ وہ بھی مشرکین مکہ کی طرح کہا کرتے تھے کہ ہم قیامت کو مانتے ہی نہیں۔ اور اگر بالفرض قیامت آ بھی گئی تو ہماری حالت وہاں بھی اچھی ہوگی جس طرح اس دنیا میں اچھی ہے۔

حضرت خبابؓ کا واقعہ

حضرت خبابؓ ابن ارتھ کاریگر تھے۔ انہوں نے مشرکین مکہ میں سے ایک شخص عاص بن وائل کے لیے تلوار یا زہر بنائی۔ جب آپ اس مشرک سے مزدوری طلب کرنے کے لئے گئے تو وہ کہنے لگا میں تمہیں مزدوری اس وقت دوں گا جب تم تکفّر پیمحمدؐ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرو گے۔ حضرت خبابؓ نے کہا کہ میں تو ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ حتیٰ تَمُوتَ ثُمَّ تَبْعُتَ یہاں تک کہ تم مر جاؤ اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جاؤ۔ میں تو اپنے ایمان کو ترک نہیں کروں گا۔ تو مشرک کہنے لگا کہ اچھا! اگر ہم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جائیں گے تو ہیں تمہاری مزدوری اس دوسری زندگی میں ہی ادا کر دیں گے۔ یہاں تمہاری اجرت ادا نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ بد بخت ایسا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ یَا بَیْنَہُمْ قِیَامَتُہُمْ رُزِیَہُ اُکْبَدُہُمْ رُزِیَہُ پش ہوگا۔ اس کے پاس نہ مال و دولت ہوگی اور نہ اولاد، پھر یہ اس دنیا کی مزدوری قیامت کے روز کیسے ادا کرے گا۔ تو یہاں پر اللہ تعالیٰ نے مشرکین اور کفار کے اس قسم کے یہودہ خیالات کا رد فرمایا ہے۔ کہ اگر بالفرض مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے گئے تو وہاں بھی ہم ان مسلمانوں سے اچھے ہوں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باغ والوں کی مثال بیان فرما کر ارشاد فرمایا

عذاب آخرت

كَذَلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ اَكْبَرُ" یہ دنیا کی سزا تھی جو باغ والوں کو ملی۔ وہ اچھے تھے جو تائب ہو گئے۔ اور فرمایا کہ سزا اسی طرح ہوتی ہے۔ اور آخرت کی سزا تو بہت بڑی ہے۔ اور دائمی ہے تو گویا مشرکین اور کافرین کو سمجھایا جا رہا ہے۔ کہ اگر تم اسی طرح جرائم کا ارتکاب کرتے رہے تو تم بڑے عذاب میں مبتلا ہو گے اور وہ عذاب آگے آ رہا ہے۔ اس عذاب کی اطلاع سائے انبیاء نے دی ہے اَللّٰی اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ خدا کی وحدانیت اور قیامت کو جھٹلانے والے دن کی سزا آنے والی ہے جس میں تم مبتلا ہو گے۔ اس سے ڈر جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں مجرمین کی سزا کا حال بیان فرمایا، اس کے ساتھ ہی متقین کی جزا کا حال بھی بیان فرمادیا۔ گویا جس جگہ ترمیم ذکر کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ترغیب بھی ہوتی ہے۔ یعنی اگر کافروں کی سزا کا حال بیان ہوا تو ساتھ ہی اہل ایمان کی جزا کا حال بھی بیان کر دیا۔

متقین کیلئے انعام

اس مقام پر بھی مشرکین کے لیے عذاب آخرت کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٍ النَّعِیْمِ بِشَکِّ مُتَّقِیْنَ کے لیے ان کے رب کے پاس نعمتوں کے باغ ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے بڑی نعمتیں مہیا کر رکھی ہیں۔ یہاں تو دنیا کے باغ کا ذکر ہوا مگر اللہ کے ہاں جو نعمتوں کے باغات ہیں۔ ان کے مقابلے میں دنیا کے باغوں کی کیا حیثیت ہے۔

متقین کی تعریف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے اَلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ الشِّرْکَ وَالْکُفْرَ وَالْمَعَاصِیَ یعنی متقین وہ لوگ ہیں جو کفر، شرک اور معاصی سے بچتے ہیں۔ پہلے شرک، کفر اور الحاد سے بچنا تو قطعی اور لازمی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی انسان میں پائی جائے گی تو متقی نہیں ہو گا بلکہ کافر، مشرک، منافق، ملحد یا تردوالا ہو گا۔ کیونکہ یہ چیزیں تقویٰ کے بالکل منافی ہیں۔ سورۃ فتح میں ہے اَلْزَمَهُمْ کَلِمَۃَ التَّقْوٰی یعنی تقویٰ کا حکم اہل ایمان کے ذمہ لازم قرار دیا گیا ہے۔ تقویٰ کا کلمہ ہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی نفاق، شرک و کفر کی آمیزش نہ ہو جو کہ تقویٰ کے منافی ہے۔ اس کے بعد معاصی کا درجہ ہے۔ بڑے اور چھوٹے گناہ سب سے بچے گا تو کامل درجے کا متقی ہو گا۔ اگر معاصی سرزد ہو رہے ہیں۔ تو صرف ایک درجے کا متقی ہے، کامل متقی نہیں ہے۔ اس کی نجات اس کے ایمان کی بدولت ہو گی

متقی کون ہیں

تقویٰ کا مفہوم تقویٰ کا لغوی معنی بچاؤ ہے یعنی برائیوں سے بچاؤ۔ پھر برائیوں میں پہلے منبر پر اعتقاد ہی برائیوں

میں اور یہ مہلک ہیں۔ سخت خطرناک بیماریاں ہیں۔ ان روحانی بیماریوں سے بچنا نہایت ضروری ہے اس کے بعد گناہ کبارہ و صغائر آتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ اپنی کتاب ”الطاف القدس“ میں فرماتے ہیں ”تقویٰ محافظت بر حدود و شرع است“ یعنی اللہ تعالیٰ نے شریعت کے جو حدود مقرر کئے ہیں۔ ان کی حفاظت کا نام تقویٰ ہے۔

سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی سات صفات بیان کی ہیں۔ ان میں آخری صفت یہ ہے ”وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللّٰهِ“ یعنی اہل ایمان وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ ایمان والوں کا شیوہ ہے۔ مگر آج حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑنے والے سب سے زیادہ مسلمان ہیں۔ دنیا میں مسلمانوں کی ایک ارب کی آبادی میں اللہ کی حدود کو توڑنے والے مسلمان ہی ہیں۔ اور ان میں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ ہم ریڈیو پر سن رہے ہیں۔ ہمارے صد صاب چین گئے ہوئے ہیں ماؤزے تنگ کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائیں گے۔ کیا یہ شرک نہیں ہے۔ کافروں کی قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانا مسلمانوں کا شیوہ ہے؟

اسی طرح جب بیرونی ممالک کے لوگ یہاں آتے ہیں تو مسٹر جناح مرحوم کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھاتے ہیں کیا یہ شرکیہ باتیں نہیں ہیں۔ جب بڑے آدمی ایسی حرکتیں کریں گے تو چھوٹے کیوں نہیں کریں گے۔ پھر یہیں بات ختم نہیں ہوتی، ثقافتی شعوے میں شرکت بھی پروگرام میں داخل ہوتا ہے۔ ان تمام امور میں حدود اللہ کو پامال کیا جاتا ہے۔

تجارت کے معاملے میں دیکھ لیں، عقیقہ کے معاملے میں ملاحظہ کر لیں۔ کس قدر قبر پرستی ہے۔ ہمارے ملک میں اور ساری دنیا میں قبروں کی کیسی تعظیم کی جاتی ہے۔ چڑھاوے چڑھتے ہیں جہاں پر سجدے کئے جاتے ہیں۔ آج دنیا میں اعتقادی عنوان میں استقدر شرک ہے جس کا کوئی حد و شمار نہیں۔ یہ سب کفر، شرک اور حدود شریعت کو توڑنا ہے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ طریفانہ انداز میں فرماتے ہیں کہ بھائی ہمارے زمانے کے مسلمانوں کا تقویٰ صرف پانی میں ہے۔ باقی کسی چیز میں نہیں۔ اگر کنوئیں میں چوہا گر جائے تو محلے کے سارے مسلمان دوڑ کر مولوی صاحب کے پاس آتے ہیں کہ مولوی جی! کیا کریں۔ مگر کھانے کے بارے میں کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ کھانا کہاں سے لائے ہو، یہ جوئے کی کھائی ہے یا سینما کی۔ کس قسم کے مال سے

لائے ہو۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ تقویٰ صرف پانی کا ہے اور کسی چیز کا نہیں۔

ورع کے برابر
کوئی چیز نہیں

تقوے کی بنیاد اعتقاد پر ہے۔ جب کہ اعتقاد حق ہو۔ اور اس کے بعد اعمال میں ورع کو ذوقیت حاصل ہے۔ کسی شخص نے نبی علیہ السلام سے پوچھا حضور! وہ بھائی ہیں، ایک نفل نماز وغیرہ زیادہ پر طہت ہے اور دوسرا بھائی ورع زیادہ کرتا ہے۔ مشکوک اور مشتبہ چیزوں سے زیادہ بچتا ہے حضور نے فرمایا لَا يَعْدِلُ بِالرَّحَلَةِ شَيْءٌ یعنی ورع کے برابر کوئی چیز نہیں ہے۔ بسک کمال چیز یہی ہے۔ حرام اور اور مشتبہ چیزوں سے بچاؤ اور تقویٰ اسی کو کہا جاتا ہے۔ یہ بچاؤ سب سے پہلے اعتقاد میں شریک اور کفر یہ باتوں اور بدعات سے ہونا چاہیے۔ بدعات تو رنگ و ریشہ میں رس بس گئے ہیں۔ کوئی کام رکن و رواج اور بدعات کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ حالانکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ ورع کے برابر کوئی چیز نہیں ہے۔ خالی عبادت کرنے والوں کو جان لینا چاہیے کہ ورع بہت بڑی بات ہے۔

جزا کا مدار
تقوے پر ہے

تو اس مقام پر فرمایا اِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٍ النَّعِيمِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں نعمتوں کے باغ متقیوں کے لیے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ یہ الغامات والنشوروں مضیوں، حاجیوں یا نمازیوں کے لیے ہیں، بلکہ یہ متقیوں کے لیے ہیں۔ اصل چیز تقویٰ ہے۔ اور اسی پر جزا کا مدار ہے۔ حضرت ابو درادہ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ کاش مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ دور کھت مقبول ہے۔ تو میرے لیے یہ تمام دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا، کیونکہ اللہ جل جلالہ کا فرمان ہے اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ یعنی خدا تعالیٰ متقیوں سے قبول فرماتا ہے۔ جو متقی نہیں ہیں۔ ان کی کوئی چیز قبول نہیں فرماتا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں میں جو متقی تھا، اُسی کی قربانی قبول ہوئی۔ دوسرے کی مردود ہوئی۔ تو گو یا قبولیت کا مدار تقوے پر ہے، دانش مندی پر نہیں۔ اسی لیے فرمایا اِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٍ النَّعِيمِ۔ بیشک متقیوں کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمتوں کے باغ ہیں۔ اور اس طرح متقین کے لیے جزا بیان فرمادی۔

مسلمین کو مجرمین
برابر نہیں

یہاں پھر مشرکین کے اس بیہودہ خیال کا رد فرمایا کہ اگر ایماندار اس دنیا میں مجرم ہیں تو کل کو اگلی دنیا میں بھی مجرم ہی ہوں گے۔ ارشاد ہوا۔ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے ساتھ برابر کر دیں گے، کیا قیامت کے دن ان

میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ تم آخرت کو اس دنیا کی زندگی پر محمول کرتے ہو۔ کہ جو آج یہاں کمزور ہیں۔ کل وہاں بھی کمزور ہوں گے۔ کیا مسلمان اور مجرم برابر ہوں گے۔ تمہارا یہ گمان عقل اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔ اگر مومن آج تکلیف برداشت کرتے ہیں، تو یہ ایمانداروں کے حق میں عبادت ہے۔ یہ تو ریاضت ہے جس سے درجات بلند ہوتے ہیں۔ کل قیامت میں یہ حالت نہیں ہوگی بلکہ اس کے برعکس ہوگی۔ آج کے اسودہ حال کل سخت سزا میں مبتلا ہوں گے جو آج کفر، شرک اور بدعات میں مبتلا ہیں، وہ کل بری حالت میں ہوں گے یہ ناممکن ہے کہ مسلمان اور مجرم ایک جیسے ہوں۔ وہاں اندھیر نگری نہیں ہوگی۔ قیامت میں مسلمان کا نتیجہ اچھا اور شائن سہلے آئے گا۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ۔ تم کیسا فیصلہ کرتے ہو، جو عقل کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی۔ یہ اس مسئلے کی تشریح ہے۔

مشرکین سے دلائل کا مطالبہ

اس کے بعد مشرکین سے دلائل کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ۔ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس کو تم پڑھتے پڑھاتے ہو، اور جس میں یہ لکھا ہوا ہے۔ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ۔ کیا تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا، جو تم چاہو گے۔ کیا کسی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ آج تم کفر کرتے ہو۔ انکار رسالت کرتے ہو اور چاہتے ہو کہ کل بھی ہم اچھے ہوں گے، کیا کوئی آسمانی کتاب تمہارے پاس ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ جو تم چاہو گے۔ وہی کچھ ہوگا۔ أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بِاللَّغَةِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ یا پھر کیا ایسا ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے قیامت تک قسم اٹھا رکھی ہے کہ تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا، جو تم فیصلہ کرتے ہو۔ جیسا کہ یہود کے بیان میں فرمایا، تم کیا خیال کرتے ہو کہ خدا نے کوئی عہد کر رکھا ہے۔ کہ نجات صرف یہودیوں کو ملے گی، هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ لاؤ اس سلسلہ میں کوئی دلیل، اگر تمہارے پاس ہے۔ یہاں بھی فرمایا کہ کیا خدا تعالیٰ نے قسم اٹھا رکھی ہے کہ سب بہتری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کفار کے مقدر میں ہی ہوگی۔ سَلِّمُوا إِلَيْهِمْ يُذَلِّكَ زَعِيمٌ۔ آپ ان سے پوچھیں کہ اس کے لیے ان کا کوئی ذمہ دار ہے۔ کیا کوئی نقلی دلیل ہے جس کی رو سے کافروں کی حالت ہمیشہ اچھی ہے گی۔ یہاں بھی اچھی ہوگی اور قیامت میں بھی۔ گویا جیسا یہ چاہیں گے۔ ویسا ہی ہوگا۔ لاؤ کس کتاب میں لکھا ہے۔

مشرکین کے لیے
شکر کا کی امداد

اس کے بعد ارشاد ہوا۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ قَلِيلًا تَوَّابِينَ كَذِبًا اِنْ كَانُوا صَادِقِينَ
یہاں مشرکوں کے ایک دوسرے خیال کی نشاندہی کی جس میں یہودی بھی مبتلا تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے
معبود بڑے مقرب ہیں۔ وہ ہمیں خدا سے بہتری دلا دیں گے۔ یہ عام یہودیوں کا تصور ہے کہ حضرت
ابراہیم خلیل اللہ دوزخ کے دروازے پر پھڑپھڑے ہوں گے اور کسی اسرائیلی کو دوزخ میں نہیں گھسنے
دیں گے جس نے غنہ کیا ہوا ہو گا شیعہ بھی ایسا ہی خیال کرتے ہیں کہ سال بھر میں ایک دن ماتم
کر لو، امام حسینؑ کا نام لے لو۔ بیڑا پار ہے۔ نماز، روزہ وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی
بہت سے بت پرست، قبر پرست ہیں جو کہتے ہیں کہ پیر صاحب کے سالانہ عرس میں شرکت کر
لینا کافی ہے، نماز روزہ کی ضرورت نہیں۔

مشرکین کا یہی تصور تھا۔ کہ لات وغری وغیرہ جن کی ہم پوجا کرتے ہیں یہ اللہ کے بڑے
مقرب ہیں۔ یہ ہم کو مصیبت کے وقت چھڑا لیں گے۔ اور خدا کے قریب کر دیں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا
یہ نہایت لغویات ہے۔ ان کو کوئی نہیں چھڑا سکے گا۔ کوئی ان سے پوچھے کہ خدا کے مقابلے میں اگر انکا
کوئی شریک تو لاؤ جو خدا کے مقابلے میں کسی کو چھڑا سکتا ہے یا پناہ دے سکتا ہے وہو یُجِیذُ وَکَا
یُجَارُ عَلَیْهِ خَدَا پناہ دیتا ہے، کوئی اور پناہ نہیں دے سکتا۔ جب گرفت آتی ہے تو کوئی کبھی کو
نہیں چھڑا سکتا۔

دنیا میں بھی قحط، زلزلے، وباؤں آتی ہیں، اُس وقت یہ قبروں والے، یہ خود ساختہ معبود
کہاں ہوتے ہیں۔ یہ جنگ کی تباہیوں میں کیوں نہیں بچاتے۔ تو یہ عقیدہ ہی باطل ہے۔ صرف
اللہ ہی ہے جو بچانے کا سامان پیدا کرے کیا ان کے شریک ہیں؟ اگر ہیں تو لائیں۔

مفسر قرآن علامہ زحشریؒ نے اس کا دوسرا معنی بیان کیا ہے۔ کفار کے اس دعوے کے
جواب میں کہ جو اس دنیا میں اچھے ہیں وہ قیامت میں بھی اچھے ہوں گے، علامہ صاحب فرماتے
ہیں کہ کیا اس بات کو دنیا میں کوئی عقلمند آدمی بھی مانتا ہے۔ لاؤ عقلمند آدمی کی بات بھی معتبر
ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی عقلمند آدمی بھی اس بات کو نہیں مانتا کہ آج کا بڑا کل اچھا ہو گا۔ ہر صاحب
عقل یہی کہتا ہے۔ کہ آج کا بڑا کل بھی بُرا ہو گا۔

علامہ زحشریؒ
کی تفسیر

تو فرمایا کہ اپنے اس دعوے کی دلیل میں کہ آج مشرکوں کی حالت اچھی ہے تو کل بھی

اچھی ہوگی اگر تمہارے پاس کوئی شریک ہیں تو لاؤ۔ علامہ زحشریؒ نے شرکاء سے یہ مراد لیا ہے کہ تمہاری اس بات کو ماننے میں اگر تمہارا کوئی شریک ہے تو لاؤ۔ فرمایا ہرگز نہیں۔ مشرکوں کا خیال عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔

یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ ۚ وَیَدْعُونَ اِلٰی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ۝۴۲
 خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْمَقُہُمْ ذِلَّةٌ ۚ وَقَدْ كَانُوا یَدْعُونَ اِلٰی
 السُّجُوْدِ وَہُمْ سَالِمُونَ ۝۴۳ فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّكْذِبُ بِہِذَا الْحَدِیْثِ ۚ
 سَنَسْتَدْرِجُہُمْ مِنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۴۴ وَامْلِیْ لَہُمْ ط ۚ اِنْ
 كِیْدِیْ مَتِیْنٌ ۝۴۵ اَمْ تَسْأَلُہُمْ اَجْرًا فِہُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ
 ۝۴۶ اَمْ عِنْدَہُمْ الْغُیْبُ فِہُمْ یَكْتُبُوْنَ ۝۴۷

ترجمہ :- جس دن کھولی جائیگی پینڈلی اور یہ سجدے کی طرف بلائے جائیں گے پس یہ سجدہ کرنے
 کی طاقت نہیں رکھیں گے ۝۴۲ ان کی آنکھیں پست ہوں گی ان کے اوپر ذلت چڑھی ہوئی
 ہوگی اور تحقیق ان کو دنیا میں سجدے کی طرف بلایا جاتا تھا اور وہ بالکل صحیح سلامت تھے
 ۝۴۳ پس چھوڑ دیں مجھے اور اس کو جو اس بات کو جھٹلاتا ہے، ہم ان کو بدرجہ عذاب کے قریب کریں
 گے۔ جہاں سے ان کو پستہ بھی نہیں ہوگا ۝۴۴ اور میں ان کو مہلت دیتا ہوں بیشک
 میری تدبیر بہت مضبوط ہے ۝۴۵ کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ طلب کرتے ہیں کہ یہ اسی تاوان
 کی وجہ سے بوجھل ہوئے ہیں ۝۴۶ کیا ان کے پاس عیب ہے پس وہ اس کو
 لکھتے ہیں۔ ۝۴۷

گزشتہ پورے
(رابط)

پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفر و شرک کرنے والوں کا رد فرمایا۔ کافروں کے اس خیال
 کی تردید فرمائی جس کے مطابق وہ کہتے تھے کہ چونکہ ہم دنیا میں بدتر ہیں لہذا آگے بھی ہم ہی بدتر ہونگے
 فرمایا کہ فرمانبردار اور مجرم یکساں کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ بات عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔ پھر
 مطالبہ کیا کہ تمہارے پاس کوئی عقلی یا نقلی دلیل ہے تو پیش کرو۔ دنیا کا کوئی عقلمند اس بات
 کو تسلیم نہیں کرے گا کہ مجرم اور فرمانبردار ایک جیسے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے متقیوں کے
 لیے مقرر کردہ نعمتوں اور ان کی کامیابی کا حال بیان کیا۔

ان آیتوں میں شرک اور کفر کرنے والوں کا حال بیان ہوا ہے۔ وہ اپنے شرک کو اس طرح

عبداللہ کا اثر اکی صحت
پر منحصر ہے۔

صحیح قرار دیتے ہیں کہ جن کی عبادت ہم کرتے ہیں، اس سے مقصود عبادت نہیں بلکہ یہ تو صرف واسطہ ہیں۔ اور ان کی عبادت کرنا گویا خدا کی عبادت کرنا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ کیونکہ جو شخص خدا تعالیٰ کو مبرا اور منزه سمجھ کر خالص اُسی کی عبادت کرتا ہے تو یہی عبادت صحیح اصول پر قائم ہوتی ہے۔ اور آگے چل کر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ مگر ان غلط عقیدہ رکھنے والوں کی یہودہ باتوں کا الٹا اثر ظاہر ہوگا۔ یہ لوگ اپنے غلط عقیدے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کی یہودہ باتیں کرتے ہیں۔ اگر یہ صحیح عبادت کرنے والے ہوتے تو اس کا اثر صحیح طریقے پر ظاہر ہوتا۔

عبادت کے صحیح یا غلط اثر کا ظہور کب ہوگا۔ تو اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر کیا اور ان لوگوں کا رد فرمایا، جن کی عبادت غلط ہے۔ ارشاد ہوا يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ جس دن کھولی جائیگی پٹلی وَيُذْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ اور یہ سجدے کی طرف بلائے جائیں گے۔ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ۔ پس یہ سجدہ کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔ خَاسِرَةٌ أَبْصَارُهُمْ ان کی آنکھیں پست ہوں گی تَرَهُمْ ذُلَّتْ ان کے اوپر ذلت چڑھی ہوئی ہوگی۔ وَقَدْ كَانُوا يَدْعُونَ إِلَى السُّجُودِ اور تحقیق ان کو دنیا میں سجدے کی طرف بلایا جاتا تھا وَهُمْ سَالِمُونَ اور وہ بالکل صحیح سلامت تھے۔ وہاں پر یہ صحیح سجدہ نہیں کرتے تھے۔ تو اصل مقصد یہی ہے کہ مشرکین اور کفار کی عبادت غلط ہے۔ اس کا اثر صحیح نہیں نکلے گا، مگر تعبیر ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے۔

یہ قرآن پاک کی مشکل آیتوں میں سے ہے۔ اس کا مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے ساق پنڈلی کو کہتے ہیں۔ اس لیے مفسرین کرام نے اس آیت کی تفسیر میں مختلف طریقے استعمال کیے ہیں تاکہ آیت کا مفہوم قریب الفہم ہو۔ پنڈلی سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلہ میں تفسیر کے دو طریقے تو عام ہیں۔ بعض مفسرین اس سے حقیقی معنی مراد لیتے ہیں۔ اور بعض مفسرین مجازی معنی مراد لیتے ہیں۔ حقیقی معنی یہ ہے کہ ساق سے پنڈلی ہی مراد لی جائے، جیسا کہ انسان کے جسم میں پنڈلی ٹانگیں اور دیگر اعضاء ہوتے ہیں۔ پنڈلی پر جسم کھڑا ہے ایسے ہی پنڈلی کا اطلاق خدا کی ذات پر کریں تو یہ حقیقی معنی ہوگا، مگر اس میں دشواری یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے لیے جمیعت ثابت ہوتی ہے۔

ساق کے
حقیقی معنی

حالانکہ اللہ تعالیٰ اعضا سے بالکل پاک ہے۔ یہ تنزیہ کے خلاف ہے۔

ساق کے مجازی معنی

بعض مفسرین جن میں ابن جریر طبریؒ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما شامل ہیں ان سے منقول ہے کہ یہاں حقیقی معنیٰ مراد نہیں ہیں، بلکہ یہ تمثیل ہے۔ تمثیل اس طرح کہ کشف ساق کما یہ ہوتا ہے سختی سے یعنی شدت اور سختی مراد ہے۔ عربی محاورے میں کشف ساق شدت، بے چینی اور سختی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں کشف الحُرْبِ عَنْ سَاقِهَا لَطَائِي نے اپنی پنڈلی کھول دی ہے۔ یعنی لٹائی سخت ہو گئی ہے۔ شدت اختیار کر گئی ہے۔

فرمایا جس دن قیامت کی سختی برپا ہوگی، اُس وقت کافروں کی عبادت صحیح نہیں ہوگی۔ اس کا اثر صحیح ثابت نہیں ہو سکے گا۔ انسانوں نے شرک کا ارتکاب کیا ہے اور شرک کا اثر بُرا اور اُلٹا نکلے گا۔ بات یہ سمجھانا مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ قیامت کی سختی سے بڑی سختی اور کوئی نہیں ہوگی۔ اولاً قیامت کا واقع ہونا اور حیرت انگیز حالات کا ظاہر ہونا، پھر تمام انسانوں کا جمع ہونا، اس کے بعد محاسبے کی منزل وغیرہ بہت ہی تلخ ہوں گے، جیسا کہ فرمایا "وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ قِيَامَتٍ بَرِيءٌ" سخت ہے اور بڑی تلخ ہے۔ تو کشف ساق سے مراد یہ ہے کہ جس دن سختی واقع ہوگی۔ اُس دن ان کی عبادت ٹھکانے نہیں لگے گی۔ غلط ہوگی۔ تو یہ گویا ساق کے مجازی معنی ہیں۔

خدا کی ذات پر
پنڈلی کا اطلاق

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اگر ساق کا حقیقی معنی یعنی پنڈلی بھی لیا جائے تو درست ہے مگر پنڈلی کا اطلاق خدا کی ذات پر کیسے کیا جائے۔ قرآن پاک میں اور بھی کئی تشابہات ہیں مثلاً جہنم ہاتھ حدیث میں اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کا ذکر بھی آتا ہے، اِنَّ قُلُوبَ بَنِي اٰدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ اَصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ دِلِ اللہ کی انگلیوں کے درمیان میں جہنم چاہتا ہے پلٹ دیتا ہے۔ یہ سب چیزیں قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ حدیث میں کمر کا ذکر بھی آتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے رحم، رشتے اور قرابت کو پیدا کیا تو اُس نے رحمان کی کمر کو پکڑ لیا۔ اسی طرح قدم کا ذکر بھی حدیث میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دوزخ میں اپنا قدم ڈالیں گے۔ جس سے وہ پڑ ہو جائے گی اور کہے گی بس اب پڑ ہو گئی ہوں۔

لہذا ————— سلف صالحین بزرگ اور آئمہ کرام ————— کہتے ہیں کہ ان سب الفاظ

پر ہمارا ایمان ہے۔ اور اسی طرح پنڈلی پر بھی۔ حدیث میں چادر اور تہ بند کا ذکر بھی آتا ہے اَلْكِبْرُ دَائِي وَالْعُظْمَةُ اَزَارِي یعنی تکر میری چادر ہے اور عظمت میرا تہ بند ہے جو ان

کو اپنے اوپر اڑھنا چاہے گامیں اُسے ذلیل کر دیں گا۔

امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور سفیان ثوریؒ جیسے ائمہ کرام کا مسلک یہ ہے کہ جس طرح یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں، ان پر ایمان رکھنا چاہیے یہ صحیح ہیں مگر ان کی کیفیت کو خدا کے سپرد کرنا چاہیے۔ کہ ان اعضا کی کیفیت کیسی ہے۔ مثلاً یہ پنڈلی ایسی نہیں ہے جیسی انسان یا حیوان کی ہوتی ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا فرمان ہے، "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" خدا کی مانند کوئی چیز نہیں۔ پنڈلی ہے۔ ہاتھ ہے مگر جیسا اُس کی شان کے لائق ہے۔ آنکھ اور کان ہیں کیونکہ وہ "بَصِيرٌ" ہے۔ مگر ایسی آنکھ اور ایسے کان نہیں جیسے مخلوق کے ہوتے ہیں، بلکہ ایسے جیسے اس کی شان کے ساتھ لائق ہیں۔

اِسْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ کا بھی یہی معنی کرتے ہیں۔ خدا عرش پر مستوی ہے مگر ایسا نہیں جیسا انسان تخت پر بیٹھا ہے۔ بلکہ اس طرح جس طرح اُس کی شان کے لائق ہے۔ یہ سبحان اللہ کا کلمہ کیا ہے یہی تشریح ہے، خدا کی ذات پاک ہے، ان تمام تشبیہات، کمزوریوں اور زمان و مکان سے۔ تو پنڈلی کو مانتے ہوئے یہ سمجھنا چاہیے۔ جیسے اُس کی شان کے ساتھ لائق ہے اس کی کیفیت میں بحث نہ کرو کہ یہ انسان کی فہم سے بالا ہے۔ اور تشبیہ دے گا تو کفر و شرک میں مبتلا ہو جائے گا۔ کیونکہ اس طرح ماوریت ثابت ہوگی جو خدا کی شان کے خلاف ہے۔

حضرت علیؑ کا قول ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات کے بارے میں اپنی عقل، وہم اور خیال کے ساتھ جو تم انتہائی تصور کر سکتے ہو، وہاں جا کر رک جاؤ اور کہہ دو کہ جو کچھ میرے تصور میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے خلاف ہے۔ خدا کی ذات بلند و برتر ہے: "تَعَالٰی اللہ" خدا کی ذات بہت عالی ہے۔ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی خدا کی شان بہت اونچی ہے "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" خدا کے مثل کوئی چیز نہیں، وہ بے مثل ہے۔ تو گویا سب سے زیادہ اُس کی شان کے ساتھ لائق ہے بحث کی ضرورت نہیں۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ خدا کا عرش پرستوی ہونا معلوم ہے۔ "الرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ اُسْتَوٰی" مگر کیفیت مجہول ہے۔ کیفیت کو مخلوق میں کوئی نہیں جانتا۔ کہ وہ کس طرح مستوی ہے۔ کہ یہ کروگے تو ٹھہرا ہی میں پڑ جاؤ گے، ایمان لاؤ اور یہی کہو جیسا اس کی شان کے ساتھ لائق ہے۔ ہماری عقل ناقص ہے۔ ہمارا فہم نارسا ہے اور وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ عام سلف صالحین نے کلام کیا ہے۔

ساق خدا کے کمال
کی ایک جہت ہے

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں، خدا کی ایک ذات ہے۔ اور اُس کی صفات ہیں۔
اُس کے اسماء اور صفات پر ایمان لانا ضروری ہے اَمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاسْمَائِهِ وَصِفَاتِهِ
خدا رحمان اور رحیم ہے۔ سار اور غفار ہے۔ یہ اس کی ساری صفات ہیں اور ننانویں نام میں صفات
ذات سے الگ نہیں ہوا کرتیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ساق یا دیگر اعضاء کا جو ذکر ہے اس سے
مراد اللہ تعالیٰ کے کمالات کی جہتیں ہیں اور وہ صفات سے الگ ہیں ان کمالات کی جہتوں میں ایک
ساق بھی ہے اور یہ ایک حقیقت ہے۔ انسان کی پنڈلی بنیاد ہوتی ہے اور دوسرا اعضا اُس پر
کھڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح ساق ایک حقیقت کو بیان کر رہی ہے۔ اس سے مراد ایسی پنڈلی نہیں
بلکہ ایک حقیقت ہے اور خدا تعالیٰ کے کمال کی جہت کو بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کمالات کی بہت سی جہتوں میں سے دو جہتیں یعنی پنڈلی اور قدم اُن کے درجے
کی ہیں۔ پنڈلی کا ظہور حشر میں ہو گا۔ اور قدم کا دوزخ میں۔ مگر کافر اور مشرک ان اُن کے جہتوں کو
سمجھنے کے بھی قابل نہیں ہوں گے کیونکہ انہوں نے اپنی استعدادوں کو خراب کیا ہوا ہے۔ باقی جہت
تو بہت بند ہیں مثلاً وجہ، سمع وغیرہ ان کو یہ لوگ کیسے سمجھ سکیں گے تو یہاں پنڈلی سے مراد وہ
تشبیہ والی پنڈلی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ایک جہت کو بیان کرنا ہے، جس کا ظہور ہو گا۔

کشف ساق سے
مراد تجلی کا ظہور ہے

اعادیت میں مختلف الفاظ آتے ہیں۔ کہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ پنڈلی کو کھولے گا
یعنی کشف ساق ہو گا۔ شاہ ولی اللہ بڑے حکیمانہ طریقے پر فرماتے ہیں کہ اُس وقت ایک خاص
قسم کی تجلی کا ظہور ہو گا۔ اس کا اثر یہ ہو گا کہ ہر مومن مرد اور ہر مومنہ عورت جب اس سمت کو دیکھیں گے
تو سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ البتہ جس شخص نے دنیا میں اخلاص اور توحید کے ساتھ خدا کے حضور
سجدہ نہیں کیا، وہ وہاں پر سجدہ نہیں کر سکے گا۔ اس تجلی کے ظہور پر ایسے لوگوں کی پشتیں تخت
کی مانند ہو جائیں گی، جس کی وجہ سے وہ سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کو دوزخ
میں پھینکا جائے گا۔ ریاکار، مشرک، کافر سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ سجدہ صرف وہ لوگ کر سکیں گے جنہوں
نے ایمان، توحید اور اخلاص کے ساتھ دنیا میں سجدہ کیا ہو گا۔

مومن سجدہ ریز ہو
جائیں گے

ایک اور روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ نے کشف
ساق کی حقیقت اس طرح بیان کی ہے يَكْشِفُ عَنْ نَوْرِ عَظِيمٍ اِيكٌ بَہت بڑے نور کا انکشاف

ہوگا۔ اس کو دیکھ کر تمام ایماندار سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں یوں آتا ہے کہ روزِ حشر ہر اس معبود کو سامنے متکین کیا جائے گا جس کی لوگ دنیا میں پوجا کرتے تھے۔ سورج پرست سورج کی طرف چلے جائیں گے اور چاند کے پجاری چاند کے پیچھے جائیں گے۔ اور آخر میں اس امت کے منافق اور مومن رہ جائیں گے۔ ان کی بھی ابتلا ہوگی۔ ان کے سامنے ایک خاص تجلی رکھی جائیگی مومن انکار کر دیں گے کہ یہ ہمارا رب نہیں ہے۔ ہم اس کے سامنے سجدہ نہیں کرتے۔ انکار کر دیں گے، کہیں گے ہم دنیا میں کفر و شرک سے بچتے رہے ہیں، ہم سجدہ نہیں کریں گے۔ پھر ان کے سامنے وہ تجلی ظاہر کی جائے گی جس میں وہ اپنے رب کو پہچانتے ہیں۔ تو فوراً سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ مگر منافق سجدہ نہیں کر سکیں گے، ان کی بات وہیں ختم ہوگئی۔ لہذا دوزخ میں جائیں گے۔ تو گویا نورِ عظیم کو کشفِ ساق سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کشفِ ساق سے مراد
انکشافِ حقیقت ہے

اس لفظ کی ایک تیسری تعبیر بھی کی گئی ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کشفِ ساق کا معنی حقیقت کا کھل جانا ہے۔ یعنی جس دن حقیقت کو کھول دیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں سورۃ طارق میں ”یَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ“ جس دن سینے کے راز بھی کھل جائیں گے جو حقیقتیں آج پوشیدہ ہیں، قیامت کے دن کھول دی جائیں گی۔ عبادت کی حقیقت بھی کھول دی جائیگی۔ تو کشفِ ساق کا مطلب حقیقت کا کھولنا۔

دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک وہ قسم جن کی عبادت حقیقت پر قائم ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو عبادت اور ریاضت کرتے ہیں۔ نمازیں بھی پڑھتے ہیں مگر ان کی یہ عبادت صحیح حقیقت پر قائم نہیں۔ قیامت کے دن عبادت کی اصلیت کا پتہ چلے گا جب ”عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ تَصْلِي نَارًا حَامِيَةً“ دنیا میں بڑی عبادت و ریاضت کی مگر سب بیکار گئی، وہ محض تھکاوٹ ہی تھی، کیونکہ صحیح حقیقت پر مبنی نہیں تھی۔

صحیح عبادت کا
انحصار معرفتِ الہی
پر ہے۔

حقیقی عبادت کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے رب کی پہچان کی جائے ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ“۔ رب کی پہچان اس کی صفت سے ہوتی ہے۔ رب کون ہے، پہلے اُس کی صفت کو پہچانو۔ یہودیوں کے متعلق فرمایا ”مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ“ انہوں نے خدا تعالیٰ کو صحیح نہیں پہچانا۔ معاذ بن جبل کی حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا۔ اے معاذ! میں میں جاؤ۔ وہاں اہل کتاب بھی ہیں، سب سے پہلے انہیں توحید کی دعوت دو، شہادۃً اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ توحید و رسالت کا سبق پڑھاؤ۔ فَاِذَا عَرَفْتُمْ اٰذَ الْاٰلِکَ جب وہ پہچان لیں کہ خدا وحدۃ لا شریک ہے اپنی صفات کے ساتھ، پھر ان کو کتنا کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں، سال میں ایک ماہ کے روزے فرض کئے ہیں، مال ہے تو زکوٰۃ فرض ہے حج فرض ہے۔ اگر رب کی پہچان نہیں ہے۔ تو نہ نماز کسی ٹھکانے لگے گی نہ روزہ۔ اسی لیے فرمایا کہ یہود نے خدا کو صحیح نہیں پہچانا۔ اور یہ پہچان ہی ضروری ہے جو انسان اللہ تعالیٰ کو صحیح پہچان کر عبادت کئے گا، اُس کی عبادت صحیح اصول پر ہوگی۔ اور اُس کا اثر ظاہر ہوگا۔ اسی طرح جو انسان خدا تعالیٰ کو اور اُس کی صفت کو صحیح طور پر نہیں پہچانے گا۔ اُس کی عبادت رائیگاں جاییگی اور آدمی جہنمی ہوگا۔ مردود ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کو جانتے تو سب ہیں، مشرک، جوگی، پادری سب جانتے ہیں مگر صحیح طور پر نہیں پہچانتے۔ دنیا میں اکثر لوگ حجاب سوء معرفت میں مبتلا ہیں۔

فرمایا جس دن ساق کھولی جائیگی اور ان کو سجدے کی طرف بلایا جائے گا تو وہ سجدے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔ ان کی آنکھیں پست ہوں گی۔ سیاہی چڑھی ہوئی ہوگی۔ دنیا میں ان لوگوں کو اللہ کی عبادت کے لیے بلایا جاتا تھا۔ **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ** لوگو! رب کے سامنے سجدہ کرو۔ اس کی پہچان کے بعد اور عقیدہ درست کرنے کے بعد اُس کی عبادت کرو۔ انسانو! تمہارا رب وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ تمہارا خالق، مالک، رازق، مدبر، متصرف وہی ہے ان صفات کو جاننے کے بعد ہی انسان کو پہچان ہوتی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ منزہ اور مبرا ہے، وہ لم یلد ولم یولد ہے۔ **لَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا شَيْءٌ** صاحبۃ ہے۔ اُس کی اولاد نہیں، وہ کھاتا پیتا نہیں، پاک ہے منزہ اور مبرا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ **فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا** اُس کا نہ کوئی نہیں ہے۔ یہ ساری پہچان ہی ہے۔ جب یہ صحیح ہو جائے تو اُس کی عبادت کرو۔ اس طرح سے کی ہوئی عبادت ہی ٹھکانے لگے گی۔

جنہوں نے دنیا میں خدا تعالیٰ کو صحیح طور پر نہیں پہچانا، ان میں تشبیہ والے بھی ہیں۔ جیسے اینیت والے جو خدا کی اولاد مانتے ہیں **اَتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا** یہ لوگ تشبیہ کے عقیدے میں مبتلا ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ بنایا۔ بیوی بچے ہونا مخلوق کی شان ہے، انہوں نے مخلوق کی یہ

عقیدہ تشبیہ
بہر شرک

صفت اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کی۔ تو وہ عقیدہ تثنیہ میں مبتلا ہو گئے۔

اسی طرح جن لوگوں نے خدا کی صفت خاصہ مخلوق میں ثابت کی وہ شرک میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ کے سوا مدبر کوئی نہیں، مگر انہوں نے قبروں والوں کو بھی مدبر جانا۔ لات و عزریٰ کو مدبر جانا۔ نبیوں کو مدبر جانا۔ مافوق الاسباب کوئی کسی کی فریاد نہیں سنتا مگر انہوں نے یہ بھی مانا تو شرک کے مرتکب ہوئے۔ خدا کی صفت علیم کل ہے، انہوں نے کہا کہ ولی بھی جانتے ہیں۔ ہماری ضرورتوں کو غائبانہ طور پر جانتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ یہی صفت وہ دوسروں میں بھی ملتے ہیں۔ حالانکہ علیم کل اور حاضر ناظر سوائے خدا کے اور کوئی نہیں۔ خدا کے سوا نہ کوئی مدبر ہے، نہ خالق ہے، نہ معبود ہے، مگر انہوں نے کہا کہ تمہیں اور بھی ہیں، ان کی عبادت کے بغیر خدا کی عبادت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تمام چیزیں شرک کے اندر آتی ہیں۔ تو اس طرح گویا شرک ہے یا تثنیہ۔

حجاب سورہ معرفت

شاہ ولی اللہ اسے حجاب سورہ معرفت سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسان یا تو حجاب طبع میں مبتلا ہے یا حجاب رسم میں۔ طبعی ضروریات مثلاً کھانا، پینا، مکان، دکان وغیرہ حجاب طبع میں آتے ہیں جب کہ رسم و رواج کو ادا کرنے والے لوگ حجاب رسم میں مبتلا ہیں۔ تیسری قسم کے لوگ حجاب سورہ معرفت میں مبتلا ہیں۔ اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ان حجابات سے آگے نکل کر خدا تعالیٰ کی وحدانیت کو مانتے ہیں۔ اور خدا کی صحیح عبادت کرتے ہیں۔

تو فرمایا وَقَدْ كَانُوا يَدْعُونَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ یعنی دنیا میں ان کو سجدہ کی طرف بلایا جاتا تھا اور وہ صحیح سلامت تھے۔ تندرست تھے۔ ان کو دعوت دی جا رہی تھی کہ کہ خدا کے سامنے سجدہ کر دے آج تمہیں اس کا اختیار ہے، یہ کل سلب ہو جائے گا۔ مگر انہوں نے اُس وقت دنیا میں سجدہ نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن ان کی پشت تختہ بن جائے گی۔ اور وہ سجدہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جائیں گے۔

استدراج کیا ہے

رسالت اور جزائے عمل کے بارے میں فرمایا فَذَرْنِي وَمَنْ يُكْذِبْ بِهَذَا الْحَدِيثِ یعنی چھوڑ دیں مجھے اور ان کو جو اس بات کو جھٹلاتے ہیں کہ عبادت صرف خدا کی ہی صحیح اصول پر ہونی چاہیئے اور نیز یہ کہ نبی رحمتی ہے اور قیامت ضرور آنے والی ہے۔ کیوں کہ نَزَتْ رُجُومٌ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ۔ اس لیے کہ ہم ان کو آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھائیں گے۔ جہاں سے

ان کو پتہ بھی نہیں ہوگا۔ استدراج آہستہ آہستہ چڑھانے کو کہتے ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جب تم دیکھو ایک شخص کو نافرمانی کے باوجود نعمتیں مل رہی ہیں تو جان لو کہ یہ شخص استدراج میں مبتلا ہے۔ یعنی یہ شخص خدا کی دی ہوئی مہلت سے غلط فائدہ اٹھا رہا ہے۔

بخاری شریف کی روایت میں یہ الفاظ اس طرح آتے ہیں **إِنَّ اللَّهَ يُسَلِّيُ بِظَالِمِ خُذَا ظَالِمٍ كَوْمَهُتٍ دِيَا**۔ حتیٰ **إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ** پھر جب پکڑتا ہے تو چھوڑتا نہیں۔ اسے سزا کے شکنجے میں جکڑ دیتا ہے یہی استدراج ہے کہ معاصی اور نافرمانی کے باوجود نعمتیں مل رہی ہیں۔ لہذا ایسے شخص کو دیکھ کر شبہ میں نہیں پڑنا چاہیے کہ شاید یہ آدمی اچھا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **وَأُمْلِي لَهُمْ** میں ان کو مہلت دیتا ہوں۔ **إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ** میری تدبیر مضبوط ہے اور یہ لوگ میری تدبیر باہر کہاں جاسکتے ہیں۔

خیر خواہوں کی نصیحتیں اعراض

رسالت ہی کے بیان میں آگے فرمایا کہ جب آپ ان کو حقائق سے آگاہ کرتے ہیں تو کیا یہ اس لیے انکار کرتے ہیں کہ آپ ان سے کچھ مزدوری طلب کرتے ہیں، معاوضہ یا فیس مانگتے ہیں۔ **أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَّخْرُومٍ مُتَقَلُّونَ** کیا یہ اس تاوان کی وجہ سے بوجھل ہوئے ہیں۔ کوئی معاوضہ طلب کرتا ہے تو گراں گذرتا ہے۔ کہ یہ تو اپنا مطلب پورا کر رہا ہے۔ فرمایا یہ بات نہیں ہے۔ کیونکہ تمام انبیاء کرام لوگوں کو صاف بتلاتے ہیں **مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ** ہم اپنی تعلیم و تبلیغ کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے، تم اپنے ذہن صاف رکھو **إِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ** یعنی ہمارا بدلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ وہی ہمیں دے گا۔ ہم کسی سے کچھ طلب نہیں کرتے بلکہ ہم تو خیر خواہی کرتے ہیں **فَاصْبِرْ أَمْيِنٌ** ہم خیر خواہ ہیں۔ تمام نبی ہی کہتے ہیں **أَنْصَحُ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا تُجِبُونِ النَّصِيحِينَ** ہم تو تمہاری خیر خواہی کرتے ہیں مگر انصوح کہ تم خیر خواہوں کی بات کو نہیں مانتے۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ لوگوں نے سچے اور مخلص خیر خواہوں کی بات کو نہیں مانا۔ خود غرضوں کے پیچھے اور باطل پرستوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، جو ہر یوں اور غلط کار لوگوں کے پیچھے لگے ہیں۔ مخلص اور خیر خواہوں کی بات کی طرف دھیان نہیں دیا۔

یہ جو کہتے ہیں کہ آج ہم آسودہ حال ہیں تو کل کو اگر قیامت آجھی گئی تو بھی ہم ہی اچھے ہونگے اور مسلمان جو یہاں مادی اعتبار سے کمزور ہیں قیامت کو بھی ان کی حالت اچھی نہیں ہوگی تو اس

آج کے دو ہفتہ کل کے تلاش

سلسلے میں ارشاد ہوا اَمْرٌ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ کیا ان کے پاس غیب ہے کیا وہ اس بات کو جانتے ہیں، بلکہ فرمایا یہ غلط ہے۔ جھوٹ کہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو آج اچھا ہے، کل بھی اچھا ہوگا، جو آج دولت مند ہے، کل بھی دولت مند ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔
 اَلْوَكَشَرُونَ هُمُ الْاَقْلُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ یعنی جو آج زیادہ دولت مند ہیں کل قیامت کے دن بڑے ہی محتاج ہوں گے۔

ابو جحیفہؓ اس حالت میں حضور علیہ السلام کے پاس آئے کہ گوشت روٹی سے پیٹ خوب بھرا ہوا تھا۔ اور ڈکار مار رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اپنے ڈکاروں کو روکو۔ جو آج دنیا میں پیٹ بھر کر کھاتے ہیں، کل قیامت کے دن زیادہ بھوکے ہوں گے۔ اس کے بعد ابو جحیفہؓ رنجب تک نہ رہے، دن میں کبھی پیٹ بھر کر دومرتبہ روٹی نہیں کھائی۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے، آج کے زیادہ دولت مند کل زیادہ محتاج ہوں گے کیونکہ دولت مند حقوق ادا نہیں کرتے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ محوڑے لوگ جو دولت کو صحیح طور پر استعمال کرتے ہیں، اُسکے فرض اور واجب تمام حقوق ادا کرتے ہیں، وہ آج بھی دولت مند ہیں، کل بھی دولت مند ہوں گے ورنہ آج کے دولت مند کل کے قلاش اور آج کے بھرے ہوئے پیٹ ولے کل کے بھوکے ہوں گے۔ تو فرمایا کیا ان کے پاس کوئی غیب کی خبر ہے۔ کہ جو آج اچھے ہیں۔ کل بھی اچھے ہوں گے۔ یہ تو کافر اور مجرمن ہیں۔ کل ان کا بُرا حال ہوگا۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ۚ
 (۴۸) لَوْلَا أَن تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِّن رَّبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ
 (۴۹) فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ (۵۰) وَإِنَّ لِكُلِّ الَّذِينَ
 كَفَرُوا بِالْإِزْلَاقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ
 إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ۝ (۵۱) وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝ (۵۲)

الربیع
 ۲۹

ترجمہ: پس اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کریں۔ اور پھلی واسے کی طرح نہ بن جائیں جب
 اس نے دعا کی تو وہ غم سے بھرا ہوا تھا (۴۸) اگر اس کے رب کی نعمت اس کا تدارک
 نہ کرتی تو البتہ پھینک دیا جاتا اس کو جیل میدان میں اس حالت میں کہ وہ بد حال تھا (۴۹)
 پھر اس کے پروردگار نے اس کو برگزیدہ بنایا اور اسے صالحین میں بنایا (۵۰) قریب ہے
 کہ کافر لوگ آپ کو پھیلا دیں اپنی آنکھوں سے (گھور گھور کر) جب وہ قرآن پاک کو
 سنتے ہیں۔ اور یوں کہتے ہیں کہ بیشک یہ تو پاگل ہے (۵۱) اور یہ قرآن تو تمام جہان
 والوں کے لیے نصیحت ہے (۵۲)

پہلی آیتوں میں توحید و رسالت کے منکرین کا بیان تھا۔ قیامت میں پیش آنے والے اللہ
 کا ذکر تھا۔ ابتدائی آیات میں کفر کرنے والوں کی بدگوئی کا حال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے
 انکار کرتے تھے اور العیاذ باللہ آپ کو دیوانہ اور پاگل قرار دیتے تھے۔ اس کے بعد مشرکین کے اس
 رویہ کا ذکر تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ آپ بدابہت کریں، تو اس طرح ایک دوسرے اتفاق ہو سکے
 گا مگر اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کر دیا فَلَا تَطْعَمُ الْمُكْذِبِينَ۔ اس کے بعد بیان ہوا کہ اللہ
 نے جو مال و دولت دے رکھا ہے، وہ محض آزمائش کے لیے ہے۔ باغ والوں کا حال بیان ہوا
 ان کو اللہ تعالیٰ نے آزمایا، پھر ان کا مال و دولت ہلاک کر دیا، اسی طرح فرمایا کہ مکے کے مشرکین
 کو مال و دولت دے کر آزمایا گیا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ اللہ کے محبوب ہیں، بلکہ یہ تو آزمائش
 ہے۔ آگے قیامت کا حال بیان فرمایا کہ ہاں یہ یہ لوگ بھیتائیں گے

گزشتہ سے پورے
 (ربیع)

آخری آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دلائی ہے کہ کافر لوگ آپ کو

صبر کی عاقبت

بڑی تکلیف دینے تھے، العیاذ باللہ آپ کو دیوانہ کہتے تھے حالانکہ اللہ کا نبی جو اخلاق عالیہ پر فائز ہوتا ہے، بڑا ہی دانا اور عظیم ہوتا ہے۔ مگر یہ لوگ حسد کی بنا پر آپ کو پاگل کہتے تھے۔ جس سے آپ کو تکلیف پہنچتی تھی، توحید و رسالت اور قیامت کے انکار سے بھی آپ دل برداشتہ ہوتے تھے۔ تو اس سلسلہ میں ان آیات کے اندر اللہ نے تسلی کا مضمون بیان فرمایا۔

قرآن کریم میں تسلی کا مضمون کثرت سے بیان ہوا ہے۔ بعض اوقات کوئی پہلا نمونہ بیان کر کے تسلی دی جاتی ہے۔ جیسے نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ انہوں نے بھی جب نصیحت کی تو قوم کہنے لگی۔ "قَالُوا اجْزُونُ وَاذْجُرْ" یہ تو پاگل ہے۔ انہوں نے ڈانٹ دیا کہ ہم تمہاری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں، کبھی دوسروں کو کہہ دیا۔ یہ بیوقوف آدمی ہے۔ اس کی بات نہ سنا۔ تو انہوں نے صبر کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کا نمونہ بھی بیان فرمایا۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ایک اور نبی کا حال ذکر کیا ہے۔ کہ اُن سے ایک معمولی سی غزیش ہو گئی تھی۔ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور کتنی بڑی آزمائش میں پڑ گئے۔ اے نبی علیہ السلام آپ ایسا نہ کریں، بلکہ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کریں۔ جو حکم آئے، اُس کے مطابق عمل کریں، جلد بازی نہ کریں اور ان لوگوں کی باتوں پر، تکلیفوں اور ایذاؤں پر صبر کریں۔ کہیں دل برداشتہ ہو کر ان کے لیے جلدی عذاب نہ طلب کر لیں۔ انتقام میں جلدی نہ کریں، یہ مناسب نہیں ہے۔ اپنے رب کے حکم کا انتظار کریں اور مشرکین کی تکلیف باتوں پر استقلال سے کام لیں۔

صبر و اطاعت
لازم و طرزِ عمل

صبر ملتِ ابراہیمی کا ایک بہت بڑا اصول ہے۔ جس طرح ذکر، نماز اور شکر وغیرہ ہیں اسی طرح صبر بھی ہے۔ صبر کا مادہ اطاعت کے لیے ہوتا ہے، جو شخص صبر نہیں کر سکتا، وہ اطاعت نہیں کر سکتا۔ اطاعت میں صبر کرنا پڑتا ہے۔ روزہ، حج، جہاد، نماز کے لیے صبر کرنا پڑتا ہے صبر کے بغیر اطاعت نہیں ہو سکتی۔ برداشت کرنا، نفس کو اس پر جمانا، طاعت وغیرہ یہ سب پابندیاں ہیں بڑے صبر کا کام ہے۔ اسی لیے فرمایا وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ۔ آپ صبر کریں اور آپ کا صبر اللہ کی توفیق سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے خدا تعالیٰ سے توفیق بھی طلب کریں۔ جس طرح ذکر فکر اور نماز ہے اسی طرح۔ صبر ہے۔ جب تکلیف آئے تو

من جانب اللہ سمجھ کر برداشت کریں۔ تکالیف کو لانا اور رفع کرنا اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے لہذا جب تکلیف آئے تو بے صبری کا اظہار نہ کریں۔

صبر و صلوٰۃ کے
ذریعے استعانت

سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ حَتَّىٰ تَمُوتَ أَوْ تَكَلِّفَ سَيِّئَةً تَوْاسُّا مَقَابِلَهُ صَبْرٌ أَوْ نَمَازٌ كَمَا تَعَالَىٰ سَعْدُكَ كَرَامَةُ مَدْرُوبٍ كَرَامَةُ نَمَازٍ پُرْهُو کہ نماز توجہ الی اللہ کا بہت بڑا ذریعہ ہے، دوسرے صبر کرنا اور برداشت کرنا بے صبری سے کام نہ لو۔ انسان کا مزاج عموماً بے صبری کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جیسے ارشاد ہے إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا۔ انسان بے صبر، تنگ دل پیدا کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ قَتُورٌ کا لفظ فرمایا کہ انسان بڑا تنگ دل ہے۔ لہذا حکم ہوتا ہے کہ اطاعت پر اور مصیبت کے آنے پر صبر کرو۔ اہم غزالیٰ فرماتے ہیں اپنے نفس کو خواہشات سے روکنا صبر ہے۔ اس مقام پر وہ تکالیف مراد ہیں جو مشرکین کی طرف سے پہنچائی جا رہی ہیں۔

صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ اور مچھلی والے کی طرح نہ بن جائیں، جنہوں نے بے صبری سے کام لیا تھا۔ مچھلی والے سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔ یہ شام اور فلسطین کے علاقہ میں رہتے تھے۔ جہاں بنی اسرائیل آباد تھے۔ اُن کے دور میں حزقیل بادشاہ تھا۔ اُس وقت کے بڑے نبی حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔

حضرت یونس علیہ السلام
کا واقعہ

اُس بادشاہی میں بیک وقت اللہ کے پانچ نبی تھے، جن میں حضرت یونس علیہ السلام بھی شامل تھے۔ بادشاہ مومن، مطیع اور منقاد تھا۔ اللہ کے نبیوں کی اطاعت کرتا تھا۔ یہ موصل اور نینوی شام اور عراق کے درمیان ہیں۔ موصل اب عراق کا ایک صوبہ ہے نینوی بھی وہاں کا ایک قصبہ ہے۔ وہاں کے لوگوں نے کچھ تعدی کی تھی اُنکے علاقے میں آدمی مائے گئے۔ اور غلام بنا کر لے گئے، تو بادشاہ نے خیال کیا کہ ان کو سمجھانا چاہیے کہ قیدیوں کو واپس کر دیں اور زیادتی نہ کریں۔

اس کا ذکر حضرت شعیب علیہ السلام سے کیا گیا کہ اس طرح زیادتی ہوئی ہے۔ اس وقت اللہ کے پانچ نبی موجود ہیں، مناسب ہے کہ ان میں سے ایک کو وہاں بھیج دیں۔ تجویز یہ ہوئی کہ حضرت یونس علیہ السلام جو بڑے نیک اور عبادت گزار ہیں، ان کو وہاں بھیج دیں۔ اگرچہ ان کے مزاج میں غلائی تھی ہے۔ تاہم ان کے زہد و تقویٰ کی بنا پر ان کا جانا ہی زیادہ مناسب ہے۔

حضرت شیعا علیہ السلام نے حضرت یونس علیہ السلام کو مامور کیا کہ وہاں جا کر نیکی کی تلقین کریں۔ انہوں نے نینوی جا کر خدا کا پیغام سنایا لوگوں کو سمجھایا کہ زیادتی نہ کریں۔ آپ نے وہاں کافی عرصہ تک تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا مگر لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ تو حضرت یونس علیہ السلام نے ان لوگوں کو عذاب کی وعید سنائی کہ ان کی نافرمانی کی وجہ سے خدا کی جانب سے ان پر عذاب آئے گا۔ یہ اتنی بات تو اللہ کے حکم سے ہونی تھی، لیکن اس موقع پر یونس علیہ السلام سے غرض یہ ہوئی کہ وحی الہی کا انتظار کرنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل گئے۔ سمجھے کہ اب مجھ پر کوئی تنگی نہیں ہوگی۔ حضرت یونس علیہ السلام کے واقعات قرآن پاک کی مختلف سورتوں مثلاً سورۃ انبیاء سورۃ یونس سورۃ صفت وغیرہ میں مذکور ہیں اور اس سورۃ میں ایک حصہ بیان ہوا ہے۔ قرآن پاک کوئی تاریخ کی کتاب تو ہے نہیں، جو ہر واقعہ کو مسلسل ایک جگہ بیان کرے یہ تو ایک نصیحت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق نصیحت کے لیے عینی بات جس جگہ موزوں ہوتی ہے، بیان کر دی جاتی ہے۔

العرض حضرت یونس علیہ السلام بے صبری کی بنا پر حکم الہی کا انتظار کے بغیر وہاں سے نکل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتلا میں مبتلا ہو گئے۔ سورۃ انبیاء میں ہے اِذْ ذُہِبَ مُعَاْصِبًا غَرَّ النَّاسُ وَجَرَہُ قَوْمٌ بِغَضَبِہِ الَّذِیْ ہُوَ اِلٰہِہِمْ سَیَئِرُہُمْ فَاِذَا دُکِّرُوا لَا یَسْمَعُوْنَ۔ قوم کو کافی عرصہ سمجھاتے رہے مگر انہوں نے ایک نہ سنی تو مُعَاْصِبًا لِلّٰہِ اللّٰہُ کے لیے قوم پر ناراض ہوتے ہوئے نکل گئے۔ حوت سے مراد مچھلی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا وَذَا النُّونِ اِذْ ذُہِبَ مُعَاْصِبًا یعنی نون کے لیے جب غصے کی حالت میں نکل گئے۔ اس سورۃ کی ابتدا میں بھی ن کا ذکر ہے ن وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ۔ ن کو کئی باتوں سے مناسبت ہے جیسا کہ ابتدائی آیتوں میں عرض کیا۔ ن سے مراد دوات ہے۔ تو قلم کے ساتھ ذکر کیا۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ ن سے مراد مچھلی سے کیونکہ ذی النون مچھلی والے کو کہا گیا ہے۔

یہاں پر حوت کا لفظ آیا ہے حوت، سمک اور ن کا اطلاق مچھلی پر ہوتا ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کی یہ غرضش کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ نہ تھا بلکہ ایک معمولی غلطی تھی چونکہ وہ اللہ کے نبی تھے، بڑے آدمی تھے، اس لیے ان کی معمولی سی غرضش بھی بڑی سمجھی جاتی ہے حضرت

انبیاء کی معمولی سی غرضش پر بھی گورن ہوتی ہے۔

آدم علیہ السلام سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا۔ قرآن پاک میں موجود ہے فَتَنِي وَلَعَنُجِدْلَهُ عَزْمًا لِّیْکِنْ مَّعْمُولِی غَطْلٰی پر بڑی گرفت آئی۔ یہ اللہ کی شان ہے کہ نبیوں کی تربیت زیادہ مقصود ہوتی ہے۔ وہاں غلات اولیٰ بات پر بھی بڑی گرفت ہو جاتی ہے۔ اسی لیے وہ لوگ ڈرتے ہتے ہیں۔ ان میں اللہ کے جلال اور عظمت کا بہت اثر ہوتا ہے۔

قیامت والی حدیث میں آتا ہے۔ کہ لوگ سفارش کے لیے انبیاء کے پاس جائیں گے مگر تھر تھرائیں گے۔ وجہ کیا ہے غَضِبَ غَضْبًا لَّمْ یَغْضَبْ قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ کہیں گے آج تو خدا تعالیٰ غصے میں ہے، پتہ نہیں ہم پر گرفت کرے، ہم یہ کام نہیں کر سکتے، لہذا دوسرے کے پاس جاؤ۔ خدا کی عظمت و جلال کے سامنے معمولی بات پر بڑی گرفت ہوتی ہے حالانکہ ان سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ سرزد نہیں ہوتا۔

”عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ تَبَتَّ مَعْمُولِی سِی بَاتِ حَتَّى۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو تنبیہ فرمائی۔ آپ تڑپ اٹھ گئے۔ محض اس وجہ سے کہ ایک اندھا آیا ہے۔ اور خیال کیا کہ یہ بڑے لوگ ہیں شاید یہ ہدایت قبول کر لیں۔ اللہ نے بڑی سختی سے فرمایا جو طلبہ گار بن کر آتے ہیں اُس کی طرف زیادہ توجہ کریں، جو اعتراض کرتا ہے، اس کے درپے نہ ہوں، آپ ذمہ دار نہیں ہیں۔

اسی طرح مچھلی والے یعنی حضرت یونس علیہ السلام سے ہوا۔ کہ وحی الہی کا انتظار کئے بغیر وہاں سے نکل پڑے اور گرفت ہو گئی۔ سورۃ انبیاء میں موجود ہے ”فَخَلَّنَا اِنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ اُس نے گمان کیا کہ ہم سختی نہیں کریں گے۔ حالانکہ وہ لغزش تھی اور ہم نے سختی ابتداء میں ڈال دیا۔ یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں ڈال دیا۔ گو یا قید خانے میں ڈال دیا۔

مچھلی کا واقعہ مشہور ہے۔ دریا کے کنارے پر پہنچے جہاز میں سوار ہوئے۔ جہاز میں پھینکے جانے کے لیے ہر بار قرعہ حضرت یونس علیہ السلام نام نکلتا ہے جہاز والے الٹا نورانی چہرہ دیکھ کر ان کو دریا میں پھینکنے سے بچکھاتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے قرعہ انہیں کے نام نکلتا ہے۔ آخر انہیں دریا میں پھینک دیا گیا اور آپ سیدھے مچھلی کے منہ میں پہنچ گئے۔

پھر کیا ہوا۔ یونس علیہ السلام نے دریا اور مچھلی کے پیٹ کی تاریکیوں میں اپنے رب کو پکارا ”فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّٰلِمِیْنَ“ چالیس دن، دس دن پانچ دن، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنا عرصہ مچھلی کے پیٹ میں رہا۔

اللہ کا حکم تھا کہ مچھلی کا پیٹ قید خانہ ہے، یونس علیہ السلام مچھلی کی خوراک نہیں ہیں۔ تو ان اندھیرے میں رب کو پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور خطا کار تو میں ہی تھا۔

دفع مصیبت کا
بہترین وظیفہ

ترمذی شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے **دَعْوَةُ الْمَكْرُوبِ دَعْوَةُ ذِي النَّوْنِ** یعنی مصیبت زدہ آدمی کی دعا یہی حضرت یونس علیہ السلام والی دعا ہے **لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ** اگر کوئی مصیبت زدہ یہ دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول فرمائیں گے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ مشائخ اور بزرگان دین نے اپنے تجربات کی بنا پر آیت کریمہ کے پڑھنے کے طریقے دریافت کئے ہیں۔

اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ سو پچاس آدمی جمع ہوں اور ایک ہی مجلس میں سوالا کھڑے رہیں آیت کریمہ پڑھی جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان تنہائی میں بیٹھ کر پڑھے۔ عشاء کے بعد اندھیرے میں بیٹھ جائے اور پانی کا پیالہ پاس رکھ لے۔ ہر روز تین سو مرتبہ یہ دعا پڑھے۔ مقررہ پڑھی مقررہ پڑھی دیر بعد پیالے میں ہاتھ ڈال کر پانی اپنے چہرے اور جسم پر ملتا ہے۔ یہ عمل تین دن، سات دن یا چالیس دن کرے گا، تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرے گا اور پریشانی دور فرمادیں گے۔ بہر حال یہ طریقہ حدیث میں نہیں ہے، حدیث میں اتنا ہی ہے کہ مصیبت زدہ کی دعا **لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ**۔ صرف یونس علیہ السلام کے لیے ہی نہیں بلکہ جو بھی مصیبت زدہ اسے پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اس کی پریشانی دور کرے گا۔

یونس علیہ السلام
کی پریشانی

بہر حال حضور علیہ السلام کو تلقین کی جا رہی ہے کہ آپ مشرکین کی ایذا رسانی پر صبر کریں اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیں کہ **إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ** کہ سخت آزمائش میں مبتلا ہونے پر جب انہوں نے دعا کی تو غم سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف مچھلی کے پیٹ میں تارکیوں کے اندر جو دم گھٹنے والی جگہ تھی۔ دوسری طرف لوگوں کا آپ کی بات کو نہ ماننا، تمسخر کرنا اور پھر عذاب الہی کا سلسلہ، یونس علیہ السلام کا بغیر انتظار حکم خداوندی چلے جانا اور گرفت میں آ جانا۔ یہ ساری باتیں تھیں جن کی وجہ سے یونس علیہ السلام غم سے بھرے ہوئے تھے یعنی مکظوم تھے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ ان حالات میں **لَوْلَا أَن تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِّنْ رَبِّهِ** اگر ان کے رب

کی نعمت یعنی احسان اور مہربانی ان کا تدارک نہ کرتی، نہ سنبھالتی تو لَبِثَ بِالْعُرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ
بِالسَّبْكِ دیا جاتا انہیں چٹیل میدان میں اس حالت میں کہ وہ ہائے ہوئے ہوتے۔ مگر اللہ کی
مہربانی شامل حال رہی تو یونس علیہ السلام کو کسی حال میں نقصان نہیں پہنچنے دیا سوائے اس کے
کہ اُن کے جسم پر کھال میں جس کی وجہ سے نرمی آگئی تھی۔ کھال بالکل نرم ہو گئی تھی۔ تو اس موقع پر بھی
اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی کہ دریائے دجلہ کے کنارے اُس چٹیل میدان میں پھلی نے آپ کو ریت کے اوپر
اگل دیا۔ اور اس طرح آپ کے نہایت نرم جسم کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ پھر جیسا کہ سورۃ صافات میں
آتا ہے ”اَنْبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقُطِيْنُ“ اللہ تعالیٰ نے فوری طور پر اُن پر کدو کا درخت
اگادیا۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو کدو بہت پسند تھا۔ آپ کو اس سے طبعی محبت
تھی، آپ نے فرمایا اِنَّهُ شَجَرَةٌ اَخِي يُونُسُ۔ یہ میرے بھائی یونس کا درخت ہے۔ کدو بہت
اچھی سبزی ہے۔ اطباء نے بھی اس پر تجربات کئے ہیں۔ گھیا گول ہو یا لمبا، اللہ تعالیٰ نے اس
میں قوت حافظہ کی تاثیر رکھی ہے۔ تاثیر کے لحاظ سے مرطوب اور ٹھنڈا ہے۔ تاہم اس میں قوت
حافظہ کو قوی کرنے کا مادہ ہے، عجیب چیز ہے۔

کدو کے
خواص

فرماتے ہیں کہ کدو کے پتے پر مکھیاں نہیں بیٹھتیں۔ شاید اللہ تعالیٰ کی یہ خاص حکمت تھی کہ وہاں
کدو کی بیل اگا دی کہ اس کے پتوں کا سایہ ہو اور یونس علیہ السلام کے نہایت نرم و نازک جسم پر مکھیاں بھی
نہ بیٹھیں۔ اس صحرانے اند کوئی دوسرا انسان موجود نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر فی کو بھیج کر یونس علیہ السلام
کے لیے دودھ کی غذا مہیا کی۔ آپ وہاں چالیس روز تک رہے۔

یونس علیہ السلام کے متعلق حکم ہوا کہ وَلَرْسَلْنَاهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ہم نے
یونس علیہ السلام کو دوبارہ ایک لاکھ یا زیادہ جو کہ غالباً ایک لاکھ بیس ہزار تھے ان کی طرف بھیجا
وہ اپنی قوم کے پاس واپس آئے تو وہاں حالات ہی بدل چکے تھے۔ وہ تمام لوگ تائب ہو چکے
تھے اور اپنے پیغمبر کا انتظار کر رہے تھے۔ کہ وہ اللہ کا بندہ کدھر گیا۔ وہ لوگ عذاب الہی کو آتا
ہوا دیکھ کر تائب ہو چکے تھے۔

یونس علیہ السلام
کی واپسی

فرمایا فَلَجَّئْبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِيْنَ اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو برگزیدہ
نفس علیہ السلام کی برگزینی

بنایا اور اُسے صالحین میں بنایا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کوئی شخص یہ نہ کہے اَتَاخِیْرُ مِّنْ یُّوْنُسَ بْنِ مَعْتَجٍ کہ میں یونس علیہ السلام سے بہتر ہوں۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرے بارے میں بھی نہ کہو۔ اُن سے لغزش ہوئی تھی تو اللہ نے گرفت کی۔ وہ خدا کے نبی اور رسول تھے۔ اور نبیوں سے معمولی لغزش ہی ہو سکتی ہے، صغیرہ یا کبیرہ گناہ تو سرزد ہوتا نہیں۔ لہذا اپنے آپ کو ان سے بہتر نہ کہو یا کسی طریقے سے اُن کی توہین نہ کر بیٹھو کہ ایسا کرنے سے کفر کا خطرہ ہے۔

تو فرمایا فَاجْتَبِهْ رَبُّهُ اللّٰهُ نے انہیں برگزیدہ بنایا اور یہی آدم علیہ السلام کے متعلق بھی فرمایا فَجَعَلَهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ اور اُسے صالحین میں سے بنایا۔ یونس علیہ السلام کی یہ معمولی سی لغزش بے صبری کا نتیجہ تھا۔ لہذا اے نبی علیہ السلام آپ ایسا نہ کریں بلکہ ایذا کو برداشت کریں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کہتے ہیں کہ نبیوں کی لغزش کا بلا وجہ ذکر کرنا بھی مکروہ تحریمی ہے۔

لے حضرت یونس علیہ السلام کا باوجود عصمت کے گناہ کو اپنی طرف منسوب کرنا (اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ) یہ مجاز یہ محمول ہے جیسا کہ بعض اہل طریقت باوجود ایمان کے کفر کو اپنی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کا اعتراف (رَبِّیْ اَظْلَمْنَا الْفُسْنَ) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اعتراف (رَبِّیْ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِّیْ) بھی اسی قبیل سے ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام سے کوئی گناہ نہیں منسوب ہوا تھا۔ صرف خطائے اجتہادی ہوئی تھی کہ انہوں نے چلے جانے کو اجتہاد سے جائز سمجھا اور انتظار

وحی نہ کیا۔ حالانکہ امید وحی تک انبیاء علیہم السلام کو انتظار کرنا مناسب ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام سے اس واقعہ میں کسی امر کی مخالفت نہیں ہوئی صرف اجتہاد میں خطا ہوئی۔ یہ خطا امت کے لوگوں کے حق میں تو معاف ہوتی ہے مگر انبیاء علیہم السلام کی تربیت اور تہذیب زائد مقصود ہوتی ہے اس لیے یہ ابتلا میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یونس علیہ السلام کو بھی اجتہادی غلطی پر یہ ابتلا ہوا۔ یہ نزدیکان و بیش بود حیرانی۔ انبیاء علیہم السلام کو صرف جسمانی تکلیف دی جاتی ہے۔

کیونکہ انبیاء علیہم السلام حقیقی گناہ اور حقیقی عقوبت سے پاک ہوتے ہیں۔ (حضرت تھانوی)

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام ”و در امثال امر الہی بیچ وجہ تقصیر نہ کردہ اند“ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں کسی طرح کوتاہی نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ آپ پہنچا دیں جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اگر آپ نے ذرہ بھر کوتاہی کی تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ نے حق رسالت

آدم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام یا یونس علیہ السلام کی لغزش کا ذکر محض لاپرواہی کے ساتھ کرنا مکروہ ہے۔ ہاں قرآن پاک کی تفسیر کے سلسلہ میں جہاں بات سمجھانی مقصود ہو۔ تشریح کرتا ہو تو جائز ہے ورنہ بلاوجہ لغزش کا ذکر کرنا اپنی بڑائی بیان کرنا ہے اور نبی کی توہین کا ارتکاب ہے اور ایسا کرنے سے کفر لازم آنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

فَرَمَا فَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُرَ لِقَوْنِكَ بِأَبْصَارِهِمْ قَرِيبٌ هُوَ قَرِيبٌ هُوَ قَرِيبٌ
لوگ آپ کو اپنی آنکھوں سے گھور گھور کر دیکھیں۔ جیسے تجھے ہلاک کرنا چاہتے ہیں یا آپ اتر انداز
ہونا چاہتے ہیں۔ تاکہ آپ اُن کی ترشرونی سے تنگ آکر تبلیغ کرنا چھوڑ دیں۔ فرمایا قریب ہے
کہ یہ لوگ پھسلایں لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ اور جب وہ قرآن پاک کو سنتے ہیں۔ وَيَقُولُونَ
إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ۔ نوکتے ہیں کہ یہ تو پاگل ہے۔ پھر اُسی پہلی آیت والے جملے کو دہرایا۔ تو ظاہر ہے
ان حرکات سے آپ کو سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ اور گھور گھور کر دیکھنے سے مراد ہے کہ گویا گاہوں

تبلیغ جاری
رکھنے کا حکم

(بقیہ ص ۱۱۸) نہیں ادا کیا۔

مسئلہ ۲۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ تفسیر مظہری سورۃ صافات کی تفسیر میں لکھتے ہیں

لَا يَحْجُوزُ ذِكْرُ ذَلَّةِ الْأَنْبِيَاءِ فَإِنَّ زَلَّتْهُمْ تَوَجُّبُ كَمَالِ الْإِنَابَةِ إِلَى اللَّهِ وَدَفَعُ دَرَجَاتِهِمْ
وَمَنْ اعْتَرَضَ عَلَى أَحَدٍ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ فَقَدْ كَفَرَ لَا تَفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ
وَحَدِيثُ أَبِي هُرَيْرَةَ مَرْفُوعاً مَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ أَنْ يَقُولَ إِلَّا خَيْرٌ مِّنْ يُّوْنُسَ
بْنِ مَتَّى۔ (متفق علیہ)

ترجمہ :- انبیاء علیہم السلام کی لغزش کا ذکر کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ انکی لغزشیں کمال انابت
الی اللہ اور ان کے رفع درجات کو واجب کرتی ہیں۔ اور جس شخص نے انبیاء علیہم السلام میں
سے کسی ایک پر بھی اعتراض کیا تو اس نے کفر کیا۔ تمام نبیوں کے بارہ میں ایک جیسا حکم ہے کیونکہ یہ
آیت کہ ”ہم اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے“ بالکل واضح ہے
اور بخاری و مسلم کی یہ حدیث بھی ہے۔ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ کسی شخص کے لیے
مناسب نہیں کہ وہ یہ کہے کہ میں یونس بن متی سے افضل ہوں۔ ۱۲۔ عبد الحمید بن عوفی۔

سے کھائے ہیں، پھسلا ہے ہیں تاکہ آپ مرعوب ہو کر تبلیغ کرنا چھوڑ دیں۔

نظر بد برحق

بعض فرماتے ہیں نظر بد لگ جاتی ہے الْعَيْنُ حَقٌّ نظر بد برحق ہے حدیث میں آتا ہے کہ بعض آدمیوں میں نظر بد کا مادہ ہوتا ہے۔ اُن کی نگاہوں میں ایسی تاثیر ہوتی ہے کہ دیکھتے ہی استعجاب پیدا ہوتا ہے اور اُس کا اثر ہو جاتا ہے۔ بعض احادیث میں یہ الفاظ ہیں کہ نظر بد انسان کو قبر میں اور اونٹ کو ہانڈی میں پہنچا دیتی ہے۔ اس کا اثر فوری ہوتا ہے۔ آدمی بیمار ہو جاتا ہے یا ہلاک ہو جاتا ہے۔

حضور کے صحابہؓ میں سے بعض کی نظر بد لگ جاتی تھی۔ کوئی شخص حوض کے کنارے تہ بہ تہ باندھے نہار ہا تھا۔ دوسرے دیکھا کہ جسم بڑا خوبصورت ہے۔ کہنے لگا، کمال جسم ہے، ایسا پہلے نہیں دیکھا۔ اس کا فوری اثر ہوا، بخار آیا اور آدمی ترپٹنے لگا۔ حضورؐ کو پتہ چلا تو اُس کو بلا کر کہا کہ تم میں سے کیوں کوئی اپنے بھائی کو قتل کرتا ہے۔ اَللّٰہُ یَرْکُتُ عَلَیْہِ تَمَّ نَے اُس کے لیے برکت کی دعا کیوں نہ کی۔ لہذا اگر کسی کی نگاہ میں ایسی تاثیر ہو تو اُسے کہنا چاہیے۔ اللہ برکت دے۔ برکت کی دعا کرنی چاہیے تاکہ نظر بد کا اثر نہ ہو۔

یہ بھی فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کی نظر بد لگتی ہو تو نظر بد والے شخص کا وضو یا غسل کا مستعمل پانی اگر مریض کے جسم پر ڈال دیا جائے تو اللہ شفا دے دیتا ہے۔ یہ حکمت خداوندی ہے کہ جس جسم میں بیماری رکھی ہے۔ اس میں شفا بھی رکھی ہے۔ جیسے مکھی کے متعلق فرمایا کہ مکھی کے ایک پر میں بیماری اور دوسرے پر شفا کا مادہ ہوتا ہے۔ وہ بیماری والا پر پہلے ڈبو جاتا ہے۔ اسی لیے مناسب ہے کہ اگر کوئی گرم چیز نہ ہو، پانی وغیرہ ہو تو جب مکھی ایک پر کو ڈبوئے تو تم دوسرا بھی ڈبو دو۔ مکھی کو پھینک دو اور چیز کو استعمال کر لو۔ اسی طرح بیماری کا اثر زائل ہو جائے گا۔ اسی طرح نظر بد والے کے جسم میں بھی بیماری اور شفا دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ اگر اُس کے غسل کا پانی مریض کے سر پر ڈال دیا جائے تو اللہ تعالیٰ شفا دے دیتے ہیں۔

قرآن پاک
نصیحت ہے

الغرض کفار و مشرکین جب قرآن پاک سنتے تھے تو حضور علیہ السلام کو پاگل کہتے تھے جس سے آپ کو تکلیف پہنچتی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے صبر کی تلقین فرمائی۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ یہ قرآن پاک یا گلوں کا کلام نہیں ہے بلکہ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِیْنَ یہ تو تمام جہان والوں کے لیے نصیحت ہے۔





سُورَةُ الْحَاقَّةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اثْنَتَانِ وَخَمْسُونَ آيَةً فِيهَا رُكُوعَانِ

سورۃ الحاقہ مکی ہے یہ باون آیتیں اور اس میں دو رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الْحَاقَّةُ ① مَا الْحَاقَّةُ ② وَمَا أَذْرَكَ مَا الْحَاقَّةُ ③ كَذَّبَتْ
ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ ④ فَأَمَّا ثَمُودُ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ ⑤
وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ⑥ سَخَّرَهَا
عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمَنِيَةَ أَيَّامٍ حُسُومًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا
صَرْعَى لَا كَانَهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ⑦ فَهَلْ تَرَى لَهُمْ
مِّنْ بَاقِيَةٍ ⑧ وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهُ وَالْمُؤْتَفِكَةُ بِالْخَاطِئَةِ ⑨
فَعَصَوْا رَسُولَ رَبِّهِمْ فَأَخَذَهُمُ أَخْذَةً رَّابِيَةً ⑩ إِنَّا
لَنَاطِقَا السَّمَاءِ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ⑪ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ
تَذْكِرَةً وَلَعَلَّهَا أَذُنٌ وَاعِيَةٌ ⑫

ترجمہ: ① وہ ثابت ہونے والا واقعہ (حادثہ) ② وہ ثابت ہونے والا واقعہ کیا ہے ③

اور اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ کو کس نے بتلایا کہ وہ ثابت ہونے والا واقعہ کیا ہے ④

قوم ثمود اور قوم عاد نے کھٹکھٹانے والی چیز کو جھٹلایا ⑤ پس قوم ثمود کو ایک خوفناک

پیچ کے ساتھ ہلاک کیا گیا ⑥ اور قوم عاد کو تند و تیز ہوا کے ساتھ ہلاک کیا گیا جو کہ حد سے

بڑھنے والی تھی ⑦ اللہ تعالیٰ نے ان پر تند ہوا کو مسلط کر دیا جو سات راتیں اور آٹھ دن

مسلط چلتی رہی، پس تم لوگوں کو اس کے اندر پچھاڑے ہوئے دیکھو گے گویا وہ کھجور کے

تنے ہیں جو اکھاڑ کر پھینک دیے گئے ہوں ⑧ پس کیا آپ دیکھتے ہیں ان میں سے

کسی ایک فرد کو بھی بچا ہوا ⑨ اور فرعون اور اس سے پہلے لوگوں اور الٰہی بستیوں والوں

نے گناہ کیے تھے ⑩ انہوں نے اپنے رب کے رسولوں کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ

نے پکڑا اُن کو بڑی چڑھی ہوئی گرفت کے ساتھ ⑩ جب پانی میں طغیانی آگئی تو
 (اے موجودہ زمانے کے لوگو) ہم نے تمہیں (تمہارے آباء و اجداد کو) کشتی میں لا دیا ⑪
 تاکہ تمہارے لیے یادگار بنادیں اس واقعہ کو اور یاد رکھنے والے کان یاد رکھیں ⑫

کوائف سورۃ

اس سورۃ کا نام سورۃ الحاقہ ہے۔ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی باون آیات اور دو رکوع ہیں۔
 یہ سورۃ دو سو چھپن کلمات اور ایک ہزار چار سو اسی حروف پر مشتمل ہے۔

سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط

سابقہ سورۃ میں رسالت کا ذکر تھا۔ اللہ کے نبی اور رسول کو مجنون کہنے والوں کا رد تھا۔ یہ بھی ارشاد
 ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو دنیاوی نعمتیں عطا کی ہوئی ہیں یہ محض امتحان کے لیے ہیں کسی کی مقبولیت کی نشانی
 نہیں ہے۔ اس کے ساتھ باغ والوں کی مثال بیان فرمائی کہ اللہ نے اُن کا بھی امتحان لیا تھا۔ اس کے
 علاوہ منکرین قیامت کا رد فرمایا، اور اُن کے ساتھ آخرت میں پیش آنے والے حالات کا ذکر فرمایا
 آخر میں پھر رسالت کے مضمون کو تازہ کیا۔ اور مشرکین کی انذار کے مقابلے میں صبر کی تلقین کی۔ جلد بازی سے
 منع فرمایا۔ مچھلی والے رسول کی مثال بیان کی کہ انہوں نے جلد بازی کی تو ابتلا میں مبتلا ہو گئے۔ فرمایا آپ
 ایسا نہ کریں بلکہ اپنے رب کے حکم کے سامنے صبر کرتے رہیں۔ اور مشرکین کی انذار کو برداشت کریں۔

مضامین سورۃ ہذا

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے جزائے عمل کا ذکر فرمایا ہے۔ کہ جزائے عمل یقیناً واقع ہو گا۔
 اور مجرموں کو سزا مل کر رہے گی۔ یہ بھی اشارہ کر دیا کہ سزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی ملے گی۔
 اللہ تعالیٰ ہر دو طریقوں سے جزائے عمل دیتے ہیں۔ تو گویا جزائے عمل سے سورۃ کو شروع کر کے
 آخر میں پھر رسالت کا ذکر فرمایا۔

پہلی سورۃ میں مشرکین کے اُس الزام کا رد تھا جس میں وہ حضور کو شاعر اور کاہن کہتے تھے۔
 اور قرآن پاک کو کمانت اور شاعری سے تشبیہ دیتے تھے۔ اس سورۃ کی ابتدا میں جزائے عمل کا بیان
 ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی مجرم کو چھوڑتے نہیں، اُسے دنیا میں بھی سزا ملتی ہے
 اور آخرت میں بھی ملے گی۔ دنیا کی سزا دنیوی اسباب کے دائرے کے اندر ملتی ہے۔ اور دنیا کا نظام
 معطل نہیں کیا جاتا۔ اور آخرت کی سزا مستقل طور پر ملے گی۔

الحاقہ کا مفہوم

الحاقہ حق سے مشتق ہے۔ اور حق کے معنی ثابت ہونا ہے حق ثابت شدہ چیز کو کہتے ہیں۔ یہ
 اللہ تعالیٰ کا اسم پاک بھی ہے، اَلْحَقُّ اَلْمُبِیِّنُ یعنی وہ ثابت اور قائم دائم ہے۔ جیسے حقوق

ہیں، کوئی حق اللہ ہے کوئی حق العباد ہے یعنی اللہ کا حق بھی ہے اور بندوں کا حق بھی ہے۔ تو گویا حق کا معنی ثابت ہونا اور حَقَّۃً کا معنی وہ حادثہ ہے جو ثابت ہو گا، یعنی ثابت ہونے والا حادثہ۔
جزائے عمل کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں تین لفظ استعمال کیے ہیں یعنی الْحَقَّۃُ الْقَارِعَةُ اور الْوَاقِعَةُ اور ان تینوں کا اطلاق قیامت پر کیا ہے، جو کہ جزائے عمل کا اصلی وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو اُس دن اُن کے اعمال کی جزا دے گا۔

جزائے عمل کا
معین وقت

یہاں پہلے صبر کی تلقین کی، پھر الحاقہ کا ذکر کیا کہ وہ ثابت ہونے والا واقعہ یعنی قیامت ضرور برپا ہوگی مشرکین کہتے تھے لَا بَعْثَ وَلَا حِزَانٍ یعنی نہ کوئی بعث ہے اور نہ حساب کتاب کے لیے قیامت یہ سب غلط کہتے ہیں کہ قیامت آنے والی ہے۔ وہ توحید و رسالت کا بھی انکار کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر قیامت کا ذکر فرمایا کہ جزائے عمل کے لیے وہ دن مقرر ہے۔ اس کے علاوہ ٹھوڑا سا توحید کا ذکر فرمایا اور دوسرے نمبر پر رسالت کا ذکر اور منکرین رسالت کا رد فرمایا۔

فرمایا الْحَقَّۃُ وہ ثابت ہونے والا حادثہ مَالْحَقَّۃُ وہ ثابت ہونے والا واقعہ کیا ہے۔ کسی چیز کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ ترکیب استعمال کی جاتی ہے۔ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَقَّۃُ ۔ اور اے پیغمبر علیہ السلام آپ کو کس نے بتلایا کہ وہ ثابت ہونے والا واقعہ کیا ہے۔ کسی چیز کی زیادہ تاکید کے لیے یا تفہیم کے لیے اس قسم کا عنوان اختیار کیا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔ کیونکہ عام مخاطب ویسے ہی نہیں جانتے مگر جو اصلی مخاطب ہے اُسے بھی گویا اس کا علم نہیں۔ تو اس جگہ چند دنیوی حقائق بیان کئے جو دنیوی سزا کے طور پر مجرمین پر واقع ہوئے۔ اور اس کے بعد پھر بڑے حادثے یعنی قیامت کا ذکر کیا۔ اور اس کو حاقہ کے لفظ سے تعبیر کیا۔ جو کہ جزائے عمل کی اصل گھڑی ہے یعنی السَّاعَةُ الْقِيَامَةُ کے واقع ہونے کا ذکر کیا اور پوری تفصیل بیان کی۔

الحاقہ کیا ہے؟

الغرض یہاں چند حقائق بیان کئے جو ان مجرمین کو بڑے جو جزائے عمل کا انکار کرتے تھے۔ بمخلہ اُن کے قوم ثمود اور عاد کا ذکر کیا کَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ قوم ثمود اور عاد نے قارعہ یعنی کھٹکھٹانے والی چیز کو جھٹلایا۔ قرع کے معنی کھٹکھٹانا، ہلا دینا کہ وہ ہر چیز کو ہلا کر رکھ دے گی کوئی نظام قائم نہیں ہے گا اور اس سے مراد قیامت ہے۔ تو گویا قوم ثمود اور عاد نے قیامت کے واقع ہونے کا انکار کر دیا، جس کی وجہ سے وہ سزا کے مستوجب قرار پائے۔

قوم ثمود اور
عاد کی سرکشی

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ سزا دو قسم کی ہوتی ہے۔ بعض سزائیں صرف تنبیہ کے لیے ہوتی ہیں۔ اور ان کو مسلسل نہیں رکھا جاتا۔ یہ سزا اس لیے دی جاتی ہے تاکہ لوگ سمجھ جائیں۔ تنبیہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ سزا اٹھالی جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
کہ ہم بندوں کو تکلیف اور خوشحالی دے کر آزماتے ہیں۔ کبھی قحط، کبھی زلزلہ۔ مگر یہ سزا دائمی نہیں ہوتی بلکہ وقتی طور پر ہوتی ہے تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔

دوسری آیت مبارکہ میں ہے۔ وَلَئِذْ يَقْنُتُ مِنْ الْعَذَابِ الْأُولَىٰ ذَوْنُ الْعَذَابِ
الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ہا اوقات ہم دنیا میں بڑے عذاب سے پہلے سزا دے دیتے ہیں تاکہ
یہ لوگ خبردار ہو کہ باز آجائیں ، بڑا عذاب تو قیامت کو آئے گا مگر اس سے پہلے بھی ہم سزا دے دیتے
ہیں۔ اس کو ابتلا کہتے ہیں۔

عذاب کی دوسری صورت یہ ہے کہ سزا آئی اور مگر فتنہ ہو گیا۔ اب بزرخ کا معاملہ شروع ہو گیا۔ جیسا کہ آگے فرعون، عاد، ثمود، قوم لوط اور اصحاب ایکہ وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ جب خدا کی گرفت آئی اُغْرَقُوا فَاَدْخِلُوْا اِنَّا رَاْهُم غَرَقْنَا، اُدھر بزرخ میں آگ پہ پیش کر دیے گئے۔ اور یہ حالت تا قیام قیامت مسلسل قائم رہے گی، اگرچہ بزرخ کی سزا مکمل سزا نہیں ہے۔ تاہم فی الجملہ سزا ہے۔ اصل سزا تو قیامت کو آئے گی جب تمام اعمال کا آخری اور قطعی فیصلہ ہوگا، مگر بزرخ میں بھی سزا شروع ہو جاتی ہے۔ اور کچھ نہ کچھ ملتی رہتی ہے اور پھر رعایت کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

سزا کی پہلی صورت ابتلا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آزمائش کے لیے وقتی طور پر سزا دیتے ہیں تاکہ لوگ باز آجائیں۔ پھر اُس کو اٹھا دیا جاتا ہے۔ مکے والوں پر سات سال تک قحط نازل رہا۔ وہاں بھی یہی فرمایا ”اِنَّكُمْ عَاثِدُونَ“ اُس کے بعد جب ہم بڑی پکڑ میں پکڑیں گے پھر ”اِنَّا مُنْقِضُوْنَ“ مجرموں سے انتقام لیں گے۔ بڑی گرفت وہاں بدر کی لڑائی کو کہا گیا ہے۔ پہلے قحط میں مبتلا کیا پھر بڑی گرفت میں تمام بڑے بڑے اکابر مجرمین ہلاک ہو گئے۔

قوم محمود اور عاف کی طاقت

تو فرمایا کَذِبْتَ ثُمَّ دَعَا إِلَى الْقَارِعَةِ یعنی قوم عاد اور قوم ثمود نے کھٹکھٹا دینے والی چیز
قیامت کو جھٹلادیا۔ اس بات کی سزا یوں دی گئی کہ فَلَمَّا ثَمُودُ فَاهْبِكُوا بِالطَّاغِيَةِ۔ قوم ثمود
کو ایک چیخ اور زلزلہ کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔ طاعیہ کا معنی زلزلہ بھی ہوتا ہے اور چیخ بھی یعنی سخت آواز۔

ان دو چیزوں سے قوم ثمود کو ہلاک کیا گیا۔ وَ اَمَّا عَادٌ اور جو قوم عاد تھی فَاَهْلَكَوْا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ انہیں تند ہوا کے ساتھ ہلاک کیا گیا عَاتِيَةً جو کہ حد سے بڑھنے والی تھی۔

اس مقام پر قوم ثمود کی ہلاکت کا پہلے بیان کیا گیا اور قوم عاد کا بعد میں حالانکہ تاریخی اعتبار سے ترتیب اس کے برعکس ہے۔ عاد پہلے گزرے ہیں۔ اور ثمود کا عروج عاد سے دو سال بعد ہوا۔ عاد یمن اور احقاف میں آباد تھے جب کہ ثمود وادی القریٰ اور تبوک وغیرہ کے علاقے میں آباد تھے قوم عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام آئے جو انہیں کی قوم کے فرد تھے۔

ہلاکت کے بیان
میں تقدیم و تاخیر

اور قوم ثمود کی طرف حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ اور یہ بعد میں آئے مگر یہاں سزا کے ذکر میں قوم ثمود کو پہلے لایا گیا اور قوم عاد کو بعد میں۔ اس کے بعد فرعون اور الٹی لستی والوں کا ذکر ہے۔ اور پھر قوم نوح کا حالانکہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پہلے غرق ہوئی، پھر عاد تباہ ہوئے اور پھر ثمود کی باری آئی۔ اس کے بعد الٹی لستی والے اور قوم شعیب کا نمبر آتا ہے اور سب آخر میں فرعون کی ہلاکت ہے۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں۔ کہ ہلاکت کے بیان میں تقدیم و تاخیر میں ایک لطیف نکتہ پنہاں ہے فرماتے ہیں کہ یہاں پر تاریخی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ بیان میں سزا کی نوعیت کا خیال رکھا گیا ہے یعنی پہلے اُس قوم کا ذکر کیا گیا جسے جلدی ہلاک کر دیا گیا۔ قوم ثمود پر ایک چٹخ آئی، ایک زلزلہ آیا اور وہ تباہ ہو گئی۔ مگر قوم عاد کے متعلق فرمایا وَ اَمَّا عَادٌ فَاَهْلَكَوْا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ انہیں تند ہوا کے ساتھ ہلاک کیا گیا سَخَّهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَ ثَمَانِيَةَ اَيَّامٍ حُسُومًا ان پر تند ہوا مسلط کر دی گئی جو سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلتی رہی۔ آٹھ دن تک انہوں نے تکلیف اٹھائی اور پھر آخری دن بالکل ہی ہلاک کر دیے گئے۔ تو گویا نوعیت کے اعتبار سے یہ سزا لمبی تھی جب کہ قوم ثمود کو یکدم ختم کر دیا گیا۔

مزید برآں سزا کی نوعیت کے لحاظ سے قوم ثمود کو ایک چیز سے ہلاک کیا گیا، چٹخ ہوا کی کیفیت ہے۔ جب اسرائیل علیہ السلام نے ایک چٹخ ماری، جگر پھٹ گئے، ہارٹ فیل ہو گئے اور ساری قوم ہلاک ہو گئی۔ یہ ہوا کی کیفیت ہے۔ برخلاف اس سے قوم عاد ہوا کے جسم سے ہلاک ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو مسلط کیا اُس نے اکھاڑ پھار کیا۔ آدمیوں کو ادھر ادھر کر لیا، ان کو آپس میں ٹکرایا اور آخر میں ان کو بالکل ہی

ہلاک کر دیا۔ ہوا سات دن مسلسل چلتی رہی اور آٹھویں دن ان کا کام تمام کر دیا۔ تو گویا یہ ہلاکت ہوا کے جسم کے ذریعے ہوئی۔

فرعون اور قوم لوط کی ہلاکت

فرعون کی ہلاکت کے اسباب میں پانی ہے، دریا ہے، ساتھ مٹی ہے، گویا اس سزا میں کئی چیزیں شامل ہیں۔ یہی حال قوم لوط کا ہے۔ دہاں ہوا بھی ہے، طوفان بھی ہے، پانی کی موجیں اٹھ رہی ہیں، بارش برس رہی ہے مٹی اور آگ بھی ہے۔ پتھر بھی ہیں۔ یہ ساری چیزیں سزا میں شریک ہیں۔ سزا نیچے سے بھی مل رہی ہے، اوپر سے بھی نازل ہو رہی ہے۔ لہذا قرآن پاک نے اس مقام پر اقوام عالم کی ہلاکت کو تاریخی اعتبار سے نہیں بلکہ سزا کی نوعیت کے لحاظ سے تقدیم و تاخیر کے ساتھ بیان کیا ہے۔

قوم عاد کا حال

بہر حال قوم عاد کی سزا کی نوعیت یہ تھی کہ ان پر تند ہوا سات رات اور آٹھ دن تک مسلسل مسلط رہی فَتَنَّا الْقَوْمَ فِيهَا صَوْغَىٰ تَمْلُوهُنَّ لَوْ كُنَّ يَعْلَمُونَ اس کے اندر بچھاڑے ہوئے دیکھو گے كَانَهُمْ عِجَازٌ يَّخْلُجُواوِيَّةً جیسا کہ کھجور کے تنے اکھاڑ کر زمین پر پھینک دیے گئے ہوں۔ یہ لوگ بڑے جسیم اور قد آور تھے اس لیے انہیں کھجور کے تنوں سے تشبیہ دی گئی۔

یہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں، مینار اور حوض بناتے تھے۔ بڑے طاقتور تھے اور اپنے جیسا طاقتور کسی دوسرے کو نہیں مانتے تھے۔ کہتے تھے مَنْ أَشَدُّهُمْ قُوَّةً ہم سے زیادہ کون طاقتور ہے۔ انہوں نے خدا کو بھی فراموش کر دیا اس قوم میں تین جرائم خاص طور پر پائے جاتے تھے۔ ایک کفر و شرک، دوسرا ظلم اور تیسرا تکبر۔

قوم ثمود کا حال

قریب قریب یہی حال قوم ثمود کا تھا۔ بڑے کاریگر، صنّاع اور نجیب تھے۔ ان کے سترہ مویشی اور بستیاں آباد تھیں۔ تنوک سے لے کر وادی القریٰ تک درخیز زمین، گھنے باغات اور عالیشان عمارتیں۔ آج ان کے کھنڈرات دیکھ کر ہی آدمی حیران ہو جاتے ہیں۔ تنوک میں پہاڑوں کے اندر ان کے مکانات کے کھنڈرات اب بھی موجود ہیں۔ کمال درجے کی عمارات اور دلکش نقش و نگار بناتے تھے۔ کمال درجے کے کاریگر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ عنکبوت میں ارشاد فرمایا کہ دنیا کے اعتبار سے یہ لوگ بڑی سوچ بوجھ رکھتے تھے مگر دین کے معاملے میں بالکل نادان اور بڑے بیوقوف تھے۔

آج دنیا کی ترقی یافتہ اقوام بڑی سوچ بوجھ کی مالک ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت اور اقتصادیات کے مالک ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ترقی یافتہ کہتے ہیں۔ برخلاف اس کے مشرقی ممالک

دنیا کی ترقی یافتہ اور ترقی پذیر اقوام

پس ماندہ ہیں۔ غیر ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ہیں یعنی ابھی ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمہ لی
 زبان میں ترقی یافتہ اقوام میں عقل معاش کامل ہے۔ مگر عقل معاد بالکل نہیں۔ یہ لوگ عقل معاد سے بالکل
 خالی ہیں۔ انہیں عقل معاش مفید نہیں ہوگا۔ جو نہی یہ معاش ختم ہوا، یہ بھی ختم ہو گئے، آگے کچھ بھی نہیں ہے
 الغرض قوم عاد کے متعلق فرمایا کہ انہیں ایسا بچھاڑ کے رکھ دیا کہ فہم شری لہم من بآقیۃ
 ان کافروں میں سے کسی ایک فرد کو بھی باقی نہیں چھوڑا۔ یہ لوگ ہود علیہ السلام کی نبوت اور قیامت کا انکار
 کرتے تھے ان میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں رہنے دیا گیا۔

فرعون اور لوط
 بستیوں والے

وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهُ وَالْمُؤَلَّفَاتُ بِأَلْمَخَاطِطَةِ۔ پھر فرعون کی باری آئی اور اس سے
 پہلے لوطی بستیوں والے جن کی بستیوں کو الٹ دیا گیا تھا، ان پر پتھر برسائے گئے اور آگ برساتی گئی
 ان کے کام ہی اُلٹے تھے ان لوگوں نے گناہ کئے تھے، جرائم کے مرتکب ہوئے فَعَصَوْا رَسُولَ رَبِّهِمْ
 انہوں نے اپنے رب کے رسولوں کی نافرمانی کی۔ رسول نے کہا اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرو وہ کہتے
 تھے وَنَذَرُ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا کیا تیرے جیسے بے وقوف آدمی کی وجہ سے ہم اپنے باپوں
 کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ رسول کہتا تھا ظلم نہ کرو، قیامت آنے والی ہے، وہ کہتے تھے کوئی قیامت
 نہیں ہے۔ ڈھکولے مارتے تھے، یہود وہ باتیں کرتے تھے۔ رسول کے فرمان کو رد کرتے تھے فَلَخَذْنَاهُمْ
أَخْذَةً رَّابِیَّةً تو اللہ نے پکڑا ان کو بڑی چڑھی ہوئی گرفت کے ساتھ۔ راہیہ کا معنی چڑھی ہوئی گرفت
 جس طرح سیلاب اوپر چڑھتا ہے۔ یہ ابتلا نہیں تھی بلکہ سزا تھی۔ اس میں گرفتار ہو کر تباہ و برباد ہو گئے
 اکثر اور تکبر سارا ختم ہو گیا۔

طوفان نوح

اس کے بعد طوفان نوح کا ذکر فرمایا إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ جب پانی میں طغیانی آگئی، پانی چڑھ
 آیا تو اسے موجودہ زمانے کے لوگو! حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِیَةِ۔ ہم نے تمہیں چلنے والی کشتی میں
 لا دیا۔ یہ نوح علیہ السلام کا زمانہ تھا۔ آج اس دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کے اباؤ
 اجداد نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار نہ ہوئے ہوں، وہی بچے تھے جو کشتی میں سوار ہو گئے۔ باقی سارے
 اس طوفان کی نذر ہو گئے۔ تو گویا ہمارے اباؤ اجداد کا کشتی نوح میں سوار ہونا ہمارا ہی سوار ہونا ہے اور
 پھر انہیں میں سے اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو آگے چلایا۔

یہ تمام چیزیں اللہ کی گرفت تھیں یہ چھوٹے چھوٹے حلقے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بڑا

اصل کلام

حادثہ یعنی قیامت ضرور واقع ہو کر رہے گا۔ اس میں قیامتِ صغریٰ اور قیامتِ کبریٰ کا مفہوم بھی آگیا۔ جو آدمی مر گیا اس کی قیامت تو برپا ہو گئی، مَتَّاتِ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ وہ تو عالمِ بدنِ بخ کی جزا و سزا میں مبتلا ہو گیا، اسی طرح بڑی قیامت تمام عالم پر یکبارگی آئے گی۔ جس طرح یہ قیامتِ صغریٰ برحق ہے، اسی طرح قیامتِ کبریٰ بھی برحق ہے، ضرور برپا ہو گی۔

یہ اُن قوموں کی قیامت تھی جن کا حال ذکر کیا گیا ہے۔ بڑے بڑے مکانوں میں متمکن تھے قوم ثمود کی بڑی بڑی سترہ سو بیتیاں تھیں اور ان کی بلڈنگوں کے نشانات آج بھی موجود ہیں اسی طرح عمیران قوم عاد کا مکان چالیس منزلہ تھا، ہر منزل سے دوسری تک چالیس گز کا فاصلہ تھا۔ اس کے کھنڈرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک موجود تھے۔ قوم عاد کی یہ یاد گاریں پانچ ہزار سالہ پیرانی تھیں اور ان کی صنعت و حرفت اور کاریگری کی زندہ مثال تھیں۔ اہرامِ مصر بنانے والوں کی طاقت کا اندازہ لگائیں ایک ایک پتھر پچھتر پچھتر من و نئی ایک دوسرے کے اوپر چڑھایا گیا تھا۔ یہ ہرم چار سو فٹ اونچا ہے۔ ان کا اوپر چڑھانا اور آپس میں جوڑنا کتنی اعلیٰ صنعت تھی۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اس کشتی کو لَنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً تمہارے لیے یادگار بنا دیا۔ کہ جو لوگ اس کشتی میں سوار ہوئے وہ بچ گئے اور انہیں کی نسل سے آئندہ دنیا کو قائم کیا۔ وَتَعِيَهَا اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ اس واقعہ کو یاد رکھنے والے کان یاد رکھیں کہ دیکھو جب خدا کی سزا آتی ہے تو لوگ کس طریقے سے ہلاک ہوتے ہیں۔ تباہ و برباد ہوتے ہیں۔ اور صرف وہی بچتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ بچانا چاہیں۔ یہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے حلقے بیان کئے اور اس کے بعد بڑے حلقے یعنی قیامت کا ذکر فرمایا

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ ۝ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ
 فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً ۝ فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝
 وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ ۝ وَالْمَلَكُ عَلَى أَرْجَائِهِمْ
 وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَنِيَةٌ ۝ يَوْمَئِذٍ
 تَعْرِضُونَ لَا تُخْفِي مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ۝ فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ
 بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاءُ مَقْرُوءٌ وَكَثِيرٌ ۝ إِلَيَّ ظَنَنْتُ
 أَنِّي مُلْقٍ حِسَابِيهِ ۝ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۝ فِي جَنَّةٍ
 عَالِيَةٍ ۝ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ۝ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا
 أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝

ترجمہ: پس جب صور میں پھونکا جائے گا ایک ہی بار پھونکنا ۱۳ زمین اور پہاڑ اٹھائے
 جائیں گے اور ان کو کوٹ دیا جائے گا ایک ہی دفعہ کوٹ دیا جانا ۱۴ پس اس دن
 واقع ہو جائے گی واقع ہونے والی بات ۱۵ اور آسمان پھٹ جائے گا پس آسمان
 اس دن بہت کمزور ہوگا ۱۶ اور فرشتے اس کے اطراف پر ہوں گے اور اٹھائیں
 گے تیرے رب کے عرش کو اپنے اوپر اس دن آٹھ فرشتے ۱۷ اس دن تم
 پیش کیے جاؤ گے تمہاری کوئی خفیہ سے خفیہ بات پوشیدہ نہ رہے گی ۱۸ پس
 جس کو اس کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا۔ وہ لوگوں سے کہتا پھرے گا میرا اعمال نامہ
 پڑھ لو ۱۹ بیشک میں تو یقین رکھتا تھا کہ (ایک نہ ایک دن) مجھے میرا حساب پیش
 آنے والا ہے ۲۰ وہ بہت پسندیدہ زندگی کے اندر ہوگا ۲۱ بڑے اونچے
 باغ میں ہوگا ۲۲ اس کے پھل قریب ہوں گے ۲۳ خوشگوار ہی سے کھاؤ پو اس

وجہ سے جو تم نے بھیجا گئے ہوئے دنوں میں ۲۴

اس سورۃ کا موضوع جزائے عمل ہے اور قیامت کا ذکر ہے۔ پہلی آیات میں الحاقۃ اور القارۃ

گذشتہ سے پوچھتے

کا ذکر فرمایا۔ چند گذشتہ اقوام کا ذکر کیا جو قیامت کو جھٹلاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر حاقہ واقع

کیا اور یہ دو قسم سے وارد ہوتا ہے۔ ایک ابتلا ہوتی ہے، وقتی طور پر تکلیف آتی اور دور ہو گئی۔

اس کے بعد پھر موقع مل گیا سزا کی دوسری قسم یہ ہوتی ہے مذکورہ اقوام کو اس دنیا میں ہی سزا ملی اور پھر اٹھایا نہیں گیا۔ وہ لوگ اس دنیا سے رخصت ہوئے اور عالم برزخ میں سزا پاتے ہیں۔

ان اقوام میں شرک و کفر تھا اور انکار رسالت بھی، یہ لوگ قیامت کا بھی انکار کرتے تھے، تو یہ قیامت کے جھٹلانے کا نتیجہ تھا کہ وہ لوگ دنیا میں ہی سزا میں مبتلا ہو گئے۔ دنیا میں آزمائش میں ڈالنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لَعَلَّہُمْ یَتَذَكَّرُونَ تاکہ انسان گمراہانے لگیں، عاجزی کریں اور گناہوں سے تائب ہو جائیں۔ دوسری نوعیت سزا کی یہ ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے قوم عاد، قوم ثمود، فرعون، قوم لوط اور قوم نوح پر مسلط کی۔ ان کا مواخذہ ہوا سزا ملی اور ہلاک ہو گئے۔

دنیا میں واقع ہونے والے چھوٹے چھوٹے حقائق بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اب مجھے **صور** ابراہیل کا ذکر فرماتے ہیں۔ فَإِذَا الْفُتُوحُ فِي الصُّورِ نَفْثَةٌ وَاحِدَةٌ جب صور میں پھونکا جائے گا، ایک ہی بار پھونکنا۔ صور پھونکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتہ مقرر کیا ہوا ہے وہ مقررہ وقت پر صور پھونکے گا۔

ایک دیہاتی شخص نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ حضور! صور کیا ہے۔ فرمایا یہ سینک کی مانند ایک طرف سے باریک اور دوسری طرف سے کشادہ ہے اور فرشتے نے منہ میں پکڑ رکھا ہے۔ سر جھکائے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم کا منتظر ہے۔ جب حکم ہوگا، صور پھونک دے گا۔ العرض حضور نے فرمایا کہ صور کھل کی مانند، سینک جیسا نوکدار ہے۔

شیخ ابن عربی جو صاحب کشف تھے، فرماتے ہیں کہ صور کا دھانہ اتنا بڑا ہے کہ ساتوں زمین اور ساتوں آسمان اس کے دھانے میں پڑے ہوئے ہیں اور قرآن پاک سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ صور دومرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلی دفعہ نظام کائنات کو درہم بہرہم کرنے کے لیے دوسرا زندہ کرنے کیلئے۔

جب پہلی دفعہ صور پھونکا جائے گا تو حالت یہ ہوگی کہ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً۔ تو اُن کو کوٹ دیا جائے گا ایک ہی دفعہ کوٹ دیا جائے۔ یعنی زمین و آسمان کو سیکارگی ایسا باریک کر دیا جائے گا جیسا ہاون دستے میں کوئی چیز کوٹ کر باریک کر دی جاتی ہے۔ اور یہ گمراہوں کی بات نہ ہو جائیں گے۔ دوسری جگہ فرمایا إِذَا الشَّمْسُ كُوَّتَتْ

وَالْجُودُ أَنْكَدَرْتُ“ سورج اور تاروں کا بیان فرمایا۔ جو شخص قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہے تو وہ سورۃ قارعۃ سورۃ شمس، سورۃ واقعہ اور سورۃ عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ کو پڑھ لے۔ تو فرمایا جب قیامت برپا ہوگی تو پہاڑ جو سب سے مضبوط ہیں، ان کو کوٹ دیا جائے گا۔ اور وہ گرد و غبار کی مانند اڑنے لگیں گے۔ سمندر بھاپ بن کر اڑ جائیں گے۔ کتنا خوفناک منظر ہوگا۔

قیامت برپا ہو جائیگی

فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ۔ پس اس دن واقع ہو جائے گی واقع ہونے والی۔ یہ واقعہ، قارعہ، طامہ وغیرہ قیامت ہی کے مختلف نام ہیں وہ حاقہ یعنی ثابت شدہ چیز ہے وہ تو ضرور ہو کر رہنے والی ہے اور واقعہ یعنی واقع ہو جائے گی۔

اس نام پر ایک مستقل سورۃ بھی ہے سورۃ واقعہ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَيْسَ لَوْقَعَتِهَا كَاذِبَةٌ“ یعنی جب وہ واقع ہونے والی چیز واقع ہو جائے گی اور اس کے واقع ہونے کی بات غلط نہیں ہے اس سورۃ میں بھی یہی مضمون ہے کہ پہاڑ چلا دیے جائیں گے، ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور آسمان کا یہ حال نہیں رہے گا جواب نظر آتا ہے۔ وَانشَقَّتِ السَّمَاءُ اور آسمان پھٹ جائے گا۔ سارا معاملہ درہم برہم ہو جائے گا۔ فَإِنَّمَا يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ آسمان اُس دن بڑا بکھرنے والا ہوگا۔ واہیۃ کا معنی کمزور۔ آج تو آسمان مضبوط چھت کی صورت میں نظر آتا ہے، اس کے اندر بڑے بڑے کمرے نظر آتے ہیں مگر جس دن یہ واقعہ پیش آئے گا، اُس دن کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اور جس وقت یہ واقعہ پیش آئے گا وَالْمَلَكُ عَلَى أَرْجَائِهِمْ اور فرشتے اس کے اطراف پر ہوں گے۔ فرشتوں پر بھی دہشت طاری ہوگی۔ کیونکہ ساری کائنات پر دہشت طاری ہوگی۔ جیسا کہ سورۃ انبیاء اور دوسری سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، کہ ہر طرف ایک مدہوشی طاری ہوگی۔ اور فرشتے اس کے اطراف و اکناف پر ہوں گے۔

حاملین عرش فرشتے

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَنِيَّةٌ“ اور اٹھائیں گے تیرے رب کے عرش کو اپنے اوپر اُس دن اٹھ۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس وقت حاملین عرش فرشتے چار ہیں۔ جب قیامت واقع ہوگی تو اُس وقت ان کی تعداد آٹھ ہو جائے گی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ کہ یہ بات انسان کی تفہیم اور اُس کے ذہن کو قریب کرنے کے لیے بیان کی ہے۔ کیونکہ عرش کا نظام بھی ایسا ہی ہے جیسے نظام حکومت ہوتا ہے۔ تو مطلب یہ ہے۔ کہ قیامت کے روز حاملین عرش آٹھ ہوں گے۔ باقی رہی فرشتوں کی کیفیت کہ وہ عرش

کو کس طرح اٹھائے ہوئے ہیں تو یہ باتیں انسانی عقل سے بالا ہیں۔ اس پر ایمان ہی رکھنا چاہیے کہ جیابھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، وہ صحیح ہے۔ مگر عقل انسانی سے بالا ہے۔ کہ انسانی فہم میں یہ کیفیت نہیں آ سکتی۔ باقی یہ بات کہ فرشتوں کو عرش کو اٹھانے کی کیا ضرورت ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے وہ جس طرح چاہے کرے۔ اتنی بات محض سمجھانے کے لیے کی ہے۔

فرشتوں کے متعلق بہت سی باتیں حدیث شریف میں آتی ہیں۔ یہ بڑی طاقت والے فرشتے ہیں۔ ابو داؤد شریف ابن ابی حاتم اور دوسری روایات میں ان فرشتوں کی جو حالت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے جسم کی کلانی ایسی ہے کہ کان کی کوسے کندھے تک سات سو سال کی مسافت ہے، اتنی بڑی کلانی ہے۔ ان فرشتوں کی اتنی بڑی بڑی جسامت ہے۔ اس کے مقابلہ میں ارض و سما کی کوئی حیثیت نہیں قرآن پاک میں عرش الہی کو عرش عظیم کہا گیا ہے یعنی بہت بڑا عرش۔

فرمایا آج اس کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں، اُس دن اُٹھ ہو جائیں گے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اس کی وجہ یوں بیان کی ہے کہ جب قیامت واقع ہوگی تو اُس دن خدا تعالیٰ کی قہری تجلی نازل ہوگی جس کی وجہ سے عرش الہی کا ثقل بہت بڑھ جائے گا۔ اُس دن کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائیگا اور پھر محاسبے کی منزل آئے گی تو خدا تعالیٰ کی قہری تجلی پڑ رہی ہوگی۔ اس لیے کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں رہے گی، سخت گھبراہٹ ہوگی۔ عرش کا ثقل بڑھ جائے گا۔ لہذا اُس دن اسے اُٹھانے کے لیے اُٹھ فرشتے مقرر ہوں گے۔

حضرت حسن بصریؒ کی روایت میں یوں آتا ہے کہ لا اُدْرٰی یعنی میں نہیں جانتا کہ اُٹھ اشتخاص مراد ہیں یا اُٹھ صفیں یا اُٹھ ہزار فرشتے۔ بہر حال اتنی بات واضح ہے کہ آج چار ہیں اُس دن اُٹھ ہو جائیں گے۔

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ نظام کائنات کو چلانے کے لیے آج اللہ تعالیٰ کی چار صفات یعنی علم، قدرت، ارادہ اور حکمت کام کر رہی ہیں۔ قیامت کو چار مزید صفات کا ظہور ہوگا، ان میں ایک صفت انکشاف ہے۔ آج جو چیزیں مخفی ہیں، اُس دن کھل جائیں گی۔ ہر چیز ظاہر ہوگی یہ صفت انکشاف کا فیضان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت سبوغ و کمال کا ظہور ہوگا۔ اُس دن ہر چیز مکمل شکل میں ظاہر ہوگی۔ تیسری صفت طہارت اور تقویٰ کا کام کرے گی۔ وہاں پر نجاست اور گندگی

نظام کائنات کیلئے
اللہ کی اُٹھ صفات

نہیں ہوگی۔ سنجاست صرف سزا کے طور پر دوزخیوں کو دی جائے گی جیسے پیپ انون وغیرہ علم طور پر وہاں تقدیس کا ظہور ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی چوتھی صفت عدل کا ظہور ہوگا۔ اور اس طرح گویا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی آٹھ صفات کا ظہور ہوگا۔

اسی لیے فرمایا کہ اُس دن ہر فرشتہ ایک صفت کے ساتھ اپنا فریضہ سرانجام دے گا۔ لیکن مفسرین فرماتے ہیں کہ چونکہ ایسی باتیں انسانی عقل میں نہیں آسکتیں لہذا ان پر صرف ایمان ہی رکھنا چاہیے۔ اور ان کو مشابہات میں شمار کرنا چاہیے۔

عرش الہی تجلی عظم

جیسا کہ حدیث میں آتا ہے ساتوں زمین اور ساتوں آسمان طے کرنے کے بعد بہشت آتا ہے۔ اور بہشت کے بھی آٹھ طبقات ہیں۔ سب سے اوپر کا طبقہ جنت الفردوس ہے۔ سچے طبقے سے لے کر بالائی طبقے تک پچاس ہزار سال کی مسافت ہے۔ پھر اس کے اوپر عرش الہی ہے۔ عرش الہی بھی مخلوق ہے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ خدا کی ذات سب سے دراز الوریٰ ہے۔ اس عرش پر اللہ تعالیٰ کی جو تجلی پڑتی ہے، اس کو شاہ ولی اللہ تجلی عظم کا نام دیتے ہیں۔ جب وہ پڑتی ہے تو پہلے عرش رنگین ہوتا ہے۔ پھر ساری کائنات رنگین ہوتی ہے۔ اور پھر اس کے نتائج پلٹ کر جاتے ہیں یہ تجلی کب سے پڑ رہی ہے اور کب تک پڑتی ہے یہی اللہ تعالیٰ کی عقل و فکر سے باہر ہے۔ جب انسان بہشت کے مقامات عالیہ میں پہنچے گے تو سمجھ میں آئے گا۔ اس وقت انسانی عقل کی وہاں تک رسائی نہیں ہے۔ بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کے نظام حکومت کی بات ہے۔ اُس کے نظام حکومت کا ظہور اس طریقے سے ہوگا۔

مخلوق کی پیشی
خالق کے روبرو

دنیا میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے حلقے ذکر کر کے بتلایا کہ یہ لوگ قیامت کا انکار کرتے تھے مگر دیکھو ان پر کیسے حلقے پڑے۔ اور جب بڑا حلقہ واقع ہوگا یعنی قیامت برپا ہوگی تو پھر کیا ہوگا۔ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ اُس دن تم پیش کئے جاؤ گے۔ جس طرح عدالت میں پیشی ہوتی ہے گواہ لائے جائیں گے، باز پرس ہوگی۔ لَا تَخْفَىٰ مِنْكُمْ خَافِيَةٌ تم میں سے کوئی نفس چھپے گا نہیں۔ دنیا میں تو کئی لوگ چھپ جاتے ہیں۔ عدالت میں پیش نہیں ہوتے۔ حکومت ان کو تلاش کرتے ہیں۔ عاجز آ جاتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ایسا نہیں ہو سکے گا۔ وہاں کوئی نہیں چھپ سکیگا۔ یا خافیکہ سے مراد یہ ہے کہ وہاں کوئی بات اور کوئی خصلت چھپ نہیں سکے گی۔ دنیا میں تو ہزاروں کہ درڑوں باتیں چھپی رہتی ہیں مگر وہاں کوئی بات، کوئی خصلت چھپی نہیں رہے گی، سب ظاہر ہو جائیگی۔

یہ جو فرمایا کہ اُس دن پیشی ہوگی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اُس دن تین پیشیاں ہوں گی جو پیشیاں ایسی ہوں گی فِجْدَالٌ وَمَعَارِیضُ کہ سوال و جواب اور جھگڑا وغیرہ ہوگا۔ جب تیسری پیشی ہوگی تو اعمال نامے اڑنے شروع ہو جائیں گے۔ فرمایا تیسری پیشی پر کسی کو دانتیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملے گا اور کسی کو بانٹیں ہاتھ میں۔

فَإِمَّا مَنُّ أُولَىٰ كِتَابِهِ بِيَمِينِهِ ۖ حَسْبُكَ أَعْمَالُ نَامَةِ دَائِيں ہاتھ میں ملے گا، فَيَقُولُ
وہ کتنا پھرے گا اَوَّمُرُّا قَرِّءُوا كِتَابِيَّةً ۔ لو بھی امیر اعمال نامہ پڑھ لو، بڑا خوش ہو گا ہاتھوں
کے معنی خذ یعنی لے لو۔ اقْرؤْا كِتَابِيَّةً ۔ میرا اعمال نامہ پڑھ لو۔ مجھے اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں
ملا ہے کامیاب ہو گیا ہوں۔

بعض دوسری احادیث میں آتا ہے کہ دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ کیا ملے گا گو یا جواز یعنی پاسپورٹ یا ویزا مل گیا۔ جس کے بغیر دوسری جگہ نہیں جاسکتا تھا۔ یہ بہشت کا ویزا ہو گا خدا کی جانب سے فلاں بن فلاں کے لیے فرمایا کہ دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ وصول کرتے والوں کو جنت میں داخل کر دو وہ کامیاب ہونے والے ہیں۔ وہ مائے خوشی کے لوگوں کو اعمال نامہ دکھاتا پھرے گا اور کہے گا اِلٰہُ خَلَقْتُ اِلَیْكَ مَلٰٓئِکَہٗمَ لَیْسَ لَکُمْ فِیْہِمْ حِسَابٌ ۝۱۰۱ میں تو یقین رکھتا تھا کہ ایک نہ ایک دن حساب کا آئینا ہے اور باز پرہیز ضرور ہوگی۔

تو دایں ہاتھ میں اعمال نامہ وصول کرے والا آدمی فَمَوْفٍ عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ بڑی
پسندیدہ زندگی پائے گا۔ من مانی گزراں کرے گا۔ وہ جس قسم کی خواہش کرے گا، وہاں اُس کو زندگی
کے ویسے ہی لوازمات نصیب ہوں گے۔ رَاضِيَةٍ کے معنی بہت پسندیدہ زندگی کے اندر
ہوگا۔ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ بڑے اونچے باغات میں ہوگا۔ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ اُن کے پھل
قریب ہوں گے۔ درختوں کے اوپر چڑھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ نہ سیڑھیاں لگانی پڑیں گی نہ
کمر سے رسمہ باندھنے کی ضرورت ہوگی جیسے کھجوریں اتارتے کے لیے باندھنا پڑتا ہے بلکہ جب خواہش
ہوگی مطلوبہ پھل خود بخود جھک کر منہ کے قریب آجائے گا تاکہ وہ اس کو آسانی سے لے لے۔ اس
کے بعد اپنی جگہ واپس چلا جائے گا۔

جنت میں کوئی سہولیت
نہیں ہوگی

جنتیوں سے کہا جائے گا کُلُوْا وَاشْرَبُوْا هٰیثُ شِئْتَ خَوْشِ گواہی سے کھاؤ پیو جتنا چاہے

کھاؤ، یہاں نہ بد مضمی ہوگی، نہ سرور ڈالیں گے۔ نہ کوئی پیٹ میں فضلہ پیدا ہوگا۔ ہر چیز بہت واسے جو چیز بھی کھائیں گے ایک خوشبودار ڈکار کے ساتھ سب کچھ مضمی ہو جائے گا۔ لَا یَبُولُونَ انہیں بول و براز کی حاجت بھی نہیں ہوگی۔ وہ پاک جگہ ہوگی، وہاں کوئی گندگی نہیں ہوگی نہ رینٹ ہوگا، نہ بلغم والی عتوک ہوگی نہ کوئی پیٹ میں تکلیف پیدا ہوگی۔ بلکہ ایک خوشبودار بشار یعنی ڈکار کے ساتھ ہر چیز مضمی ہو جائے گی۔

اور یہ ساری نعمتیں اس وجہ سے ہیں بِمَا اسْلَفْتُمْ فِي الْآيَاتِ الْخَالِيَةِ جو تم نے بھیجا، گزے ہوئے یا فراموشیوں میں۔ یعنی دنیا میں عقیدہ درست کیا، نیک اعمال کئے۔ یہ ان اعمال کا صلہ ہے۔ جو تم نے دنیا میں اختیار کئے اور اپنے لیے ذخیرہ آخرت آگے بھیجا۔ یہ سلوک تمہارے ساتھ اس وجہ سے کیا جا رہا ہے۔

وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ ۖ فَيَقُولُ يَلَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَةَ ۖ
 وَلَمْ أَدْرِمَا حِسَابِيَةَ ۚ يَلَيْتَهَا كَانَتْ الْقَاضِيَةَ ۚ (۲۵)
 مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهُ ۚ (۲۶) هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيهِ ۚ (۲۷) خَذُوهُ
 فَقُلُوهُ ۚ (۲۸) ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ۚ (۲۹) ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا
 سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ۚ (۳۰) إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ
 الْعَظِيمِ ۚ (۳۱) وَلَا يَحْضُرُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمُسْكِينِ ۚ (۳۲) فَلَيْسَ لَهُ
 الْيَوْمَ هُمْ مَنَاحِيْمُهُ ۚ (۳۳) وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غَسَلِينَ ۚ (۳۴) لَأَكْلَهُ
 إِلَّا الْخَاطِئُونَ ۚ (۳۵)

ترجمہ: اور بہر حال وہ انسان جس کو اس کا اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا
 کاش کہ میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا (۲۵) اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے (۲۶)
 کاش کہ یہ موت مجھے ختم ہی کہہ دیتی (۲۷) افسوس کہ آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا (۲۸)
 افسوس کہ آج میرا اقتدار بھی برباد ہو گیا (۲۹) (فرمائیے گا) اس کو بچھڑو اور اس کے گلے
 میں طوق ڈال دو (۳۰) پھر اسے جہنم کی آگ میں ڈال دو (۳۱) پھر اس کو ایسی زنجیر میں
 جسی لمبائی ستر گز ہے جکڑ دو (۳۲) تحقیق وہ عظمتوں والے خدا پر ایمان نہیں رکھتا تھا (۳۳)
 اور مسکین کے کھانا کھلانے پر بے نیگہتہ بھی نہیں کرتا تھا (۳۴) پس آج اس کا یہاں کوئی
 دوست نہیں (۳۵) اور آج اسے غسلین (زخمیوں کے دھون) کے سوا کھانا بھی کوئی
 نہیں ملے گا (۳۶) اس کو صرف خطا کار ہی کھائیں گے (۳۷)

گزشتہ سے پوستر

قیامت واقع ہونے پر انسانوں کے دو گروہ ہو جائیں گے۔ پہلی آیتوں میں صور پھونکنے کا ذکر
 ہوا۔ نظامِ جہان کے درہم برہم ہو جانے اور زمین و آسمان کے تغیر و تبدل کا بیان ہوا۔ اُس روز عرش
 الہی اور ملائکہ کی کیفیت کا حال بھی ذکر کیا گیا پچھلے درس میں اُس گروہ کا ذکر ہوا اَمِنْ اُوْتِيَ كِتَابَهُ
 بِسَمِيْنَةٍ جس کو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ بڑا خوش ہو گا۔ اپنا اعمال نامہ لوگوں کو

دکھاتا پھرے گا۔ اس گمروہ کو ملنے والے انعام و اکرام کا ذکر بھی پچھلے درس میں ہو چکا ہے۔

اب ناکام ہونے والے گمروہ کا بیان ہوتا ہے۔ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ بہر حال وہ انسان جس کو اس کا اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں دیا گیا۔ فَيَقُولُ يَلِيْتَنِي لِمَ أُوتِيَ كِتَابَهُ وہ کہے گا کاش کہ یہ اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا۔ یہ اصحاب شمال ہیں۔ جیسا کہ سورۃ واقعہ میں گزر چکا ہے۔ أَصْحَابُ الشِّمَالِ مَا أَصْحَابُ الشِّمَالِ فِي سُوءٍ وَحَمِيمٍ، وَخَلٍ مِّنْ يَّحْمُومٍ اُس دن لوگوں کا بہت بُرا حال ہو گا۔ یہ اصحاب شمال ہیں۔ جن کا اعمال نامہ قیامت والے دن بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اور سورۃ الشقاق میں وَرَأَوْا ظَهْرَهُ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ ایسے لوگوں کا اعمال نامہ پیچھے سے دیا جائے گا۔ یعنی سامنے نہیں دیا جائے گا۔ ان لوگوں کو نہایت ذلت کے ساتھ پیچھے کی طرف سے بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا۔

دایاں ہاتھ بہت اور قوت والا ہوتا ہے جب کہ بائیں ہاتھ دائیں کی نسبت کمزور ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ عزت والے کام دائیں ہاتھ سے کرنے چاہئیں۔ کسی کو کوئی چیز دینا ہو مصافحہ کرنا ہو، دائیں ہاتھ سے کرنا چاہیے۔ حقارت کے کام، گندگی صاف کرنا۔ استنجہ پاک کرنا وغیرہ بائیں ہاتھ سے کئے جاتے ہیں۔

الغرض جس کا اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کے اعمال اس قدر کمزور ہیں کہ وہ خدا کے عذاب کو روک نہیں سکتے، لہذا یہ شخص عذاب میں مبتلا ہو گا۔ اگر اس کے اعمال میں قوت ہوتی تو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملتا۔ اور اس کے اعمال غضب الہی کو روک سکتے۔

لہذا بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ حاصل کرنے والا شخص افسوس اور حسرت کا اظہار کرے گا اور کہے گا

اظہار افسوس

يَلِيْتَنِي لِمَ أُوتِيَ كِتَابِي کاش! کیا اچھا ہوتا یہ اعمال نامہ مجھے ملتا ہی نہ۔ وَلَوْ

أُورِثَ مَا حَسِبِي میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ مجھے علم ہی نہ ہوتا۔ يَلِيْتَنِي كَأَنَّتِ

الْقَاضِيَةُ افسوس کہ یہ قیامت یا موت مجھے ختم ہی نہ ہوتی، میرا وجود ہی باقی نہ رہتا دوبارہ زندگی حاصل

نہ ہوتی۔ سورۃ النبا میں ہے۔ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَلِيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا کاش میں مٹی ہوتا، بے جان

ہوتا، عقل و شعور سے خالی ہوتا تو آج اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتا۔ مگر اس کا اظہار افسوس کچھ کام نہیں

آئے گا۔

مال کچھ کام
نہیں آئیگا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن باتوں کا ذکر فرمایا جن کی وجہ سے لوگ غرور کرتے تھے، اتراتے تھے۔ اور جن کی وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيكَهٖ بَايَسَ مَا تَهْوَاهُ لَوْ كَفَّ اَفْسُوسُ مَلْتَمَے ہوئے کہیں گے کہ افسوس میرا مال آج میرے کچھ کام نہ آیا۔ وہ مال جسے دنیا میں سمیٹ سمیٹ کر رکھتے تھے اور اسے من مانے طریقے سے خرچ کرتے تھے، آج وہ ان کے کسی کام نہیں آئے گا۔ گذشتہ سورۃ میں گزر چکا ہے کہ وہ لوگ اس بات پر غرور کرتے تھے کہ اُن کا نَ ذَا مَالٍ وَبَنِيْنٌ کہ اللہ نے انہیں مال اور اولاد دی ہے۔ حالانکہ آخرت میں یہ چیزیں کسی کام نہ آئیں گی۔ اسی طرح سورۃ ہمزہ میں آتا ہے کہ دنیا میں مال جمع کرنے والا یَحْسِبُ اَنْ مَّا لَهٗ اَخْلَدَهٗ سمجھتا تھا کہ میں ہمیشہ خوشحال رہوں گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے عام طور پر انسان اسی مال کی وجہ سے مفتون ہوتا ہے۔ اور آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔

سورۃ التعلیٰت میں ہے وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ انسان مال کی محبت میں پکا بھی ہے۔ فطرت انسانی ہے کہ عام طور پر مال سے بڑی محبت ہوتی ہے اسی لیے شریع الہیہ یعنی آسمانی شریعتیں لوگوں کو تہذیب سکھاتی ہیں۔ مال کی محبت بے شک فطری ہے۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ اس میں مبتلا ہو کر انسان فرائض کو ترک کر بیٹھے۔ ایسی صورت میں یہی مال وبال بن جائے گا۔ اگر مال کو ہی معبود بنا لیا، حلال و حرام کی تمیز چھوڑ دی تو یہی مال فتنہ بن جائے گا۔ چنانچہ اس جگہ یہی بات بیان ہو رہی ہے کہ بائیں لحظہ میں اعمال نامہ حاصل کرنے والا آدمی کہے گا مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيكَهٗ افسوس! میرے مال نے مجھے کچھ کام نہ دیا۔

البولسب کا واقعہ قرآن پاک میں موجود ہے۔ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ الْبُلْسَبُ بڑا دولت مند آدمی تھا مگر جب خدا تعالیٰ کی گرفت آئی تو اس کے مال نے اور جو کچھ اُس نے کمایا تھا، کچھ بھی کام نہ آیا۔

اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ آخرت میں جب دنیا کے دولت مند دیکھیں گے کہ غریبوں سا کین کو بڑے درجے اور فلاح نصیب ہو رہی ہے۔ تو تمنا کریں گے کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی جاتیں، ہم ایسی تکالیف و ماں برداشت کر لیتے اور اس کے بدلے آج ہمیں راحت نصیب ہوتی، درجہ ملتا، مگر اس وقت ان کا کف افسوس ملنا کسی کام نہ آئے گا۔

اقتدار بھی جاتا
ہے گا

مال کے بعد اقتدار ایسی چیز ہے جس پر انسان اترتا ہے جس کے پاس حکومت ہوتی ہے وہ ہمیشہ غرور کرتا ہے۔ ایسا انسان شاذ و نادر ہی ہوگا جو اقتدار پر ٹانٹہ ہونے کے باوجود جامہ انسانیت میں ہے۔ انصاف قائم کرے۔ مخلوق خدا پر ظلم نہ کرے، لوگوں کا استحصال نہ کرے، مگر قیامت کے روز یہ چیز بھی اس کے کام نہ آئے گی اور وہ کہے گا هَلْكَ عَنِّي سُلْطَانِيَّةُ اَفْسُوس کہ آج میرا اقتدار بھی برباد ہو گیا۔ حکومت بھی چھین گئی۔ آج نہ کوئی نوکر چاکر ہے، نہ فوج ہے، نہ پولیس ہے، نہ سیکورٹی والے ہیں جو میرے کام آئیں۔ مگر وہاں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ انسان بے یار و مددگار ہوگا۔ بلکہ یہی چیزیں اس کے لیے ہلک ثابت ہوں گی۔

امت محمدیہ کا
فتنہ مال ہے

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے لِكُلِّ اُمَّةٍ فِتْنَةٌ ہر امت کا کوئی نہ کوئی فتنہ ہوتا ہے وَفِتْنَةُ اُمَّتِي الْمَالُ اور میری امت کا فتنہ مال ہے فرمایا مجھے اس بات کا خطرہ نہیں ہے کہ تم فقر میں ہلاک ہو جاؤ گے۔ مجھے خطرہ یہ ہے کہ تم پر دنیا پھیلا دی جائے گی اَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا فَتُهْلِكُ كَمَا اَهْلَكْتَهُمْ پھر تم کو وہ اس طرح ہلاک کر دے گی جس طرح پہلے لوگوں کو کیا۔ دنیا میں غرور و تجر کیا۔ بڑائیوں میں پڑ گئے اور تباہ ہوئے۔ دنیا کا پھیلاؤ ہی سب کو تباہ کر دے گا۔ اور ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ میری امت کا فتنہ مال ہے۔

مخصوص اخلاق
حیا ہے

نبی علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ہر امت کا کوئی مخصوص اخلاق ہوتا ہے۔ اور میری امت کا مخصوص اخلاق حیا ہے۔ جب تک امت میں حیا باقی رہے گی ٹھیک رہیں گے۔ جب حیا اٹھ جائے گی تو ناکام و نامراد ہوں گے، برباد ہو جائیں گے۔

مال و جاہ کا
غلط استعمال

تو فرمایا کہ مال اور اقتدار یہ دو چیزیں ہیں جن میں مبتلا ہو کر اکثر و بیشتر لوگ ناکام ہوتے ہیں کیونکہ ان دونوں چیزوں کو غلط استعمال کرتے ہیں۔ قیامت کے روز ان کے پاس نہ مال ہوگا نہ اقتدار ہوگا بلکہ وہاں تو فلاح ہوئے۔ اور جیسا کہ آگے آخری آیت میں آ رہا ہے، اس وقت انسان اس کا افسوس کرے گا۔

مجرمین کا جہنم
رسید ہونا

ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا خُذُوهُ فَغُلُّوْهُ اس کو پکڑ لو اور اس کے گلے میں طوق ڈال دو۔ یہ مجرم ہے جیسا کہ سورۃ یس میں آتا ہے فِيْ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلَالٌ ان کے گلے میں طوق ہوں گے۔ اسی طرح یہاں بھی فرمایا کہ حکم ہوگا کہ طوق پہنا کر ثُمَّ الْجَحِيْمُ صَلْوٰهُ اسے جہنم کی آگ میں ڈال دو۔ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ پھر ان کو زنجیروں میں جکڑ دو ان زنجیروں میں

ذُرْعَهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْجُدْ لَهُ مِثْلَ الْمَلَأَى سِتْرًا سِتْرًا كُنْزُهُ فِي جِبْرِ طَرَفِ جَهَنَّمَ فِي مِثْلِ مِثْلِ دُرٍّ
بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ وصول کرنے والا شخص آج اسی سزا کا مستحق ہے۔ اسے زنجیروں میں جکڑ کر اور
گلے میں طوق ڈال کر جہنم رسید کر دو۔

خدا کے عظیم
کا انکار

ایسے لوگوں کی جہنم رسیدگی کی دو وجوہات اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائیں۔ ایک تو یہ کہ اِنَّهٗ كَانَ
لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وہ عظمتوں والے خدا پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ جب اللہ کے نبی کہتے تھے
قُولُوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تَفْلَحُوْا یعنی اللہ پر ایمان لے آؤ، فلاح پا جاؤ گے، تو یہ اکرٹا تھا۔ خدا
کی توحید کو نہیں مانتا تھا۔ بلکہ کہتا تھا کہ باپ دادا کے تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کو مان لیں
یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ الٹا اکرٹا تھا۔ کہتا تھا العباد باللہ اس بیوقوف آدمی کی بات کو کیسے مان لوں،
اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ تُوْپَاکُل ہے، دیوانہ ہے۔ اسے اس جرم کی پاداش میں جہنم رسید کیا جا رہا ہے۔ کہ
اِنَّهٗ، كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ کہ وہ خدا کے برتر پر ایمان نہیں لاتا تھا۔

اطعام مسکین
سے اعراض

اس کا دوسرا جرم یہ ہے کہ وَلَا يَخْصُصُ عَلٰی طَعَامِ الْمُسْكِيْنَ مسکین کو کھانا کھلانے پر
برا نیگہ نہ بھی نہیں کرتا تھا۔ نہ خود مسکین کو کھانا کھلاتا تھا، نہ دوسروں کو ہی ترغیب دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ
نے ان دو جرائم کا ذکر کیا جن کی پاداش میں اس کو ذلت و رسوائی کے ساتھ دوزخ میں ڈالا جا رہا ہے
اہم راز می جو چھٹی صدی کے آخر میں اور ساتویں صدی کے شروع میں گزرے ہیں۔ آپ کا انتقال

دین کا خلاصہ

۶۰۶ھ میں ہوا۔ آپ بڑے اہم تھے۔ انہوں نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے۔ کہ دین کا خلاصہ اور نچوڑ دو
چیزیں ہیں اگر کوئی شخص دین کو سمجھنا چاہے تو اس کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے اور
وہ یہ ہے اَللّٰهُ الْعَظِيْمُ لَا مَرٰلَہٗ وَالشَّفَقَتُ عَلٰی خَلْقِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے احکام کی تعظیم
اور مخلوق خدا پر شفقت۔ ان دو چیزوں کو پھیلایا جائے تو دین کے سارے قوانین انہیں میں آجائیں گے۔
عام متکلمین کے انداز میں اس کو یوں بیان کریں گے کہ دین نام ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد

حقوق اللہ
حقوق العباد

کا۔ یا اللہ کے حقوق ہیں یا مخلوق کے، تیسری چیز کوئی نہیں۔ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ حقوق
اللہ ہیں۔ جو شخص اللہ کے حقوق نہیں مانتا وہ دہریہ ہے یا کافر۔ لہذا ناکام ہوتا ہے۔ اور جو شخص
مخلوق کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ مخلوق پر شفقت نہیں کرتا، وہ بھی ناکام اور مردود ہے۔ الغرض
ان دو قوانین کو پھیلایں گے تو ہر چیز اس میں آجائے گی۔ ان سے باہر کوئی چیز نہیں ہے۔ دین اسی

کا نام ہے۔

تو مطلب یہ ہے کہ یہ شخص نہ تو اللہ کا حق ادا کرتا تھا، نہ مخلوق کا حق اور عنوان یہ ہے لَا يُؤْمِنُ
بِاللَّهِ الْعَظِيمِ خدائے عظیم کی توحید کو نہیں مانتا تھا۔ اور مسکین کے کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا
تھا۔ خود کھانا تو کجا، دوسرے کو بھی آمادہ نہیں کرتا تھا۔ اُس میں یہ ادنیٰ درجے کی نیکی بھی نہیں تھی جیسا
کہ سورۃ دہر میں ہے وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا اللہ تعالیٰ نے ان
لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنی خوشی سے مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

باعزت روٹی انسان
کا بنیادی حق ہے

مسکین کو روٹی کھلانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھیک مانگنے والوں کو دے کر بھکاریوں کی تعداد
میں اضافہ کیا جائے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ محتاج کی روزی کا مستقل بندوبست کیا جائے۔ اس کے لیے
باعزت روزگار دیا کر کے باعزت روٹی کا انتظام کیا جائے۔ آج کی دنیا میں بھی اَلْخُبْنُ بِالْكَرَامَةِ
کا بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ ہر شخص کو باعزت روٹی ملنی چاہیے۔

در بدر بھیک مانگنا انسانیت کی تذلیل ہے۔ یہ صرف ہمارے ممالک کا ہی رواج ہے اور یہ
ذلت ہمارے ہی مقدر میں ہے۔ ورنہ عیسائی ممالک میں کوئی بھیک نہیں مانگتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ
ہم دین سے دور ہو گئے ہیں، مذہب سے بیگانہ ہو گئے۔ جہالت، تاریکی، شرک، بدعت وغیرہ تمام
قباحتیں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔

خلیجی نے سیرت میں لکھا ہے کہ پہلی صدی کے آخر میں آدھی دنیا سے زیادہ پر مسلمانوں کی سلطنت
تھی، جہاں جہاں مسلمان تھے کہیں ایک جگہ بھی کوئی قبیحہ خانہ نہیں تھا۔ انگریز کے زمانہ میں لائسنس
لے کر برائی کرنے والی پچھتر فی صد عورتیں مسلمان تھیں۔ یہی حال مصر، ایران اور ہندوستان میں تھا۔
مسلمانوں پر اس قدر ذلت مسلط ہو گئی تھی۔

گداگری حرام ہے

شاہ ولی کہتے ہیں کہ ہمارے دین میں گداگری حرام ہے۔ یہ اسی طرح اکسا پھارہ میں شمار ہوتی ہے
جیسے چوری، ڈاکہ، زنا وغیرہ۔ لیکن حکومتیں اس کا خاطر خواہ انتظام نہیں کرتیں، وہ اپنی عیاشی میں لگی
ہوئی ہیں سیکھیں بن رہی ہیں، اعلان ہو رہے ہیں یہ ہو جائیگا، وہ ہوشیار بننے کو در منظر ہوا۔ مگر حال یہ ہے کہ
لوگ بھیک مانگ رہے ہیں اور ان کی عیاشی چل رہی ہے۔ ملی وی جیسی بڑی اور حرام چیزوں پر کیوں دولت
خرچ کی جا رہی ہے۔ غیر ضروری چیزوں کی حکومت کیوں اجازت دے رہی ہے۔ عیاشی کے کاموں پر

ارہوں روپیہ خرچ کر نیکی بجائے حکومت مبالغہ اور غربا پر دوری کا بندوبست کیوں نہیں کرتی بلکہ ہم جس نظام کا حصہ ہیں اس کا خاصہ ہی یہ ہے کہ خود عیش کرو، دوسروں کی فکر نہ کرو۔ کوئی مرتا ہے مرنے دو، اسلام کا نام لیتے رہو، غریبوں اور مزدوروں کا نام لیتے رہو مگر ان کی خدمت کا کام مت کرو۔ محض نام لے کر زندگی گزارو۔

غربا کی دستگیری مسلمان
سوسائٹی کا فریضہ ہے

الغرض لَا يَحْضُرُ عَلَى طَعَامِ الْمَسْكِينِ سے مراد یہ ہے کہ مسکین کو بھکاری نہ بناؤ۔ ان کو باروز گار بناؤ۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے کر چلو۔ جو سوسائٹی اپنے غربا و مساکین کی دست گیری نہیں کرتی، وہ ذلیل سوسائٹی ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں باعزت نہیں ہے۔ صدقہ خیرات تو وقتی چیزیں ہیں ان سے وقتی طور پر گزارا وقت ہو سکتی ہے، بھیک کا دروازہ نہیں کھل جانا چاہیے۔ بھیک کی اجازت دینا انسانیت کی تدلیل ہے اپنے غربا و مساکین کی مستقل بحالی کا بندوبست مسلمان سوسائٹی کا فریضہ ہے۔

دوزخی بے یار و مددگار
رہ جائیں گے

چونکہ باتیں ہاتھ والا شخص نہ حقوق اللہ ادا کرتا تھا، نہ حقوق العباد، اس لیے فرمایا کہ اسے ستر ستر گز لمبی زنجیروں میں جکڑ کر اور گلے میں طوق ڈال کر جہنم میں پھینک دو۔ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هُمْنٌ مِّنْ حَمِيمٍ آج اُس کا یہاں کوئی دوست نہیں ہے۔ دنیا میں اس کے بڑے دوست تھے جو برائی میں اس کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ مگر آج وہ بے یار و مددگار ہے۔ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غَسَلِينَ۔ آج اُسے غسلین کے سوا کھانا بھی کوئی نہیں ملیگا۔ غسلین، زنجیروں کے دھوون یعنی پیپ اور خون ملے ہوئے زرد پانی کو کہتے ہیں۔ یہ اُسکی خوراک ہوگی۔

جب انسان جسمانی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔ یا غم میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کے لیے دو ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک مخلص دوست جو دکھ درد میں اس کی غم خواری کرے، اس سے باتیں کرے اور دوسرا کھانا جو اسکی جسمانی قوت کی بحالی میں مدد دے، تو اس ضمن میں فرمایا کہ دوزخیوں کا نہ کوئی دوست ہوگا جو ان سے ہمدردی کا اظہار کرے ان کے دکھ درد میں شریک ہو، پیار و محبت کی بات کرے اور نہ انہیں کھانا ہی ایسا پیش ہوگا جو کمزوری کا مقابلہ کر سکے۔ سورة غاشیہ میں فرمایا لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ دوزخیوں کا کھانا نہ بھوک سے بچائے گا نہ جسم کو فائدہ دے گا۔

فرمایا اس قسم کا کھانا لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ صرف خطا کار ہی کھائیں گے۔ وہ خطا کار جو حقوق اللہ اور حقوق العباد سے اعراض کرتے ہیں، یہ کھانا ان کے لیے ہوگا۔ البتہ مومنوں

کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑے اعزاز رکھے ہیں۔ ان کا ذکر پہلی آیات میں آچکا ہے۔ کہ ان کو حکم ہو گا۔
 ”كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ“ تم اُن اچھے کاموں کے بدلے میں
 جو دنیا میں سرانجام دیتے ہو، خوب کھاؤ پیو۔ عیش و آرام کی زندگی بسر کرو۔

فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ ۝۳۸ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ ۝۳۹ إِنَّهُ لَقَوْلُ
رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝۴۰ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُوْمِنُونَ ۝۴۱ وَلَا
بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذْكُرُونَ ۝۴۲ تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ
۝۴۳ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ ۝۴۴ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ
۝۴۵ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝۴۶ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ
عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝۴۷ وَإِنَّهُ لَتَذْكُرَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ۝۴۸ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ
أَنَّ مِنْكُمْ مُّكْذِبِينَ ۝۴۹ وَإِنَّهُ لَحُسرَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝۵۰
إِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ۝۵۱ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝۵۲

۵۲

ترجمہ: پس قسم ہے مجھے ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو ۝۳۸ اور ان چیزوں کی جن کو
تم نہیں دیکھتے ۝۳۹ بیشک یہ قرآن پاک البتہ ایک معزز فرشتے کا لایا ہوا کلام ہے ۝۴۰
اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے بہت کم ہی تم ایمان لاتے ہو ۝۴۱ اور نہ یہ
کسی کاہن کا قول ہے، بہت ہی کم تم نصیحت پکڑتے ہو ۝۴۲ یہ تو پودر دگاہ عالم
کی طرف سے نازل کردہ ہے ۝۴۳ اور اگر یہ رسول ہمارے ذمہ کوئی بات جھوٹ
بنا کر لائے ۝۴۴ تو ہم اسے دائیں ہاتھ سے (قوت) سے پکڑتے ۝۴۵ پھر اس کی رگ
گہر دن کاٹ ڈالتے ۝۴۶ اور پھر تم میں سے کوئی بھی اس کو گرفت سے روکنے والا
نہ ہوتا ۝۴۷ اور تحقیق یہ قرآن تو متقیوں کے لیے نصیحت ہے ۝۴۸ اور بیشک
ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے جھٹلانے والے بھی ہیں ۝۴۹ اور یہ (قرآن پاک)
کافروں پر بڑے افسوس کا باعث ہوگا ۝۵۰ اور بیشک یہ قرآن پاک سرسرخ اور یقینی
بات ہے ۝۵۱ پس آپ اپنے عظمتوں والے رب کے نام کی تسبیح بیان کریں ۝۵۲

گزشتہ سے پیوستہ

سورۃ الحاقہ کے پہلے رکوع میں قیامت کا ذکر ہے۔ آخری آیتوں میں بنیادی عقائد کا بیان ہے
مبجلہ اُن کے رسالت اور نبوت کا ذکر ہے۔ جس طرح کفار قیامت کا انکار کرتے تھے، اسی طرح حضور علیہ
السلام کی نبوت اور رسالت کے منکر تھے۔ پہلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی اس قسم کے واقعات

پیش آتے ہیں جب کہ لوگ ان کی تکذیب کرتے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف پیغمبر کا انکار کرتے تھے، بلکہ وحی الہی اور اس کے لانے والے فرشتے کا بھی انکار کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ اپنے پاس سے باتیں گھڑ کر لایا ہے، خدا کا پیغام نہیں ہے۔ بعض شاعر اور کاہن کا خطاب دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ یہ غیب کی خبریں بتاتے ہوتے ہیں اور سچ کے ساتھ جھوٹ ملاتے ہیں۔ اپنی فیس لیتے ہیں مسیح عبادت بولتے ہیں۔ جنات کے ساتھ تعلق قائم کرتے ہیں۔

پہلی سورۃ میں گزر چکا ہے۔ کہ بعض بد بخت لوگ حضور علیہ السلام کو مجنون کہہ کر رسالت کا انکار کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر نبوت اور رسالت کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سورۃ کے پہلے رکوع میں قیامت اور سابقہ اقوام کا ذکر تھا۔ اُن سزاؤں کا اجمالی ذکر تھا جو اُن اقوام کو دی گئیں۔ پھر اس سے قیامت کے برحق ہونے کی دلیل قائم کی۔ جیسے ————— ”اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ“ اس کے بعد انسانوں کے دو گروہوں یعنی اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کا ذکر ہوا۔ اصحاب شمال کو ملنے والی سزا کا بیان ہوا۔ اور اس کی بنیادی وجہ بیان کی کہ وہ لوگ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اور انسانی حقوق ضائع کرتے تھے۔

آیات زیرہ درس میں نبوت اور رسالت کا ذکر ہے۔ قرآن پاک کا کلام الہی ہونا بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ قسم ہے اس چیز کی جو تم دیکھتے ہو۔ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ اور اُن چیزوں کی جن کو تم نہیں دیکھتے۔

لا کی تفسیر مفسرین نے دو طریقوں سے کی ہے۔ اول یہ کہ لا تاکید کے لیے آتا ہے۔ جیسے لا اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِيَامَةِ میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں۔ یا مثلاً فَلَا أُقْسِمُ بِمَوْقِعِ النُّجُومِ میں ستاروں کے ڈوبنے کی قسم کھاتا ہوں۔ سنا رہے ڈوبتے ہیں تو سورج نمایاں ہوتا ہے سابقہ انبیاء کی مثال ستاروں جیسی تھی اور خاتم النبیین کو اللہ تعالیٰ نے سر اجاً منیراً فرمایا۔ تو یہ لا قسم کی تاکید کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ایک محاورہ بھی ہے۔

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ لا نافیہ ہی ہے۔ کیونکہ مفعول ایک ہی نکلتا ہے۔ فَلَا أُقْسِمُ میں نہیں قسم کھانا اُن چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو، اور جن کو تم نہیں دیکھتے۔ قسم اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بات بڑی واضح ہے۔ قسم اٹھانے کی تو وہاں ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں کوئی بات

پوشیدہ ہو تو دوسرے کو یقین دلانا مقصود ہو۔ مگر قرآن پاک کا کلام الہی اور وحی الہی ہونا تو واضح ہے۔
حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق ہیں قسم اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں۔ لہذا اس لحاظ سے
لا نفی مراد ہے۔ مگر زیادہ تر اسے لاتا کیدی کے معنوں میں ہی لیا جاتا ہے۔

غیر اللہ کے نام کی
قسم کھانا شرک ہے

یہاں ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ حضورؐ نے غیر اللہ کے نام کی قسم اٹھانے سے منع فرمایا ہے
جیسے مَنْ أَقْسَمَ بِغَيْرِ اللَّهِ فَقَدْ أَشْرَكَ جِس نے اللہ کے علاوہ کسی دوسرے قسم
کھائی، اُس نے شرک کیا۔ نیز یہ بھی ارشاد ہے لَا تُقْسِمُوا بِآبَاءِكُمْ وَلَا بِالطَّوْأَعِیْتُ اپنے
باپوں اور طاغوت کے نام پر مت قسم اٹھاؤ۔ اگر قسم سے غیر اللہ کی تعظیم مراد ہے تو پھر واضح شرک
ہے۔ اور تعظیم مد نظر نہیں تو پھر بھی شرک کی صورت بنتی ہے۔ ہر حالت میں ناپسندیدہ ہے۔ قسم صرف
اللہ کے نام کی یا اُس کی صفت کی اٹھانی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ خود
مخلوق کی قسم
اٹھاتا ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خود کئی چیزوں کی قسم اٹھائی ہے۔ جیسے وَالَّذِیْنَ وَالَّذِیْنَ یَا لَا اَقْسَمُ
بِمَوْقِعِ الْجُؤْمِ یَا فَلَ اَقْسَمُ بِمَا تُبْصِرُونَ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ مفسرین کرام فرماتے ہیں
کہ غیر اللہ کی قسم نہ اٹھانے کا قانون صرف انسانوں کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ اس کے
لیے یہ قانون نہیں ہے۔ انسان تو اللہ تعالیٰ کا نام یا اس کی صفت سامنے رکھ کر قسم اٹھاتا ہے اور
سمجھتا ہے کہ میں خدا کے نام کی تعظیم کر رہا ہوں اگر غلط بیانی کروں گا تو اللہ تعالیٰ مواخذہ کرے گا
تو ایسی صورت میں دوسرے کو یقین آ جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے قسم اٹھانے کا یہ مطلب نہیں ہے
اللہ تو خود عظمت والا ہے۔ باقی جن چیزوں کی قسم اٹھائی گئی ہے، وہ تو مخلوق ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے
قسم اٹھانے میں قسم کا مفہوم نہیں پایا جاتا، بلکہ صرف ایک دلیل قائم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
نے اس چیز کو بطور گواہ پیش کیا ہے اس پر غور کرو، بات سمجھ میں آ جائے گی۔ اس قسم سے مقصوم کی
تعظیم مراد نہیں ہوتی۔

حدیث شریف میں حضورؐ کی ایک دعا مذکور ہے کہ اے اللہ! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں
کہ تو ملائکہ کو اور اپنی مخلوق کو ہماری اس بات پر گواہ بنائے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ اَنْتَ وَحْدَكَ
لَا شَرِیْكَ لَكَ تو اکیلا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔

حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مقدمات کے فیصلہ کے لیے بھی دیکھ لیتے ہی ہیں۔ یا تو گواہ پیش

کے جائیں یا قسم پر فیصلہ ہو۔ فرمایا قَضَىٰ بِيَمِينٍ وَشَاهِدٍ۔ جہاں گواہ موجود نہ ہو وہاں فیصلہ قسم پر ہوگا۔ مدعی کے ذمہ گواہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اگر گواہ نہیں ہیں تو مدعا علیہ قسم اٹھانے کا اور حاکم اس کے مطابق فیصلہ کر دے گا۔

مبصر اور غیر مبصر

فرمایا قَدْ أَقْسَمُ بِمَا تُبْصِرُونَ میں قسم اٹھاتا ہوں، اُن چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو۔ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ اور جن کو تم نہیں دیکھتے۔ عالم شہادت میں زمین، آسمان، ستارے اور مخلوق نظر آنے والی چیزیں ہیں اور بعض چیزیں نظر نہیں آتیں مثلاً ملائکہ، جنات، جبرائیل۔ ایک دفعہ حضورؐ گھر میں تشریف فرما تھے، جبرائیل علیہ السلام آئے اور وحی لائے۔ آپ حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف فرما تھے۔ آپ نے ان کو بتایا کہ عائشہؓ! جبرائیل علیہ السلام آئے ہیں اور تم کو سلام کہتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے سلام کا جواب دیا وَعَلَيْهِ السَّلَامُ اور عرض کیا تیری مالا ندری کہ اے اللہ کے نبی آپ تو جبرائیل علیہ السلام کو دیکھ رہے ہیں مگر ہمیں وہ نظر نہیں آتا ہمارے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں پردہ غیب میں رکھا ہوا ہے۔

اسی طرح کعبہ نظر آتا ہے، بیت المعمور نہیں نظر آتا کہ وہ عالم بالا میں ہے۔ فرشتے بیت اللہ کے طواف کے لیے آتے ہیں مگر نظر نہیں آتے۔ بیت اللہ تشریف پر تجلی پڑ رہی ہے مگر نظر نہیں آتی۔ ایسی ہی اور کتنی چیزیں ہیں جو نظر نہیں آتیں۔ تو اس میں کفار کے لیے دلیل قائم کی جا رہی ہے۔ کہ تم جبرائیل کا انکار کرتے ہو، وحی الہی کا انکار کرتے ہو، قرآن پاک کے منجانب اللہ ہونے کا انکار محض اس لیے کرتے ہو کہ یہ چیزیں تمہیں نظر نہیں آتیں حالانکہ بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن کا تم بن دیکھے یقین کرتے ہو۔ بعض چیزیں تم دوسروں کی تقلید میں مانتے ہو، بعض دوسروں سے سُن کر تسلیم کر لیتے ہو مگر جبرائیل کو، وحی الہی کو اور قرآن پاک کو تسلیم کرنے میں کون سا امر مانع ہے انہیں بن دیکھے کیوں نہیں مانتے۔ اللہ کا نبی کہہ رہا ہے کہ جبرائیل آئے ہیں، اللہ کا پیغام لائے ہیں، مگر تم ماننے کے لیے تیار نہیں ہو۔ کیا تم دنیا کی ہر چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ہی یقین کرتے ہو؟

بعض چیزیں انسانی عقل سے بالا ہیں، کئی چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے پردہ غیب میں رکھا ہے ایک وقت آئے گا، سب کو کھول دے گا۔ اس وقت سب چیزیں شہادت بن جائیں گی۔ اب پابند کیا گیا ہے۔ ”يَوْمَ يُنْفَخُ الْغُيْبُ“ غیب پر ایمان لاؤ فلاح پا جاؤ گے۔ اگر ایمان

نہیں لاؤ گے۔ نجات نہیں ہوگی۔ اسی لیے حضورؐ کی دعا کے الفاظ ہیں کہ اے اللہ! میں گواہی دیتا ہوں
 الْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ یعنی جنت اور دوزخ برحق ہیں۔ حالانکہ یہ نظر نہیں آتیں۔ اسی طرح
 جبریل کا آنا، وحی الہی کا نازل ہونا نظر نہیں آتا مگر برحق ہے۔ اس پر ایمان لانا ضروری ہے انہیں ماننے
 میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔

اسی طرح بد زخ کا معاملہ ہے، قیامت کا معاملہ ہے، نظر نہیں آتا مگر انسان دوسروں
 سے سن کر یا ان کی تقلید میں ایمان لاتے ہیں۔ وہاں تو انکار نہیں کرتے۔ پھر یہاں انکار کی کیا وجہ ہے
 جب پیغمبر کو دیکھتے ہو تو اس کے پاس وحی لانے والے کو بھی مان لو۔

کلام الہی، زبان رسول

الغرض یہ تمام چیزیں بیان کر کے فرمایا کہ میں قسم اٹھاتا ہوں محسوسات کی اور غیر محسوسات کی،
 مبصرات کی اور غیر مبصرات کی یعنی ان سب چیزوں کو بطور گواہ اور بطور دلیل پیش کرتا ہوں کہ
 اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِيْمٍ البتہ قرآن پاک ایک پیغام ہے بزرگ رسول کی زبان سے ادا
 کیا ہوا۔ لقول کے معنی اس کی زبان سے ادا کیا ہوا۔ اس کا ذاتی قول نہیں ہے۔ وہ رسول ہے،
 عزت والا ہے۔ قرآن پاک کو لانے والا فرشتہ بھی عزت والا ہے۔ دونوں کو کریم کے لفظ سے
 تعبیر کیا۔ یعنی رسول جسے دیکھتے ہو وہ بھی عزت والا ہے اور فرشتہ جو نظر نہیں آتا، وہ بھی عزت والا ہے
 بڑی شرافت والا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے مَا اَذِنَ اللّٰهُ لَشَيْءٍ اللّٰهُ تَعَالٰی اتنی مہربانی
 اور شفقت سے توجہ نہیں فرماتا جتنا اس چیز پر جو نبی کی زبان سے نکلتی ہے مَخْرَجٍ مِنْهُ
 اللہ تعالیٰ اس کو بڑی مہربانی سے سنتا ہے۔ وہ کلام الہی ہے۔ نبی کا کلام نہیں مگر نبی کی زبان سے
 ادا کیا گیا ہے۔

قرآن پاک شاعر
 کا کلام نہیں

کفار کہتے تھے۔ کہ یہ کلام الہی نہیں بلکہ کسی شاعر کا کلام ہے، محض تمک بندی ہے حالانکہ
 قرآن پاک کا شعر نہ ہونا ایک واضح بات ہے مگر افسوس کہ لوگ ایمان نہیں لاتے اور ہٹ دھرمی
 کر رہے ہیں۔ شعر و شاعری کا مدار تو تخیلات پر ہوتا ہے۔ کسی کی مدح کر دی، کسی کی قدح کر دی۔
 سورۃ شعراء میں ارشاد ربانی ہے۔ وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْفَاوْنُ شاعروں کے پیچھے چلنے
 والے گمراہ لوگ ہوتے ہیں۔ شعر جتنا جھوٹا ہوگا اتنا ہی زیادہ لذیذ ہوگا اور زیادہ داد وصول کریگا
 بدخلاف اس کے قرآن پاک تو حقائق پر مبنی ہے۔ اس کے سارے حقائق برحق ہیں۔ اس بات کو

تو سمجھدار عرب بھی جانتے تھے کہ قرآن پاک کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے سلسلے میں جو روایات آئی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے جسے آپ خود بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میں حضور علیہ السلام کو ایذا پہنچانے میں پیش پیش ہوا کرتا تھا بلکہ بسا اوقات آپ کو قتل کرنے کے درپے رہتا تھا۔ میں اپنے خیالات میں مگن خانہ کعبہ میں آیا اور دیکھا کہ حضور پہلے سے وہاں موجود ہیں۔ اور قرآن پاک پڑھ رہے ہیں۔ میں دل میں کہہ رہا تھا کہ آپ شاعر ہیں مگر اُسی وقت آپ کی زبان مبارک سے یہ آیت پاک نکلی وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُوْمِنُونَ حضرت عمرؓ کہتے ہیں۔ کہ میں سوچنے لگ گیا۔ کہ یہاں شاعری کی تو نفی کر دی گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر آپ شاعر نہیں ہیں تو کاہن ضرور ہیں۔ یہ خیال آتا تھا۔ تو آپ نے اگلی آیت تلاوت کر دی وَلَا يَقُولُ كَاهِنٌ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں پھر متذنب ہو گیا کہ آپ نے تو کاہن ہونے کی بھی نفی کر دی۔ اتنی دیر میں حضورؐ سورۃ کو آخر تک پڑھ گئے۔ تو میرے دل میں قرآن پاک کی وقعت پیدا ہو گئی۔ یہ نہ تو شاعری ہے اور نہ کمانت۔ بلکہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ یہ تو رسول کریم کی زبان سے ادا کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

قرآن پاک کاہن کا کلام نہیں

سورۃ قلم میں بیان ہوا کہ قرآن پاک کسی مجنون کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایسا کلام ہے جس کو قلم سے لکھنے والے لوگ عاجز ہیں۔ کہ اس کا مقابلہ کر سکیں۔ فرمایا کہ آپ کو پاگل کہنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اِنَّكَ لَعَلٰی خَلِقٌ عَظِيْمٌ۔ آپ تو بلند ترین اخلاق پر ہیں۔ جس سے بلند اور کوئی اخلاق نہیں ہے۔ آپ تو عظمت والے ہیں۔

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے

اسی طرح اس سورۃ میں ذکر ہوا کہ یہ شاعر کا کلام بھی نہیں شاعر تو معمولی باتوں کے پیچھے لگے ہوتے ہیں، ان کا دار و مدار تخیلاتی باتوں پر ہوتا ہے۔ آپ کاہن بھی نہیں کہ کاہنوں کا اخلاق وہ نہیں ہوتا جو پیغمبر کا ہوتا ہے۔ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ یہ تو رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ وحی الہی ہے۔ خدا تعالیٰ کا کلام ہے اس کو لانے والا بزرگ فرشتہ ہے جس ہستی کی زبان سے ادا کیا جا رہا ہے۔ وہ رسول کریم ہے اور بڑی عزت والا ہے۔

قرآن پاک کی مثل لانے کے لئے چیلنج

کفار کہتے تھے کہ قرآن پاک اللہ کا کلام نہیں۔ بلکہ خود ساختہ ہے اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ

اس مضمون کو قرآن پاک نے کئی ایک طریقوں سے بیان کیا ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے چیلنج کیا کہ اگر تمہارے کہنے کے مطابق یہ کلام من گھڑت ہے۔ **تَوَفَّائُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ** تم بھی اس جیسی ایک سورۃ بنا کر لے آؤ جس میں قرآن پاک جیسے حقائق، علوم، فصاحت اور بلاغت ہو۔ یہ چیلنج چودہ صدیوں سے قائم ہے مگر آج تک کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا، جو اس چیلنج کو قبول کرے اور قرآن جیسی ایک آیت ہی بنا کر لائے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ جس کسی نے بھی اس معاملہ میں جرأت کی، اس نے منہ کی کھائی۔ مثلاً جب سلیمہ کذاب نے کوشش کی تو حضرت عمر بن العاصؓ جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، کہنے لگے کہ تم پر لعنت ہو کہ تم **وَالْعَصْرِ** کے مقابلے میں ایسا اول فول کلام پیش کرتے ہو۔ حالانکہ خود تیرا دل گواہی دیتا ہو گا کہ تو جھوٹا ہے۔ غرضیکہ مخالفین اس بات کو خوب جانتے تھے۔ کہ وہ قرآن پاک کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جس نے بھی کوشش کی، وہ جھوٹا ثابت ہوا۔

رسول خود کلام بنا کر اللہ کی طرف منسوب نہیں کر سکتا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی غیر تو کجا خود رسول بھی اپنی طرف سے کوئی کلام بنا کر اللہ کی طرف منسوب نہیں کر سکتا۔ **وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ** یعنی اگر رسول ایسا کرے۔ کوئی جھوٹ موٹ بنا کر لائے تو پھر سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ کرے گا **لَا خِزْيَٰنَ مِنَّا لَهُ** بالیمین ہم اُسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیں گے۔ **ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ** اور اس کی رگ گردن کاٹ دیں گے۔ **وَتَيْنٍ** اُس رگ کو کہتے ہیں جو دل سے اوپر کی طرف اُٹتی ہے۔ اور ایسی صورت میں **فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ** اور تم میں سے کوئی بھی روکنے والا نہیں ہو گا۔ اس قسم کا مضمون تورات میں بھی موجود ہے کہ کوئی سچا نبی خدا کی طرف غلط بات منسوب کرے گا۔ تو خدا اس کو ہلاک کر دے گا۔ زندہ نہیں چھوڑے گا۔

ہاں البتہ جھوٹے نبیوں کے متعلق یہ بات نہیں ہے۔ اُن کو تو مہلت ملتی رہتی ہے۔ جیسے سلیمہ کذاب، اسود غنسی اور مرزا قادیانی وغیرہ۔ وہ اول فول باتیں کرتے رہتے ہیں۔ خود بنا کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں مگر ذلیل ہوتے ہیں یا مارے جاتے ہیں۔ سچا نبی اللہ تعالیٰ کی طرف غلط بات منسوب نہیں کر سکتا۔ اگر کرے گا تو فرمایا ہم اس کا محاسبہ کریں گے اور تم میں سے کوئی بھی اُسے روکنے والا نہیں ہو گا۔

قرآن پاک متقین کے
لیے نصیحت ہے

یہ قرآن پاک کیلئے فرمایا **وَإِنَّهُ لَتَذْكُرَةٌ لِلْمُتَّقِينَ** یہ تو متقینوں کے لیے تذکرہ اور —
نصیحت ہے۔ جیسے پہلی آیت میں فرمایا **تَنْزِيلٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ** یعنی قرآن پاک تو رب العالمین
کا نازل کردہ ہے۔ مگر اس سے فائدہ وہی اٹھاتا ہے جو متقی ہے۔ اس میں خوف خدا پایا جاتا ہے۔
قیامت کے محاسبے سے ڈرتا ہے۔ اسی لیے سورۃ بقرہ میں فرمایا **هُدًى لِلْمُتَّقِينَ** کہ قرآن پاک
متقین کے لیے ہدایت ہے الغرض یہ کلام نصیحت اور یاد دہانی اُن لوگوں کے لیے ہے جو ڈرتے ہیں
اور اللہ تعالیٰ کی مخالفت نہ کرتے ہیں۔

منکرین جھوٹے ہیں

یہ حقائق بیان کرنے کے بعد فرمایا **وَأَنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُم مَّكَذِبِينَ** اور بیشک ہم
جانتے ہیں کہ تم میں سے جھٹلاتے والے بھی ہیں جو قرآن پاک کو جھٹلاتے ہیں اور احکام الہی جیسے قیامت
توحید اور رسالت کو جھٹلاتے ہیں نیز فرمایا کہ یاد رکھو **وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ** یہ کافروں پر
بڑے افسوس کا باعث ہوگا۔ آگے چل کر کفار بڑا افسوس کریں گے۔

قرآن پاک حق یقین ہے

فرمایا **وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ** قرآن پاک حق یقین ہے۔ یہ کوئی مشکوک چیز نہیں ہے۔
کوئی بناوٹی چیز نہیں ہے بلکہ قرآن کا بیان حق ہے۔ یہ قطعی اور یقینی ہے۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں
ہے۔ نہ من گھڑت ہے نہ جھوٹا بلکہ خداوند قدوس کا سچا کلام ہے۔ اُس کی صفت ہے۔ اس نے
وحی کے ذریعے اتارا ہے۔ لانے والا بزرگ فرشتہ ہے۔

وحی کے لانے میں بھی بڑا اہتمام ہوتا ہے **لَا يَأْتِيهِمُ الْبَاطِلُ مِنْ يَمِينٍ وَلَا مِنْ
خَلْفِهِ** اُس میں آگے یا پیچھے کسی شیطان یا مخلوق کا دخل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جب وحی نازل ہوتی ہے تو
چاروں طرف پرے لگ جاتے ہیں کہ کوئی اس میں دخیل نہ ہو سکے۔ یہ تو **تَنْزِيلٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ** ہے

تسبیح بیان کرنے
کا حکم

یہ تمام حقائق بیان کرنے کے بعد سورۃ کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔ **سُبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ
الْعَظِيمِ** اپنے رب کی تسبیح بیان کریں کہ اس نے ہماری ہدایت اور رہنمائی کے لیے کلام پاک
نازل فرمایا۔ وہ عظمتوں کا مالک ہے، اس نے ہم پر بڑی مہربانی کی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور
نے فرمایا **اجْعَلُوها فِي رُكُوعِكُمْ** اسے اپنے رکوع میں داخل کر لو۔ اور کہو **سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ**
اسی طرح جب آیت **سُبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى** نازل ہوئی تو فرمایا **اجْعَلُوها فِي سُجُودِكُمْ**
اسے اپنے سجدے میں داخل کر لو یعنی **سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى**۔ عبد اللہ بن مسعود کی روایت میں آتا

ہے۔ جو رکوع کرنا ہے اور تین دفعہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ کہتا ہے تو اس کا رکوع مکمل ہے۔
 وَذَلِكَ اَوْنٌ اور یہ ادنیٰ درجہ ہے۔ در نہ نفلی عبادت میں پانچ دفعہ سات دفعہ، اکیس دفعہ،
 اکتالیس دفعہ بھی یہ تسبیح کہی جاسکتی ہے۔ حضورؐ بعض اوقات آٹھ بار رکوع کرتے اور تسبیح پڑھتے
 جتنی قرات ہوتی۔ دوسپاڑے کے برابر قرات کی اور اتنی ہی لمبی تسبیح بیان کی لعلی الحمد۔ سُبْحَانَ
 رَبِّيَ الْعَظِيمِ۔ اسی طرح سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھتے۔ تو فرمایا خدائے پاک کی ذات بے عیب
 اس نے ہماری ہدایت کے لیے قرآن نازل فرمایا یہ کفار غلط باتیں منسوب کرتے ہیں۔

[illegible]



سُورَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ أَرْبَعٌ وَالرُّجُوعُ إِلَيْهَا فِيهَا أَرْكُوعَانِ

سورۃ معارج مکی ہے یہ چوالیس آیتیں اور اس میں دو رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ ① لِلْكَافِرِينَ لَيْسَ
لَهُ دَافِعٌ ② مِنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ ③ تَجْرُ الْمَلَائِكَةُ
الرُّوحَ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ
④ فَأَصْبَحَ صَبْرًا جَبِيلًا ⑤ إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا
⑥ وَنَرَاهُ قَرِيبًا ⑦ يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ ⑧
وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ⑨ وَلَا يَسْأَلُ حِمِيمًا
⑩ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ⑪ يَوْمَ يَسْأَلُ
يَوْمَئِذٍ بَنِيهِ ⑫ وَمَصْحَبَتَهُ وَآخِيَهُ ⑬ وَ
فَصِيلَتِهِ الَّتِي تُتَوَى ⑭ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ⑮
لَهُ يَوْمَئِذٍ ⑯

ترجمہ : مانگا ہے ایک مانگنے والے نے ایسا عذاب جو واقع ہونے والا ہے ① کافروں

پر۔ اس کو کوئی ہٹانے والا نہیں ② وہ عذاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو سیڑھیوں

والا ہے ③ عروج کریں گے فرشتے اور جبریل امین اس کی طرف ایک دن میں جسکی

مقدار پچاس ہزار کے برابر ہے ④ پس آپ اچھا صبر کریں ⑤ بیشک یہ لوگ اسے

بعید خیال کرتے ہیں ⑥ اور ہم اس کو قریب دیکھ رہے ہیں ⑦ جس دن آسمان

پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا ⑧ اور پہاڑ رنگین دھنی ہوئی اون کی مانند ہو

جائیں گے ⑨ اور اس دن کوئی دوست کسی دوست کو نہیں پوچھے گا ⑩ ایک
دوسرے کو دکھائے جائیں گے، مجرم خواہش کرے گا کہ کاش وہ اس دن کے عذاب
سے بچنے کے لیے اپنے بیٹوں کا فدیہ دیدے ⑪ اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی
کو ⑫ اور اپنے اس قبیلہ کو جو اس کو پناہ دیتا تھا ⑬ اور سب زمین پر ہستے
والوں کو بھی (فدیہ میں پیش کر دے) پھر اپنے آپ کو بچالے ⑭

کوالف اور مضامین

اس سورۃ کا نام سورۃ المعارج ہے۔ اس کی تیسری آیت میں معارج کا لفظ ہے جس سے اس
سورۃ کا نام لیا گیا ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کے دور کو ع چوالیس آیتیں، دو سو سو کہ کلمات
اور آٹھ سو اسیٹھ حروف ہیں۔ اس کے مضامین گذشتہ سورۃ الحادۃ سے ملتے ہیں۔ اس سورۃ کے ابتداء
میں قیامت کا ذکر ہے۔ آخر رکوع میں نبوت اور رسالت کا انکار کرنے والوں کا رد ہے۔ اس سورۃ میں
میں بھی زیادہ تر قیامت کے بارے میں ارشادات ہیں۔

سابقہ سورۃ سے ربط

اس سے پہلی سورۃ میں بیان ہوا کہ مشرکین جن کو قیامت کے روز بائیں ہاتھ میں اعمال کا نامہ
ملے گا، وہ بڑا افسوس کریں گے۔ اور جہنم میں داخل ہونے کی وجہ یہ بیان کریں گے کہ "لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ
الْعَظِيمِ وَلَا يَخْضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمَسْكِينِ" یعنی خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور
مسکین کو کھانا کھلانے کا انتظام نہیں کرتے تھے، اس سورۃ میں بھی اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اسی
ذہن کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ قیامت کے متعلق جلدی کر رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ عذاب
الہی جلدی کیوں نہیں آتا۔ خود عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مگر جب وہ قیامت کا دن آئے گا تو یہ
لوگ آرزو کریں گے کہ بیوی، بھائی، قبیلہ، مال وغیرہ سب کچھ فدیہ میں دے کہ نجات حاصل کر لیں مگر
انہیں نجات حاصل نہیں ہوگی۔

عذاب کا مطالبہ

ارشادِ ربانی ہے۔ سَأَلْ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ مانگا ہے ایک مانگنے والے نے
ایسا عذاب جو واقع ہونے والا ہے۔ یہ مشرکین کے اس مطالبہ کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے منہ
سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ قیامت جلدی کیوں نہیں آتی۔ اور جس عذاب سے آپ ڈراتے ہیں، وہ واقع
کیوں نہیں ہوتا۔

سائل نکرہ ہے اور اس کے دو معنی ہوتے ہیں۔ اس کا ایک معنی پوچھنا یا استفسار کرنا ہے اور

دوسرا معنی مانگنا یا طلب کرنا۔ اس جگہ سائل سے مراد طلب کرنا ہے۔

کیا سائل سے مراد
پیغمبر خدا ہے

سائل سے کون مراد ہے۔ مفسرین نے اس کی دو تفسیریں کی ہیں۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی فرماتے
کہ سائل سے مراد خود پیغمبر خدا ہیں۔ بعض دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جب مشرکین ہٹ دھرمی
کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبیوں کا انکار کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ کے رسول اور نبی
خود بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے تھے۔ ”رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ
خَيْرُ الْفَاتِحِينَ“ یعنی اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کر دے۔ یعنی ان پر
عذاب نازل فرما اور ان کو اپنی گرفت میں لے۔ اس لیے شاہ عبدالقادر سائل سے پیغمبر خدا مراد لیتے ہیں
یعنی پیغمبر خدا نے تمہارے لیے عذاب مانگا ہے۔ ایسا عذاب کیسے لے دافع جس کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔
وہ آکرہے گا۔

اگر سائل کا یہ معنی بھی کیا جائے تو درست ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے حالات سے یہ بات
معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے تنگ آکر اللہ تعالیٰ سے عذاب کی درخواست کی۔ حضرت نوح علیہ السلام
نے عرض کیا ”يَا رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا“ یعنی اے ہمارے رب! روئے زمین
پر کسی کافر کو بسنے والا نہ رہنے دے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی ایسا ہی کہا تھا۔ ”رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا
وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ“ یعنی اے اللہ! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کر دے۔ حضور علیہ
الصلوة والسلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۃ زخرف کے آخر میں نبی کی زبان سے فرمایا
”يَا رَبِّ إِنَّ هَؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ“ اے میرے پروردگار! یہ قوم تو ایمان نہیں لاتی۔
اب تو ہی فیصلہ کر۔

سائل سے مراد کافر
اور مشرک ہیں

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جگہ سائل سے مراد پیغمبر علیہ السلام کی ذات نہیں بلکہ
کفار و مشرکین ہیں، جو اپنے منہ سے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جس سزا سے تو ہمیں ڈرانے
ہے، اُسے لانا کیوں نہیں۔ اسی طرح قیامت کے متعلق استفسار کرتے تھے ”مَتَى هَذَا الْوَعْدُ
إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ“ یعنی اگر قیامت کا وعدہ یہ حق ہے تو کب پورا ہو گا۔ مشرکین میں سے ابولہب
اور نضر ابن عارض ابن کلدہ وغیرہ اس قسم کی بات کرتے تھے۔ جیسا سورۃ انفال میں ہے۔ ”اللَّهُمَّ
إِنَّا كَانُوا هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَابًا مِنَ السَّمَاءِ أَوِ اسْقِنَا مِائِدًا

اَلَيْسَ۔ اگر محمد درست کہتے ہیں۔ تو اے اللہ! تو ہم پر پھڑوں کی بارش کر دے یا سخت ترین عذاب نازل فرما۔ اس طرح گویا اپنے منہ سے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور یہ محض تعصب اور عناد کی وجہ سے ایسا مطالبہ کرتے تھے۔

الغرض فرمایا سَالَسَائِلُ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ۔ ایک مانگنے والے نے ایسا عذاب مانگا جو واقع ہو کر رہنے والا ہے کافروں پر۔ لِلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ۔ اس کو کوئی ہٹانے والا نہیں، وہ آکر رہیگا۔ مِنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ وہ عذاب اللہ کی طرف سے ہے سیڑھیوں والا۔

لفظ معارج
کی تشریح

معارج کے اسی لفظ سے سورۃ کا نام سورۃ المعارج ہے۔ معارج چڑھنے کی جگہ کو کہتے ہیں مفسرین نے اس کا معنی بلندیوں والا، آسمانوں والا، درجوں والا۔ فضیلتوں والا، سیڑھیوں والا بھی کیا ہے۔ جب ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جاتے ہیں تو انہیں بڑی سیڑھیاں عروج کرنا پڑتا ہے۔ معارج بھی اسی لفظ سے ہے یعنی عروج کرنا۔ معارج سیڑھی کو بھی کہتے ہیں جس پر آدمی عروج کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ ایک موقع پر جبرائیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو حضور نے سوال کیا اِنِّیْ اُبْقَاعُ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ اللّٰہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ خطے کون سے ہیں؟ تو جبریل علیہ السلام نے فوراً عروج کیا۔ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور آکر جواب دیا کہ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ الْمَسَاجِدُ اللّٰہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ خطے مسجدیں ہیں۔ اور ناپسندیدہ خطے بازار ہیں جہاں ہر قسم کا جھوٹ، فریب، فراڈ جھوٹی قسمیں اور دغا وغیرہ ہوتا ہے۔ وہاں شیطان کا جھنڈا گڑا رہتا ہے۔ مسجدیں اللہ کے ذکر اور عبادت کا مقام ہیں لہذا یہ سب سے زیادہ پسندیدہ خطے ہیں۔ الغرض معارج کا معنی عروج والا اور بلندیوں والا ہے۔

عروج ملائکہ

ارشاد ہوتا ہے تَفْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ اِلَیْہِ۔ عروج کرتے ہیں فرشتے اور جبریل امین اُس کی طرف۔ جیسا سورۃ قدر میں فرمایا تَنْزِلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ یعنی نازل ہوتے ہیں فرشتے اور خاص طور پر روح الامین۔ یَا نَزَلَ بِہِ الرُّوحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ یعنی قرآن پاک کو آپ کے دل پر روح الامین لائے ہیں۔ سورۃ نبا میں ہے یَوْمَ یَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا جس دن فرشتے اور خاص طور پر روح الامین صفت بستہ کھڑے ہوں گے۔ روح الامین سب

فرشتوں سے زیادہ مقرب ہیں، وحی لانے والے ہیں۔

تو فرمایا تَعْرِجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ۔ عروج کریں گے اس کی طرف ملائکہ اور روح فی یوم۔

ایک دن میں کان مقدارِ خَمْسِينَ اَلْفَ سَنَةٍ جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

اس دن کی تفسیر میں مفسرین کرام نے بہت سی باتیں بیان فرمائی ہیں سب سے مشہور بات یہ ہے کہ اس دن سے

مراد قیامت کا دن ہے۔ عروج کریں گے فرشتے اور روح ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال

کے برابر ہوگی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ تَرَىٰ

پس ایک دن ایسا ہے۔ جیسا تم ایک ہزار سال شمار کرتے ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی سیکم اور اس کا فرمان

اس کا حکم اتنی مقدار میں جاری ہوتا ہے۔

پچاس ہزار سال کا دن

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ابتدائے نَفْخ یعنی پہلا صور پھونکے جانے سے لے کر حنٹ یا دوزخ

میں داخل ہونے تک کا عرصہ پچاس ہزار سال کے برابر ہو گا عام طور پر مشہور تفسیر یہی ہے کہ اس دن

سے مراد قیامت کا دن ہے۔ کہ اتنا لمبا ہو گا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جس طرح بعض گذشتہ اقوام

کی سزا کے لیے مختلف عرصہ مقرر کیا گیا، اسی طرح قیامت کے دن کا عرصہ پچاس ہزار سال کے برابر

ہو گا مثلاً بعض قوموں کو اس طرح سزا دی گئی کہ یکدم ختم ہو گئے۔ جبرائیل نے ایک بیخ ماری اور ساری

قوم ہلاک ہو گئی۔ بعض قوموں پر سزا کی کیفیت چند گھنٹوں تک اور بعض پر سارا دن قائم رہی۔ بعض قوموں

کو تین دن تک سزا ہوتی رہی ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعَدًّا۔ قوم فرعون چند گھنٹوں میں غرق

ہو گئی۔ اسی طرح طوفان کا واقعہ چھ مہینے تک جاری رہا۔ بعض قوموں پر قحط نازل کر دیا۔ جو کئی

سال پر محیط رہا۔ اعمال نامے کے متعلق آتا ہے کہ انسان کے اعمال دن کے وقت جاتے ہیں۔ یہ پورا

دن ہوتا ہے کہیں فرمایا کہ ہفتے کے بعد ایک رپورٹ جاتی ہے۔ کہیں سالانہ رپورٹ ہوتی ہے۔ اسی

طریقے سے مختلف واقعات ہوتے رہتے ہیں اور اسی طرح سمجھ لیں کہ قیامت کا جو واقعہ ہو گا وہ پچاس ہزار

سال کا ہو گا۔

مسلمانوں کا عروج و زوال

حضور علیہ السلام کے بعد دنیا میں مسلمانوں کو جو عروج حاصل ہوا۔ اس کی مدت ایک ہزار سال

بنتی ہے۔ پانچ سو سال تک اقتدار عربوں کے پاس رہا اور اگلے پانچ سو سال سلجوقی اور ترک برسرِ اقتدار

ہے۔ اس کے بعد زوال شروع ہوا۔ ہنود کا غلبہ ہو گیا، انگریز غالب آ گئے۔ مسلمانوں کا عروج ایک

ہزار سال تک قائم رہا۔ یہ غلبہ صرف دینی طور پر ہی نہیں بلکہ سیاسی طور پر بھی مسلمان غالب ہے۔ مسلمانوں کا موجودہ انحطاط جو کئی صدیوں پر محیط ہے، دین بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اب مسلمان اس قدر کمزور ہیں کہ دنیا میں ان کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ اگرچہ اجلاس کر رہے ہیں۔ میٹنگیں بلا رہے ہیں اتفاق و اتحاد کے ریڈولیشن پاس کر رہے ہیں مگر اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے۔ اسلام آباد کانفرنس کا کیا نتیجہ مرتب ہوا۔ اس سے چار ماہ پہلے بھی کانفرنس ہوئی مگر اس کا بھی کیا اثر ہوا۔ اس لحاظ سے تو اچھا ہے کہ مسلمانوں کو ایک جگہ اکٹھا بیٹھ کر بات چیت کا موقع تو مل رہا ہے۔ یہ بھی اچھی علامت ہے۔ اس سے پہلے تو یہ بھی محال تھا۔ کفار کو اس قدر غلبہ حاصل ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں مل بیٹھنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔

آئندہ بھی غیر اقوام مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق میں پھوٹ ڈالیں گی۔ یہ بڑی طاقتیں رخنہ ڈالنے کی کوشش کریں گی۔ یہ نفاق کا ایسا بیج ڈالتے ہیں کہ مسلمانوں کو پتہ بھی نہیں چلتا اور انہیں آپس میں لڑاتے ہیں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر سمندر میں دو مچھلیاں آپس میں لڑ رہی ہوں تو میں یقین سے کہوں گا کہ اس میں بھی انگریز کا دخل ہے۔ تاہم یہ بات باعث اطمینان ہے۔ کہ مسلمانوں نے انحطاط کے اس زمانے میں مل بیٹھنا شروع کر دیا ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا کر دے کہ ان میں حیات نو آجائے۔ ان کو عزت کا مقام حاصل ہو۔ ہر مسلمان چاہتا تو یہی ہے کہ یکجہت مجموعی مسلمانوں کو عزت نصیب ہو، اپنا بھریا ہو اوقار دوبارہ حاصل کریں مگر سلطنت اقوام غالب کی جادوگری ایسا ہونے نہیں دیتی۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا مزدور اگر

پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اصل بات یہ ہے کہ ہماری یہ حالت اس مالک الملک سے انحراف کی وجہ سے ہے جس

کی حقیقی حکومت قائم ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

سلطنت اس کی فقط باقی بتاں آذری

مسلمانوں کے زوال کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ دین اور خدا کی اطاعت سے برگشتہ ہیں پیچھے ہٹے ہوئے ہیں۔ حضرت نبی کریم کا ارشاد ہے کہ عزت و وقار اس وقت حاصل ہوگا جب دین کے مرکز

مسلمانوں کے زوال کی وجہ

پر واپس پلٹ آؤ گے حَتّٰی تَرْجِعُوْا اِلٰی دِیْنِکُمْ۔ اس کے بغیر عزت و ناموس کا حصول ممکن نہیں
 حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اگر قریش میں دو آدمی بھی صلاحیت والے ہوں تو سلطنت
 اُن کے گھر سے باہر نہیں جائے گی۔ معلوم ہوا کہ دو آدمی بھی باصلاحیت باقی نہ رہے، نہ عسکریوں میں
 رہے، نہ امویوں میں۔ ورنہ خلافت اُن سے باہر نہ جاتی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سچو قبیلوں کو توفیق
 دی تو ترکوں نے چار سو سال تک یورپی طاقتوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ یہی ترک جن پر پچھلی جنگ میں انگریز
 نے کفر کا فتویٰ لگوایا۔ ہندوستان میں صرف ایک عالم دین مولانا شیخ المنہ کے علاوہ بیشتر پیروں اور
 مولویوں نے انگریز کی حمایت میں ترکوں پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ شیخ المنہ ہی تھے جنہوں نے اس فتوے
 کے خلاف جہاد کیا۔ انہوں نے کہا کہ ترک گنہگار تو ہو سکتے ہیں مگر کافر نہیں ہو سکتے۔ لہذا ان کے خلاف لڑائی
 کا جواز قطعی غلط ہے۔

بہر حال عام معمول کے مطابق ان پر بھی انحطاط آیا، عیاشی آئی، جیسا کہ سلطنت کا خاصہ ہے کہ
 ابتداءً شمشیر و سان سے ہوتی ہے، مگر اختتام طوئس و رباب پر ہوتا ہے۔ یہاں پر مغلوں کا حال ہی دیکھ لیں
 کہ اُن کا اخیر شعر و شاعری اور ناچ گانے پر ہوا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قیامت کا وقت بڑا دراز ہے شیخ ابن عربیؒ کا
 بھی قول ہے کہ پل صراط کا سفر پندرہ ہزار سال میں طے ہوگا لوگ پانچ ہزار سال کے عرصہ میں پل صراط پر
 چڑھیں گے، پانچ ہزار سال کا عرصہ اس پر سفر کریں گے اور پانچ ہزار سال میں نیچے اتر جائیں گے۔ یہ
 یہ روایت کثیفی ہے حضور علیہ السلام کا فرمان نہیں ہے

موسےؑ کے لیے لبا عرصہ
 بھی مختصر ہوگا۔

ایک دوسری حدیث میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ عرصہ اگرچہ بہت طویل ہے مگر مومن پر یہ
 عرصہ اتنا مختصر ہوگا، جتنے عرصہ میں چار رکعت نماز ادا کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذہن کو
 اس قدر مطمئن رکھے گا کہ اتنا لبا عرصہ اسے اتنا مختصر معلوم ہوگا۔

فرمایا کہ کافر لوگ جلدی کرتے ہیں مگر فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْدًا۔ آپ اچھا صبر کریں اضطراب
 اور بیقراری کا اظہار نہ کریں۔ بد دعا بھی نہ کریں۔ بلکہ صبر کریں، ہر چیز اپنے وقت پر وقوع پذیر ہوگی
 قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے اندازہ مقرر کیا ہوا ہے۔
 قبل از وقت کوئی چیز نہیں آئیگی۔ لہذا آپ پریشان نہ ہوں۔ کفار آپ سے تمنہ کرتے ہیں۔ اپنے

صبر کی تعین

منہ سے عذاب مانگتے ہیں۔ قیامت کا وقوع چاہتے ہیں۔ آپ کو شاعر اور مجنون کہتے ہیں۔ دیوانہ اور کاہن کہتے ہیں۔ جھوٹا اور مفتری کہتے ہیں۔ مگر آپ ان سب کی پروا کئے بغیر صبر سے کام لیں۔ پچھلی سورۃ میں بھی فرمایا کہ آپ صبر کریں اور پچھلی واسطے پیغمبر کی طرح بے صبری نہ کریں۔ جس کی وجہ سے وہ ابتلا میں پڑ گئے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پیار سے نبی تھے مگر جلد بازی کی وجہ سے آزمائش سے دو چار ہونا پڑا۔ لہذا آپ صبر و استقلال کا دامن نہ چھوڑیں، تنگ دل نہ ہوں، زبان پر حرف شکایت نہ لائیں۔ کوئی تکلیف آئے، صدمہ گزرتے تو صبر اور نماز سے مدد لیں اَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ نماز پڑھیں اللہ کی طرف رجوع کریں تو ہر ایذا کا مقابلہ ہو گا۔

قیامت قریب ہے

بنی علیہ السلام کو کفار کی ایذا رسانی پر صبر کی تلقین کے بعد ارشاد ہوا کہ یہ لوگ جس عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا یہ لوگ اُسے بعید خیال کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وَنَزَّلَهُ قَرِيبًا ہم اس کو قریب دیکھ رہے ہیں۔ یہ ماضی اور حال تو ہمارے اعتبار سے ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں تو یہ ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی چیز نہیں۔ مزید برآں جو چیز گزر گئی وہ تو بعید ہو گئی مگر جو چیز قطعی طور پر آنے والی ہے، وہ تو ہر حال قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مطالبے کو ضرور پورا کرے گا اور ان کا منہ مانگا عذاب آکر رہے گا۔

سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

فرمایا جب وہ دن آئے گا تو حال یہ ہو گا يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْهَيْدِلِ آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا، اس کی رنگت تبدیل ہو جائے گی۔ ایک وقت آئے گا کہ آسمان درپچے درپچے ہو جائے گا۔ پھٹ جائے گا۔ اور سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ وہ تمام چیزیں جو آج نظر نہیں آتیں، وہ سب نظر آئیں گی، انسان انہیں دیکھ سکیں گے۔

پہاڑ جو اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی مخلوق ہے۔ اور اللہ نے انہیں ابتداءً افریقہ سے زمین پر ٹکایا ہوا ہے، اُن کی حالت یہ ہو جائے گی وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ یعنی پہاڑ رنگین دھنی ہوئی اون کی مانند ہو جائیں گے۔ عہن رنگین اون کو کہتے ہیں۔ تو پہاڑوں کے ذرات منتشر ہو جائیں گے۔ سیاہ و سفید ہر قسم کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ بالکل ایسے جیسے رنگین اون دھن دی جاتی ہے

دوست دوست کو نہیں پوچھے گا

گذشتہ سورۃ میں کفار کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ قیامت والے دن نہ تو ان کو

اچھی خوراک ملے گی جس سے اُن میں قوتِ مدافعت پیدا ہو اور نہ کوئی دوسٹ ہوگا، جو تکلیف میں اُن کی غمگساری کر سکے۔ اس جگہ بھی فرمایا وَلَا تَسْتَعْلِ حَیْثُ حَیْسًا اور اس دن دنیا کا کوئی دوست اپنے دوست کو نہیں پوچھے گا۔ دوسری سورۃ میں فرمایا کہ آج کے دوست کل وہاں دشمن بن جائیں گے **إِلَّا الْمُتَّقِينَ** ماسوائے متقینوں کے یعنی وہ پرہیزگار اور متقی لوگ جن کی دوستی محض اللہ کے لیے تھی، وہ وہاں بھی قائم رہے گی۔ اس کے علاوہ کوئی دوست کسی کو نہیں پوچھے گا۔ نفسِ انسانی کا عالم ہوگا۔ **يُبْصِرُ وَهُمْ** ایک دوسرے کو سامنے دیکھیں گے۔ پہچانیں گے کہ دنیا میں یہ میرا دوست تھا، مخلص تھا، جگر ہی تھا مگر اُس دن کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ کیونکہ انہوں نے کام دینے والے اعمال ہی سرانجام نہیں دیے۔ نہ ایمان لائے، نہ حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کئے اسی لیے آج کون کسی کو پوچھیکا، سب کو اپنی اپنی فکر ہوگی۔

بیٹے کسی کام نہیں آئیں گے

يَوْمَ السُّجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابٍ يَوْمَ يَذْبُذُہ۔ اس دن مجرم خواہش کرے گا کہ کاش وہ عذاب سے بیٹوں کے ساتھ فدیہ دے دے۔ وہی بیٹے جو رشتے میں سب سے قریب اور عزیز چیز ہوتے ہیں اور جن کی خاطر اُس نے دنیا میں جھوٹ بولا، چوہی کی، خیانت کی کیونکہ یہ فطری طور پر پیارے ہوتے ہیں تو اس دن خواہش کرے گا کہ ان کو فدیہ دے کر اپنی جان بچا لوں مگر اُس کی یہ حسرت پوری نہیں ہو سکے گی۔ جیسا سورۃ عَبَسَ میں فرمایا **يَوْمَ كَفَرْنَا مِنْ أَخِيهِ** وَأَمَّا وَابْنُ الْخَمْسِ اس دن انسان اپنے بھائی سے، ماں باپ اور بیوی بیٹوں سے بھاگے گا بیوی جو دنیا میں اُس کی رازدار تھی۔ چاہے گا کہ اُسے فدیہ میں دے کر اپنی جان چھڑا لوں یعنی بیوی میری بجائے جہنم میں چلی جائے اور میں بچ جاؤں۔ اسی طرح بھائی جو دنیا میں دست و بازو ہوتا ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں "ہر کہ برادر ندارد، قوتِ بازو ندارد" اور یہ بھی مقولہ ہے کہ جس کی بیوی نہیں ہے اُس کو آرام نہیں ہے۔ اور اسی طرح "ہر کہ مادر ندارد، شفقت ندارد"، جس کی ماں نہیں وہ شفقت سے محروم ہے۔ الغرض اُس دن مجرم خواہش کرے گا **وَصَاحِبَتَهُ وَأَخِيهِ** کہ بیوی اور بھائی کو فدیہ میں پیش کر دے۔ مگر یہ بھی نہیں ہوگا۔

بیوی اور بھائی بھی فدیہ نہیں دیں گے

وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤَيِّدُہ وہ قبیلہ جس کی رسم و رواج ادا کرنے کے لیے بڑی بڑی ٹھیکیں مارتا تھا۔ کہتا تھا ہمارا خاندان اور فیملی ایسی ہے، ہماری قوم ایسی ہے اور اس کے لیے عداوت

خاندانی بڑائی نامک
تھیلنے کی

تمام رسوم ادا کرنا تھا، خواہش کرے گا کہ سارے قبیلے کو فدیہ دے کر اپنی جان چھڑالوں۔ اللّٰہی تَعَوَّذْ بِہِ
وہ قبیلہ جو اس کو پناہ دیتا تھا دنیا میں اُسے فدیہ میں پیش کر دوں۔ مگر وہ قبیلہ بھی اس کے کسی کام
نہ آئے گا۔

روسے زمین کا کوئی فدیہ
قابل قبول نہیں ہوگا

وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيہُ ۚ کہے گا، کاش ساری زمین اور اس پر
رہنے والے سب کو فدیہ دیکر بچ جاؤں، لیکن یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔ دوسری جگہ فرمایا کہ اگر
ساری زمین خزانے اور سونے سے بھری ہوئی ہو، اور اس جیسی اور بھی ہو اور انسان چاہے کہ یہ سب
کچھ فدیہ دے کہ جان بچائے تو اللہ نے فرمایا قبول نہیں ہوگا :

مسلم شریف کی حدیث میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے ابن آدم ! اگر
ساری زمین سونے کی بھری ہوئی ہو تو کیا تم اس کا فدیہ دینے کے لیے تیار ہو۔ آدمی عرض کرے گا،
ہاں مولا کریم ! میں تیار ہوں۔ ارشاد ہوگا تم جھوٹے ہو۔ میں نے تم سے ایک تھوڑی چیز کا دنیا میں مطالبہ
کیا تھا۔ اَلَا تَشْرِكُ بِیْ شَيْئًا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ مگر تم نے دنیا میں میری اتنی
بات نہ مانی، اب سونے کی بھری ہوئی ساری دنیا فدیہ دینے کے لیے تیار ہو، تم جھوٹے ہو۔

العرض فرمایا کہ زمین واسے جتنے بھی ہیں، کہے گا کہ ان کو فدیہ دیکر اپنے آپ کو بچائے۔ فرمایا
ایسا نہیں ہوگا۔ اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے وہ وجوہات بیان فرمائی ہیں جن کی بنا پر ایسا نہیں
ہو سکے گا۔

كَلَّا إِنَّهَا لَنَظٌ ۝۱۵ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَابِ ۝۱۶ تَدْعُو مَنَآدٍ أَدْبَرَ وَلُؤْلُؤًا ۝۱۷ وَجَمَعَ فَأَوْعَى ۝۱۸ إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝۱۹ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝۲۰ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝۲۱ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝۲۲ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝۲۳ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝۲۴ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝۲۵ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝۲۶ وَالَّذِينَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُونَ ۝۲۷ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝۲۸

ترجمہ :- ہرگز ایسا نہیں ہوگا بیشک وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ ہے ۱۵ کھینچنے والی ہے کلچہ کو ۱۶ دوزخ ان لوگوں کو پکائے گی جنہوں نے پشت پھیری اور رد گردانی کی ۱۷ جس نے مال جمع کیا اور سمیٹ سمیٹ کر رکھا ۱۸ بیشک انسان جی کا کچا پیدا کیا گیا ہے ۱۹ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بے صبر ہو جاتا ہے ۲۰ اور جب اسے بھلائی پہنچتی ہے تو بخیل بن کر بیٹھ جاتا ہے ۲۱ مگر نمازی ۲۲ جو اپنی نماز میں مداومت کرتے ہیں ۲۳ اور وہ لوگ جن کے مالوں میں حق مقرر ہے ۲۴ سائل کا اور محروم کا ۲۵ اور جو لوگ قیامت کے دن کی تصدیق کرتے ہیں ۲۶ اور وہ لوگ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں ۲۷ ان کے رب کا عذاب بے فکر ہونے کی چیز نہیں ہے ۲۸

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے منہ سے عذاب مانگتے والوں اور قیامت کا مطالبہ کرنے والوں کا رد فرمایا۔ اور کہا کہ یہ لوگ قیامت کو بعید سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ قریب ہے اور اپنے وقت پر آئے گی۔ اس دن مجرم آرزو کرے گا کہ کاش اپنے بیٹوں، بیوی، بھائی، قبیلے اور تمام روئے زمین والوں کو فدیہ دے کر اپنی جان چھڑا لے، مگر ایسا نہیں ہوگا۔ فرمایا کہ لا ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

گزشتہ سورت

اول تو ان تمام چیزوں کا فدیہ بنتا ہی محال ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی جائے تو یہ باطل آئندہ پوری نہیں ہوگی۔ اس مقام پر سب سے پہلے بیٹوں کا ذکر کیا کہ آدمی کا سب سے زیادہ حق اور تسلط بیٹوں پر ہوتا ہے۔ اگر کہیں یہ غمال رکھنا ہو تو سب سے پہلے یہی ہو سکتا ہے اس کے بعد انسان کا تسلط اپنی بیوی پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھائی اور پھر سارا قبیلہ۔ عام اجنبی لوگوں کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔ تو اس جگہ اللہ تعالیٰ اسی ترتیب کے ساتھ ذکر کیا کہ انسان خواہش کرے گا کہ فلاں کو فدیہ میں دے دوں، فلاں کو دے دوں، مگر ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں مَا تَقْتُلُ مِنْهُمْ یعنی اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔

فرمایا کَلَّا ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ مجرم فدیہ دے کہ اپنی جان بچائے بلکہ إِنَّكَ لَفِي ضَلٰكٍ مُّبِينٍ وہ تو جلاتے والی آگ ہے۔ نقلی کا معنی جلانے والی، آتش سوزاں۔ اور نَزَاعَةٌ کھینچنے والی ہے لِلشَّوٰی اطراف کو شوی ہاتھ پاؤں کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور اس کا اطلاق اندر رنی اعضا پر بھی ہوتا ہے۔ اور بعض نے اس کا معنی اکیلے کیا ہے۔ یعنی کلیجے کو کھینچتی ہے۔ حدیث شریف میں اس کی کیفیت بھی بیان ہوئی ہے کہ قیامت کے دن جب جھگڑا ہوگا۔ تو بعض آدمیوں کو دوزخ خود طلب کرے گی۔ اور کہے گی اِلٰیَّ يٰ مُتَافِقُ اے منافق میری طرف آؤ۔ يٰ جَامِعُ النِّسَالِ اے مال اکٹھا کرنے والے، ادھر آؤ۔

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اُس دن لوگ کثیر تعداد میں ہونے کی وجہ سے بٹے جلتے ہوں گے۔ دوزخ میں سے اونٹ کی گردن جیسی ایک گردن نکلے گی اور جن لوگوں کو پکڑنا مقصود ہوگا انہیں چن چن کر پکڑ لیگی جیسے کہین پکڑتی ہے۔ اور اٹھا کر لے جائے گی۔ وہ گردن یا کر پیچھو سوال کی مسافت تک لمبی ہوگی اور مجرمن کو چن چن کر نکال لے گی۔

تو فرمایا وہ آگ کلیجے کو کھینچتی ہے۔ جس طرح سورۃ ہمزہ میں فرمایا اَلَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْفِتْنَةِ یہ ایسی آگ ہوگی جو سب سے پہلے دل پر چڑھتی ہے۔ انسان کے اعضاء کا نمبر تو بعد میں آئے گا، پہلے یہ دل پر اثر انداز ہوگی۔ لہذا شوی سے مراد اگر کلیجہ ہے تو بھی اور اگر اعضاء و اطراف ہیں تو بھی آگ کا اثر سب سے پہلے ان چیزوں پر ہوگا۔

فرمایا تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَسَ وَتَوَلٰی یعنی دوزخ ان لوگوں کو پکارے گی جنہوں نے مجرمین پر دوزخ

دوزخ مجرم کو خود طلب کرے گی۔

پشت پھیری اور روگردانی کی۔ یعنی دوزخ ان لوگوں کو طلب کرے گی جنہوں نے اطاعتِ الہی کی طرف سے پیٹھ پھیری اور ایمان لانے سے روگردانی کی۔ کہے گی آؤ! تمہاری سزا کا وقت آن پہنچا، تمہارے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے۔

تو جس نے پشت پھیری معصیت کے ساتھ اور اعراض کیا ایمان لانے سے اور اسے ساتھ وَحَمَعَ فَاَوْعَى یعنی حسرت نے مال جمع کیا، سمیٹ سمیٹ کر رکھا۔ لفظ جمع میں یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ اس نے حلال و حرام کی تمیز کے بغیر مال جمع کیا۔ یہ نہیں دیکھا کہ مکروہ ہے یا مستحب پس ہے۔ اکٹھا ہی کرنا چلا گیا جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں لوگوں کی ذہنیت ہوتی ہے حلال و حرام کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا، امریکہ، برطانیہ، جرمنی، فرانس وغیرہ کا سرمایہ دارانہ نظام ہی ہمارے ملک میں رائج ہے جس میں ایک ہی بھوت سوار ہے، مال جمع کرو، بینک بیلنس قائم کرو۔ کاروبار کرو، حلال و حرام کی کوئی پروا نہ کرو۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضور علیہ السلام کے ایک صحابی حضرت سمرہؓ پیشہ کا کاروبار کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس پر بھی گرفت کی۔ کہ تم پیشہ بیچتے ہو، اس سے لوگ شراب بنائیں گے جو کہ حرام ہے۔ لہذا یہ کام ترک کرو، ورنہ گرفت ہوگی۔ اگرچہ پیشہ بذاتہ حرام نہیں ہے۔ مگر اس سے شراب بنانے کا احتمال ہے لہذا عافیت اسی میں ہے کہ یہ کاروبار ترک کرو۔ یہ مشکوک ہے۔

کسبِ حلال اور
کسبِ حرام

ترمذی شریف میں روایت موجود ہے حضرت عمرؓ بازار میں گشت کرتے تھے اور اعلان کرتے تھے، جس کو مسئلے کا علم نہ ہو، وہ بازار میں بیٹھ کر تجارت نہ کرے، پہلے حرام و حلال کی تمیز سمجھو کہ کونسا کاروبار جائز ہے اور کون سا ناجائز اس کے بعد تجارت کرو۔ جو حلال و حرام کو نہیں سمجھتا، اُسے تجارت کی اجازت نہیں ہوگی۔ حضرت عمرؓ اس قدر محتاط تھے۔

اسلامی نظام معیشت کا تعلق اس اصول سے ہے کہ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانا جائز نہیں ہے۔ نیز لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ مِضَاعَفَةً ذَکَا چوگنا سود مت کھاؤ۔ مگر یہاں جو ذہنیت کا فرمایا ہے وہ قیصر و کسریٰ کی ذہنیت ہے۔ اس دور میں اسے امریکہ اور برطانیہ کی ذہنیت کہا جاسکتا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت پہلے زمانے میں بھی موجود تھی اور آج بھی موجود ہے۔ مال جمع کرنے میں یہ نہیں سمجھتا کہ دنیا کی کمائی ہے

یا انشورنس کی۔ پیسہ سود سے آرہا ہے یا سٹے سے۔ خنزیر کا ٹھیکہ لے رکھا ہے یا تھیسٹر کی کھائی ہے۔ بس مال جمع کرنے سے غرض ہے خواہ کسی راستے سے آئے۔ تو اس لیے دوزخ پکار پکار کر کہے گی۔ یا جامع المال یا منافع یا مشرک ادھر آؤ۔ تم نے دنیا میں ایمان سے روگردانی کی تھی معصیت میں آلودہ تھے۔ آؤ! آج اپنے کئے کا بدلہ چکیو۔

جمع مال میں حلال و
حرام کی تمیز

اہل اسلام کے لیے مال جمع کرنے پر بھی پابندی ہے۔ آپس کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ حلال و حرام کی تمیز پیدا کرو۔ اَجْبِلُوا فِي الطَّلَبِ روزی کے حصول کے لیے اچھا راستہ پکڑو۔ وہ طریقہ اختیار کرو جس کو اللہ اس کے دین اور شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ غلط راستے پر مت چلو۔ یہ فلم ایکڑ کتنی کھائی کرتے ہیں۔ لاکھوں میں کھیلتے ہیں، مگر کھائی حرام ہے۔ بینڈ باجے والے، کھیل ٹماشے والے، فوٹو گرافر اور بینک والے بڑی کھائی کرتے ہیں مگر حرام ہے۔ مجسمہ ساز اور ان کی تجارت کرنے والے، یہ سب ناجائز ذرائع ہیں۔ خدا کی جانب سے لعنت برستی ہے۔ تو گویا جمع مال میں حلال و حرام کی تمیز ضروری ہے جس طرح طلب رزق میں حلال ذرائع کی پابندی ہے۔ اسی طرح خرچ کرنے میں بھی پابندی ہے، مَسَارِقُهُمْ يَنْفِقُونَ ہمارے عطا کردہ مال میں سے خرچ کرتے ہیں مگر کس طرح۔ اَعْطُوا كُلَّ ذِي حَقِّ حَقَّهُ اس طرح کہ ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرو۔ جائز راستے پر چلو، اور خرچ کرنے میں کبھی نہ کرو۔

جائز و ناجائز
اخراجات

الفاق میں پہلے فرائض آتے ہیں۔ پہلا نمبر زکوٰۃ ہے۔ صدقہ فطر اور قربانی ہے اس کے بعد نفقات واجبہ ہیں۔ "وَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ" قرابت دار کو اس کا حق ادا کرو۔ بھائی یا بہن غریب ہے۔ چچا زاد بھائی نادار ہے، اس کے پاس وسائل نہیں تو حنفی قانون میں واجب ہے کہ اس کو اتنا دے کہ اس کا بھی وقت بسر ہو سکے۔

اس کے علاوہ عبادت میں خرچ کرنے کا موقع ہے جیسے حج اور عمرہ۔ مساکین اور مسافر حقدار ہیں سب کی درجہ بدرجہ حق ترسی کرے۔ تو یہاں فرمایا کہ اس نے مال جمع کرتے وقت بھی حلال و حرام کی تمیز نہ کی اور خرچ کرتے وقت بھی بخل سے کام لیا کیونکہ اس نظام معیشت کا طریق کار ہی یہ ہے کہ کماؤ جس طرح بھی آئے اور خرچ کرو، جہاں جی چاہے۔ مگر اسلام میں تو پابندی ہے۔ حرام ملکوں پر خرچ نہیں کر سکتے۔ فضول خرچی منع ہے۔ سب سے پہلے فرائض ادا کرو۔ اس کے بعد جائز ضرورتیں

پوری کرو۔ باطل رسومات، کھیل تماشے اور عیاشی کے کاموں میں خرچ نہ کرو۔ بلکہ اسلام کے متعین کردہ راستے پر چلو اسی میں فلاح ہے۔

رفاہیت بالغہ

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں، قیصر و کسریٰ کی حکومتیں رفاہیت بالغہ میں مبتلا تھیں۔ ہر چیز عمدہ سے عمدہ استعمال کرتے تھے، پہننا بہ تو بہت اعلیٰ لباس ہے تو نفیس ترین، رہائش تو بڑے اعلیٰ درجے کی خوراک بہت عمدہ۔ فرماتے ہیں۔ یہی رفاہیت بالغہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عرب کی سرزمین پر آخری نبی کو مبعوث فرمایا اور رفاہیت بالغہ کے نظام کو باطل قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعے سادگی کی تعلیم دی، تعیش اور اسراف کو ناجائز قرار دیا۔ وہ لوگ میز کرسی کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ حضورؐ نے فرش پر بیٹھ کر کھانے کا طریقہ سکھایا۔ وہ لوگ چار پائی کے بغیر سوتے نہیں تھے، آپؐ نے زمین پر سو کر دکھایا۔ اور اسے سنت قرار دیا۔ آپؐ نے سادہ زندگی بسر کر کے تکلف سے منع فرمایا۔

حضور کا اسوۂ حسنہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اعلان کر دیا مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ میں تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا اور میں کسی چیز میں تکلف کرنے والا نہیں ہوں۔ خوراک جیسی ملی کھالی، لباس جیسا میسر آیا، پہن لیا۔ رہائش کے لیے جس قسم کا مکان ملا، اس میں رہائش پذیر ہو گیا۔ سواری کے لیے آپؐ نے کبھی اونٹ یا گھوڑے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ بلکہ بسا اوقات آپؐ گدھے پر سوار ہو جاتے تھے۔ ترمذی شریف میں موجود ہے۔ حضرت جابرؓ کی بیمار پرسی کے لیے جاتے ہیں۔ تین میل کا سفر ہے، صحابہ کی جماعت ساتھ ہے مگر سواری کے لیے گدھا بھی میسر نہیں ہوا۔ کلمہ والی زمین پر پیدل ہی چل رہے ہیں جبکہ گردوغبار بھی اڑ رہا ہے۔ آپؐ نے کوئی تکلف نہیں فرمایا۔ بہر حال جمع اور اونچائی میں یہ سارے مضمون آجاتا ہے۔ جمع کرتے وقت حلال و حرام کی تمیز نہ کی، ہشتبہ اور مکروہ کا خیال نہ کیا۔ خرچ کرنے کی جگہ پر خرچ نہ کیا، بخل سے کام لیا۔ حقوق ادا نہ کئے۔ اسراف اور ناجائز کاموں پر خرچ کیا۔ سو و لعب کی سرپرستی کی۔ تو ایسے لوگوں کو دوزخ تدعو پکار پکار کر۔ بلائے گی کہ تمہاری سزا کا وقت آچکا ہے۔ اس کی طرف آ جاؤ۔

انسانی فطرت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا انسان جی کا کچا پیدا کیا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے إِذَا مَسَّهُ الشَّجَرُ وَهُوَ عَاثِلٌ تو بے صبر ہو جاتا ہے۔ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا اور جب اسے بھلائی پہنچتی ہے تو بخل

ہے کہ بیٹھ جاتا ہے یعنی دونوں صورتوں میں اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ یا تو صبر کا دامن چھوڑ دیتا ہے یا بخل پر اتر آتا ہے۔

اَلَا الْمُصَلِّیْنَ ہاں جو ایماندار اور نمازی ہوں گے وہ ایسا نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آٹھ خصلتوں کا ذکر فرمایا۔ جن کے حاملین کی یہ حالت نہیں ہوگی۔ نہ تو وہ تکلیف کے وقت صبر کا دامن چھوڑیں گے، اور نہ آسائش میں بخیل بنیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے انسان میں دو خصلتیں بہت بُری ہیں۔ ایک انتہائی درجے کی بزدلی اور دوسرے انتہائی درجے کا بخل۔ بخل یہ ہے کہ مال موجود ہونے کے باوجود جائزہ مقام پر خرچ نہ کرے۔

جائزہ ضروریات کے
لیے خرچ کو فریضی اجازت

حضرت مہذہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرا خاوند کنخوس آدمی ہے، آنا بھی نہیں دیتا کہ بچوں کا جائزہ خرچہ پورا ہو سکے۔ تو کیا میں اس کے علم کے بغیر اس کے مال میں سے اتنا لے سکتی ہوں، جس سے بچوں کا جائزہ خرچہ پورا کروں، تو آپ نے اجازت دے دی۔ فرمایا تم جائزہ کاموں کے لیے لے سکتی ہو۔ معروف یعنی جائزہ ضروریات کے لیے، نہ کہ ضائع کرنے کے لیے۔

نمازی بخیل نہیں ہوتا

تو فرمایا اَلَا الْمُصَلِّیْنَ ذکر نمازیوں کا کیا، مراد ایمان والے لوگ ہیں۔ اور ایمان والوں کی اس اعلیٰ خصلت کو بیان فرمایا کہ جو نمازی ہو گا وہ بخیل نہیں ہو گا وہ تو پورے حقوق ادا کرے گا دوسری جگہ فرمایا مَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ اِيْمَانَكُمْ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمانوں کو ضائع کر دے یعنی تمہاری نمازوں کو۔ وہ نمازیں جو تم نجیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھیں وہ تیرے لیے قبلہ کی بنا پر ضائع نہیں جائیں گی بلکہ مقبول ہوں گی۔ جس طرح وہاں ایمان کا ذکر کر کے مراد نماز لیا ہے، اسی طرح یہاں نمازی سے مراد ایماندار لوگ ہیں۔

نماز میں مداومت

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ۔ وہ ایماندار جو اپنی نماز میں مداومت کرتے ہیں۔ مداومت میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں۔ اگر نماز ادا نہیں کی تو بے قراری پیدا ہو جاتی ہے۔ سکون نہیں آتا۔ اسی لیے جتنے صالح سلف گذرے ہیں وہ نماز کا اہتمام وقت سے پہلے ہی شروع کر دیتے تھے۔ امام ابو طالب مکیؒ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں، جو اذان سے پہلے ہی نماز کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ نماز کی اذان کوئی راستے میں سنتے ہیں، کوئی مسجد میں پہنچ کر، جب تک وہ نماز ادا نہیں کر لیتے انہیں قرار نہیں آتا۔

الغرض نماز کی مداومت میں یہ ساری چیزیں شامل ہیں یعنی وضو، طہارت، لباس کی پاکیزگی، وقت کی پابندی اور باقی تمام لوازمات۔ دائمون سے مراد یہ نہیں ہے کہ کبھی پڑھ لی، کبھی چھوڑ دی بلکہ مداومت سے مراد اپنے لوازمات کے ساتھ نماز کو ہمیشگی سے قائم کرنا ہے۔

اُس کے بعد اگلی خاصیت بیان فرمائی۔ وَالَّذِينَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ اور وہ لوگ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق مقرر ہے۔ شریعت نے حقیقی سائل اور محتاج کو سوال کرنے کی اجازت دی ہے۔ جب تک اُس کا کام نہ چل جائے۔ بلا وجہ مانگنا ناجائز اور حرام ہے۔ کسی پر کوئی مصیبت آگئی ہے۔ حادثہ پیش آگیا یا تاوان آگیا۔ تو ایسی صورت میں مانگنا جائز ہے حَتّٰی يُصِيْبَ قَوَامُ الْاَنْحِ یہاں تک ذرا گھڑاں ٹھیک ہو جائے اس کے علاوہ سوال کی اجازت نہیں۔

سائل و محروم کی حق رسی

بعض فرماتے ہیں کہ سائل وہ ہے جو طلب کرتا ہے اور محروم وہ ہے جو طلب نہیں کرتا۔ بیہوشی طلب کرتی ہے۔ نوکری اپنی مزدوری طلب کرتا ہے ان کا حق معلوم ہے، یہ سائل ہیں، ماں مسکین، مسافر، یتیم طلب نہیں کرتا ان کا حق مقرر نہیں ہے۔ یہ محروم ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ سائل وہ ہے جو زبان سے بول کر مانگتا ہے۔ جیسے انسان، یہ سائل ہے۔ اور محروم وہ ہے جو قوت گویائی نہیں رکھتا جیسے جانور، لہذا یہ محروم ہیں، جانور پال رکھا ہے۔ اس کی خوراک کا ذمہ دار اس کا مالک ہے۔ اگر اسے بھوکا رکھے گا تو سخت مجرم ہوگا۔ اس محروم کا بھی حق ہے۔

سائل اور محروم کون ہیں

تیسری صفت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی وَالَّذِينَ يُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ یعنی جو قیامت کے دن کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ تو اس سورۃ کا موضوع ہے۔ کفار قیامت کا ہی انکار کرتے تھے مگر ایماندار جو ہیں وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ کہ قیامت برحق ہے اور آنے والی ہے۔ اُس دن حساب کتاب ہوگا اور اعمال کا بدلہ ملے گا۔

روز قیامت کی تصدیق

چوتھی صفت یہ بیان فرمائی وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ وہ لوگ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ انہیں خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کیس اللہ تعالیٰ گرفت میں نہ لے لے۔ اسی خوف سے ایسا شخص نماز ترک نہیں کرے گا، جرائم سے بچے گا۔ حلال کھائی کھے مگر اسراف سے اجتناب کرے گا۔ سائے انبیاء علیہم السلام نے یہی بات سمجھائی اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ

عَصِيَّتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ یعنی اگر میں اپنے رب کی مخالفت کروں گا، تو بڑے دن کے عذاب میں بکڑا جاؤں گا۔ اسی اعتقاد کی بنا پر مومن اپنے رب سے ڈرتا ہے۔

ایمان خوف اور امید
کے درمیان ہے

فرمایا اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَا مُوِّنٌ تیرے رب کا عذاب بے فکر ہونے کی چیز نہیں ہے۔ مومن کو ہر وقت اس کی فکر لگی رہنی چاہیے۔ عذاب کے عذاب سے بے فکر ہونا کفر کی نشانی ہے۔ اور اسی طرح قطعاً طور پر پُر اُمید ہونا، یہ بھی کفر کی علامت ہے۔ یعنی نہ تو یہ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کبھی نہیں بخشے گا اور نہ یہ ایمان ہو کہ میں ضرور ہی بخشا جاؤں گا۔ بلکہ اَلْاِيْمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَا یعنی ایمان خوف اور اُمید کے درمیان ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے بارہ میں فرمایا يٰۤاَعُوْذْنَا رَعِبًا وَّ رَهْبًا "میرے بندے مجھے رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے ہیں۔ تمام انبیاء کرام ہمارے انعامات میں رغبت بھی رکھتے ہیں اور ہماری گرفت سے ڈرتے بھی ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِأُفُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۲۹ إِلَّا عَلَىٰ أَرْوَجِهِمْ
أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۳۰ فَمَنْ
ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۳۱ وَالَّذِينَ هُمْ
لَا مَنِّيهِمْ وَعَهْدُهُمْ رُحُونَ ۳۲ وَالَّذِينَ هُمْ
بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ ۳۳ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ
يُحَافِظُونَ ۳۴ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ۳۵ ط

۵۶

ترجمہ: اور وہ لوگ جو اپنے شہوت کے مقامات کی حفاظت کر رہے ہیں ۲۹ سوائے اپنی بیویوں
کے یا جن کے مالک ہیں انکے واسطے ہاتھ (بوندیاں) تو ان پر کوئی ملامت نہیں ۳۰ پس جو شخص ان
کے علاوہ کوئی راستہ تلاش کرے، تو یہ لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں ۳۱ اور وہ لوگ
جو اپنی امانتوں اور عہد کی رعایت کرتے والے ہیں ۳۲ اور وہ لوگ جو اپنی شہادتوں پر قائم
رہتے والے ہیں ۳۳ اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں ۳۴ یہ لوگ بہشتوں
میں ہوں گے باعزت ۳۵

گزشتہ سے پیوستہ

اس سچے درس میں ذکر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کا انکار کرنے والوں کی تردید بیان کی اور
قیامت کے وقوع اور مجرمین کی سزا کا حال بیان کیا۔ یہ بھی بتایا کہ قیامت کے دن مجرمین تمنا کریں گے
کہ کسی طرح ان کی جان بچ جائے۔ فرمایا ان کی طرف سے کسی قسم کا فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ جہنم
ان کو پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی جس میں سزا پائیں گے۔

اس کے بعد عام انسانوں کی حرص اور بے صبری کا ذکر فرمایا۔ یہ بھی بیان کیا کہ عام طور پر انسان
کی حالت یہ ہے کہ جب اسے خیر پہنچتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے اور جب شر پہنچتا ہے تو بے صبری
میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ البتہ ان لوگوں کو اس گروہ سے مستثنیٰ کیا جو قرآن پاک میں مذکورہ آٹھ صفات
سے متصف ہیں۔ یعنی نماز میں مداومت اختیار کرنے والے جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حصہ مقرر ہے
جو قیامت کی تصدیق کرتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ گزشتہ درس میں یہ چار صفات بیان ہوئیں۔

شرمگاہ کی
حفاظت

بقیہ چار صفات ہیں وَالَّذِينَ هُمْ لِفُتُوخِهِمْ حَافِظُونَ۔ وہ لوگ جو اپنے شہوت کے مقامات کی حفاظت کرتے ہیں۔ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ۔ لہذا ان کے پاس اپنی بیویوں کے أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ یا جن کے مالک ہیں ان کے واسطے ہاتھ۔ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مُلْتَمِئِينَ۔ تو ان پر کوئی ملامت نہیں۔ ہاں! جو شخص ان کے علاوہ کوئی اور راستہ تلاش کرے گا۔ فَنَبِيْنُ ابْتِغَا وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ۔ یہ لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ جن میں یہ صفت پائی جائے گی یعنی اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں گے وہ بھی بے صبری والے گروہ سے مستثنیٰ ہوں گے۔

جائز ذرائع۔ نکاح
اور ملک مبین

قضائے شہوت کے لیے اسلام نے دو ہی ذرائع جائز قرار دیے ایک نکاح اور دوسرا ملک مبین۔ پہلے ذریعہ کے لئے ازواج کا لفظ یعنی جوڑا استعمال کیا۔ ازواج، زوج کی جمع ہے۔ عورت کا جوڑا مرد ہے اور مرد کا عورت۔ گویا زوج کا لفظ مرد اور عورت ہر دو پر بولا جاتا ہے۔ تو ازواج سے مراد وہ جوڑے ہیں جو عقد نکاح کے ذریعے آپس میں منسلک ہو جائیں۔

ہر عورت ہر مرد کے لیے زوج نہیں بن سکتی۔ بلکہ اس کے لیے بہت سی شرائط ہیں۔ ویسے تعوی اعتبار سے تو مرد و زن جوڑا ہے جیسے فرمایا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ یعنی مرد اور عورت کو جوڑا پیدا کیا مگر شہوت رانی کے لیے ہر عورت ہر مرد کی زوج نہیں بن سکتی، نہ ہر مرد ہر عورت کا زوج بن سکتا ہے جوڑا بننے کے لیے دو ہی صورتیں ہیں یعنی نکاح یا ملک مبین۔

نکاح کے ضمن میں یہ شرط ہے کہ مُحْصِنِينَ غَيْرِ مُسِفِحِينَ۔ کہ عقد نکاح اور پاکدامنی مقصود ہو۔ غَيْرِ مُتَحِدِّیْ أَخْدَانٍ محض دوستانہ قائم کر کے قضائے شہوت کر لی، یہ حرام ہے۔ دوسری صورت مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ کی ہے کہ عورت مرد کی ملکیت ہو یعنی شرعی لونڈی ہو۔ ان صورتوں کے علاوہ باقی تمام ذرائع کو حرام قرار دیا۔

شرعی لونڈی
کون ہے

لونڈیاں اور غلام بنانا حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے۔ اس زمانے میں تو یہ چیز بھی نہیں ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں ساری دنیا میں لونڈی غلام کا رواج تھا۔ اور ہزاروں سال سے چلا آ رہا تھا۔ جنگ میں دشمن کے جو مرد و زن پکڑے جاتے تھے، ان کو حکومت غلام اور لونڈیاں قرار دیتی تھی۔ انکو فاتح آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔ اور پھر ان کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔ کسی عورت کا کسی مرد کی ملکیت میں آنا۔ اس مرد کے لیے بغیر نکل عورت کو تصرف میں لانا اور قضائے شہوت کرنا جائز تھا۔

لڑائی میں جو قیدی بنتے تھے، ان کے ساتھ چار قسم کا سلوک کیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے
 اِمَّا مَنَّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءٌ يٰۤاَتُوْا نَّ قِيْدِيْوْنَ بِرَحْمٰنٍ كَرِيْمٍ، انہیں ویسے ہی رہا کر دو یا ان سے
 فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ تیسری صورت یہ تھی کہ دشمن کے ایسے قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور چوتھی صورت
 میں غلام اور لونڈی بنایا جاتا تھا۔ غلام اور لونڈی بنانا ان چار صورتوں میں سے ایک ہے۔ یہ
 لازم نہیں ہے کہ قیدی کو ہر حالت میں غلام یا لونڈی ہی بنالیا جائے بلکہ اگر پہلی تین صورتوں میں
 سے کوئی بھی مناسب نہ ہو تو یہ چوتھی صورت اختیار کر کے غلام اور لونڈی بنایا جاسکتا ہے۔ اس قسم
 کا فیصلہ حضور علیہ السلام کے زمانے میں ہوا ہے۔ بلکہ ساری دنیا میں یہ رواج موجود تھا، تو جس عورت
 کو لونڈی بنا کر کسی کی ملکیت میں لے دیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ بلا نکاح شہوت رانی جائز ہوتی
 تھی، نکاح کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی کو مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ کہا گیا ہے۔

ہاں البتہ لونڈی کے بھی بعض شرائط ہیں۔ اگر لونڈی کا مالک خود کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کر دے تو پھر اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، اُس سے خدمت کے باقی کام لے سکتا ہے مگر اس کے قریب نہیں جاسکتا۔ قطعاً حرام ہے۔

مالک لونڈی کو بیچ بھی سکتا ہے۔ اس قسم کی خرید و فروخت عام ہوتی تھی۔ غلام اور لونڈی بچے بکاتے تھے۔ مگر کافی عرصہ سے اب یہ دستور باقی نہیں رہا۔ اٹھارہویں صدی میں یورپ اور ایشیا کے لوگوں نے مل کمرہ پیرس میں ایک کانفرنس کی تھی۔ جس میں طے پایا تھا کہ لونڈی غلام کا نظام ختم ہونا چاہیے۔ چنانچہ اُس کے بعد دنیا میں یہ نظام باقی نہیں رہا۔

اس دوران میں مسلمانوں پر زوال آگیا۔ اور جہاد میں دشمن کے مرد و زن پر قبضہ اور ان کو لوٹڈی
 غلام بنانے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہذا قضائے شہوت کا صرف ایک ہی ذریعہ باقی رہ گیا یعنی نکاح۔ اس
 کے علاوہ کوئی دوسری صورت جائز نہیں۔ ہم جنسی یعنی لواطت حرام ہے۔ مُسَاحِقَہ یعنی ایک
 عورت کا دوسری عورت کے ساتھ خلط ملط بھی حرام ہے۔ اسی طرح جانوروں کو اپنی ہو س کا
 نشانہ بنانا، حدیث میں اس پر بھی لعنت آئی ہے۔ اُجرت دے کر زنا کرنا اور قضائے شہوت کے
 کے لیے متعہ کرنا بھی حرام ہے۔ یہ سب ذرائع مَآوِ اَوْ ذَٰلِکَ میں آتے ہیں اور کوئی بھی جائز نہیں
 اللہ تعالیٰ نے شہوت رانی کی اجازت صرف زوج کی صورت میں دی ہے۔

لوند کا کے لیے
بعض شرائط

اس دور میں لحد
ذریعہ نکاح ہے

نکاح کے لیے
بعض شرائط

زوجیت سے صرف قضائے شہوت ہی مراد نہیں بلکہ یہ کئی ایک مقاصد کے لیے ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”مُحْصِنِينَ“ قید لصلح میں لانے والے ہوں۔ محض شہوت مقصود نہیں ہونی چاہیے صحیح طور پر نکاح ہو، حقوق ادا کئے جائیں اور نسل کشتی مطلوب ہو۔ اس طرح نکاح میں آنے والی عورتوں کے لیے بھی بعض شرائط ہیں۔ کہ وہ کسی دوسرے کی متکبر بیوی نہ ہو، محرمات میں سے نہ ہو کہ ان کے ساتھ بھی نکاح جائز نہیں۔ اور پھر یہ ہے کہ دو یا زیادہ آدمیوں کی مشترکہ بیوی بھی نہیں ہو سکتی۔ صرف ایک کے لیے مختص ہونی چاہیے۔ اور اس کا اعلان بہ سر عام گواہوں کی موجودگی میں ہونا چاہیے علی رؤوس الأشہاد کہ فلاں عورت فلاں مرد کے ساتھ مختص ہے، اس کا نکاح ہوا ہے۔ نکاح کا مقصد امور خانہ داری کی سر انجام دہی بھی ہے اور نسل انسانی کا آگے بڑھانا بھی ایک بڑا مقصد ہے اللہ تعالیٰ نے انسان پر شہوت کو مسلط کر کے نسل انسانی کی بقا کا ذریعہ پیدا کر دیا۔ کہ انسان اس بات پر مجبور ہے۔

متعہ اور نکاح
میں فرق

نکاح کی صورت میں مذکورہ مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں امور خانہ داری اور نسل انسانی کو آگے بڑھانا، مگر متعہ میں محض شہوت رانی مقصود ہوتی ہے۔ دو چار مہینے کے لیے وقتی طور پر متعہ کر لیا۔ مقررہ مدت ختم ہوئی۔ تو معاملہ خود بخود ختم ہو گیا۔ نہ نسل صحیح ہوئی، نہ عدت کی ضرورت، نہ وراثت کا مسئلہ پیدا ہوا، بلکہ نسل بھی حرام ہو گئی۔ نہ نسل کا ثبوت، نہ امور خانہ داری مقصود بلکہ صرف شہوت رانی سے غرض۔ تو مَا وَدَّكَ الْكَاذِبُ کے تحت یہ سب ذرائع حرام ہیں۔

اسلام اور
لونڈی غلام

اس دور میں لونڈی غلام کا وجود تو ویسے ہی ختم ہو چکا ہے۔ ہاں آئندہ اگر کوئی موقع آئے کہ کفار کے ساتھ جہاد ہو۔ مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو۔ قیدی مرد اور عورتیں آئیں، ان کی رہائی کی بھی کوئی صورت پیدا نہ ہو، نہ فدیہ لینا مناسب ہو، نہ احسان کر کے چھوڑ دینا اور نہ ان کے قتل کی نوبت آئے تو پھر جو حقیقی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنالیا جائے۔ ہاں اگر اس رواج کو ختم کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں، اسلام پر کوئی زوال نہیں آتا۔ اگر ساری دنیا کے لوگ مل کر اس رواج کو ختم کر دیں کہ لونڈی غلام نہیں رکھنا، تو درست ہے۔ ایسے قانون کی اسلام بھی پابندی کرے گا۔ اس سے اسلام کے کسی اصول پر حرف نہیں آتا۔

لونڈی غلام بنانا فرض
واجب نہیں

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے لونڈی غلام بنانے کو رواج رکھا ہے یہ درست ہے

مگر یہ کوئی فرض واجب نہیں کہ لونڈی غلام بنانا لازمی امر ہو۔ چونکہ نزول قرآن کے وقت یہ بین الاقوامی رواج تھا، اس لیے اسلام نے بعض اصلاحات کے ساتھ اس کی اجازت دی، لازم قرار نہیں دیا۔ اُس زمانے میں سارے کاروبار غلاموں کے سر پر تھے۔ اس وقت کے معاشی نظام میں ان کا وافر حصہ تھا۔ اگر اس نظام کو یک دم بند کر دیا جاتا۔ تو دنیاوی کاروبار میں خلل واقع ہو سکتا تھا، لہذا اسلام نے اس کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ یہ تمہارے انسانی بھائی ہیں، کسی وجہ سے تمہارے ماتحت ہو گئے ہیں، ان کے ساتھ انصاف کرو، ان کا حق ادا کرو، زیادتی نہ کرو۔ یہی نہیں بلکہ غلام کی آزادی کو تعزیریاتی قوانین اسلام کا حصہ بنا کر ان کی آزادی کی راہ ہموار کر دی۔ لہذا یہ الزام کہ اسلام لونڈی غلام بنانے کی ترغیب دیتا ہے، قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔

تو فرمایا جس نے جائز ذریعے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ تلاش کیا، وہ تعدی کرنے والا ہے۔ شرمگاہ کی حفاظت کا یہ مطلب ہے۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَللّٰهُمَّ رَاقِیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَتِّیْ اے اللہ! میں مادہ شہوت کے شر سے تیری ذات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں اس میں شر ہے اور قدرت نے اسے انسان پر مسلط کر دیا ہے تاکہ نوع انسانی کا بقا رہے۔ مگر اس کے ساتھ بہت سی شرائط عائد کر دیں جن کی پابندی ضروری ہے۔ کوئی مسلمان ان شرائط کے بغیر شہوت رانی نہیں کر سکتا۔ جو شخص اپنی شرمگاہ کی ناجائز ذرائع سے حفاظت کرے گا، وہی کامیاب ہو گا۔ اسی لیے فرمایا وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُوْنَ۔ یہ پانچویں صفت ہے۔

نیچے کاروں کے گروہ کی چھٹی اور ساتویں صفت یہ بیان کی کہ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِمَنَیْهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ۔ وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد کی رعایت کرنے والے ہیں۔ امانت میں ہر قسم کی خصوصی اور عمومی امانتیں شامل ہیں۔ خصوصی امانتوں کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، اس میں وضو، غسل، نماز وغیرہ کے مسائل شامل ہیں جو انسان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو شخص وضو درست نہیں کرتا، غسل جنابت صحیح نہیں کرتا۔ وہ امانت میں خیانت کرتا ہے۔ جو نماز کا خیال نہیں رکھتا۔ زکوٰۃ کو چھپاتا ہے یا اس میں کمی بیٹی کرتا ہے وہ بھی امانت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔

امانت اور عہد
کی حفاظت

عمومی امانتوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ کسی سے کوئی امانت لے کر واپس نہ کرے

کسی کا حق مارے، چوری کرے، یہ عام امانتیں ہیں۔ لہذا مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ان امانتوں میں تمام خصوصی اور عمومی احکام آجاتے ہیں۔ ان کی رعایت ضروری ہے۔ جو ان کی نگرانی کرے گا، فلاح پائے گا۔ جو ان کی حفاظت نہیں کرے گا، ناکام ہوگا، جہنم کا شکار بنے گا۔

شہادت کی
درستی

آنحضور اور آخری صفت ہے کہ وَالَّذِينَ هُمْ يَشْهَدُونَ اور وہ لوگ جو اپنی شہادتوں پر قائم ہیں۔ یعنی گواہیوں کو بلا کم و کاست بیان کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَقِمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ محض اللہ کے لیے بلا در رعایت شہادت کو قائم کرو۔ اس میں امیر غریب کی پروا نہ کرو، اگر شہادت درست ہوگی تو فیصلے بھی صحیح ہوں گے اور اگر رعایت کرو گے تو خسار ہی پیدا ہوگی، فساد ہوگا، ظلم ہوگا، لہذا مقدمہ ہو یا کوئی اور معاملہ گواہی ٹھیک ٹھیک دو۔

انگریزی قانون
شہادت

انگریزی قانون شہادت تو اس قسم کا ہے کہ پولیس اور وکیل خود شہادت پڑھاتے ہیں۔ یوں کٹنا، یوں نہ کٹنا، وزن پھنس جاؤ گے۔ یا مقدمہ خراب ہو جائے گا۔ بھلا اس قسم کی شہادت سے مقدمے کا فیصلہ صحیح ہو سکتا ہے؟ اس قسم کی گواہیاں حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے اَقِمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ جو کچھ دیکھا ہے، حق و انصاف کے ساتھ گواہی دو۔ انگریز کا قانون شہادت تو بالکل ہی غلط ہے، اس کے تحت قیامت تک درست فیصلہ نہیں ہوگا۔ کسی کو انصاف میسر نہیں آئے گا۔ سب معاملات خراب ہوں گے جو جیتا وہ بھی ہارا اور جو ہارا وہ تو خراب ہوا ہی ہے۔ ان حالات میں لوگ صحیح فیصلے کی برکات سے محروم رہیں گے نا انصافی کا دور دورہ ہوگا۔ اگر کوئی شہادت کو چھپائے گا تو یہ بھی نفس شہادت کے خلاف ہوگا۔

اللہ کے ہاں
پسندیدہ عمل

فرمایا ان آٹھ صفات کے حامل لوگ جہنم کی دعوت سے بچ جائیں گے۔ آخر میں آٹھ صفات میں سے پہلی صفت کو پھر دہرایا۔ شروع میں فرمایا الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ اور یہاں فرمایا وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ یعنی وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللَّهِ مَا دُومَ عَلَيْهِ اللہ کے نزدیک پسندیدہ اعمال وہ ہیں جن پر ہمیشگی اختیار کی جائے اگرچہ حقوڑا ہی ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک عمل ایک دن کیا، اور چار دن غائب ہو گیا۔ یہاں حفاظت سے مراد مداومت ہے یعنی وہ لوگ نماز کے ارکان، واجبات، سنن، مستحبات، اوقات سب کی حفاظت کرتے ہیں۔

قبولیت نماز کے
لیے شرائط

سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ نماز وقت نہ ہو جائے۔ ہر وقت یہی خواہی رہتی ہے پھر یہ کہ جو نماز پڑھتے ہیں وہ اس کے شرائط و آداب کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نماز کے لیے کپڑے کی پاکیزگی۔ جسم کی طہارت اور وقت کی پابندی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ قبولیت نماز کے لیے اخلاص کی ضرورت ہے حلال روزی کی ضرورت ہے۔ اگر لباس حرام پہنا ہے تو نماز کیسے قبول ہوگی۔ دعا کس طرح مستجاب ہوگی۔ یہ تمام چیزیں حفاظت نماز کے ضمن میں آتی ہیں۔

نماز مقرب الی اللہ ہے

اللہ تعالیٰ نے نماز کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر سے اول اور آخر ذکر کیا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ فرماتے ہیں کہ نماز اُمُّ الْعِبَادَات یعنی سب عبادات کی بنیاد اور مُقَرَّبٌ إِلَى اللَّهِ یعنی اللہ سے قریب کرنے والی عبادت ہے۔ نماز اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرنے والی ہے۔ اگر کسی آقا کا بھگا ہوا غلام اُس کے حضور دست بستہ حاضر ہو جائے، تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ نماز کی بھی یہی صورت ہے اپنے مالک الملک کے سامنے مودب ہو کر کھڑا ہو جائے تو نجات پائے گا۔ وگرنہ مالک سخت قہر میں ہوگا یہ نماز غضب کو ٹھنڈا کرنے والی چیز ہے۔

نماز کے لیے
بشارت

اسی لیے فرمایا کہ نمازوں کی حفاظت کرنے والے اور آٹھ صفات کے حاملین اُولَئِكَ رَفِیْ جَنَّتْ مُكْرَمُوْنَ جَنَّتْ میں جائیں گے اور اُن کی عزت کی جائیگی۔ ورنہ عام طور پر اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِنْسَانٌ حَرِیصٌ اور بے صبر ہے۔ اس میں جزع فزع ہے۔ ایک حالت میں ناشکری کرتا ہے اور ایک حالت میں بے صبری کا اظہار کرتا ہے۔ ہاں ان آٹھ صفات والے لوگ جنت کے حقدار ہوں گے اور عزت پائیں گے۔ باقی محروم ہوں گے۔

فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قِبَلَكَ مُهْطِعِينَ ۖ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ
الشَّمَالِ عِزِينَ ۖ ﴿۳۷﴾ أَيْطَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُدْخَلَ
جَنَّةَ نَعِيمٍ ۖ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ۖ إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾
فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ إِنَّا لَقَادِرُونَ ﴿۴۰﴾
عَلَىٰ أَنْ تُبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۚ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿۴۱﴾
فَذَرَهُمْ يَخْوَضُونَ وَيُلْعَبُونَ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي
يُوعَدُونَ ﴿۴۲﴾ يَوْمَ يُخْرِجُونَ مِنَ الْجُدَاثِ سِرَاعًا كَانَهُمْ
إِلَىٰ نَصِيبٍ يُوَفِّضُونَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهُقُهُمْ
ذِلَّةٌ ۚ ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۴۴﴾

ترجمہ پس ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے، کہ آپ کی طرف دوڑتے ہوئے آتے ہیں ﴿۳۶﴾
دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی گمراہ درگمراہ ﴿۳۷﴾ کیا ان کافروں اور مشرکوں میں
سے ہر ایک امید رکھتا ہے کہ وہ نعمتوں کے باغوں میں داخل ہوگا ﴿۳۸﴾ خبردار ہم نے ان کو
اس چیز سے پیدا کیا جسے یہ جانتے ہیں ﴿۳۹﴾ پس میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب
کی یقیناً ہم قادر ہیں ﴿۴۰﴾ اس بات پر کہ ہم ان لوگوں سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم اس بات میں
عاجز نہیں ہیں ﴿۴۱﴾ پس ان کو چھوڑ دیں یہ باطل باتوں میں گھستے رہیں اور کھیل تماشے میں
لگے رہیں، یہاں تک کہ یہ اس دن سے جا ملیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے ﴿۴۲﴾
جس دن قبروں سے نکلیں گے، اتنا دوڑتے ہوئے جائیں گے گویا کہ وہ اپنے نشانوں
کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں ﴿۴۳﴾ ان کی نگاہیں پست ہوں گے ان پر ذلت سوار ہوگی
یہی ہے وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا ﴿۴۴﴾

گزشتہ آیات میں منکرین قیامت کو وعید سنائی گئی تھی کہ قیامت کے روز مجرمین کو دوزخ خود
اپنی طرف پکارے گی۔ جو دنیا میں احکام الہی سے پشت پھرتے تھے، روگردانی کرتے تھے مال سمیٹ
گذشتہ سے پیوستہ

سمیٹ کر رکھتے تھے، خرچ کرنے میں بخل کرتے تھے، حلال و حرام میں تمیز نہیں کھتے تھے انہیں دوزخ
چن چن کر اپنے اندر داخل کرے گی۔ انسان کے پیدا نشی طور پر حرص اور بے صبر ہونے کا ذکر کیا یعنی
جب اُسے شہ پہنچتا ہے تو بے صبری کا اظہار کرتا ہے اور جب اُسے خیر پہنچتی ہے تو بخل کرتا ہے۔
البتہ اس سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن میں اچھے صفات پائی جاتی ہیں۔ یعنی نماز میں مداومت، اختیار کرنے
والے، جو اپنے مال میں محتاجوں اور محروموں کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ روز قیامت کی تصدیق کرتے
ہیں۔ اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ شہوت کے مقاموں کی حفاظت کرتے ہیں۔

اپنی امانتوں اور عہدوں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں اور خصوصاً نماز
کی پوری پوری نگرانی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ یقیناً کامیاب ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ انہیں بہشت میں
داخل کرے گا۔ جہاں ان کی عزت و تکریم کی جائے گی۔

انسان کی فطری
بے صبری پر اشکال

اب مشرکین اور کفار کا رد ہے جو قیامت کے بارے میں ٹھٹھا اور استنزار کرتے تھے۔
مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا نشی طور پر حرص اور بے صبر پیدا کیا ہے
”اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوًّا“ تو پھر اس سے ثابت قدمی اور نیک اعمال کی توقع کس حد تک
درست ہے۔ یہاں یہ اشکال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جانوروں میں بھی حرص و لالچ کا عنصر موجود ہے
اور یہی مادہ انسان میں بھی فطری طور پر ہے تو پھر انسان کو حیوان پر فضیلت کس طرح حاصل ہوتی ہے،
اور اس سے نیکی کی توقع کس طرح رکھی جاسکتی ہے۔

جواب۔ انسانی ترقی کا
انحصار بے صبری پر ہے

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں حرص اور
بے صبری کا مادہ دوسری مخلوق سے زیادہ رکھا ہے۔ مگر انسان کا یہ عنصر اس لیے رکھا ہے کہ
وہ ترقی کے منازل طے کر سکے۔ اگر انسان میں بھی باقی مخلوق کی طرح حرص و بے صبری کا مادہ معمولی
مقدار میں رکھا جاتا تو پھر انسان کو باقی مخلوق پر فضیلت حاصل نہ ہوتی، کسی ذی روح میں حرص و
بے صبری کا جس قدر زیادہ مادہ ہوگا۔ اُسی قدر اُس میں ترقی کرنے کی تڑپ زیادہ ہوگی۔ اور وہ
کوشش اور محنت کے ذریعے ترقی کی منازل طے کرے گا۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو انسان بھی حیوانوں
کی طرح ترقی کے راستے پر گامزن نہ ہوتا۔ انسان کی درجاتِ عالیہ اور قرب الہی تک رسائی اسی
بے قراری کی مرہونِ منت ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے

الصَّبْرُ يُجْمَدُ فِي الْمَوَاطِنِ كُلِّهَا
إِلَّا عَلَيْكَ فَإِنَّهُ مَذْمُومٌ

صبر سربات میں اچھی چیز ہے۔ مگر اے مولا کریم! تیرے بارے میں صبر نہیں ہو سکتا۔ یعنی تیری رضا اور تیرا قرب حاصل کرنے کے لیے صبر اچھا نہیں ہے بلکہ بے قراری ہی بہتر ہے تاکہ مقصد جلد از جلد حاصل ہو جائے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے بھی ایک شعر میں اس مفہوم کو بیان کیا ہے

طلبم نہایت آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہ نا شکبے بہ دل امیدوارے

میں اُس کی انتہا طلب کرتا ہوں، جس کی کوئی انتہا نہیں۔ نگاہیں ہمیشہ بے قرار رہتی ہیں اور دل میں امید رہتی ہے۔ کہ آگے بڑھ جائیں، ترقی کر جائیں۔

مولانا رومؒ نے اسی چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا ہے۔
اے برادر بے نہایت درگہست
ہر کہ بروے می رسی پائیت

اے بھائی! اسکی بارگاہ بے نہایت ہے۔ جس مقام پر بھی پہنچو، وہاں ٹھہر مت بلکہ آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

الغرض اگر حرص اور بے صبری انسان میں نہ ہوتی تو قرب خداوندی اور مراتب عالیہ حاصل کرنے کا غدیہ ہی پیدا نہ ہوتا۔ انسان بھی جانوروں کی طرح عام چیز یہ ہی اکتفا کر لیتا۔ تو حقیقت میں یہ دو خصلتیں انسان کی ترقی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ودیعت کی ہیں۔ بخاری اور مسلم کی حدیث میں موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ کہ دو حریص ایسے ہیں جو کبھی سیر نہیں ہوتے۔ ایک علم کا طالب اور دوسرا مال کا طلبگار۔ یہ دونوں چاہتے ہیں کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے آگے ہی بڑھتے جائیں۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا احد جائزہ نہیں مگر دو چیزوں میں۔ ایک وہ جس کو خدا تعالیٰ نے مال دیا ہے، اور پھر اسے صحیح جگہ پر صرف کرنے کی توفیق دی ہے دوسرا وہ کہ جس کو خدا تعالیٰ نے علم دیا ہے، اور وہ لوگوں کو حکمت سکھاتا ہے۔ یہ دونوں قابل رشک ہیں۔ اور اصل میں یہ دو چیزوں میں حد جائزہ ہے

دو چیزیں بھی حرص اور بے قراری کی وجہ سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہیں۔ تاکہ اُسے ترقی کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوں۔

آگے اللہ تعالیٰ نے اُن کفار و مشرکین کا رد فرمایا ہے جو قیامت کا انکار کرتے تھے، ٹھٹھا اور مذاق کرتے تھے۔ اور متنبہ کیا ہے۔ کہ قیامت کو سیریش آنے والے واقعات میں اُن کا حال بُرا ہوگا۔

ارشاد ہوتا ہے فَسَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا اِنْ كَافِرُونَ كُوفِيَ كُفْرًا بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ۔ کفر کے اصطلاحی معنی انکار کرنا ہے۔ یعنی توحید و رسالت، قیامت، معاد، احکام الہی، کُتُب سماویہ، ملائکہ اور

قرآن و سنت کی بعض اصطلاحات

تمام وہ چیزیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے ان کا انکار کرنا۔ اسی طرح شرک یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو مانستے ہوئے اُس کی عبادت میں یا صفات میں کسی کو شریک کیا جائے۔ منافق وہ ہوتا ہے۔ جو زبان سے تو اقرار کرے مگر اس کا دل کفر کے ساتھ مطمئن ہو۔ الحاد ٹیڑھا چلنے کو کہتے ہیں اسی طرح شک بھی برمی بیماری ہے۔ یہ تمام اصطلاحات ہیں، جو قرآن میں استعمال ہوتی ہیں۔

فرمایا فَسَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قَبْلَكَ مُطْعَمِينَ اِنْ كَافِرُونَ كُوفِيَ كُفْرًا بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ۔ کہ آپ کی طرف دوڑتے ہوئے آتے ہیں۔ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ رَاٰیْهِمْ مِنْ كُلِّ حِوْطٍ۔ اور بائیں طرف سے بھی عَنِ الْيَمِينِ گروہ درگروہ۔ کفار جھنڈ درجھنڈ بیٹھے ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں، مذاق اور استہزاء کر رہے ہیں۔ قیامت کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔

کفار کی گروہ بندی

عزیزین سے مراد گروہ درگروہ ہے، جیسا کہ حنظلہ کی ایک حدیث میں ہے۔ کہ ایک دفعہ آپ بام تشریف لائے تو صحابہ کی جماعتیں گروہ درگروہ بیٹھی تھیں۔ آپ نے فرمایا مَالِیْ اَرْکُوعِیْنَ کیا ہے کہ میں تم کو گروہ درگروہ بیٹھے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

الغرض قرآن نے بیان فرمایا کہ ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے۔ کہ آپ کے گروہ درگروہ بیٹھے ہیں۔ ٹھٹھا اور استہزاء کر رہے ہیں، مذاق اڑا رہے ہیں۔

قرآن پاک میں موجود ہے کہ بعض کافر قیامت کا انکار کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ سب جھوٹی کہانیاں ہیں۔ قیامت کوئی نہیں ہے۔ آج تک دنیا سے گیا ہوا کوئی شخص واپس نہیں آیا، یہ ساری دنیا کیسے جی اٹھے گی۔ اور اگر بالفرض قیامت ابھی گئی تو ج طرح آج ہم اس دنیا میں بہتر زندگی گزار رہے ہیں اور مسلمانوں کی حالت خستہ ہے اسی طرح اس دن بھی ہماری ہی حالت اچھی ہوگی۔ اگر کوئی بہشت وہاں ہے تو وہاں بھی ہم ہی جائیں گے۔

کفار کی خام خیالی

جس طرح آج ہمیں سہولتیں حاصل ہیں، اسی طرح قیامت کو بھی حاصل ہونگی۔ کلمہ پڑھنے والے اور توحید کے
 زعمویدار اسی طرح تکلیف میں رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلْطَّمَعُ كُلُّ اَمْرٍ مِّنْهُمْ اَنْ يَدْخُلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ
 کیا ان کافروں اور مشرکوں میں سے ہر ایک اُمید رکھتا ہے کہ وہ نعمتوں کے باغوں میں داخل ہوگا۔
 فرمایا کَلَّا خَبِرُوا لَیْسَ اَنْتُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ یہ ان کی خام خیالی ہے۔

حضرت قطره آب
پیدائش

اِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُونَ فرمایا کہ ہم نے اُن کو اُس چیز سے پیدا کیا جسے یہ جانتے ہیں۔ دراصل یہ الفاظ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کی توجہ اُن کی خلقت کی طرف دلائی ہے کہ یہ سمجھتے بھی ہیں کہ ہم نے انہیں پانی کے حقیر قطرے سے پیدا کیا ہے جیسا فرمایا اَللّٰهُ يَخْلُقُكُمْ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ کیا ہم نے تم کو پانی کے ایک حقیر قطرے سے پیدا نہیں کیا۔ دوسری جگہ فرمایا خَلَقَهُ مِنْ تَرَابٍ انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ کافر ہو، مشرک ہو، نیک ہو، بد ہو، سب کی پیدائش پامال مٹی اور ناپاک قطرہ سے ہے۔ پھر اس کا مقام خروج اور دخول بھی ناپاک ہے۔ وہ ناپاک قطرہ جس کو یہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جسم کے ساتھ لگ جلتے تو فوراً اس کو دور کرتے ہیں، جسم کو پاک کہہ تے ہیں۔ فرمایا اپنی اس حیثیت کے باوجود تم یہ توقع رکھتے ہو کہ نعمتوں کے باغوں میں جاؤ گے۔

مشرکین - نجاست
در نجاست

فرمایا نعمت کے باعثوں میں وہ داخل ہو سکتا ہے جو ایمان لے آئے۔ اعمال صالحہ کی دولت حاصل کرے، اپنے اخلاق و اطوار پاک کرے، ورنہ اس کی اصلیت تو ناپاک ہی ہے۔ کفار و مشرکین تو ناپاک چیز سے پیدا ہوتے پھر کفر و شرک اور بدعتوں والے ناپاک کام کئے تو ان کے اوپر گندگی پر گندگی چڑھتی گئی، مجسم گندگی بن گئے، یہ جنت میں کیسے جائیں گے۔ جیسے منافقوں کے متعلق فرمایا **”إِنَّهُمْ رِجْسٌ وَمَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ“** یہ گندے ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے مشرکوں کے بارے میں فرمایا۔ **”إِنَّ الشِّرْكَوْنَ كَجَسٍّ“** مشرک تو ناپاک ہیں، اول پیدائشی ناپاک، اس کے بعد کفر و شرک کی ناپاکی۔ کیا یہ جنت میں داخل ہونے کے قابل ہیں؟

تذکیہ ملکہ
فلاح ہے

ہاں! حقیر قطرہ آبِ سید اہم نے والا جب اپنے آپ کو ایمان سے پاک کر لیتا ہے۔
اعمالِ صالحہ سے اپنی تطہیر کر لیتا ہے۔ باطن کو بھی نورِ ایمان سے پاک کر لیتا ہے۔ توحید اور اخلاق

حسن سے مزین ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر کو بھی تمام الائنشوں سے پاک کر لیتا ہے۔ تو بہشت میں داخل ہونے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یعنی بہشت کے باغوں میں داخلے کا مدار تنہا ظاہر و باطن پر ہے۔

تمام تصرفات قبضہ
قدرت میں ہیں

فرمایا تمام تصرفات اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔ فَلَا أُقْسِرُ بِرَبِّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ میں قسم کھاتا ہوں مشرق اور مغربوں کے رب کی۔ إِنَّا لَقَادِرُونَ ہم اس بات پر قادر ہیں عَلَى أَنْ نُبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ کہ ہم ان لوگوں سے بہتر لوگ پیدا کر دیں۔ وَمَا نَحْنُ بِمُسْبِقِينَ اور ہم اس بات میں عاجز نہیں ہیں کہ ہم کو تھکا کر کوئی نکل بھاگے گا۔

اس موقع پر مشرق اور مغرب کی بجائے مشرق اور مغرب یعنی جمع کے صیغے استعمال کیے۔ نظام تو مشرق اور مغرب ایک ایک ہی ہے اور واحد کا صیغہ ہی استعمال ہونا چاہیے تھا۔ مگر سورج کے طلوع و غروب کے مختلف مقامات ہونے کی بنا پر مشرق اور مغرب کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ سورج ہر روز طلوع اور غروب کا نقطہ بدلتا رہتا ہے۔ سردی میں مقام طلوع و غروب اور ہوتا ہے اور گرمی کے موسم میں اور ہوتا ہے۔ لہذا یہاں جمع کے صیغے استعمال کیے۔ تو فرمایا جس طرح مشرق اور مغرب ہر چیز کا تصرف ہمارے قبضہ قدرت میں ہے۔ اسی طرح ہم اس بات پر بھی قادر ہیں کہ کفار و مشرکین جیسے نافرمان اور استغناء کرنے والے لوگوں کی جگہ بہتر لوگوں کو لے آئیں۔

کفار مکہ کا نعم البدل
انصار مدینہ

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی انتظام فرما دیا۔ مکہ میں دشمنان دین آپ کے ساتھ کھڑا اور مذاق کرتے تھے۔ انصار رسانی کے لیے دوڑتے تھے۔ اس کے بدلہ میں اللہ نے مدینہ میں آپ کے گرد وہ لوگ جمع کر دیے جو ایمان اور نیکی کے ساتھی تھے۔ اطاعت اور توحید خداوندی کے جذبے سے سرشار تھے۔ اپنا مال دولت اور تمام قوتیں اسلام اور رضا الہی کے لیے خرچ کرنے کو ہر وقت تیار ہتے تھے۔ آپ سے ہدایات کے حصول اور نفس کی تہذیب کے لیے ہر وقت آپ کے گرد جمع ہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو کھڑا کر دیا جو مکہ کے ابو جہل اور ابولہب وغیرہ سے بہر حال بہتر تھے۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ان کفار و مشرکین کی جگہ اچھے لوگوں کو کھڑا کر دیں۔ اگر یہ مان لیں تو ان کی ہی بہتری ہوگی اور نہ ہم اپنا فیصلہ صادر کر دیں گے۔

فرمایا فَذَرُهُمْ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں يَخُونُونَ وَيَلْعَبُونَ یہ باطل باتوں میں ہی گھستے رہیں اور کھیل تماشے میں لگے رہیں۔ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يَوعَدُونَ یہاں

کفار کو ان کے حال
پر چھوڑ دیں

یہ اس دین سے جا ملیں جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ نتیجہ یہی ہو گا کہ دنیا کی زندگی ختم ہو جائے گی اور وعدے یعنی قیامت کا دین آجائے گا اور یہ اس سے جا ملیں گے۔

قبروں سے
نکلیں گے
تو دوڑتے ہوئے
جائیں گے

یَوْمَ يُخْرِجُونَ مِنَ الْأَحْبَادِ سِیَّاحًا جِس دِل قُبروں سے نکلیں گے۔ تو دوڑ پڑے
ہوئے جائیں گے۔ یعنی جدھر سے آواز آرہی ہوگی۔ بگل بج رہا ہوگا۔ ادھر دوڑ کر جائیں گے کَا نھم
إِلَىٰ تَصِیْبٍ یُّؤَفِّضُونَ گویا کہ وہ اپنے نشانوں کی طرف دوڑے۔ چلے جاتے ہیں۔ اس طرح
تیز دوڑیں گے، جس طرح تیر نشانے کی طرف جاتا ہے۔

نُصَب، انْصِب کی جمع ہے اور نصب بت کو بھی کہتے ہیں۔ جس طرح دنیا میں لوگ بتوں کی عبادت کے لیے تیزی سے دوڑتے ہوئے جاتے ہیں۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ میں پہلے جا کر سجدہ کر لوں، عبادت کر لوں، اسی طرح قیامت کو لوگ قبروں سے دوڑتے ہوئے اٹھیں گے اور اپنے نشانوں کی طرف جائیں گے۔ نصب کا یہ معنی بھی کیا ہے مگر پہلا معنی زیادہ متبادر ہے۔

کفار کی ذلت
در سواری :

کفار جب قبروں سے برآمد ہوں گے تو ان کی حالت یہ ہوگی کہ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ
ان کی نگاہیں پست ہونگی، جھکی ہوئی ہوں گی۔ تَوَهَّمُوهُمْ ذَلَّةً ان پر ذلت سوار ہوگی۔
سیاہی چھائی ہوئی ہوگی، چہرے سیاہ ہوں گے اگر دو غبار پڑا ہوا ہوگا، آنکھیں اوپر اٹھا کر نہیں
دیکھ سکیں گے۔ تدامت ہوگی۔ کہیں گے جس دن کا ہم انکار کرتے تھے، وہ ان پہنچا۔ قیامت
برحق ثابت ہوئی۔ اب تو برا حشر ہوگا۔ فرمایا ذَلِكِ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ۔
یہی ہے وہ دن جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ آج تم کو اس کا بھگتان کرنا پڑے گا۔ اپنے عقیدے
اور اعمال کی جزا آج ضرور تم کو ملے گی۔ یہی وہ دن ہے۔

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَصَلَّى اللَّهُ
تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَاصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

IMM



سُورَةُ نُوحٍ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَتَانِ وَعِشْرُونَ آيَةً فِيهَا كُتُبُهَا

سورۃ نوح مکی ہے اور یہ اٹھائیس آیتیں اور اس میں دو رکعت ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ أَنْ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَهُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ① قَالَ يَقَوْمِ إِلَىٰ لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ②
إِنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُوا ③ يَفْرِضْ لَكُمْ مِنْ دُونِكُمْ
وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ④ إِنْ أَجَلَ اللَّهُ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ
لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ⑤ قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا
⑥ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاوِي إِلَّا فِرَارًا ⑦ وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ
لِتُغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَفْشَوْا شَايِبَهُمْ
وَاصْرُؤًا وَاسْتَكْبَرُوا وَاسْتَكْبَرُوا ⑧

ترجمہ : بیشک ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اس کی قوم کی طرف مبعوث فرمایا (اور دعوت الی الحق

کایوں حکم دیا) کہ اپنی قوم کو ڈراؤ پیشتر اس کے کہ ان کے پاس دکھ دینے والا عذاب آجائے ①

کہا اس نے اے میری قوم کے لوگو! بیشک میں تمہیں کھول کر ڈرسانے والا ہوں ② (اور

میں تمہیں صاف صاف کہتا ہوں) کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو اور

میری بات مانو ③ اللہ تعالیٰ تمہاری کئی غلطیاں معاف کر دیا، اور تمہیں مقررہ وقت تک ہمت دے گا، بیشک

جب اللہ تعالیٰ کا مقررہ وقت آجاتا ہے مؤخر نہیں کیا جاتا اور تم سمجھتے ہو ④ نوح (علیہ السلام) نے عرض کیا،

اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو شب و روز دعوت دی ⑤ مگر میری دعوت نے

ان لوگوں کے لیے کوئی اضافہ نہیں کیا سوائے بھاگنے کے ⑥ اور جب بھی میں نے

ان کو بلایا تا کہ اے پروردگار! تو ان کی بخشش فرمائے تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں

ٹھونس لیں، اور کپڑے اپنے اوپر لپیٹ لیے اور انہوں نے اصرار کیا اور بڑا تکبر کیا ﴿۷﴾

کو اللہ اور
مضامین

اس سے پہلی سورۃ معارج تھی۔ جس میں زیادہ ترقیامت کا ذکر تھا، تاہم ضمناً توحید و رسالت کا بیان بھی تھا۔ اس سورۃ کا نام حضرت نوح علیہ السلام کے نام پر سورۃ نوح ہے۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی اٹھائیس آیات دو رکوع دو سو چوبیس الفاظ اور نو سو انیس حروف ہیں۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی اُس دعوت الی الحق اور دعوت توحید کا ذکر فرمایا ہے، جو انہوں نے اپنی قوم کو دی۔ اس دعوت کے مختلف طریقے اور اس کا روای کا بیان ہے جو نوح علیہ السلام نے اس سلسلہ میں سرانجام دی۔ گویا دعوت الی الحق کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

سابقہ سورۃ
سے ربط

گذشتہ سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو صبر جمیل کی نصیحت فرمائی۔ کفار و مشرکین آپ کو طرح طرح کی ابتدائیں پہنچاتے تھے۔ بھٹا اور متحیر کرتے تھے۔ آپ کے گرد گردہ در گردہ جمع ہو کر آپ کی دعوت کی تکذیب کرتے تھے۔ قیامت کا انکار کرتے تھے۔ اور کہتے تھے اگر یہ سچا ہے تو پھر آتی کیوں نہیں۔ نہایت یہودہ باتیں کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فَاَصْبِرْ صَبْرًا جَدِيدًا" اے نبی علیہ السلام! آپ انکی ابتداء رسانی پر صبر و استقلال کا مظاہر کریں، تنگ دل نہ ہوں، وقت آنے پر ان کو ضرور سزا ملے گی۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں۔

اس سورۃ میں حضرت نوح علیہ السلام کو اُس صبر جمیل کے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ جس کی تعین اللہ تعالیٰ نے سابقہ سورۃ میں حضور نبی کریم کو کی۔ فرمایا کہ دعوت الی الحق اور دعوت الی التوحید کے سلسلہ میں جس قدر صبر حضرت نوح علیہ السلام نے کیا، کسی اور کو میسر نہیں آیا۔ لہذا اس جگہ ان کی دعوت کی تفصیلات اور ابتداء رسانی پر صبر کا ذکر کر کے حضرت نوح علیہ السلام کو بطور نمونہ پیش کیا۔ کہ اے نبی علیہ السلام آپ بھی صبر کریں ہم ان سے ضرور بدلہ لیں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام، حضرت آدم علیہ السلام کی آٹھویں یا دسویں پشت میں ہیں۔ ان سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے شیت علیہ السلام کے متعلق مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ بھی نبی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بھی وحی بھیجی جس طرح آدم علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام
سے حضرت نوح علیہ السلام
تک

پر۔ ان کے علاوہ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث فرمایا ہو تو اس کا ذکر نہیں ملتا جتنا دریں کے بارے میں خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا نام اخنوخ تھا۔ وہ بھی آدم علیہ السلام کی اولاد سے تیسرے یا چوتھے نمبر پر تھے۔

_____ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے زمانے کے درمیان اکثر لوگوں کا اعتقاد اچھا تھا۔ مگر نوح علیہ السلام کے زمانہ میں اکبر بگڑ گیا۔ اور انہوں نے شرک کو اختیار کر لیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے باپ ملک یا ملک انجو شرک سے منع کیا کرتے تھے پھر حضرت نوح علیہ السلام کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں صاحب شریعت نبی اور رسول بنا کر مبعوث فرمایا۔ اس سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام کا جو ذکر ملتا ہے۔ اُن پر بھی اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی۔ جس میں اکثر احکام ایسے تھے، جن کا تعلق دنیا کی آبادی سے تھا۔ عقیدہ تو موجود تھا، اس کے علاوہ شریعت کے کوئی خاص احکام نہیں تھے۔ تفسیر مدارک والے لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے کپڑے سینے کی سوئی اور مشین حضرت ادریس علیہ السلام نے ایجاد کی۔ ان پر کئی صحیفے نازل ہوئے۔ جن میں دنیا کی آباد کاری کے احکام تھے۔ مگر حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں میں شرک پیدا ہو گیا تھا۔ جس کا ذکر اس سورۃ کے دو سکرکوع میں آتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے
حالات زندگی

حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ قرآن پاک کی دیگر بہت سی سورتوں میں ضمناً آتا ہے۔ مگر یہ سورۃ پوری حضرت نوح علیہ السلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ دینی ایسے ہیں کہ بن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے مکمل طور پر الگ الگ سورۃ میں فرمایا۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر اس سورۃ میں اور حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر سورۃ یوسف میں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی۔ اس کے بعد آپ نو سو پچاس برس تک اپنی قوم کو تبلیغ فرماتے رہے سورۃ غنچوت میں ہے۔

”فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا“ یعنی حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں پچاس کم ہزار سال ٹھہرے۔ اور لوگوں کو حق کی دعوت دیتے رہے۔ اس دوران میں نوح علیہ السلام کے ساتھ بڑے بڑے واقعات پیش آئے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

”إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا“ نوح علیہ السلام ہمارا بڑا شکر گزار بندہ تھا۔ کوئی ایسی ایذا نہیں،

جوان کو نہ پہنچی ہو۔ قوی، فعلی، عملی، مار پیٹ ہر طرح سے ان کو تکلیف دی گئی، مگر انہوں نے ہر مصیبت کو صبر و تحمل سے برداشت کیا۔

اس زمانے میں صرف حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ہی لمبی نہ تھی بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے پہلے اکثر لوگوں نے لمبی عمریں پائی ہیں۔ تین تین، چار چار، پانچ پانچ سو سال عمر کے لوگ تھے۔ مگر نوح علیہ السلام کی عمر ایک ہزار پچاس سال تھی۔ چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی۔ نو سو پچاس سال آپ تبلیغ کرتے رہے۔ اس کے بعد مشہور تاریخی طوفان نوح آیا۔ یہ طوفان دس رجب سے لے لیکر دس محرم تک مسلسل چھ ماہ تک قائم رہا اور آپ اتنا عرصہ کشتی میں سوار رہے۔ اتنا لمبا عرصہ تبلیغ کے نتیجے میں صرف ستر آدمی ایمان لائے جن میں چند عورتیں بھی تھیں۔ اور یہی لوگ کشتی میں سوار ہوئے۔ اور اس طوفان کی زد سے محفوظ رہے۔ اس طوفان کا حال سورۃ ہود کے دو کونے میں بیان کیا گیا ہے۔ بائبل اور تورات میں بھی اس طوفان سے متعلق روایات ملتی ہیں۔

طوفان نوح
کی کیفیت

طوفان کی اس قدر کیفیت تو قرآن پاک میں بھی موجود ہے کہ اللہ نے زمین سے پانی کو اٹھنے کا حکم دیا تھا، اور اوپر سے بارش بھی برساتی تھی۔ مگر طوفان کی مدت کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ تورات کی روایت میں میعاد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اوپر سے مسلسل مو سلا دھار شدید قسم کی بارش برس رہی تھی اور نیچے سے زمین کو پانی اٹھنے کا حکم تھا اور یہ سلسلہ پورے چالیس دن جاری رہا۔ یہاں اگر بارہ گھنٹے یا چوبیس گھنٹے مسلسل بارش ہو، تو کیا حالت ہوتی ہے اور جہاں مسلسل چالیس روز تک اوپر سے بارش اور نیچے سے پانی ابلتا رہا ہو۔ وہاں کی بستیوں کا کیا حال ہوگا۔ تورات کی روایت کے مطابق پانی بلند ترین پہاڑی سے بھی تیس فٹ اونچا چلا گیا تھا۔

کیا طوفان ساری
دنیا آیا تھا؟

اس سلسلے میں دو روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ طوفان ساری دنیا پر آیا تھا۔ اس سے کوئی خطہ زمین تباہ نہیں ہوا تھا۔ دوسری روایت یہ بھی ہے کہ اُس زمانے میں ساری دنیا پر آبادی ہی نہیں تھی۔ طوفان صرف اُس علاقے میں آیا تھا جس علاقے میں انسانی آبادی موجود تھی۔

طوفان تھمنے کے بعد نوح علیہ السلام ساٹھ سال تک دنیا میں موجود رہے تو اس طرح نوح کی عمر مبارک ایک ہزار پچاس سال بنتی ہے۔ اس سے زیادہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مگر زیادہ مشہور یہی ہے کہ چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی، نو سو پچاس سال و عطا کیا اور ساٹھ سال

طوفان کے بعد اس دنیا میں قیام کیا۔ اس طرح آپ کی عمر ایک ہزار پچاس سال ہوئی۔

پہلے صاحب
شریعت رسول

بخاری اور مسلم شریف کی روایات میں آتا ہے کہ قیامت کے روز جب لوگ نوح علیہ السلام کے پاس سفارش کے لیے جائیں گے تو ان الفاظ سے آپ کو خطاب کریں گے **يَا نُوحُ اِنَّكَ اَوَّلُ الْمُرْسَلِ اِلَى اَهْلِ الْاَرْضِ** یعنی اے نوح علیہ السلام آپ اہل زمین کی طرف۔ سب سے پہلے رسول ہیں۔ آپ سفارش کریں کہ اللہ تعالیٰ حساب کتاب شروع کریں، ہم بڑی تکلیف میں ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ مجھ سے کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر باز پرس ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دینگے **نَفْسِيْ نَفْسِيْ اَذْهَبُوْا اِلَى غَيْرِيْ** دوسروں کے پاس جاؤ۔ گویا اس طرح وہ لوگوں کو ٹال دیں گے۔ الغرض حضرت نوح علیہ السلام اہل زمین کی طرف پہلے صاحب شریعت رسول تھے۔ اور یہ رسول کہ جن کی قوم کو تبلیغ کی حجت پوری ہونے پر سزا دی گئی۔ اس سے پہلے نہ کوئی مستقل شریعت تھی اور نہ ہی کسی قوم کو سزا دی گئی۔

پورے سال کے
روزے

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت ادریس اور حضرت شلیث علیہ السلام کے ادوار میں صرف دنیا کی آباد کاری کے قوانین تھے، کوئی مستقل شریعت نہیں تھی۔ البتہ نوح علیہ السلام کے زمانے میں شریعت کا نفاذ ہوا۔ مثلاً مشہور ہے کہ آپ کے زمانے میں پورے سال کے روزے فرض تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ بہت زیادہ جسمانی طاقت رکھتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان میں روحانیت پیدا کرنے کے لیے سال بھر کے روزے مقرر فرمائے۔ مگر انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو رد کر دیا۔

عروج بن عقیق

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے نہایت اختصار کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت آپ کی قوم کے انکار اور طوفان کی صورت میں عذاب کا ذکر فرمایا ہے۔ اس طوفان میں کافروں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ قصے کہانیوں کی کتابوں میں آتا ہے کہ ایک شخص عروج بن عقیق کو زندہ رکھا گیا۔ یہ بھی کافر تھا اور اپنے قد کا آدمی تھا۔ یہ پانی میں نہیں ڈوبا تھا۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے زندہ رکھا تا کہ بعد میں آنے والے لوگوں کو بتائے کہ ان کے ساتھیوں کے ساتھ کیا حشر ہوا تھا۔ بعض اوقات مجرموں کو سزا دی جاتی ہے تو کسی کو چھوڑ بھی دیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ دوسروں کو جا کر بتائے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ بہر حال یہ تاریخی روایتوں میں بیان آتا ہے۔ قرآن و حدیث یا کوئی اور معتبر روایت نہیں ملتی۔ واللہ اعلم۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ غلط ہے یا صحیح۔ ممکن ہے خدا کی قدرت سے ایسا ہی

ہوا ہو۔ جیسے دجال اور خضر علیہ السلام کے حیرت انگیز واقعات ملتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو بھی عبرت کے لیے زندہ رکھا ہو۔ صحیح بات اتنی ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے تمام کافروں کو ہلاک کر دیا تھا۔ صرف وہی بچے تھے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے۔ اور پھر انہیں کی اولاد سے نسل انسانی قائم رہی اس لیے اس اعتبار سے حضرت نوحؑ کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔

موجودہ نسل انسانی
حضرت نوحؑ کی
اولاد سے ہے

کشتی نوح میں جو ستر آدمی سوار تھے، ان کی اولاد بھی آگے نہیں چلی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام، حام اور یافث تھے۔ اس وقت جتنی بھی انسانی نسل دنیا میں موجود ہے، یہ ان تین خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے تمام عرب قبائل، اور ہندوستان پاکستان وغیرہ کے باشندے سامی نسل سے ہیں۔ حبشہ والے اور ارد گرد کے افریقی ممالک کے لوگ حام کی اولاد ہیں۔ اسی طرح روسی اور یورپی ممالک کے باشندے تیسرے بیٹے یافث کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

بہر حال حضرت نوح علیہ السلام نے جو دعوت حق دی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا اور آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو تسلی دی۔ حضرت نوح علیہ السلام کا نمونہ پیش کر کے صبر جمیل کی تلقین کی۔ کہ جس طرح حضرت نوح نے صبر و تحمل سے کام لیا، اسی طرح آپ بھی صبر کریں اور تسلی رکھیں۔ سورۃ کے ابتداء میں فرمایا اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوحًا اِلٰی قَوْمِهٖ ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف مبعوث فرمایا۔ آپ اسی قوم اور خاندان کے فرد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول بنایا، وحی نازل فرمائی۔ شریعت عطا کی اور دعوت الی الحق کا یوں حکم دیا اَنْ اَنْذِرُ قَوْمَكَ کہ آپ اپنی قوم کو ڈرائیں، انہیں خواب غفلت سے جگائیں مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ پیشتر اس کے کہ ان کے پاس دکھ دینے والا عذاب آجائے عذاب سے مراد وہی طوفان ہے۔ کہ طوفان آنے سے پہلے پہلے آپ ان کو خوف دلائیں۔ گویا یہ اللہ کی طرف سے انذار کا حکم تھا۔

حضرت نوح کی
بعثت اور انذار

نبیوں کی تعلیم میں بشارت اور انذار دونوں چیزیں داخل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہر نبی مبشر اور منذر ہو اگر تم سے۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ذٰلِكَ لِيَاْمَنَ الْاِيْمَانُ کو خوش خبری بھی دیتے ہیں۔ اور نافرمانوں کو ڈراتے بھی ہیں۔ یہاں پر حضرت نوح علیہ السلام کو انذار کا حکم دیا جا رہا ہے۔ کہ آپ ان کو ڈرائیں شاید یہ راہِ راست پر آجائیں۔

انذار کا تقدم

بعض اوقات انذار کو تقدم حاصل ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات بشارت کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے۔
 حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی سورۃ مدثر میں آتا ہے۔ ”فَمَنْذَرًا لِّعِبَادٍ لِّمَنِ الْكَرِيمُ!“
 آپ اٹھ کھڑے ہوں اور ان کو آنے والے بڑے وقت کے خطرناک نتائج سے ڈرائیں۔ یہاں پر نوح
 علیہ السلام کو حکم دیا جا رہا ہے اَنْذِرْ قَوْمَكَ کہ اپنی قوم کو ڈرائیں۔

انذار کو مقدم لانے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اکثر انسان برائی میں ہی مبتلا ہوتے ہیں۔ لہذا ان
 کی اکثریت کی مناسبت سے انذار کو مقدم رکھا گیا۔ کہ آپ ان کو ڈرائیں کہ کفر و شرک کا انجام اچھا نہیں
 ہوگا۔ اگاہ ہو جاؤ۔ خبردار ہو جاؤ معصیت اور نافرمانی قابلِ مواخذہ ہے۔ اپنے آپ کو بچا لو۔ حضرت
 نوح علیہ السلام نے سب سے پہلے یہی دعوت لوگوں کو دی۔ اس مقام پر اس دعوت کا ذکر نہایت اختصار
 کے ساتھ کیا گیا ہے۔ دوسری سورتوں میں دوسرے واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام
کی تعلیم

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم پاکہ نوح علیہ السلام نے قوم سے یوں خطاب کیا قَالَ يَقَوْمِ
 اِنِّیْ لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ اے میری قوم کے لوگو! میں تم کو کھول کر ڈرسانے والا ہوں۔ کہ اگر
 کفر و شرک سے باز نہیں آؤ گے تو اس کا بہت بُرا نتیجہ سامنے آئے گا، لہذا سنبھل جاؤ۔ سورۃ یونس
 میں ہے کہ آپ نے فرمایا اے لوگو! میں جو بات کہتا ہوں، خوب سمجھ لو تھُمَّ لَا یَکُنْ اَمْرُکُمْ
 عَلَیْکُمْ غُمَّةً تَہْمَیْ اے معاملے میں کوئی اشتباہ والی بات نہیں ہونی چاہیے۔ میں تمہیں صاف
 صاف کہتا ہوں اِنْ اَعْبُدُوا اللّٰهَ صِرَفَ اللّٰهِ کی عبادت کرو۔ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں
 ”مَا مِنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ“ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں، الٰہ صرف ایک ہی ہے۔ اسی کی عبادت کرو۔
 میرا پیغام اور میری تعلیم یہی ہے۔ اور نیز یہ کہ وَاتَّقُوا اُنِّیْ سے ڈرو کیونکہ اگر اُس کا خوف دل میں ہوگا
 تو معصیت سے بچ جاؤ گے وَاطِیْعُوْنِ اور میری بات مانو، میری اطاعت کرو کیونکہ نبی کی اطاعت
 فرض ہے۔ اور صرف یہی بات نجات کا ذریعہ ہے۔ کہ اللہ کی عبادت کرو اور میری اطاعت کرو۔

ما فوق الاسباب
استمداد غیر اللہ
سے شرک ہے

اسی سورۃ کے دوسرے رکوع میں آتا ہے۔ کہ یہ لوگ خاص قسم کے شرک میں مبتلا تھے۔ اور
 وہ یہ ہے کہ نیک لوگوں کی روحوں سے امداد طلب کرتے تھے۔ حالانکہ ما فوق الاسباب استمداد مانگنا
 شرک ہے۔ ما فوق الاسباب امداد کہ ناصرف خدا تعالیٰ کا کام ہے۔ ”وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ“ امداد
 اسی سے طلب کی جاسکتی ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو طاقت نہیں کہ اسباب کے دائرے سے باہر

کسی کی امداد کر سکے۔ غائبانہ امداد نہ کوئی فرشتہ کر سکتا ہے، نہ جن، نہ انسان، نہ بھوت اور نہ کوئی ظاہری اور باطنی چیز۔ لہذا اسی بناء پر قوم نوح شرک میں مبتلا تھی۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

عبادت صرف اللہ
ہی کی روا ہے

حکم ہوا کہ اے لوگو! صرف اللہ کی عبادت کرو۔ ہر نبی نے اپنی اپنی قوم کو یہی نصیحت کی۔
”يَقُومُوا عِبَادَةَ اللَّهِ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهِ غَيْرُهُ“ اے لوگو! صرف اللہ کی عبادت کرو۔ اللہ کے

ماسوا کوئی خالق، مالک، مدبّر، مربی۔ مستحق عبادت مدد کرنے والا۔ نافع و ضار نہیں ہے۔ یہ تمام اختیارات صرف خدا تعالیٰ کے پاس ہیں۔ باقی ساری مخلوق عابد ہے۔ مقرب سے مقرب استی بھی عبادت پر ہی فخر کر سکتی ہے۔ اِنْ اَعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ میں بھی اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں تم بھی اُسی کی عبادت کرو۔ مقربین فرشتے حتیٰ کہ جبرائیل علیہ السلام بھی اُسی کی عبادت کرتے ہیں۔

عبادت الہی
کامصلہ

فرمایا اگر اللہ کی عبادت کرو گے، اُسی سے ڈرو گے اور میری اطاعت کرو گے تو یَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ اللہ تعالیٰ تمہاری کسی غلطیاں معاف کر دے گا۔ یہاں پر مِنْ سے مراد بعض غلطیاں ہیں، ساری غلطیاں معاف نہیں ہوتیں۔ اگر حقوق اللہ میں کوتاہی ہوئی ہے۔ تو معافی مانگنے سے اور استغفار کرنے سے اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتے ہیں اور اگر غلطی حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق میں ہے۔ تو متعلقہ بندے ہی معاف کر سکتے ہیں۔ ورنہ معافی نہیں ہوگی۔ اسی لیے یَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ فرمایا کہ تمہاری کچھ غلطیاں معاف فرمادے گا۔ وَلَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى اور تمہیں مقررہ وقت تک مہلت دے گا۔ اُس وقت تک جو اس کی مصلحت میں مقرر ہے۔ زیادہ سے زیادہ طبعی عمر تک کہ جب وہ مقررہ وقت آجاتا ہے تو پھر اس میں تاخیر نہیں ہوتی خواہ وہ وقت سزا کے لیے مقرر ہو یا جزا کے لیے۔ فرمایا اِنَّ اَجَلَ اللَّهِ اِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر ٹلنا نہیں، پورا ہو کر رہتا ہے۔ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ اگر تمہیں عقل و شعور اور سمجھ ہے تو یاد رکھو وہ وقت آنے والا ہے۔

حضرت نوح کی
شبِ روضہ دعوت

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرایا، تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ اُن کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے رہے۔ آپ نے تبلیغ کے وہ تمام طریقے اختیار کئے جو اس سورۃ میں اور دوسرے مقامات پر مذکور ہیں مگر سینکڑوں سال کی محنت کے باوجود وہ قوم راہِ راست پر نہ آئی۔ آخر تھک ہار کر حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہِ رب العزت میں

دعا کی قال رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَنَهَارًا اے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو شب و روز مسلسل دعوت دی فلم یزدہم دُعَاۃًیْ اِلَّا فِرَارًا مگر میری دعوت نے ان لوگوں کے لیے کوئی اضافہ نہیں کیا، سوائے بھاگنے کے۔ یعنی یہ لوگ میری دعوت سے راہ فرار ہی اختیار کرتے رہے ہیں تاکہ ان کے کان میں کلمہ خیر کی آواز تک نہ پڑے۔ میں نے جتنا زیادہ ان کو پکارا، یہ اتنا ہی بگڑے۔

یہاں پر لیل و نہار کا لفظ بتا رہا ہے کہ تبلیغ حق کا فریضہ ادا کرنے کے لیے دن کا ہونا ہی شرط نہیں بلکہ رات اور دن جب بھی موقع میسر آئے تو یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اسی لیے میں نے شب و روز ایک کر دیا، ہر آن ان کو دعوت الی الحق دی، زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ کیونکہ جو کسی کام میں متفکر ہوتا ہے۔ وہ کسی خاص وقت یعنی دن یا رات کا انتظار نہیں کرتا، بلکہ جب بھی موقع ملے اپنا فرض سرانجام دیتا رہتا ہے۔ میں نے ان کو جس قدر نرمی کے ساتھ بلایا یہ اتنے ہی سخت ہو گئے۔ اے مولا کریم! میں نے ان کو دن کو تبلیغ کی، رات کو تبلیغ کی۔ ان کو عام مجمعے میں بھی بلایا اور تنہائی میں بھی بات کی خوشی کے موقع پر بھی توجہ دلائی اور غمی کے حال میں بھی ان کی راہنمائی کی کوشش کی مگر انہوں نے میری ایک نہیں مانی۔ انہوں نے سوائے بھاگنے کے اور کچھ نہیں کیا۔

دعوت حق سے
بیزاری

وَ اِنِّیْ کُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ اَوْ رَجَبْتُہُمْ اَوْ بَلَّیْتُہُمْ لَتَغْفِرْ لَہُمْ تاکہ اے پروردگار تو ان کی بخشش فرمائے یہ ایمان قبول کر لیں اور توحید کو اختیار کر لیں، میری دعوت کا مقصد یہی تھا تَوَجَّعُوا اَصَابِعُہُمْ فِیْ اِذَا ذٰلِہُمْ تَوَّابُوْنَ تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں تاکہ نوح علیہ السلام کی کوئی بات ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ وَ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَہُمْ اور اپنے کپڑے سمیٹنے لگے۔

کپڑے سمیٹنے کا مقصد کسی کام سے اپنے آپ کو الگ کر لینا ہے کہ یہاں سے کھسک جاؤ کسی کی بات نہ سنو۔ کپڑے سمیٹنے کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کان انگلیوں سے بند نہ ہوتے ہوں، تو ان میں کپڑا ٹھونس لیا جائے تاکہ کسی صورت بات کان میں نہ پڑ جائے۔ یا کپڑا اوپر ڈال لینا تاکہ رکاوٹ بن جائے اور بات کان تک نہ پہنچ سکے۔ اگر اس سے مراد کپڑا اور ٹھکر لیٹ جانا لیا جائے تو یہ بھی بیزاری کا اظہار ہے۔ نفرت کرنا ہے بھاگنے کی کوشش ہے۔ یہ ساری باتیں اس میں آجاتی ہیں۔

فرمایا کہ انہوں نے کان بند کر لینے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ وَاَصْرُوا انہوں نے اصرار کیا اور ضد

باطل عقیدے پر
اصرار، اور تکبر

کی کہ ہم تو اپنا عقیدہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور جس کی پرستش ہم کرتے ہیں اس کو ترک نہیں کریں گے۔ گویا انہوں نے کفر و شرک پر اصرار کیا۔ بلکہ اس کے علاوہ وَاسْتَكْبَرُوا سُبْحَانَكَ۔ انہوں نے بڑا تکبر کیا۔ سورۃ ہود میں ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کو کہتے تھے، تو یہ بوقوت آدمی ہے، جو خواہ مخواہ ہمیں ایسی باتیں کرتا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ کہتے تھے کہ تیرے جیسا بوقوت آدمی ہی ایسی باتیں کرتا ہے، کہ صرف ایک خدا کی پرستش کرو، اپنے بزرگوں کو چھوڑ دو، اُن کی روحانیت سے استمداد نہ کرو۔ تو ہمیں اپنے طریقے سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ ہم تیری بات نہیں سنتے تو عقل مند آدمی نہیں ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا لَيْسَ لِيُ سَفَاهَةٌ ”اے میری قوم کے لوگو! میں بوقوت نہیں ہوں۔ خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تم غلطی پر ہو اور بیجا اصرار کرتے ہو۔ تکبر کر رہے ہو، اور یہ تکبری کا اظہار تھا کہ وَمَا تَرْكُوكَ أَتَّبِعُكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا لِنَاكِدِي الرُّسُلَ“ یعنی تیرے پیچھے لگنے والے تو ہمارے کئی کھین لوگ ہیں۔ فلاں چوہدری نے نہیں مانا، فلاں خاں صاحب نے تسلیم نہیں کیا۔ فلاں سردار نے تمہاری دعوت کو قبول نہیں کیا۔ صرف چند مزبور بیٹے لوگ تیرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ جن کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہی اُن کا تکبر تھا۔ حالانکہ ابتداء میں انبیاء کے متبع ہمیشہ کمزور لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ سارے نبیوں کی تاریخ یہی ہے۔ بڑے لوگ بعد میں مجبور ہو کر اسلام قبول کرتے ہیں۔

ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جَهَارًا ⑧ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ⑨

ترجمہ: بیشک پھر میں نے اُن کو برملا دعوت دی ⑧ پھر میں نے ان کو علی الاعلان دعوت دی۔

اور میں نے ان کو پوشیدہ طور پر بھی دعوت (توحید) دی ⑨

پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ کا ذکر فرمایا ہے کہ کس طرح انہوں نے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ دوسرے رکوع میں مشرکین کے شرک اور اس کی مختلف صورتوں کا ذکر ہے اور آخر میں پھر منکرین کے لیے سزا کی دعا ہے۔ الغرض اس سورۃ میں نوح علیہ السلام کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ کہ انہوں نے کس طرح لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچایا، اور اُن کی طرف سے دی گئی ایذاؤں اور پریشانیوں کو کس طرح برداشت کیا۔

اس سورۃ میں حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ کے پانچ طریقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے درس میں ان پانچ میں سے دو طریقوں یعنی رات اور دن کی تبلیغ کا بیان آچکا ہے اور آئندہ باقی طریقوں کا ذکر ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام اور اُن کے پیروکار خدا کا پیغام اور اس کی وحدانیت کی تعلیم انہیں پانچ طریقوں سے دیتے رہے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے یہ سارے طریقے سینکڑوں سال تک اپنی قوم پر آزمائے مگر سوائے اُن ستر آدمیوں کے جو کشتی پر سوار ہوئے، اور کوئی ایمان نہ لایا سورۃ ہود میں ارشادِ ربانی ہے۔ "وَأَوْحِي إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ" یعنی اے نوح! تمہاری قوم میں سے سوائے ان ستر لوگوں کے جو ایمان لاچکے، اور کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔

اس کے بعد جب اپنی قوم سے بالکل مایوس ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا فرمائی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے تبلیغ کے سلسلے میں جس قدر محنت کی، اس کی تفصیل اسی دھماکے اندر ہی آرہی ہے۔ جیسا کہ پہلے درس میں گذر چکا ہے۔ اپنے اپنی قوم کو دن کو بھی دعوت دی اور رات کو بھی دعوت دی مگر وہ بھاگتے رہے۔ اب آگے دوسرے ذرائع تبلیغ کا ذکر آ رہا ہے۔

دعوت الی الحق کا تیسرا طریقہ آپ نے یہ بتایا کہ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُھُمْ جَمَاعًا پھر میں نے اُن کو بر ملا دعوت دی۔ تبلیغ کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ بعض اوقات بر ملا دعوت موثر ثابت ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کی سوچ اس قسم کی ہوتی ہے کہ اگر اُن کو فرداً فرداً کوئی بات سمجھائی جائے تو وہ شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کہ کیا بات ہے، ہمیں اکیلے کیوں بتلایا جا رہا ہے۔ کہیں اس میں کوئی فاسد غرض نہ ہو۔ اس بات کا ذکر بر ملا کیوں نہیں کیا جا رہا۔ تو اس لیے نوح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی قوم کو بر ملا بھی دعوت دی۔ جیسا کہ سورۃ یونس میں ہے ثُمَّ لَا یَكُنْ اَمْرُکُمْ عَلَیْکُمْ غُمَّةً اے لوگو! میری بات صاف صاف سمجھ لو، اس کے بعد تمہارے دلوں میں شک و شبہ یا تاریکی نہیں رہنی چاہیے۔ میری دعوت واضح ہے۔ اِنْ اَعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيعُوْا۔ یعنی عبادت صرف اللہ کی کرو۔ اُسی سے ڈرو اور میری بات مانو۔

الغرض حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم پر بر ملا دعوت کی حجت بھی پوری کر دی، کیونکہ رات کی دعوت میں گھر میں اکیلے آدمی اور علیحدگی کا تصور پایا جاتا ہے اور جہاز میں عام مجمع کا اعلان دعوت مقصود ہے۔ جو جو طریقے حضرت نوح علیہ السلام نے اختیار کئے، وہ سارے طریقے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی استعمال فرمائے۔ یعنی رات کو بھی تبلیغ کی، دین کو بھی، عام مجالس میں بھی کی، بازاروں اور منڈیوں میں دعوت دی، عام اجتماعات میں خدا کا پیغام سنایا۔

علی الاعلان دعوت

دعوت کا چوتھا طریقہ یہ بیان کیا کہ ثُمَّ اِنِّیْ اَعْلَنْتُ لَھُمْ پھر میں نے اُن کو علی الاعلان دعوت دی۔ علی الاعلان سے مراد ہے ڈونڈی بٹو کر۔ جیسے کوئی اہم معاملہ ہو تو ڈونڈی پٹوائی جاتی ہے۔ اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے ڈونڈی بٹو کر عام اعلان کے ذریعے لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ کہ خبردار ہو جاؤ، پھر نہ کہنا کہ ہمیں پتہ نہ چلا اب کان کھول کر اللہ کا پیغام سن لو۔ مگر پھر بھی قوم پر کوئی اثر نہ ہوا۔

پوشیدہ طور پر دعوت

بعض لوگ نفیاتی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر انہیں کوئی بات علی الاعلان کی جائے یا اُن کی کسی خامی کا بر ملا اظہار کیا جائے تو وہ ہزارمان جاتے ہیں، نصیحت نہیں پکڑتے۔ اسی حجت کو کوپرا کہنے کے لیے وَاسْرَرْتُ لَھُمْ اَسْرَارًا۔ اے مولا کریم! میں نے اُن کو پوشیدہ طور پر بھی دعوت توحید دی۔

امام احمدؒ کے متعلق مشہور ہے۔ کہ ایک دفعہ انہوں نے لمبی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ایک بے سمجھ آدمی آیا۔ کہنے لگا ایک مسئلہ دریافت کرتا ہوں کہ حضورؐ نے ایسی لمبی ٹوپی پہنی تھی؟ یہ بات اس نے عام مجلس میں کی تاکہ امام صاحب کی خفت ہو جائے اور آپ مجمع میں رسوا ہوں۔ اس بڑی نیت سے سوال کیا۔ تو اس کے جواب میں امام صاحب نے فرمایا نَضَعَتْ اَمْرُ فَضَحَتْ تُوْنِے نصیحت کی ہے یا رسوا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی یہ سوال بر ملا کر کے تم کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو۔ الغرض بر ملا بات میں بعض اوقات خفت اٹھانا پڑتی ہے۔ لہذا حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو پوشیدہ طور پر بھی تبلیغ کر کے انہیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔

تبلیغ کے پانچ
اصول

الغرض حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا اللہ! میں نے دعوت الی الحق اور تبلیغ دین کے تمام طریقے استعمال کر لیے ہیں ان کورات کو بھی دعوت دی اور دن کو بھی دعوت دی۔ شب و روز میں جب بھی موقع ملا میں نے تیرا پیغام پہنچانے میں کُستی نہیں کی۔ پھر ان کو بر ملا مجالس میں بھی سمجھایا، اور علی الاعلان بھی خدا کا پیغام پہنچایا۔ میں نے ان کو تنہائی میں فرداً فرداً بھی تیرا پیغام سنایا، مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

تبلیغ کے یہ اصول
ہر زمانے میں کارآمد ہیں

تبلیغ کے یہ پانچ اصول ہر زمانے کے ہر مبلغ کے لیے کارآمد ہیں۔ اگر کسی کورات کو موقع ملتا ہے تو رات کو تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے، خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچائے۔ مگر اس زمانے میں رات کے وقت تو ساری دنیا کھیل تماشے میں مصروف ہوتی ہے۔ چارادب کفار و مشرکین کے علاوہ کلمہ گو بھی اسی رد میں بہ رہے ہیں۔ لہذا لعب میں مصروف رہتے ہیں۔ عبادت کون کرتا ہے اور تبلیغ کون کرتا ہے دن کے وقت لوگوں کی اکثریت پیٹ کی ضروریات میں لگی رہتی ہے۔ ایسے کتنے آدمی ہوں گے جو محض رضانے الہی کے لیے لوگوں تک دین پہنچائیں جسے سمجھ کر نجات حاصل کر سکیں۔ حصولِ روزگار، معیشت، ملازمت، محنت یہ سب چیزیں جائز ہیں۔ مگر نوعِ انسانی کے لیے سب سے زیادہ اہم ضرورت کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے۔ جس سے لوگ فلاح پائیں۔

اب راتوں کو ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہ تبلیغ ہو رہی ہے۔ لاوڈ سپیکر ایک نئی مصیبت آگئی ہے۔ رات کو اس پر صلوٰۃ و سلام شروع کر دیا۔ یا محافل کو کچلنے کے لیے برا بھلا کہنے لگے بغیر بازی یا گانا بجاتا شروع کر دیا۔ یہ کون سی تبلیغ ہے۔ کوئی پنجابی غزل ہو رہی ہے، کوئی اردو نغمہ گارہا ہے، کوئی

لاوڈ سپیکر کا
غلط استعمال

کچھ کہتا ہے کوئی کچھ کہتا ہے۔ اس سے کون سی اصلاح ہوتی ہے۔ کسی کے ذہن میں کوئی اچھی بات تو اترتی نہیں۔ جب اتارے گی بڑی بات ہی اترے گی، کیونکہ تبلیغ تو مقصد ہی نہیں، محض اپنے فرقے اور اپنی پارٹی کی حمایت مقصود ہے یا پھر پیٹ پروری مطلوب ہے۔

عرب کہتے تھے فی العتاب حیوۃ؟ دوسروں کو برا بھلا کہنے میں زندگی ہے لہذا بعض لوگوں کی اللہ تعالیٰ نے روزی ہی علمائے دیوبند کو گالیاں دینے میں رکھی ہے۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ کو دو سو سال ہو گئے ہیں۔ مگر آج تک لوگ انہیں گالیاں دے کر روزی کھاتے ہیں۔ تبلیغ کا کوئی پروگرام نہیں۔ بس مخالفین کو گالیاں دو اور اپنا پیٹ بھرو۔ یہ تو ضمناً بات آگئی تھی حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں تبلیغ کا کوئی معقول طریقہ ہی نہیں ہے۔ اگر لاوڈ سپیکر ہی استعمال کرنا ہے تو کوئی اچھی بات تو کرو۔ یہ کون سی نیکی ہے کہ لاوڈ سپیکر کھول کر دوسروں کی نمازیں خراب کرو۔ اُدھر نماز ہو رہی ہے، اُدھر وہ درس دے رہے ہیں۔ ایک مسجد میں درس ہو رہا ہے، اور دس بیس مسجدوں میں نمازیں خراب ہو رہی ہیں۔ کسی کو کوئی پرواہ نہیں۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے، پڑوسی کو مت ستاؤ۔ چہ جائیکہ عبادت کے اندر لوگوں کو ستایا جائے۔ بعض اوقات لاوڈ سپیکر کے غرغری کی آواز ایسی آتی ہے کہ نمازوں کے دوران پتہ ہی نہیں کہ امام کیا پڑھ رہا ہے اور مقتدی کیا سن رہے ہیں۔ رکوع و سجود میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی نیکی نہیں بلکہ مصیبت ہے۔ یہ لوگ عذاب میں مبتلا ہیں۔ کیا خاک ترقی کی ہے۔ کوئی نماز نہیں پڑھ سکتا، کوئی تلاوت نہیں کر سکتا۔ دن میں بھی ہو رہا ہے۔ رات کو بھی بارہ بجے تک جاری ہے۔ کیا دعوتِ لیل و نہار کا یہی مقصد تھا۔ کہ دوسروں کی عبادت میں خلل ڈال جائے۔ گانا بجانا ہو اور گالیاں دی جائیں۔ دن کو پیٹ کا دھندا ہے اور رات کو لہو و لعب میں مبتلا ہیں۔

عناد و تعصب
دین نہیں

جب کہیں جلسہ ہوتا ہے، بر ملا تقریر ہوتی ہے، تو وہاں بھی یہی چیز ہے جس طرح ممکن ہو مخالفین کو ذلیل کرو۔ خدا راضی ہو یا نہ ہو مگر اپنی پارٹی اور اپنے فرقہ کو قائم رکھو۔ کسی کو فائدہ ہو یا نہ ہو، کسی کے عقیدے کے خلاف ہو یا حق میں کوئی جائے جہنم میں، تم اپنا مطلب پورا کرو۔ یہ سمجھتے ہیں کہ دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ یاد رکھو تعصب اور عناد کوئی دین نہیں۔ حضورؐ نے اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دی ہے۔ وہ شخص کاہل الایمان نہیں، جو پڑوسیوں کو ستا رہے یہ نماز کے دوران بھی شور مچا رہے

میں ایہ کون سا دین ہے۔

تبوک کے واقعہ میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص آگے سے گزرا گیا۔ نماز میں خلل واقع ہو گیا۔ آپ نے اس کے لیے بد دعا فرمائی کہ خدا کرے تو اپنی ٹانگوں سے چل نہ سکے۔ وہ آدمی لنگڑا ہو گیا تھا۔ اُس نے حضور کو ایذا پہنچائی تھی۔ مرتے دم تک ٹھیک نہ ہوا۔ یہ روایت ابو داؤد میں موجود ہے۔

نماز کے آگے سے گزرنے کا

نماز کے آگے سے گزرنے والا مسئلہ بھی اہم ہے۔ حضور نے فرمایا کہ کوئی شخص چالیس سال یا چالیس رات تک کھڑا ہے تو یہ اس کے لیے نماز کے آگے سے گزرنے سے بہتر ہے۔ ہاں اس طرح نماز کی نماز میں فرق نہیں آئے گا۔ البتہ گزرنے والا گنہگار ہو گا۔ نماز ہو جائے گی۔ اسی لیے اگر کھلی جگہ میں نماز پڑھ رہے ہو تو آگے سترہ رکھنے کا حکم ہے تاکہ نماز سکون کے ساتھ ادا کی جاسکے۔

دین قیامت تک قائم ہے

أَعْلَنْتُ لَهُمْ کے مطابق تبلیغ دین کا ایک طریقہ علی الاعلان بھی ہے۔ مگر یہاں تبلیغ کی بجائے لہو و لعب، فحاشی اور عریانی کا اعلان ہوتا ہے۔ ٹانگے کے پیچھے سینما کا اشتہار بازہ کہ فحاشی پھیلانی جا رہی ہے تبلیغ دین کا اعلان کون کرتا ہے۔ کیا حکومت یہ فریضہ انجام دے رہی ہے۔ دین ایک سچی حقیقت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے دین قیامت تک سٹے گا نہیں اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو کھڑا کرتا ہے گا۔ جو دین پر خود بھی قائم رہیں گے اور دعوت بھی دیتے رہیں گے۔ مخالفوں کی ایذا میں بھی برداشت کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ قیامت برپا ہو جائے گی۔ مگر اس زمانے میں حکومتیں کیا کر رہی ہیں، پارٹیاں کیا کر رہی ہیں۔ دولتمند یہ خدمت کہاں تک سرانجام دے رہے ہیں۔ دین کی کونسی دعوت دے رہے ہیں۔ کس بات کا اعلان کر رہے ہیں۔ اسی طرح وَأَسَدْتُ لَهُمُ اسراراً۔ کے مصداق پوشیدہ طور پر تبلیغ کا کیا حق ادا کر رہے ہیں۔

اسوۂ حسنہ پر عمل کا فقدان

بہر حال تبلیغ کے یہ پانچ طریقے نوح علیہ السلام نے اپنی قوم پر آزمائے۔ اور ان کا ذکر اپنی دعائیں کیا۔ یہی پانچ طریقے تمام امتوں پر لاگو ہیں۔ مگر کیا آج کا مسلمان ان پر عمل درآمد کر رہا ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ أَعْلَنْتُ لَهُمْ کے مطابق مسلمان ساری دنیا میں کلمہ حق کا اعلان کرتے مگر یہ منافقت میں مبتلا ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضور کا اسوۂ حسنہ سب سے بہتر ہے۔ پھر اسے قبول کیوں نہیں کرتے۔ حضور کا اسوۂ حسنہ عبادت میں پکڑو، نکاح طلاق میں پکڑو۔ سیاست میں

پکڑو۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طور طریقہ سب سے افضل ہے تو پھر اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے۔ وزیر اکٹھے ہوئے اسلام کی سر بلندی کی باتیں ہوئیں۔ پندرہویں صدی ہجری کی تقریباً کا اعلان ہوا۔ ان تقریبات سے کس قدر فائدہ ہوا۔ جب کہ اسلام کے اصولوں پر عمل ہی نہیں ہے۔ عقیدہ درست نہیں ہے۔ دماغوں میں کفر و شرک بھرا ہوا ہے۔ بد عملی اور عیاشی کا دور دورہ ہے فحاشی پائی جاتی ہے۔ لہو و لعب میں مبتلا ہیں۔ مگر زبان سے کہتے ہیں کہ اسلام سچا مذہب ہے اگر واقعی سچا مذہب ہے تو پھر اس پر عمل کر کے کیوں نہیں دکھاتے۔

قول و فعل
میں تضاد

برناڈشا بڑی مشہور انگریز شخصیت ہوئی ہے۔ وہ اسلام کی بڑی تعریف کیا کرتا تھا۔ مولوی ظفر علی خاں مرحوم لندن گئے۔ برناڈشا سے ملاقات ہوئی تو اُس نے اسلام کی بڑی تعریف کی۔ ظفر علی خاں جذباتی آدمی تو تھے ہی، کہنے لگے اگر اسلام ایسا سچا دین ہے تو پھر تم اسلام قبول کیوں نہیں کر لیتے برناڈشا نے مولوی صاحب کو ڈانٹ دیا کہ تم مجھے اسلام کی دعوت دیتے ہو، پہلے خود اسلام پر کار بند ہو کر آؤ۔ تمہارا خود اسلام پر عمل نہیں ہے، مجھے کیا دعوت دیتے ہو۔ میں تم سے اسلام کو زیادہ جانتا ہوں۔ پہلے صحابہ کرام جیسے بن کر آؤ۔ پھر مجھے دعوت دینا۔ تمہارے قول و فعل میں تضاد ہے۔

اسلام کے نام پر
الحاد کی تبلیغ

مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ ساری دنیا میں توحید کا اعلان کرتے، اسلام کی دعوت دیتے۔ مگر اب تو کوئی اعلان بھی نہیں کر سکتا۔ بیرونی ممالک میں وفد جاتے ہیں۔ طلباء بھی جاتے ہیں۔ مگر لہو و لعب کے لیے۔ شراب نوشی اور رنڈی بازی کے لیے۔ یہ دوسروں کو کیا ٹھیک کریں گے، خود رگ و ریشے میں سیودیت، نصرانیت اور الحاد لیا ہوا ہے۔ نام مسلمانوں جیسے ہوتے ہیں، کام سارا سیودانصار کا اور الحاد کا کرتے ہیں۔ وہاں سے کیا سیکھ کر آتے ہیں۔ یہ کیا اعلان کریں گے۔

پوشیدہ طور پر بھی وہی دعوت دے گا۔ جس کے دل میں کوئی سہمردی ہے اور جسے اپنے دین کی حقانیت پر یقین ہے کہ اس سے بہتر کوئی دین نہیں، ہم اگر کسی کو سمجھائیں گے، کسی کا بھلا کریں گے، تو ہمیں بھی فائدہ پہنچے گا "فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰی" آپ ان کو نصیحت کریں خواہ ان کو فائدہ دے یا نہ دے، آپ کو ہر حالت میں یہ نصیحت فائدہ پہنچائیگی۔ آپ کا ترغیب ادا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات بلند ہوں گے۔

یہ اُس دعوت کا ذکر ہے جو نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دی اور جو ان کی دعا کے اندر آئی ہے۔ اگلی آیات میں ان باتوں کا ذکر ہے، جو نوح علیہ السلام نے لوگوں سے کیں۔ اور بارگاہ الہی میں عرض کرتے ہیں کہ میں نے یہ باتیں اپنی قوم کے لوگوں کو سمجھائیں، شاید کہ وہ میری بات سمجھ جائیں۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰ يُرْسِلِ
السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝۱۱ وَيَسْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ
وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ أَنْهَارًا ۝۱۲ مَا لَكُمْ
لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ۝۱۳ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝۱۴
أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا ۝۱۵ وَجَعَلَ
الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا ۝۱۶ وَاللَّهُ أَنْتَبَكُمْ
مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۝۱۷ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ
إِخْرَاجًا ۝۱۸ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ بَسَاطًا ۝۱۹ لَّتَسْلُكُوا
مِنْهَا سُبُلًا مُّفَاجَا ۝۲۰

ترجمہ: پھر میں نے انہیں کہا اپنے رب سے استغفار کرو بیشک وہ بہت بخشنے والا ہے ۱۰ اللہ تعالیٰ اچھوڑ دے گا آسمان کو تم پر کہ موسلا دھار بارش برسائے ۱۱ اور بڑھا دے گا تمہارے لیے مال اور بیٹے اور تمہارے لیے باغات تیار کر دے گا اور تمہارے لیے نہریں بنا دے گا ۱۲ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے وقار سے خوف نہیں کھاتے ۱۳ اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہیں مختلف اطوار (دوروں) میں پیدا کیا ۱۴ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کو کیسے تہ بہ تہ پیدا کیا ۱۵ اور آسمانوں کے اندر چاند کو نور بنایا اور سورج کو روشن چراغ بنایا ۱۶ اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں زمین سے ایک خاص طریق پر پیدا کیا ۱۷ پھر تمہیں زمین میں واپس لوٹائے گا اور پھر اسی سے دوبارہ نکالے گا ۱۸ اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنا دیا ۱۹ تاکہ اس کے کشادہ راستوں پر تم چل سکو ۲۰

گزشتہ صفحہ پر

یہ سورۃ نوح ہے۔ اور ان دو وس میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے۔ جو انہوں نے تھک ہار کر بارگاہ الہی میں پیش کی کہ رَبِّ اِلٰہِیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَنَهَارًا یعنی اے پروردگار میں نے اپنی قوم کو شب و روز دعوت دی مگر میرے بلانے پر وہ اور زیادہ بھاگنے

لگے۔ انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور کپڑے سمیٹ لیے، اصرار اور تکبر کیا۔ میں نے ان کو برا بھی دعوت دی اور پوشیدہ طور پر بھی نصیحت کی، علی الاعلان بھی تبلیغ حق کی مگر انہوں نے میری کسی بات کو نہیں مانا۔

استغفار کی
ترغیب

آخر میں میں نے انہیں یہ بھی کہا فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ اپنے رب سے استغفار کرو۔ معافی مانگو کیونکہ اِنَّهٗ كَانَ عَفُوًّا وہ بہت بخشش کرتے والا ہے۔ استغفار کا معنی بخشش مانگنا، ڈھانپ لیسنا پر وہ پوشی کرنا ہے۔ مطلب یہ کہ تم ایمان قبول کر لو، تو اللہ تعالیٰ تمہاری کوتاہیوں کو معاف کر دیں گے۔ کفر و شرک کو چھوڑ دو کیونکہ ان کی موجودگی میں معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب کفر و شرک سے باز آ جاؤ گے تو بخشش کے اہل بن جاؤ گے اللہ تعالیٰ تمہاری باقی تمام کوتاہیوں سے درگزر فرما دیگا۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَلْاِسْلَامُ مِمَّا كَانَتْ قَبْلَہٗ اسلام لانے سے سابقہ کوتاہیاں معاف ہو جاتی ہیں۔ اسلام لانے سے پہلے کتنا بھی بڑا مجرم ہو مگر جب وہ کفر و شرک سے مجتنب ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ تو اس کی سابقہ تمام کوتاہیاں معاف ہو جاتی ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے رب سے معافی مانگو، وہ بڑا بخشنے والا ہے تمہیں معاف فرمائے گا۔

استغفار کی
برکات

فرمایا اگر تم استغفار کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ يُوسِلُ السَّمَاءَ عَلَیْكُمْ مَدَدًا اللہ تعالیٰ آسمان کو چھوڑ دیگا کہ تم پر موسلا دھار بارش برسائے۔ وَيُمِدُّكُمْ بِاَمْوَالٍ وَبَنِيْنَ اور بڑھادے گا تمہارے لیے مال اور اولاد وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنَّاتٍ اور تمہارے لیے باغات کے پھل تیار کر دے گا۔ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهَارًا اور تمہارے لیے نہریں بنا دیگا۔ یہ تمام چیزیں تمہیں میسر آ جائیں گی۔ بشرطیکہ تم اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔

بارش کے لیے
استغفار

بارش کے باب میں بھی ایسا ہی آتا ہے۔ بارش رگ جائے، قحط پڑ جائے تو استغفار کیا جائے ایک دفع لوگوں نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا۔ قحط سالی ہے، بارش نہیں ہو رہی ہے تو آپ نے استغفار کیا اور لوگوں سے بھی استغفار کرنے کو کہا۔ کسی نے کہا کہ حضور علیہ السلام نے استغفار کیا ہے اور اس کی تعلیم دی ہے۔ تو اس کا کیا مطلب ہے۔ تو آپؐ یہی آیت پڑھی۔ اِمام ابو حنیفہؒ فرماتے

ہیں۔ استسقاء کی حقیقت یہ ہے کہ انسان خدا سے گناہوں کی معافی مانگے، اور دعا کرے کہ مولا کریم! ہماری کوتاہیاں معاف فرمادے اور اس کے نتیجے میں ہم پر اپنی رحمت نازل فرما۔

نماز استسقاء
کی حقیقت

یہ عام طریقہ ہے۔ کہ جب بارش نہ ہو رہی ہو تو کھلے میدان میں نکل کر دو رکعت نماز استسقاء ادا کی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد بارش کی دعا کی جاتی ہے۔ تاہم استسقاء کی حقیقت اتنی ہے کہ گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔ اگر دو نفل پڑھ لے جائیں تو فہما، اگر نفل نہ بھی پڑھے جائیں تو یہ ضروری نہیں ہیں۔ یہ مستحبات میں ہے۔ مقصد استسقاء اور دعائے بعض اوقات فرض نماز کے بعد بارش کے لیے دعا کر لی جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ ایک آدمی نے آکر شکایت کی کہ حضرت! پانی نہیں مل رہا ہے۔ جانور ہلاک ہو رہے ہیں۔ تو اپنے خطبے کے دوران ہی بارش کے لیے دعا فرمادی تھی۔

ہر پریشانی کا
حل۔ استسقاء

حضرت حسن بصریؒ سے ایک روایت منقول ہے۔ کہ ان کے پاس مختلف قسم کے لوگ آتے۔ کسی نے کہا کہ حضرت! قحط سالی ہو رہی ہے۔ آپ نے فرمایا استغفار کرو۔ دوسرے شخص نے کہا کہ میری بیوی بانجھ ہو گئی ہے بچہ نہیں جیتی۔ فرمایا۔ استغفار کرو۔ ایک اور شخص نے لگا۔ ہماری کھیتی باڑی خراب ہو گئی، فصل نہیں دیتی۔ آپ نے اس کو بھی فرمایا، استغفار کرو۔

الغرض مختلف قسم کی پریشانی والے لوگوں کو آپ نے ایک ہی جواب دیا کہ استغفار کرو۔ تو ایک شاگرد نے دریافت کیا۔ کہ حضرت آپ نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ تو فرمانے لگے کہ یہ قرآن پاک کا مفہوم ہے۔

کیا حضرت نوح علیہ السلام نے نہیں فرمایا تھا کہ اپنے رب سے استغفار کرو اس کے بدلے میں بارش برسے گی، مال اور اولاد میں برکت ہوگی اور پانی کی سیرابی نصیب ہوگی۔ ان لوگوں نے یہی چیزیں تو طلب کی تھیں، لہذا میں نے ان کو ایک ہی جواب دیا کہ اپنے رب سے استغفار کرو۔

ایک اشکال اور
اس کا جواب

بعض اوقات لوگ ایمان بھی لاتے ہیں، استغفار بھی کرتے ہیں، مگر ان کی پریشانیاں دور نہیں ہوتیں۔ بارش نہیں ہوتی، اولاد نہیں ملتی یا کوئی اور پریشانی دور نہیں ہوتی۔ تو اس اشکال کا جواب کیا ہے؟ حالانکہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم استغفار کرو تو تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے، بارش ہوگی، اولاد ہوگی، مال کی فراوانی ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اس ضمن میں مولانا شاہ شرف علی

تھا تو ہی فرماتے ہیں۔ کہ استغفار کے صلے میں مطلوبہ مقاصد کا حصول محض قوم لوح کے لیے تھا، عام اقوام کے لیے نہیں تھا۔ حضرت لوح علیہ السلام کے زمانے میں چالیس سال تک قحط مسلط رہا، عورتیں بائجھ ہو گئیں اور ان لوگوں کو درجہ پریشانیوں لاحق ہو گئیں تو حضرت لوح علیہ السلام نے انہیں یہ نسخہ بتایا تھا۔ یہ خصوصیت اُسی قوم کے لیے تھی۔

استغفار سے
روحانی خوشی

یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایمان اور استغفار کا نتیجہ یقیناً اچھا ہوتا ہے اس کے نتیجے میں یا تو مطلوبہ چیز مل جاتی ہے یا اس سے بہتر کوئی چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ جو شخص استغفار کرے گا، اُسے روحانی خوشی یقیناً حاصل ہوگی۔ یا پھر رضا بالقضا کی صورت میں نہایت اچھا صلہ میسر آئے گا اگر اُسے روحانی خوشی حاصل ہو جائے یا اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی ہو جانے کی سعادت نصیب ہو جائے تو یہ مال، اولاد اور بارش سے یقیناً بہتر ہے۔

استغفار کی کثرت
کا حکم

اسی لیے کثرت سے استغفار کرنے کا حکم ہے۔ صحابہ کرامؓ بیان فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ایک ایک مجلس میں سو سو دفعہ استغفار کرتے تھے۔ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ تَوَّابٌ غَفُوْرٌ، تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَالتَّوْبُ إِلَيْهِ۔ فرمایا جو سچے دل سے یہ سید الاستغفار پڑھے گا، تو اس کے گناہ اگر سمندر کی جھاگ کے برابر بھی ہوں گے، تو خدا تعالیٰ معاف فرمائے گا۔ اس میں اہم عظم بھی ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی استغفار کے الفاظ ہیں ان کے پڑھنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ محض زبانی رٹ نہ لگائے بلکہ دل کی گہرائیوں سے استغفار کے الفاظ پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائیں گے۔

فوت شدہ والدین
کے لیے استغفار

بیہقی شریف کی روایت میں ہے۔ کہ مرنے والے لوگ منتظر رہتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی دعا کئے یا صدقہ خیرات کرے۔ جب ان چیزوں کا ثواب انہیں پہنچتا ہے تو انہیں بڑی راحت ہوتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ کہ ایک شخص کو اپنے اعمال کی نسبت سے زیادہ بلند درجہ حاصل ہو گا۔ اُس کو تعجب ہو گا اور وہ عرض کرے گا، باری تعالیٰ! میرے اعمال تو اس قابل نہیں تھے جس قدر درجہ تولدے مجھے عطا کیا۔ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے بِاسْتِغْفَارٍ وَلَكَ لَكَ یہ درجہ تجھے تیرے بیٹے کے استغفار کرنے کے صلے میں عطا ہوا ہے وہ تیرے لیے بخشش

مانگتا ہے اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ اسی لیے حضور علیہ السلام نے تعلیم دی کہ اپنے ماں باپ کے لیے استغفار کیا کرو۔ تاکہ اُن کے گناہ معاف ہوں اور درجات بلند ہوں۔ استغفار الیہا مفید و طیف ہے۔ ہر لائق بیٹا اپنے ماں باپ کے لیے استغفار کرتا ہے۔

استغفار گناہوں کی میل دور کرتا ہے

قرآن پاک میں استغفار کا بیان کثرت سے آیا ہے۔ مَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا اللّٰهُ کے سوا گناہوں کو کون معاف کرنے والا ہے؟ معافی مینے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔ انسان کو عاجزی اور کثرت سے استغفار کرنی چاہیے۔ بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ استغفار تسبیح و تہلیل سے بھی زیادہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ استغفار انسان کے گناہوں کو اس طرح دور کرتی ہے جس طرح صابن کپڑے کے میل کچیل کو دور کرتا ہے۔ تسبیح تو بمنزلہ خوشبو کے ہے۔ اگر استغفار سے میل کچیل دور ہو جائے تو تسبیح و تہلیل کی کھوڑی سی خوشبو بھی بڑی مفید ثابت ہوگی۔ اور انسان کی روح نکھر جائیگی۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد بھی ہے۔ کہ استغفار کثرت سے کرنی چاہیے۔ اس کے صلے میں دنیا میں خیر و برکات حاصل ہوں گی۔ اگر یہ نہ مل سکیں تو اس سے بہتر نعمت یعنی روحانی مسرت تو ضرور حاصل ہوگی۔ قیامت میں نیکیوں کا ذخیرہ میسر آئے گا۔ اور اگر رضا بالقضائے کا مقام حاصل ہو گیا تو بندہ بہت بلند مقام پر چلا گیا۔

ہر نبی کا وظیفہ استغفار

حضرت نوح علیہ السلام کی دعائیں بیان کردہ جس طرح تبلیغ کے طریقے تمام لوگوں کے لیے قابلِ عمل ہیں۔ اسی طرح طریقہ استغفار بھی تمام ہی نوع انسان کے لیے واجب العمل ہے۔ تمام انبیاء کرام نے استغفار کا طریقہ اپنایا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر عمل کرتے رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اَطْمَعُ اَنْ يَغْفِرَ لِيْ خَطِيئَتِيْ يَوْمَ الدِّينِ یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ فیصلے کے دن میری کوتاہیوں کو معاف فرما دیگا، تو گویا استغفار کرنے کا۔ معافی مانگنے کا دستور العمل بھی بتایا جا رہا ہے کہ تمام انسان اس طرح اپنے پروردگار سے کوتاہیوں کی معافی طلب کریں۔ اس کے بہت مفید نتائج برآمد ہوں گے۔

دلائل توحید

استغفار کی حقیقت اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد کا ذکر کرنے کے بعد اگلی آیات میں توحید کے دلائل سمجھائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ دلائل کا تعلق انسان کے اپنے وجود سے ہے اور کچھ خارجی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مقصد ان دلائل سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت

اور اُس کی قدرت نامہ فوراً سمجھ میں آجائے۔ فرمایا۔ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کہ اللہ کے وقار سے خوف نہیں کھاتے۔ رجا کا معنی امید بھی ہوتا ہے اور خوف بھی یہاں پر یہ دونوں معنی لگتے ہیں۔ یعنی تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی بزرگی، وقار اور اس کی عظمت سے نہ امید رکھتے ہو۔ نہ خوف کھاتے ہو اور نہ ایمان قبول کرتے ہو۔

تخلیقِ انسانی

دلائل توحید کے سلسلے میں پہلے انسان کی پیدائش کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مختلف طریقوں سے پیدا فرمایا۔ ذرا غور کرو کہ تمہاری پیدائش کس طرح ہوئی۔ ایک زمانہ تھا جب تم کچھ بھی نہیں تھے، جیسا کہ سورۃ دھر میں ہے "هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا" تم کوئی قابل ذکر چیز نہ تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ابتدا میں عناصر کی شکل میں انسان کی تخلیق کی یہ غذا جو انسان کھاتا ہے، مایا مٹی وغیرہ یہ عناصر (ELEMENTS) ہیں۔ پھر انسان کو غذا ملی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جسم میں مختلف مواد پیدا کئے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا، کیا تم غور نہیں کرتے، اہم نے تمہیں مٹی سے بنایا۔ اور پھر نسل انسانی کو قطرہ آب سے پیدا کیا۔ پھر قطرہ آب میں تبدیلیاں پیدا کیں، پھر اس کو گوشت میں تبدیل کیا پھر اس میں ہڈیاں پیدا کیں۔ اور پھر اس کے اوپر چمڑا لگا دیا۔ اعضاء بنائیے "فَتَبَرَّكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ" اب کہاں عناصر اور کہاں انسان جیسی مٹی۔ "فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا" اسے سننے اور دیکھنے والا بنا دیا۔ قرآن پاک نے جگہ جگہ انسان کی توجہ اُس کی پیدائش کی طرف دلائی ہے۔ "فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ" انسان اپنی وجہ تخلیق کی طرف غور کرے کہ وہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے کیا بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل کے طور پر تخلیقِ انسانی ایک بہترین دلیل ہے۔

علاوہ ازیں، انسان کا صرف وجود ہی تخلیق نہیں کیا، بلکہ اس میں ظاہری اور باطنی قوی پیدا کئے۔ باطنی قوی میں روح، نفس، عقل اور دیگر باطنی حواس رکھے۔ ان میں جتنے لطافت ہیں وہ بلند سے بلند چلے جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ آخری لطیفہ نور القدس سے بھی بڑھ کر حجرِ تحت ہے جس کے اندر تجلی الہی کا نمونہ ہوتا ہے۔ جہاں تک ظاہری قوی کا تعلق ہے، قرآن پاک کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے انسان سے زیادہ حسین و جمیل کوئی چیز پیدا نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ

نے سب سے احسن شکل و صورت انسان کو عطا کی۔ تو گویا یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔

آسمانوں کی تخلیق

انسانی تخلیق کے بعد آسمانوں کی تخلیق کو دوسری دلیل کے طور پر پیش کیا اَللّٰهُ تَعَالٰی کَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کو کیسے تہ بہ تہ پیدا کیا۔ جو آسمان ہمیں نظر آتا ہے۔ یہ آسمان دنیا ہے جس کو اللہ نے ستاروں اور سیاروں سے مزین فرمایا۔ سورۃ ملک میں ارشاد ہے ذِیْنَا السَّمٰوٰتِ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحٍ آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے زینت بخشی۔ ان کے حسن و جمال کا مشاہدہ کرنا ہو تو رات کے اندھیرے میں کرو۔ باقی چھ آسمان اس سے اوپر تہ بہ تہ ہیں۔ اور سب سے اوپر بہشت ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی نشانی ہے۔

شمس و قمر کی
ضیاء پاشیاں

آسمانوں کا ذکر کرنے کے بعد چاند اور سورج کی تابانیوں کو بطور دلیل پیش کیا ارشاد ہوتا ہے۔ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْہِیْنِ نُّوْرًا اور ان آسمانوں کے اندر چاند کو نور بنایا۔ چاند کی دھیمی دھیمی اور میٹھی میٹھی چاندنی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کئی مفاد وابستہ کر رکھے ہیں بھلوں میں رطوبت، رس اور مٹھاس چاند کی مریخون منت ہے۔ اور پھر اندھیری راتوں میں روشنی کا مینار بھی ہے۔ اسی طرح سورج کے متعلق فرمایا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا اور سورج کو روشن چراغ بنایا۔ اس کی روشنی اور حرارت میں بے شمار مفاد ہیں۔ حیوانات، نباتات، جمادات ہر چیز کے لیے سورج کی حرارت اور روشنی لازمی ہے۔ ورنہ کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔

اب تو سائنس کا زمانہ ہے۔ ایٹمی دور ہے۔ انسان سورج کی شعاعوں سے بہت کام لینے لگا ہے۔ جوں جوں تیل کے ذخائر ختم ہو رہے ہیں انسان سائنسی ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اب سورج کی شعاعوں سے گھروں میں چولہے گرم کئے جائیں گے۔ کھانا پکایا جائے گا اور بے شمار کام لیے جائیں گے جس دن سے اللہ تعالیٰ نے سورج کو پیدا کیا، اس کا خزانہ برابر چل رہا ہے۔ انسان جن ذخائر کو نکالتا ہے وہ کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر اللہ نے سورج میں روشنی اور حرارت کا ایسا خزانہ رکھا ہے کہ جب تک نظام شمسی (SOLAR SYSTEM) کو قائم رکھنا منظور ہے، یہ چلتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک دن آئے گا جب سورج کو بے نور کر دیا جائے گا۔ اس کی تمام طاقتیں چھین لی جائیں گی۔ جیسا فرمایا اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ یعنی جب سورج کو لپیٹ دیا جائے گا۔

فرمایا جو شخص چاند اور سورج کی ضیا پاشیاں اور ان سے مستفید ہو کر بھی ان سے دلیل نہیں پکڑتا اور اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہیں لانا، وہ بالکل عقل کا اندھلہ ہے اسے ذرا بھی تمیز نہیں۔

انسان ہر حالت میں زمین سے وابستہ ہے

اگلی دلیل کے طور پر فرمایا، ذرا غور کرو واللہ اَبْتَتُّكُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں زمین سے بطور نباتات پیدا کیا۔ انسان کی ابتداء بھی مٹی سے ہوئی اور پھر اس کی خوراک کا ذریعہ بھی زمین ہی کو بنایا۔ انسان کی غذا کو زمین سے پیدا کیا۔ اگر غذا ہی نہ ہوگی تو مواد کہاں ہوں گے۔ مواد نہیں تو خون پیدا نہیں ہوگا۔ اور انسانی زندگی باقی نہیں رہے گی۔ گویا تخلیق اور زندگی کی بقا کا احتصار زمین پر ہے۔

زمین کی وابستگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا پھر تمہیں زمین ہی میں واپس لوٹائے گا۔ جب مقررہ وقت پر انسان کی موت واقع ہوگی تو زمین میں ہی دفن ہوگا جیسا سورۃ عبس میں فرمایا اَمَاتَهُ فَاَقْبِرْهُ۔ پھر موت دی اور قبر میں ڈال دیا۔ تو گویا اس کی واپسی کی جگہ بھی زمین ہی ٹھہری۔ اور پھر قیامت کو اسی زمین سے ہی اٹھایا جائے گا۔ دوسری جگہ وضاحت کے ساتھ فرمایا۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اٰخَرٰی۔ یعنی زمین سے تمہیں پیدا کیا، اسی میں لوٹائیں گے اور پھر اسی سے دوبارہ نکالیں گے۔ فرمایا۔ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اٰخَرًا۔ اسی میں تم کو لوٹائیگا اور پھر اسی سے تم کو نکالے گا۔ تو گویا انسان کی توجہ اس طرف دلائی کہ تم ہر روز لوگوں کو پیدا ہوتے اور مرتے دیکھتے ہو، اسی پر قیاس کر کے دوبارہ اٹھائے جانے پر بھی ایمان لے آؤ۔ اور ان مشاہدات کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل پکڑو۔

زمین سے وابستگی کی ایک اور حقیقت بیان کی۔ واللہ جَعَلَ لَكُمْ الْاَرْضَ بِسَاطًا۔ اللہ نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنا دیا۔ جس پر آرام کرتے ہو۔ نہ بہت سخت ہے نہ بہت نرم بلکہ اسے انسان کے حسب حال بنایا۔ لَتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فَرْجًا۔ تاکہ اس کے نشان زدہ کٹودہ راستوں پر چل سکو۔ زمین پر بے شمار راستے بنا دیے۔ تاکہ لوگ اپنی معاشی ضروریات کے لیے سفر اور نقل و حمل کر سکیں۔

آسمانی راستے حضرت علیؑ نے خطبے کے دوران فرمایا۔ کہ اے لوگو! میں زمین کی نسبت آسمانی راستوں

کو زیادہ جانتا ہوں۔ آسمانی راستوں سے مراد ایمان اور نیکی کے راستے ہیں۔ انہیں تمہیں بتاؤں
 جن راستوں پر چل کر تم قرب الہی اور رضائے خداوندی حاصل کر سکتے ہو۔ زمینی راستوں سے
 تو تم واقف ہو جن سے اپنی ضروریات پوری کرتے ہو، مگر آسمان کے راستے مجھ سے پوچھو، جو ایمان
 نیکی اور اطاعت کی طرف جاتے ہیں۔

الغرض نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے یہ تمام مشاہدات پیش کئے اور توحید
 کی دعوت دی۔ کہ ان دلائل کی موجودگی میں تم اللہ کی وحدانیت پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔

قَالَ نُوحٌ رَبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالًا وَوَلَدًا
الْاَخْسَارَ ﴿۲۱﴾

ترجمہ :- نوح علیہ السلام نے عرض کیا اے پروردگار بیشک انہوں نے میری نافرمانی کی ہے۔ اور
ان لوگوں نے اتباع کیا ان کا جن کے مال اور اولاد نے ان کے لیے سوائے خسارے کے کچھ زیادہ
نہ کیا۔ ﴿۲۱﴾

گذشتہ سے پیوستہ

سورۃ نوح میں نبوت اور رسالت، طریقہ تبلیغ، توحید اور قیامت کا ذکر ہے اور بنیادی عقائد ہیں
— تو گویا اس سورۃ میں منکرین توحید کا رد، مشرکوں اور کافروں کی مذمت اور ساتھ ساتھ جزائے عمل کا
بیان ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے۔ اور اس میں اُس پیغام کا بیان ہے جو انہوں
نے اپنی قوم تک پہنچایا، یعنی اِنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيعُوْا عِبَادَةَ اللّٰهِ کی کہ وہ اس
سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ دنیا و آخرت کا فائدہ اسی میں ہے۔ مگر حضرت نوح علیہ السلام
اتنا لمبا عرصہ تبلیغ کرنے اور مصائب و تکالیف اٹھانے کے باوجود وِہَا اَمِنَ مَعَهُ لَقَلِيلٌ
بہت کم لوگ ایمان لائے، وہی ستر آدمی جو کشتی پر سوار ہوئے۔ باقی ساری قوم ایمان سے خالی گئی۔
آخر کار نوح علیہ السلام نے تنگ آکر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی۔ کہ مولا کریم میں نے اپنی
قوم کو صبح اور شام دعوت دی، بہ ملا دعوت دی۔ علی الاعلان دعوت دی اور پوشیدہ طور پر دعوت دی
مگر یہ ایمان نہ لائے۔ اس کے بعد اُن دلائل توحید کا ذکر کیا جو انسان کے اپنے وجود سے تعلق رکھتے
ہیں اور بعض خارجی دنیا سے متعلق ہیں مگر قوم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آیت زیر درس میں قوم کی نافرمانی اور
دولت متدلوگوں کے اتباع کا ذکر ہے۔

نام اور لقب

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام عبد الغفار تھا۔ اور نوح عبد
تھا۔ نوح کا لفظ نوحہ کے مادے سے ہے جس کا معنی رونا اور گریہ و زاری کرنا ہے۔ چونکہ نوح علیہ
السلام قوم کی حالت زار پر کثرت سے روتے رہے، نوحہ کرتے رہے۔ لہذا اُن کا لقب نوح پڑ گیا۔
تمام انبیائے کرام کا یہ فرض منصبی رہا ہے کہ وہ قوم کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی تسبیح

اتباع رسول
فرض ہے

اُسی سے ڈرائیں اور اپنے اتباع کا حکم کریں۔ جیسا کہ نوح علیہ السلام نے بھی کیا اور قوم کو دعوت دی۔
 ”اِنَّ اَعْبُدُ اللّٰهَ وَالْقَوَّةَ وَاَطِيعُوْنِ“ اسی طرح ہر قوم کا فرض ہے کہ وہ اپنے نبی کا اتباع کرے۔
 خود قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ ”مَنْ يُّطِيعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اطَاعَ اللّٰهَ“ یعنی جس نے رسول کی اطاعت
 کی، اُس نے گویا اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت کی۔ کیونکہ نبی خود نہیں آتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے
 مامور ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی مطلق اطاعت بھی لازم ہے۔ وہ خدا کا نائب ہوتا ہے، اس کا مطیع
 اور فرمانبردار ہوتا ہے۔ اللہ کی اطاعت اس لیے کہ وہ مالک و مجبور ہے۔ اور نبی کی اطاعت اس
 لیے کہ وہ خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ لہذا نبی کی اطاعت سے سرتابی کرنے
 والا کافر ہوتا ہے۔ عام صلحاء، اولیاء یا علماء کی اطاعت سے انکار کرنے والا کافر نہیں ہوتا۔ مگر
 ان کی اطاعت اس لیے کہ نبی پڑھتی ہے کہ وہ تبلیغ رسالت کرتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے بھی
 اپنے باپ سے کہہ دیا تھا ”فَاتَّبِعْنِيْ اِهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا“ اے میرے باپ! میری بات
 مان لے، میں تجھے سیدھا راستہ دکھاتا ہوں۔ کہ صراطِ مستقیم میرے پاس ہے۔
 اس ضمن میں اپنے باپ پر واضح کیا کہ ”قَدْ جَاءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ“ میں یہ اس لیے کہتا
 ہوں کہ میرے پاس اس کا علم ہے۔ یعنی قطعی اور یقینی علم سوائے نبی کے کسی کے پاس نہیں ہوتا۔
 اسی لیے نبی کی اطاعت مطلقاً فرض ہوتی ہے۔ باقیوں کی اطاعت فرض نہیں ہے۔

صاحب مال و دولت
 کا اتباع

الغرض حضرت نوح علیہ السلام اپنی دعا میں اللہ تعالیٰ سے عرض کر رہے ہیں کہ میری
 قوم نے میرا اتباع کرنے کی بجائے ”وَاتَّبَعُوْا مِنْ لَّدُنْهِ مَالًا“ وَلَدَهُ الْاَوْحَسَا
 یعنی میری قوم نے ان لوگوں کا اتباع کیا جن کے مال اور اولاد نے انہیں سوائے خدائے کے کچھ نہ
 پہنچایا۔ یعنی میرا کہا ماننے کی بجائے دولت مندوں، رئیسوں اور صاحب مال و اولاد کا اتباع کیا۔
 جس طرح انہوں نے کہا اُسی طرح میری قوم نے کیا۔ اور اس طرح غلط روش پر چل نکلے۔ اگرچہ مال و
 اولاد کی کثرت ایک نعمت ہے۔ مگر اکثر و بیشتر اللہ تعالیٰ سے غافل کرتے کا ذریعہ بھی ہے
 آخرت کو فراموش کرنے کا ایک قوی سبب ہے۔ دنیا کے اکثر متمولین نے غرور و تکبر کے ساتھ
 یہی کہا۔ ”نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا“ ہمارا مال اور اولاد زیادہ ہے۔ ہمیں کون پوچھنے والا
 ہے۔ کون سزا دینے والا ہے۔ جیسا کہ پچھلی سورۃ میں گزر چکا ہے ”اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِيْنًا“

یہ بد بخت رئیس محض اس لیے انکار کرتا ہے کہ اللہ نے اسے مال اور اولاد دے رکھا ہے۔ ولید بن مغیرہ کے دس بیٹے تھے۔ آگے بھی آئے گا وِبَنِّیْنَ شُهُودًا۔ جب بیٹے مجلس میں حاضر ہوتے تھے تو بڑی رونق ہوتی تھی۔ حدیث شریف میں ایک دوسرے شخص ابو الریحال کا ذکر آتا ہے۔ اُس کے بھی دس جوان بیٹے تھے۔ مجلس میں آتے تھے۔ مشاورت میں حصہ لیتے تھے، صلح و جنگ میں شریک ہوتے تھے اور وہ اس پر اتنا اتھا تو گویا اولاد کی کثرت اللہ تعالیٰ سے غافل کہنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو مال و اولاد کی کثرت کے باوجود اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ کوئی خال خال ہی ایسا ملے گا۔ ورنہ نو ہزار نو سو ستانوے معذوری ہونگے۔

سرمایہ دارانہ اور
اشتراکی نظام معیشت

وہ مال جس کی بدولت لوگ تاجر کہلاتے ہیں، سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا مرہون بنتا ہے۔ اور یہ نظام ہی سب سے بڑی مصیبت ہے جس میں نہ مال جمع کرنے پر کوئی پابندی ہے اور نہ خرچ کرنے میں۔ جس ذریعے سے چاہو مال کھاؤ۔ اس میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں۔ اسی طرح جس کام میں چاہو خرچ کرو، کوئی رکاوٹ نہیں۔ سود کی کھائی ہو یا شراب کے ٹھیکہ کی، خنزیر کی تجارت ہو یا تھیسٹر کی آمدنی، اس میں کوئی پابندی نہیں۔ خرچ کرنے میں حقوق العباد کی پروا نہیں، یتیمی و مساکین کا خیال نہیں۔ زکوٰۃ اور صدقہ خیرات کی طرف توجہ نہیں، محض اپنی عیش و عشرت سے غرض ہے۔ یہ اسی سرمایہ دارانہ نظام کی لائی ہوئی لعنت ہے۔

اشتراکی نظام معیشت بھی ویسا ہی لعنتی ہے جیسے روس، چین اور ویت نام کا نظام۔ وہ تو آسمانی شریعت کو مانتے ہی نہیں، وہ تو خدا کی ہستی کا ہی انکار کرتے ہیں۔ ان کا تو یا جوج ماجوج والہ نظریہ ہے۔ کہ زمین والوں کو ہم نے مغلوب کر دیا ہے۔ اور اب آسمان والے کو مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کی وحدانیت کا عقیدہ مذہبی لوگوں نے اپنا کام چلانے کے لیے ایجاد کیا ہے۔ سٹالن کے کلام میں موجود ہے کہ خدا کا عقیدہ ہوا ہے۔ اور ہم اس ہڈے کو مٹانا چاہتے ہیں۔ الغرض اشتراکی اور سرمایہ دارانہ دونوں نظام لعنت ہیں۔ اسلام کا نظام معیشت ہی فطری نظام ہے۔ جو کھانے اور خرچ کرنے میں حلال و حرام کی تمیز سکھاتا ہے۔

سوائیٹس کے اعضاء
فاسدہ

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اعضاء فاسدہ کو کاٹنا ضروری ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو آدمی پوچھتی دفعہ چوری کرے اُسے قتل کر دو۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں، یہ ٹھیک ہے۔ اور

یہ تعزیر اُقتل ہے۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ، اب جو باز نہیں آتا، اُسے شوٹ کر دو۔ یہ سوسائٹی کے لیے پھوڑا ہے۔ اگر اس کو باقی رکھا گیا، تو سارے جسم کو خراب کرے گا۔ لہذا ہر عقل مند ڈاکٹر اُسے کاٹ دینے کا ہی مشورہ دے گا۔ جس طرح کسی انسانی جسم کا پاؤں یا ران یا بازو کا ٹنا ضروری ہو جاتا ہے اُسی طرح سوسائٹی کے عضوِ فاسد کو بھی ختم کرنا ضروری ہے۔ تاکہ باقی سوسائٹی میں گندگی نہ پھیلنے پائے آج کل ایران والے بھی یہی کچھ تو کہہ رہے ہیں۔ یہ منشیات کی سمگلنگ کرنے والے بھنگ، چرس، شراب کا کاروبار کرنے والے، پچیس تیس آدمی اڑا دیے کہ یہ باز نہیں آتے تھے، سوسائٹی کے لیے بمنزلہ ناسور تھے۔ انہوں نے کمانی میں حلال و حرام کی پروا نہیں کی، انہیں باقی نہیں رہنا چاہیے۔

لائسنس یافتہ زندگی

سرمایہ داری نظام میں اسی قبیل کا ایک دوسرا ذریعہ معاش ہے۔ زندگیوں لائسنس لے کر چکلے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ حکومت خود سرپرستی کرتی ہے۔ اُسے آمدنی سے غرض ہے، چاہے کسی راستے سے آئے۔ امام حلبی نے سیرت میں لکھا ہے کہ پہلی صدی کے آخر تک مسلمانوں کے زیر تسلط کسی بھی علاقے میں کوئی ایک بھی قحبہ خانہ نہیں تھا۔ مسلمان آدمی دنیا سے زیادہ حصے پر چھائے ہوئے تھے، مگر کسی جگہ کوئی ایک لائسنس یافتہ زندگی نہیں تھی۔ برخلاف اس کے انگریز کے زمانے میں یہاں پچھتر فیصد کنجریاں مسلمان تھیں۔ کلکتہ، ممبئی، مصر ہر جگہ یہ لعنت مسلمان عورتوں نے اپنے گلے میں ڈال رکھی تھی۔ ایران کا تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ وہ شیعہ ہیں اور متعہ کر لیتے ہیں۔ ہندو بھی سکھ ہو، سب سب متعہ کر لیتے ہیں۔ پیسہ کمانے سے غرض ہے۔ حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں۔ اس نظام کی یہی خصوصیت ہے۔

حلال و حرام کی تمیز

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اتَّقُوا اللَّهَ وَأَجِبُوا فِي الطَّلَبِ۔ اللہ سے ڈرو اور طلبِ رزق میں صحیح راستے پر چلو۔ برے راستے سے کمانا حرام ہے۔ ایسی کمانی میں برکت نہیں ہوگی عبادت قبول نہیں ہوگی۔ اس سے صدقہ و خیرات منظور نہیں ہوگا اور آگے جہنم کا توشہ بنے گا۔ مندا احمد کی روایت میں ہے۔ کہ حرام مال چھوڑ جاتا، جہنم کے راستے کا توشہ ہے۔ کپڑا حرام مال سے پینا نماز قبول نہیں ہوگی، خوراک حرام مال سے کھانی دعا قبول نہیں ہوگی۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ مفتی اور قاضی نماز کی ادائیگی کا فتویٰ دے دیں مگر قبولیت دوسری چیز ہے۔ اگر غسل کر کے صاف جسم اور پاک کپڑے کے ساتھ نماز ادا کی گئی تو مفتی یہ تو نہیں کہے گا کہ نماز ادا نہیں

ہوئی، مگر نماز کا مقبول ہونا اور چیز ہے۔

ابور دؤا کہتے ہیں۔ — کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میری یہ دو رکعت نماز بارگاہ الہی میں مقبول ہوگئی ہے تو بخدا میرے نزدیک یہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ کیونکہ قبولیت کا معیار یہ ہے کہ **اَنْتَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ**۔ مقبول اس کی ہوگی جو متقی ہوگا۔ کفر و شرک سے بچنے والا اور خدا سے ڈرنے والا ہوگا۔

شادی سیاہ کی رسوم

جس طرح طلب رزق میں جائز ناجائز کا خیال نہیں رکھا جاتا، اسی طرح خرچ کرنے میں بھی کسی بات کی پروا نہیں کی جاتی۔ دولت مند لو لعب میں مشغول ہیں، رسومات پر بلا وجہ بھاری رقم خرچ کر رہے ہیں۔ پچھلے جمعہ میں ایک بزرگ نے بتایا کہ ایک منگنی کی رسم میں چالیس جوڑے کپڑے تو برادری کے لوگوں کو دئے ہیں اور دس جوڑے خاص قسم کے خاص عورتوں کو دیئے گئے۔ اور کھانا صرف تو ریگیں پکائی گئیں۔ یہ صرف منگنی ہے۔ اور شادی پر کیا ہوگا۔ یہ ہمارے ملک کا رواج ہے۔ دولت مند کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ مکانات روشن ہوتے ہیں۔ سینکڑوں قمقمے جلتے ہیں۔ کیا یہ اسراف و تبذیر نہیں کیا اس پر لعنت نہیں برستی۔ اور پھر سب بڑھ کر یہ کہ دوسروں کے لیے مشکلات پیدا کی جا رہی ہیں۔ دیکھا دیکھی دو سگر بھی رسومات کی ادائیگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ بیچو سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں۔ یہ محاورہ بالکل درست ہے۔ ”مال حرام بود بجائے حرام رفت“ حرام کی کمانی حرام کے راستے ہی خرچ ہوگی۔ کھیل تماشے میں جائے گی۔ جوئے اور شراب میں جائے گی یا فحاشی کے کاموں میں صرف ہوگی۔

فوتیگی کی رسوم

اسی طرح مرنے کی رسومات میں بھی بے جا اسراف کیا جاتا ہے۔ یہ تیجا ہے، یہ دسواں ہے۔ یہ جالیسواں ہے، مردہ چاہے عذاب میں مبتلا ہو جائے، رسوم ادا ہونی چاہئیں۔ ہمارے ملے والے ایک صاحب نے بیان کیا کہ ایک شخص کی لاہور میں شادی ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد بیوی ایک چھوٹا بچہ چھوڑ کر فوت ہوگئی۔ بیچارہ عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ تین دن کے بعد جانے لگا کہ کوئی مزدوری کر دوں، بچے کی پرورش بھی دے رہا ہے۔ تو ساس اور سرسرنے لگے، اٹو کے پیٹھے اکدھر جاتے ہو، آگے چیل آ رہا ہے، وہ کون کرے گا۔ اس کے لیے رقم ادا کر کے جاؤ۔ بیچارے کے پاس کچھ نہیں تھا۔ ناچار گھر کے برتن بیچ کر تین سو روپے سسرال والوں کو دیئے تاکہ چیل کی رسم ادا کر سکیں تب کہیں جا کر اسی جان

چھوٹی اور محنت مزدوری کے لیے جاسکا۔ یہ ہے مال و دولت جس نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا
ہاں تو ذکر یہ ہو رہا تھا کہ مال و دولت کی محنت میں انسان کس حد تک اپنے مالک سے دور
ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ یہی مال ایک اچھا ساتھی بھی ثابت ہو سکتا ہے
حضور کا ارشاد گرامی ہے کہ مال اُس شخص کے لیے اچھا ساتھی ہے لَمَنْ اَدْبَىٰ حَقَّ اللّٰهِ۔ جو
اللہ اور اس کے بندوں کا حق ادا کرتا ہے۔ ورنہ یہی مال وبال جان ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کی دیوار کے سامنے بیٹھے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ
آئے۔ آپ نے فرمایا هُمْ اَدَا قُلُوبُكُمْ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ اَلَا مَنْ قَالَ هَكَذَا وَهَكَذَا وَ
هَكَذَا۔ جو لوگ دنیا میں بہت مال جمع کرتے تھے، کل قیامت کو ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوگا۔ ہاں
جس نے دائیں بائیں ہر طرف حقوق ادا کئے، وہ وہاں بھی دولت مند ہوں گے۔ ورنہ عام طور پر آج کا
دولت مند کل کا فلاں ہوگا۔ اُس نے حقوق ادا نہیں کئے۔ دولت عیاشی اور فحاشی میں ٹٹائی۔ کھائی بھی ناجائز
طریقے سے کی۔ خرچ بھی ناجائز کیا۔

اسلامی نظام معیشت

اسلامی نظام میں کمانے پر بھی پابندی ہے۔ اور خرچ کرنے پر بھی۔ اسلام حرام ذرائع سے مال اکٹھا
کرنے سے منع کرتا ہے، اور حلال ذرائع کی ترغیب دیتا ہے۔ جب حلال راستے سے مال آجائے تو
پھر سارے حقوق ادا کرو، اس کے بعد جو بچ ہے اُسے اپنے مصرف میں لاؤ۔ کوئی جائیداد خریدو، کوئی اور
چیز خریدو، تمہارے لیے مباح ہے۔ اور اگر حقوق ادا نہیں کئے، صرف دولت جمع ہی کرتے رہے۔
بیلنس برابر کرتے رہے، ذرائع آمدنی کی علت و حرمت کا خیال نہیں کیا تو پھر خرچ کرنے میں کوئی سی
پابندی قبول کرو گے۔ بلڈنگ بازی پر خرچ ہوگا۔ ایک ایک بلڈنگ کے نقشہ تیار کرتے پوسٹر
ستر ہزار کی رقم اٹھ رہی ہے۔ کیا یہ اسراف و تبذیر کی حد نہیں ہے۔

اس سلسلے میں حکومت ہماری راہنمائی کر رہی ہے۔ وہ خود سر بلڈنگ عمارات کی تعمیر میں لگی
ہوئی ہے۔ قصر صدارت کی تعمیر پر پینتالیس کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ اب اندازہ لگاؤ کہ اسلام کا نام
لینے والی مملکت میں قصر صدارت پر اٹھنے والے اس قدر بھاری اخراجات کہاں تک جائز ہیں۔
وفاقی سیکریٹریٹ کی تعمیر پر۔ اربوں روپے خرچ کیے گئے۔ اس کی تزئین کے لیے ستر ستر ہزار
روپے کے قالین عمارات کے راستوں پر بچھے ہوئے ہیں۔ جن پر لوگ جوتوں سمیت چلتے ہیں۔ خدا کا

غضب، اس قدر اسراف جس ملک کے اسی فیصدی لوگوں کو دو وقت کی پیٹ بھر کر روٹی بھی نصیب نہ ہو، صرف بیس فیصدی لوگوں کے پاس کوئی توازن یا وسائل ہیں، اُس ملک میں اتنا عالیشان قصر صدارت اور سیکرٹریٹ بنا مکاں جائز ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ قریش کو زمین نہیں خریدتے تھے کہ تم لوگوں کے لیے بڑا نمونہ قائم کرو گے۔ لہذا ضرورت سے زیادہ ضروریات زندگی مرت حاصل کرو۔

الغرض موجودہ زمانے کے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام معیشت دونوں باطل ہیں، سرمایہ دارانہ نظام کے عاملین خدا کی ہستی کو مانتے ہوئے، انجیل کو بہ حق تسلیم کرتے ہوئے اس نظام باطل کو اپنائے ہوئے ہیں۔ جس میں چند آدمی عیش کرتے ہیں۔ اور دوسرے غربت کی چکی میں پیستے ہوئے ہیں۔ اشتراکی نظام انکارِ خدا اور انکارِ شریعت کی بنا پر لگتی ہے۔ اسلامی نظام معیشت ہی واحد نظام ہے جو آمد و خرچ کے حدود مقرر کر کے مخلوق خدا کے درمیان توازن قائم رکھتا ہے۔

معیارِ اتباع

آیت زیرِ درس میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی اس بنیادی خامی کی شکایت کی ہے۔ جس کی رو سے انہوں نے مال و دولت کے زعم میں مبتلا ہو کر نبی کے اتباع کے بجائے سرمایہ دارانہ ذہنیت کا اتباع کیا۔ عرض کیا۔ قَالَ نُوحٌ رَبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ اے میرے پروردگار انہوں نے میری نافرمانی کی وَ اتَّبَعُوا مِنْ لَّدُنِّيْ ذَمًا لِّوَالِدِہِ الْاَخْسَاۗءِ اور ان لوگوں کا اتباع کیا جن کے مال و اولاد نے سوائے خدائے کے کچھ فائدہ نہ کیا۔ مال و دولت والے لوگوں نے اپنے مال کی بدولت غلط نمونے قائم کئے پیچھے رسوماتِ باطلہ پر عمل پیرا ہے۔ دوسروں کو بھی اسی راستے پر چلاتے ہے انہوں نے نبی کے اتباع کے بجائے مال و دولت کو قابلِ تقلید جانا۔ کہتے تھے نبی کے پاس کیا ہے جو ہم اس کی پیروی کریں۔ یہ انسان ہو کر نبوت کا دعوے کرتے ہیں نہ اس کے پاس مال و دولت ہے، نہ کوٹھی ہے، نہ فوج ہے، نہ باغات ہیں۔ ہم اس کا اتباع کیوں کریں۔ اتباع تو ان لوگوں کا ہونا چاہیے جن کے پاس یہ سارے لوازمات موجود ہیں۔ تو گویا نوح علیہ السلام کے عدم اتباع کی وجہ یہ تھی اور اس قوم کا معیارِ اتباع نبوت کے بجائے سرمایہ تھا اس آیت میں نوح علیہ السلام نے اپنے رب کے حضور یہی شکایت پیش کی۔

وَمَكْرُؤًا مَّكْرًا كَبِيرًا ﴿٢٢﴾ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا
وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴿٢٣﴾ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا ۖ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ
إِلَّا ضَلَالًا ﴿٢٤﴾

ترجمہ :- اور انہوں نے تدبیر کی بہت بڑی تدبیر ﴿۲۲﴾ اور ان کی قوم کے سرکردہ لوگوں نے
کہا کہ _____ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑ بیٹھنا اور ود، سواع، یغوث
یعوق اور نسر کو نہ چھوڑنا ﴿۲۳﴾ اور تحقیق انہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا۔ اور (ایسے پروردگار) ان ظالموں کیلئے
سوائے گمراہی کے کچھ زیادہ نہ کرے ﴿۲۴﴾

گذشتہ سے پورے

گذشتہ درس میں نوح علیہ السلام کی قوم کی حالت کا بیان تھا جو انہوں نے اپنی دعائیں
اپنے رب کے حضور پیش کی۔ اور نہایت دکھ کے ساتھ عرض کیا رَبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْكَ يَعْنِي اے
اللہ! میری قوم نے میری نافرمانی کی اور وَاَتَّبَعُوا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالًا وَوَلَدًا اِلَّا خَسَارًا اور
ان لوگوں کا اتباع کیا جن کے مال و اولاد نے انہیں سوائے نقصان کے کچھ اضافہ نہ کیا۔ یعنی مال و اولاد
کی کثرت نے انہیں خود بھی دین سے محروم رکھا اور دوسروں کو بھی محروم کیا۔

اس درس کی آیات میں سے پہلی آیت میں قوم نوح علیہ السلام کے ان داؤد بیچوں کا تذکرہ ہے
جو انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلانے کے لیے آزمائے۔ دوسری آیت میں ان کے پانچ
معبودان باطلہ کا بیان ہے جن کی پرستش پر وہ جمے ہے اور تیسری آیت میں نوح علیہ السلام نے اس
گمراہی کا حال بیان کیا ہے جس میں قوم کے لوگ خود بھی مبتلا ہے اور دوسروں کو بھی بھٹکاتے ہے۔

قوم نوح
کے داؤد بیچ

عرض کیا کہ میری قوم نے نہ صرف یہ کہ میری نافرمانی کی اور دولت مندوں کا اتباع کیا۔ بلکہ
وَمَكْرُؤًا مَّكْرًا كَبِيرًا۔ انہوں نے تدبیر کی، بہت بڑی تدبیر۔ یعنی میری دعوت کو پھیلنے سے
روکنے کے لیے انہوں نے بڑا داؤد بیچ کھیلایا کہ لوگ میری بات کو نہ مانیں۔ مگر کامیابی محض تدبیر ہوتا
ہے۔ اور کبار مبالغہ کا صیغہ ہے۔ عظام اور قرأ کے وزن پر مثلاً کبیر بڑے کو کہتے ہیں، کبار اوسط صیغہ
کو اور زیادہ مبالغہ کرنا ہو تو کبار بولتے ہیں یعنی ادنیٰ درجہ، اوسط درجہ اور اعلیٰ درجہ یہ کبار مبالغہ کا

صیغہ ہے اور اس کا معنی ہوا بہت بڑا داؤہ تو گویا اس قوم نے نبی کی مخالفت میں بہت سے داؤے چلائے جن کی تفصیل شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اس طرح بیان کی ہے۔

نبوت میں شبہات
پیدا کرنا

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ پہلی تدبیر انہوں نے یہ کی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت کے متعلق شبہات پیدا کیے کہ یہ نبی نہیں ہو سکتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح دوسرا نبیاء کی نبوت کے متعلق مشرکین نے شک و شبہات پیدا کئے، قرآن پاک میں ان کی تفصیل موجود ہے۔ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ اور نوح علیہ السلام کی بھی اسی طرح تکذیب کی گئی۔ یہ تو ہمارا بھائی ہے، ہماری برادری کا آدمی ہے، فلاں کا بیٹا ہے، کھانا پیتا ہے، کاروبار کرتا ہے، اس کے بیوی بچے ہیں، یہ کیسے رسول ہو سکتا ہے۔ مَا لِهَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَلْبَسُ فِي الْأَسْوَاقِ۔ یہ کھانا کھانے والا اور گلیوں بازاروں میں چلنے پھرنے والا کیسے رسول ہو سکتا ہے گویا انہوں نے بشریت اور انسانیت کو رسالت کے خلاف سمجھا۔ سورۃ قمر میں حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق بھی ایسا ہی آیت ہے اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ کیا ہم اپنے میں سے ایک انسان کا اتباع کریں۔ اگر ایسا کریں گے تو اِنَّا اِذَا لَفِيَ ضَلَالٌ وَّسُعِيرٌ۔ ہم پاگل ہوں گے جو ایسا کریں گے۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کے متعلق کہتے تھے اِنَّا لَنَرَاكَ فِي سُفَاهَةٍ ہم تو تمہیں بیوقوف خیال کرتے ہیں جو تمام معبودان کو چھڑا کر ایک خدا کی عبادت کی طرف بلاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جواب میں کہا لَيَقُولُنَّ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ اے میری قوم! میں بیوقوف نہیں ہوں بلکہ وَلَٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں تو رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں تاکہ اس کا پیغام تم تک پہنچاؤں۔

تو گویا قوم نوح کی پہلی مکاری یہ تھی کہ وہ آپ کی نبوت کے متعلق لوگوں میں شک و شبہات پیدا کرتے تھے۔ تاکہ لوگ آپ پر ایمان نہ لائیں۔

اللہ تعالیٰ کی
الوہیت انکار

قوم نوح کا دوسرا داؤہ یہ تھا کہ وہ خدا کی وحدانیت اور بعض اوقات اُس کے وجود کا ہی انکار کر دیتے تھے۔ جیسے کہ قرآن پاک میں فرعون کے متعلق موجود ہے کہ وہ کہتا تھا۔ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ یہ رب العالمین کیا چیز ہے۔ کوئی رب نہیں۔ وہ اس قدر مغرور تھا۔ کہ کہتا تھا مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ میں اپنے علاوہ تمہارا اور کوئی معبود نہیں جانتا۔ تو اس طرح گویا حضرت نوح کی قوم کے لوگ بھی اللہ

تعالیٰ کے وجود اور اس کی الوہیت کا انکار کرتے تھے کہ جب خدا کی ذات کا انکار ہو جائے گا تو اس کو بھیجے۔ والے نبی کی خود بخود ہی تمکین ہوگی۔ تو گویا مکتبہ کبار کی یہ بھی ایک صورت تھی۔

منظر خدا
کا عقیدہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب نبوت میں شبہات پیدا کر کے یا خدا کا انکار کر کے بھی ان کی چال کامیاب نہ ہوتی، تو وہ ایک اور حربہ استعمال کرتے۔ کہتے ہم مان لیتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور آپ اس کے رسول بھی ہیں مگر جن کی ہم پوجا کرتے ہیں، ان کے اندر بھی خدا کا ہی وجود ہے تو ہمیں ان کی پوجا سے کیوں ہٹانا ہے۔ یہ بھی تو منظر خدا ہیں۔ اس پر اپکنڈا کی بنا پر جاہل لوگ سمجھتے تھے کہ یہ معبودان بھی خدا کے مقرب ہیں ان کی عبادت کرنے سے خدا راضی ہوگا، ان کے اندر خدا جلوہ گر ہے۔ یہ بھی انہی ایک چال تھی کہ لوگ نوح علیہ السلام کا کفر مانیں۔

منظر خدا کا عقیدہ ہندوؤں کے اوتار والے عقیدے سے مشابہ ہے۔ یہ عقیدہ عیسائیوں، پرانے بابلیوں، مشرکوں اور مصریوں میں بھی پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی اور کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے بعض کلمہ گو مشرک بھی اس عقیدہ باطل میں مبتلا ہیں۔ جیسا کہتے ہیں۔

وہی جو عرش پر تھا خدا ہو کر

اتر پڑا ہے۔ دینے میں مصطفیٰ ہو کر

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جلوہ گری سے اگر یہ مراد لیا جائے کہ ان میں الوہیت کی کوئی صفت آگئی ہے تو یہ تو باطل ہے۔ کیونکہ کسی مخلوق میں الوہیت کی کوئی بات نہیں آتی۔ الوہیت اور مخلوق متضاد چیزیں ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ معبودان باطلہ اور خدا تعالیٰ میں وجود قدر مشترک ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کا وجود واجب ہے یعنی اپنی ذات سے ہے۔ جب کہ ان کا وجود اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے۔ ایک واجب الوجود ہے اور دوسروں کا وجود ممکن ہے۔ اور ممکن الہ نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہونے میں نبی، جبریل، اندرگ اور ساری مخلوق برابر ہیں تو ایک مخلوق دوسری مخلوق کا معبود نہیں بن سکتی۔ جب کہ وہ سارے اپنے وجود میں خدا کی طرف محتاج ہیں۔ لہذا یہ اوتار یا منظر خدا کا عقیدہ سکر سے ہی باطل ہے۔ یہ عقیدہ سخت ظالمانہ اور بدترین شرک والا عقیدہ ہے۔

اپنے علم پر تکبر

نبوت کے انکار کی ایک وجہ ان کا وہ محدود علم تھا جس پر غرور و تکبر کرتے تھے۔ قرآن پاک نے بعض بد بخت قوموں کا حال یوں بیان کیا کہ **فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ**

مِّنَ الْعِلْمِ اللّٰهِ کے رسول جب واضح باتیں کہہ آئے تو بعض مشرکین اپنے علم پر اترنے لگے اور بنی کی تعلیم کا انکار کر دیا۔ کہنے لگے ہمارے پاس علم موجود ہے۔ تم ہمیں کیا سبق پڑھاؤ گے، ہم خوب جانتے ہیں۔ پرانے رومی کہتے تھے کہ نبیوں کا وعظ و نصیحت عام لوگوں کے لیے ہوتا ہے، ہم تو صاحب علم ہیں، حکمت و دانائی کے مالک ہیں، ہمیں ایسی تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح یونانی علماء کہتے تھے کہ ہم مہذب، شائستہ، اور ہدایت یافتہ ہیں۔ ہمیں نبیوں کے اتباع کی ضرورت نہیں ہے! افلاکون اور دوسرے فلاسفہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم علیہ السلام کا اتباع کیوں کریں، ہمارے پاس علم و حکمت کا خزانہ ہے بنی کا اتباع تو وہ کریں جو جاہل ہیں، جن کے پاس علم نہیں ہے۔ تو گویا اس طرح انہوں نے بنی کی پیروی سے انکار کیا۔ آج بھی اس قسم کے لوگ موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ مُلّا لوگ دُقیانوسی باتیں کرتے ہیں۔ ان کے پاس کیا ہے۔ ہمارے پاس سائنس اور ٹیکنالوجی ہے، فلسفہ و حکمت ہے، علوم و فنون ہیں، ہمارے لیے ان کی پرانی باتیں کیا معنی رکھتی ہیں

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا جتنا بھی علم ہے وہ تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ یہ قطعی اور یقینی علم تو نہیں ہے۔ کیونکہ قطعی علم صرف بنی کے پاس ہوتا ہے، جو بجانب اللہ ہوتا ہے۔ باقی سارا ظن اور گمان ہے۔ سائنسی تجربات یا مشاہدات کو علم نہیں کہہ سکتے، نہ صنعت و حرفت اس شمار میں آتا ہے۔ بلکہ حقیقی علم اللہ تعالیٰ کی جانب سے بنی کے پاس آتا ہے۔ اور اُسی کا یہ انکار کرتے ہیں۔ بنی کی رسالت میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں تو گویا یہ ساری صورتیں مکہ و مکہ اگبار کے تحت آتی ہیں۔

تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی تعلیم کا مرکز ہی نقطہ یہی تھا کہ سارے معبودانِ باطلہ کو ترک کر کے صرف ایک — خدا کی پوجا کرو۔ اس تبلیغ کے جواب میں حضرت نوح کی قوم کے سرکردہ لوگوں نے کہا وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی باتوں میں آکر اپنے معبودوں کو نہ چھوڑ بیٹھنا۔ یہ شخص تم سے تمہارے معبود چھڑانا چاہتا ہے مگر تم ایسا نہ کرنا بلکہ خاص طور پر وَلَا تَذَرُنَّ وُدَّوْا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا۔ وُد، سُوَاع، یغوث، یعوق اور نسر کو نہ چھوڑنا۔ قوم نوح کے اور بھی معبود تھے، مگر یہ پانچ خاص معبود تھے، جن کو نہ چھوڑنے کی تلقین کرتے تھے، حضور علیہ السلام کے متعلق

معبودانِ باطلہ
پر اصرار

بھی مشرکین نے کہا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ الْاِلَهَیَّ وَ الْاَحَدَیَّ کیا تمام معبودان کو چھوڑ کر صرف ایک خدا پر قناعت کر لیں اِنَّ هٰذَا الشَّیْءَ عَجَبٌ یہ تو عجیب بات ہے۔

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ قوم نوح علیہ السلام ہر مقصد کے لیے الگ الگ معبود مقرر کر رکھے تھے۔ ان پانچ معبودان باطلہ کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ وَدّ: وَدّ مودت سے ہے۔ عربی میں مودت، محبت کو کہتے ہیں۔ تو وَدّ کو یا محبت کا دیوتا تھا۔ اسے مرد کی شکل میں بناتے تھے، جو کہ بڑا قوی اور حسین و جمیل ہو مرد کو فطرتاً عورت کی خواہش ہوتی ہے۔ اُس سے مقاربت کرتا ہے تو نسل پیدا ہوتی ہے۔ تو یہ وَدّ محبت کا دیوتا تھا۔ اس کی پرستش کرتے تھے، ہندو اس کو برہما جی مہاراج کہتے ہیں، جس کا مطلب ہے کائنات کو ایجاد کرنے والا۔

۲۔ سواع: عربی زبان میں سکون و استقرار پر بولا جاتا ہے۔ اس کو حسن و جمال کی دیوی کہتے تھے۔ اور عورت کی شکل میں بناتے تھے۔ جس طرح عورت گھر کو چلاتی ہے، امور خانہ داری سرانجام دیتی ہے۔ اسی طرح یہ دیوی کائنات کو چلاتی ہے ان کا خیال تھا کہ دنیا کی قیومیت، استقرار اور ثبات اسی کے دم سے ہے۔ یہ دنیا کے کاروبار کو چلاتی ہے اور تھامتی ہے۔ ہندو اسے لشن جی کہتے ہیں۔

۳۔ یغوث، یغوث کے مادے سے ہے۔ جس کا معنی ہے۔ فریادرس۔ اس کو گھوڑے کی شکل میں بناتے تھے۔ گھوڑا بڑا تیز رفتار جانور ہے۔ جہاں ضرورت ہو تیزی سے مدد کے لیے پہنچ جاتا ہے عوث کا عقیدہ بھی ایسا ہی ہے کہ جب مصیبت میں غائبانہ طور پر پکارو، عوث صاحب فوراً مدد کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ انسانوں کی فریادرسی کرتے ہیں۔ اسی لیے قوم نوح کے لوگ یغوث کی پرستش کرتے تھے کہ وہ اُن کی فریادرسی کرتا تھا۔

۴۔ یعوق، یعوق کے مادے سے ہے، جس کا معنی ہے حفاظت کرنے والا۔ تکلیف کو دور کرنے والا۔ یعوق یہ شیر کی شکل میں بناتے تھے۔ یہ عقیدہ آج بھی موجود ہے۔ شیر خدا کی شکل کتا کو آج بھی لوگ غائبانہ طور پر پکار رہے ہیں۔ دکن میں جگہ جگہ حضرت علیؑ کے نام پر شیر بنائے ہوئے ہیں۔ تو یہ مشکل کشائی والا عقیدہ قوم نوح میں بھی تھا حالانکہ قرآن پاک میں صاف طور پر موجود ہے بَلْ اٰیٰہُ تَدْعُوْنَ فِیْکَشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْہِ اِنْ شِآءُوْا وَ تَنْسُوْنَ مَا تَشْرِکُوْنَ (الانعام - ۱۴) اللہ کے سوا تکلیف کو کون دور کر سکتا ہے۔ تکلیف ہٹانے والا صرف اللہ ہے۔ تم بے شک پکارتے رہو یہ بھی اس کی رضا پر منحصر ہے، اگر چاہے گا تو تکلیف کو رفع کر دے گا، اور نہ پابند نہیں ہے، وہ اگر

کسی کو تکلیف پہنچانا چاہیے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ اِذَا ارَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوءَ فَلَا مَرَدَ لَهُ اگر خدا کسی قوم کو ذلیل کرنا چاہتا ہے، مغلوب و محکوم کرنا چاہتا ہے تو ساری دنیا مل کر بھی اُس کے فیصلے کو ٹال نہیں سکتی۔

غوث کا عقیدہ اس زمانے میں بھی عام ہے۔ خواجہ بہاؤ الدینؒ کے بارے میں غوث بہاؤ الدینؒ کہتے ہیں۔ غوث الاعظم حضرت پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہیں۔ یہ بھی غائبانہ امداد کرتے ہیں، لوگوں کی فریاد رسی کرتے ہیں۔ ذرا غور کرو کہ قوم نوح اور ان لوگوں کے عقیدے میں کیا فرق ہے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ولی اللہ تھے، اُن کے ہاتھ پر سوا لاکھ آدمیوں نے توبہ کی۔ انہوں نے کفر و شرک کی بیج کنی کی۔ اُن کے بارے میں یہ عقیدہ کہ وہ غائبانہ فریاد رسی کرتے ہیں کہاں کا انصاف ہے؟ جس قدر ——— توحید کی تبلیغ انہوں نے کی، اُس زمانے میں اور کسی بزرگ نے نہیں کی۔ اُس کے اثرات آج تک موجود ہیں آپ ہفتے میں ایک دن جمعرات کو وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ان کے مواعظ حسہ موجود ہیں ایک ایک حرف کو پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے۔ ان کے مقالات میں توحید ہی توحید ہے۔ ان کی تصنیف فتوح الغیب پڑھ کر دیکھو، شرک کی جتنی تردید انہوں نے کی ہے، اُس دور میں کسی بزرگ نے نہیں کی۔ آج وہی پیران پیر غوث ہیں۔ انہیں فریاد رس بنالیا گیا ہے۔ بزرگوں کے بارے میں حسن ظن رکھنا چاہیے۔ عقیدت ہو کہ وہ بھی بندے تھے، خدا کی توحید کا درس دیتے تھے۔ لوگوں کو کفر و شرک سے ہٹاتے تھے، اُن کی وجہ سے لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔

خواجہ بہاؤ الدینؒ ذکر یا اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے اب اُن کی قبر پر کتنا اونچا گنبد بنا ہوا ہے۔ قبر پر ہر منٹ میں پانچ آدمی سجدہ کرتے ہیں۔ کیا وہ یہی کام کرتے تھے، العیاذ باللہ۔ انہوں نے تو مشرکانہ عقائد کو جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیا۔ کیا وہ کہہ گئے تھے کہ میری قبر پر گنبد بنالینا؟ یہ تو بعد میں بادشاہوں نے بنا ڈالے اور یہ اڈے قائم ہو گئے۔

کیا خواجہ معین الدین اجمیریؒ کہہ گئے تھے کہ میرا گنبد بنانا، قبر کو پختہ کرنا، چپس لگانا اور پر جگہ جگہ لائٹ جلائی جا رہی ہے۔ ————— قبر پر ہتھکے چلائے جا رہے ہیں۔ عقل

کا تو بالکل ہی دیوالیہ نکل گیا۔ قبر کے اوپر ہوا کے ہتھکے لگانے کا کیا فائدہ۔ عجیب عقیدہ ہے جو ملک مر گیا، اس کی قبر بنالی، گنبد بنالیا۔ یہاں وہ دیوانہ بیچارہ مر گیا۔ مجذوب تھا یا پاگل تھا۔ اب

اُس کا گنبد بنا لیا ہے، پوجا شروع ہو گئی ہے۔ حکومت ایسی خرافات کی سرپرستی کرتی ہے، خود گنبد بناتی ہے اور لوگوں کو خرافات کی ترغیب دیتی ہے۔ حالانکہ حکومت کا کام ان چیزوں کو مٹانا تھا۔ مگر ہو کیا رہا ہے۔ چادریں چڑھاؤ، گلاب کے پانی سے قبروں کو غسل دو۔ عرس جھاؤ۔ قوالی کرو، اہل حق کرو۔ لوگ سجدے کرتے ہیں، کرتے رہیں، جہنم میں جائیں، حکومت کو ٹیکس سے غرض ہے۔ ان اٹھوں کی آمدنی حکومت اپنی مدوں میں خرچ کرتی ہے۔ کچھ کلرک کھا جاتے ہیں، کچھ نوکر کھاتے ہیں۔

نسر گدھ کو کہتے ہیں۔ گدھ کی عمر بڑی لمبی ہوتی ہے۔ یہ بڑا طاقتور پرندہ ہے۔ اس کی نگاہ بھی بڑی تیزی ہوتی ہے۔ تو یہ معبود گدھ کی شکل میں بناتے تھے۔ کہتے تھے یہ بڑی تیزی سے مدد کے لیے پہنچتا ہے۔ یہ عمر کا دیوتا ہے۔ اس کی وجہ سے عمر لمبی ہوتی ہے۔

مذکورہ پانچ قسم کے معبود قوم نوح میں پائے جاتے تھے۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ کی روایت میں ہے کہ یہ پانچوں آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ وہ ان میں بڑا تھا۔ یہ سارے نیک اور صالح لوگ تھے۔ جب یہ مر گئے اور کچھ زمانہ گزر گیا۔ تو شیطان نے لوگوں کو اس طرف راغب کیا اور انہوں نے ان کے مجسمے بنالے۔

بخاری شریف میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ وہ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر پانچ بزرگوں کے نام ہیں (یہ حضرات ادریس علیہ السلام، شیت علیہ السلام یا آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ جب آدم علیہ السلام قریب المرگ تھے تو یہ پانچوں بیٹے ان کے پاس موجود تھے) قوم نوح کے نیک آدمی تھے، جب یہ مر گئے تو لوگوں کو بڑا افسوس ہوا۔ کیونکہ ان کی نیکی کی وجہ سے لوگوں کو ہدایت نصیب ہوتی تھی۔ شیطان نے ان کے دلوں میں رغبت ڈالی کہ ان کے مجسمے اور تصویریں بنالو اور جہاں تم عبادت کرتے ہو انہیں وہاں رکھ لو تاکہ انہیں دیکھ کر تم عبادت کی طرف زیادہ راغب ہو سکو۔ کہ یہ بزرگ ایسی عبادت کرتے تھے تو اہل ادا کرتے تھے، اور دکر تے تھے۔

کچھ وقت اور گزرا تو یہ بزرگ خود معبود بن گئے۔ شیطان نے سبق پڑھایا کہ ان کی پرستش ہونی چاہیے چنانچہ ایسا ہی ہونے لگا۔ اس کے بعد طوفان نوح میں یہ سب عابد و معبود ڈوب گئے۔ عربوں میں پھر سے شیطان نے ان کو تازہ کیا۔ لوگوں کو ان کی طرف رغبت دلائی، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شیر اور گدھ اور دوسری صورتوں میں معبود موجود تھے اور مختلف قبیلوں میں انکی پوجا ہوتی تھی

اسی طرح لات ایک نیک آدمی تھا۔ بخاری شریف میں ہے کہ حج کے زمانے میں لوگوں کو ستوپلایا کرتا تھا۔ اس کی موت کے کچھ عرصہ بعد اس کا مجسمہ بنایا گیا اور عبادت شروع ہو گئی۔ عزیزی ایک دہشت تھا۔ اس کے بیچے کوئی بزرگ بیٹھا ہو گا۔ لہذا اس کی پوجا شروع ہو گئی۔ مناتہ بڑا سرکش تھا مشعل کے مقام پر اس کا عظیم مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ لوگ مدینے سے اس کے نام پر احرام باندھتے تھے۔ اور صفا اور مروہ کے درمیان دوڑ لگاتے تھے۔

الغرض نوح علیہ السلام نے اپنی دعا میں بیان کیا کہ میری قوم نے لوگوں کو بے کمانے کے لیے بڑے دوا بیزچ کھیلے۔ اور معبودانِ باطلہ کی پرستش پر خود بھی مصر ہے اور دوسروں کو ترغیب دی کہ اپنے معبودوں خاص طور پر پانچ کو کسی حالت میں بھی ترک نہ کرنا۔

گمراہی کی طرف
دعوت

اس کے بعد نوح علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ ان لوگوں کے کفر و شرک پر اصرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا کہ انہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا۔ اور خود بھی گمراہ ہوئے۔ بالکل اسی طرح جیسے مکے والوں کے متعلق ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَكُمْ يَوْمَئِذٍ مِّنْ عَذَابٍ لَّيْسَ بِمُعْتَدٍ اِلَّا اَلْاَلْبَسَ کہ یہ لوگ جو کفر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی ایمان پر مجبور اور قرآن سے روکتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی عیسائی مشنریاں لالچ دے کر گمراہ کر رہی ہیں، ہسپتال بناتے ہیں، اسکول چلاتے ہیں، پیسے کا لالچ دیتے ہیں، دودھ اور کھلونے بھیج کر گمراہی کی طرف بلاتے ہیں۔ اور جہاں ضرورت ہوتی ہے دباؤ ڈال کر بھی لوگوں کو عیسائی بنایا جاتا ہے۔ عیسائیوں نے اندلس میں کیا کیا۔ بعض کو مار دیا گیا۔ بعض بھاگ گئے اور بعض کو جبراً عیسائی بنایا گیا۔ چین کے صوبہ ختن میں مسلمانوں کی سات کروڑ کی آبادی تھی جہاں صرف ایک کروڑ مسلمان رہ گئے ہیں۔ یہ کیمینٹوں کی کاروائی ہے۔ مار دیا۔ دبا دیا۔ تقسیم کر دیا یا کیمونسٹ بنالیا۔

بخارا میں چالیس ہزار مسجدیں تھیں اور ملک میں چار سو سے زیادہ مدارس تھے۔ مگر آج وہاں دو ہزار مسجدیں بھی نہیں ہیں۔ یہاں بھی گمراہی کے لیے ہر حربہ استعمال کیا گیا۔

اعشی شاعر کا واقعہ کتابوں میں ملتا ہے۔ وہ نبی کریم سے ملنا چاہتا تھا۔ مگر کھارنے اُسے ایک سواونٹ اناج کا دیا کہ وہ آپ کے پاس نہ جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ صناجۃ الحرب یعنی عربوں کا باجہ کھاتا ہے۔ اگر اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھ دیا تو سارا عرب فریفتہ ہو جائے گا۔ لہذا اسے لالچ دیکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جانے سے روکا۔

اس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک غریب آدمی کی پانچ سات جوان لڑکیاں تھیں مگر انہیں کوئی پوچھتا
 تک نہیں تھا۔ اُس شخص نے اعشیٰ کو اپنے ہاں دعوت دی، اس کی خوب خاطر تواضع کی۔ اونٹ
 ذبح کیا، کھانا کھلایا، شراب پلائی۔ اس نے مہمانوں میں آکر اُس غریب آدمی کی مدح میں قصیدہ کہہ دیا۔
 پھر کیا تھا آٹا فانا اس شخص کے چہرے ہونے لگے اور بڑے بڑے رئیسوں کی طرف سے اس کی لڑکیوں
 کے لیے نکاح کے پیغام آنے لگے۔ تو اس طرح اُسے گمراہ کیا گیا۔ اگرچہ سوا اونٹ اناج اُس کے کام نہ آیا
 وہ راستے ہی میں اونٹنی سے گر کر مر گیا۔ تاہم گمراہ ہو گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! ان کو گمراہی کی سزا یہ دے کہ وَلَا تَزِدِ
الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا یعنی ان ظالموں کے لیے سوائے گمراہی کے کچھ زیادہ نہ کر۔ ان کو تباہی کی نظر بڑھا۔
 اگلی آیت میں حضرت نوح کی بددعا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ سے عرض کیا گیا ہے کہ یہ قوم کا
 گلا سٹرا پھوڑا ہے۔ اسے کاٹ کر تباہ و برباد کر دے۔

مِمَّا خَطِيئَتُهُمْ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا ۖ فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِنْ
 دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا ۝ (۲۵) وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنْ
 الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ (۲۶) إِنَّكَ إِنْ تَذَرَهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا
 يَلِدُوا إِلَّا فِاجِرًا كَفَّارًا ۝ (۲۷) رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ
 بَيْتِي مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا
 تَبَارًا ۝ (۲۸)

۲

ترجمہ: وہ لوگ (قوم نوح) اپنی کوتاہیوں کے سبب غرق کئے گئے۔ پھر آگ میں داخل کیے گئے۔ پھر
 انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا مددگار نہ پایا ۝ (۲۵) اور نوح (علیہ السلام) نے عرض کی
 اے میرے پروردگار زمین پر کسی کافر کو بسنے والا نہ رہنے دے ۝ (۲۶) بیشک اگر تو ان کو چھوڑ دے گا تو یہ تیرے
 بندوں کو گمراہ کر دیں گے۔ اور یہ نہیں جنہیں گے مگر ڈھیٹ کافر ۝ (۲۷) اے پروردگار مجھے اور میرے
 والدین کو — اور جو میرے گھر میں مومن بن کر داخل ہو۔ اور تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کو
 بخش دے۔ اور ظالموں کے لیے تباہی کے سوا کچھ زیادہ نہ کر ۝ (۲۸)

گزشتہ سے پیوستہ

گزشتہ درس میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے دوران اُن دافویچوں کا ذکر تھا جو آپ کی
 قوم نے آپ کی دعوت کے خلاف آزمائے۔ نبوت میں شبہات پیدا کئے لوگوں کو تلعین کی کہ اپنے معبودوں
 کو مت چھوڑنا۔ خاص طور پر ود، سواح، یغوث، یعوق اور نسر سے وابستگی پر آمادہ رکھا۔ مفسرین کرام
 فرماتے ہیں کہ قوم نوح کے لوگ ایسے سخت اور بد وضع تھے کہ بوڑھے مرتے وقت اپنی اولاد کو وصیت
 کر جاتے تھے کہ نوح علیہ السلام کی بات نہ ماننا بلکہ اپنے معبودوں پر جمے رہنا۔ سابقہ درس میں یہ
 بھی گزر چکا ہے کہ قوم نوح کے معبودان باطلہ کی پرستش نبی علیہ السلام کے زمانے کے مشرکین بھی کرتے
 تھے اور انہوں نے بھی انہیں ناموں سے مجسمے بنائے تھے۔ یہ تصور ہندوستان میں بھی برہما، بشن،
 وشنو، اندر دیوتا اور ہنومان کے نام سے پایا جاتا ہے۔ جس طرح نوح علیہ السلام کے زمانے میں ان پانچ
 معبودوں سے مختلف اغراض وابستہ کی ہوئی تھیں، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک

اور پھر ہندوؤں کے تصورات میں بھی یہ چیزیں ملتی ہیں۔

انسان کے اندرونی
معبود

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ کہ قوم نوح علیہ السلام کے جن پانچ معبودان کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تو انسان کے خارجی معبود ہیں۔ جن کی مشترک پرستش کرتے ہیں۔ مگر ہر شخص کے اندر بھی یہ پانچوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ جب تک آدمی ان کے پھندے سے آزاد نہ ہو، اس کی عبادت صحیح نہیں ہوتی ان اندرونی معبودان کی تفصیل شاہ صاحب اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

وہ جس طرح خارجی دنیا میں مشرکین نے وہ کو محبت کا دیوتا بنا رکھا ہے۔ اسی طرح اندرونی طور پر انسان کا اپنا جسم وہ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ ہر انسان اپنے جسم کے بناؤ سنگھار میں مصروف نظر آتا ہے۔ حجاب طبع بھی یہی ہے کہ انسان اپنے جسم کی پرورش، زیب و زینت، تروتازگی میں لگا ہوا ہے اور ساری عمر لگا رہتا ہے حتیٰ کہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ انسان کا جسم اُس کا وہ ہے جسکی پرستش ساری عمر کر رہتا ہے۔

سوانہ انسان کا نفس اندرونی طور پر اس کے لیے سوانہ ہے جس کی رضا انسان کو ہر حالت میں مطلوب ہوتی ہے۔ انسان تقویٰ و طہارت اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے حکم کو اپنے نفس کے مقابلے میں ٹھکراتا رہتا ہے اور اپنے نفس کی بات مانتا ہے اُس کی پوجا کرتا ہے۔ ایسے بہت کم لوگ ہوں گے جن کو اس بات کا احساس ہو، کہ نفس کو اُس حد تک راضی رکھنا چاہیے جس حد تک خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا پہلو نہ نکلے۔ شریعت کا ابطال نہ آئے اور اطاعت میں فرق نہ آئے۔ اگر خدا کی اطاعت اور اس کی رضا کو نفس پر قربان کر رہا ہے۔ تو یہی انسان کا سوانہ ہے جسکی وہ پرستش کر رہا ہے۔

یعوت

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ یعوت انسان کا خاندان ہے جس میں باپ، بیٹا، بھائی اور دیگر افراد شامل ہیں۔ انسان ان کو راضی رکھنے کی فکر میں رہتا ہے۔ تاکہ یہ بھی بوقت ضرورت اس سے تعاون کریں۔ خاندان کے یعوت کو خوش رکھنے کے لیے ہر قسم کی رسومات ادا کرتا ہے۔ سمجھتا ہے۔ کہ اگر برادری بگڑ گئی تو میرا تمام معاملہ خراب ہو جائے گا، لہذا ان کو ہر حالت میں خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور شریعت کے قانون کو بھی ترک کر دیتا ہے لہذا یہ خاندان ہی اس کا یعوت ہے۔ ساری عمر اسی کو خوش کرنے میں لگا رہتا ہے۔

یعوت

انسان کا مال اس کے لیے بمنزلہ یعوت کے ہے۔ انسان مال کی محبت میں کم و بیش بڑا شدید

”وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ“ مال کے متعلق انسان سمجھتا ہے۔ کہ یہ اس کی تکلیف کو دور کریگا یہ اس کے لیے عرق ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے ”يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ“ یعنی سمجھتا ہے کہ مال اس کو قائم رکھیگا۔ اس لیے انسان مال جمع کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ یہ مال کی محبت کا نتیجہ ہے کہ اس کے فرائض بھی ادا نہیں کرتا۔ نہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے نہ صدقہ خیرات کرتا ہے۔ بلکہ اسے سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے۔ کہ مشکل وقت میں کام آئے گا۔ لہذا یہ انسان کے لیے عرق ہے۔

— شیطان انسان کے لیے نسر ہے، جو اسے ہر وقت بہکاتا رہتا ہے۔ یہ حرص اور غصے کے بازوؤں کے ساتھ انسان پر حملہ آور ہوتا ہے اور ایسے ایسے دوسوے ڈالتا ہے۔ جس سے انسان کا عقیدہ خراب ہو جائے۔ جیسا کہ پہلے شرک کرنے والوں کا حال بیان ہوا۔ شیطان کے بہکاوے میں آنا گویا نسر کی پستش کرنا ہے۔

نسر

الغرض یہ اندرونی پانچ معبودانِ باطلہ ہیں جن سے ہر آدمی کو واسطہ پڑتا ہے۔ اور جو اس کے لیے رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ پچھلی آیات میں حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی قوم کی شکایت کی تھی کہ انہوں نے اپنے نبی کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اب اگلی آیت میں اُس قوم کی نیا بے کی سزا کا ذکر ہے۔ مَّا خَطَبْتَهُمْ أُعْرِقُوا یعنی وہ لوگ اپنی کوتاہیوں کے سبب غرق کئے گئے۔ یہاں پر مِمَّا کا لفظ بمعنی ہے۔ یعنی وہ قوم بہ سبب اپنی کوتاہیوں کے تباہ و برباد ہوئی۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے کہ تباہی ہمیشہ کسی گناہ کی پاداش میں آتی ہے۔ اور تکلیفیں اور پریشانیاں یقیناً کسی کوتاہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ تو قوم نوح کی غرقابی ان کے گناہوں کی وجہ سے تھی۔

قوم نوح کی غرقابی کا سبب

یہاں پر خَطَبْتُ جمع کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اُس قوم میں کوئی ایک کوتاہی نہ تھی بلکہ وہ لوگ بہت سے گناہوں میں ملوث تھے۔ مثلاً ان کی اعتقاد ہی خطایہ تھی کہ وہ توحید کا نام بھی سننے کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ اپنی اولاد کو بھی وصیت کرتے تھے کہ نوح علیہ السلام کی بات نہ ماننا اور اپنے معبودوں کو ترک نہ کرنا۔ رسالت کے متعلق ان کی خطایہ تھی کہ وہ نوح علیہ السلام کے ساتھ انتہائی بدسلوکی سے پیش آتے تھے۔ جہاں چاہا آپ کو پکڑ لیا، گلا دبا دیا۔ بے ہوش ہو گئے پھر مارتے تھے، گالیاں دیتے تھے، بیوقوف اور پاگل کا خطاب دیتے تھے مگر نوح علیہ السلام اس دور

میں یہی دعا کرتے تھے رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔ یعنی اے پروردگار میری قوم کو معاف کر دے کیونکہ وہ سمجھتے نہیں۔ نادان ہیں۔ مگر وہ لوگ آپ کو ایذا پہنچانے میں کوئی موقع ضائع نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ نبی کو اذیت پہنچانا اللہ تعالیٰ کی شدید ناراضگی مول لینا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے مَنْ أَذَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنَنْتُهُ بِالْحَرْبِ۔ یعنی جو میرے کسی دوست کو تکلیف پہنچائے گا، اس کے لیے میرا چیلنج ہے کہ اُسے ذلیل اور تباہ کر دوں گا۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ ہر کام اپنے مقررہ وقت پر سرزد ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ انتقام ضرور لیتے ہیں۔

قوم نوح کی ایک خطایہ بھی تھی کہ وہ جزائے عمل کا انکار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ باقی حقوق میں بھی کوتاہی کے مرتکب ہوتے تھے۔ تو یہ سائے کے سائے اُن کے جرائم تھے۔ جن کی تباہی پختلیٹ جمع کا لفظ فرمایا۔ کہ وہ اپنی خطاؤں کے سبب غرق کئے گئے۔

اور پھر اُن کی غرقابی کے لیے پانی عذاب الہی کی صورت میں آیا۔ آسمان کی طرف سے بھی پانی کو چھوڑ دیا گیا یعنی چالیس دن تک مسلسل موسلا دھار بارش ہوتی رہی اور زمین سے بھی پانی کے چشمے جاری ہو گئے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ پانی کی اس قدر بہتا ہو گئی کہ اونچے سے اونچے پہاڑ سے بھی اس کی سطح تیس فٹ تک بلند ہو گئی۔ اور اس طرح وہ قوم اپنے گناہوں کی پاداش میں کیفر کردار تک پہنچی۔

تمام منکرین غرق ہو گئے

جیسا کہ اگلی آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعا آئے گی کہ اے مولا کریم! زمین پر ایک بھی کافر کو باقی نہ چھوڑ۔ تو یہاں اُنْغَرِقُوا کا مطلب یہی ہے۔ کہ اُس قوم کے تمام کے تمام کفار غرق ہو گئے۔ اور ان میں سے ایک بھی باقی نہ رہا۔ صرف وہی ستر آدمی بچے تھے جو ایمان لائے اور کشتی میں سوار ہو گئے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی اس عذاب سے نہ بچ سکا حالانکہ وہ کتا تھا سا اَوْحَىٰ اِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِي مِنْ الْمَاءِ یعنی پہاڑ پر چڑھ کر پانی کے عذاب سے بچ جاؤں گا۔ مگر وہ بھی غرق ہو گیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی سے ابن ابی حاتم کی روایت ہے جسے ابن کثیر نے بھی بیان کیا ہے۔ حضور فرماتے ہیں کہ قوم نوح میں سے اگر خدا تعالیٰ کسی پر رحم کرے تا تو یقیناً اس بچے پر کرے گا، جسے اُس کی ماں نے کہ پہاڑ پر چڑھ گئی تھی۔ جب پانی اُس عورت کے کندھے تک پہنچا تو اُس نے بچے

کو سر پر اٹھالیا۔ اور جب پانی ستر تک پہنچ گیا تو اُس نے بچے کو اور اوپر بازوؤں پر اٹھالیا کہ کسی طرح وہ بچ جائے مگر پھر بھی وہ نہ بچ سکا اور اپنی مال کے ساتھ ہی ڈوب گیا۔ تو اس طرح گویا تمام کفار غرق ہو گئے اور اُن میں سے کوئی بھی نہ بچ سکا۔

آگ کی سزا

تو فرمایا کہ وہ لوگ دنیا میں تو پانی میں غرق ہوئے اور موت کے بعد عالم برزخ میں پہنچے تو آگ میں داخل کئے گئے۔ فَادْخُلُوا نَارًا۔ مفسرین نے اس سے یہ اخذ کیا ہے کہ پانی کی سزا تو انہیں دنیا میں ملی، مگر آگ کی سزا برزخ میں مل رہی ہے اور یہ سزا بھی برحق ہے۔ اگرچہ یہ مکمل سزا نہیں ہے کیونکہ مکمل سزا تو قیامت کو ملے گی تاہم برزخ میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملتا ہے۔ آل فرعون کے متعلق بھی ایسے ہی الفاظ آتے ہیں کہ انہیں صبح شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔

مرنے والا چاہے کسی شکل میں مرے، قبر اور برزخ کا عذاب اس سے ٹل نہیں سکتا۔ اُس کے جسم اور روح کا کوئی نہ کوئی حصہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔ جسے تکلیف یا راحت محسوس ہوتی ہے۔ ہاں البتہ عالم برزخ میں وقت کا احساس نہیں ہوتا، جب حشر میں اٹھیں گے تو کہیں گے "هَنَّا بَعْثْنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا" ہمیں ہماری قبروں سے کس نے نکال لیا۔

الغرض قوم نوح کے لوگ ادھر پانی میں ڈوبے گئے، ادھر آگ میں داخل کئے گئے۔ فَلَمَّا جَعَلُوا لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا مگر انہوں نے اللہ کے سوا کسی کو مددگار نہ پایا۔ زود صاحب آئے نہ سواح نے مدد کی، نہ یغوث نے فریاد رسی کی نہ یعوق کسی کام آیا اور نہ نسر سے کچھ بن پڑا۔ خدا کے سوا کوئی بھی مافوق الاسباب مددگار نہ آیا۔ آج بھی صورت حال یہی ہے۔ کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا، لوگ خواہ مخواہ وہم میں مبتلا رہتے ہیں اور شرک میں ڈوبے رہتے ہیں۔ طرح طرح سے اپنا عقیدہ گندہ کرتے ہیں۔

نوح علیہ السلام کی بددعا

سورۃ کے آخری حصے میں حضرت نوح کی تین دعاؤں کا ذکر ہے۔ پہلی یہ دعا کی وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا۔ نوح علیہ السلام نے عرض کیا، اے میرے پروردگار! زمین پر کسی کافر کو زندہ نہ رہنے دے۔ دَیَّار دوران سے ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں معنی لگتے ہیں۔ یعنی کسی چلتے پھرنے والے یا کسی گھر میں رہنے والے کو زندہ نہ چھوڑ۔ یہ قہر الہی کا ظہور ہے۔ یہ غَضَبًا لِلَّهِ ہے یعنی اللہ کے لیے ناراضگی پیدا ہو گئی ہے۔ اور سزا شروع ہو چکی ہے۔

حضرت نوح نے مزید عرض کیا۔ إِنَّكَ إِنْ تَذَرَهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ اگر تو ان کو زندہ چھوڑ دے گا تو میرے بندوں کو گمراہ کر دے گا۔ وَلَا يَكِيدُ وَلَا فَاكِجًا كَفَّارًا اور یہ نہیں جنیں گے میکر ڈھیٹ کافر، یعنی ان کی اولادیں بھی ایسی ہی ہوں گی۔ سورۃ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام کو بتلادیا گیا تھا کہ لَنْ يَكُونُ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ یعنی تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے، بس وہی ایماندار رہیں گے، ان کے علاوہ اور کوئی ایمان نہیں لائیں گے۔ لہذا حضرت نوح نے ان کی تباہی و بربادی کی بددعا ہی کی۔

شاہ ولی اللہؒ کی زبان میں یہ گلاسٹر اعضو ہے، اس کو کاٹ دینا ہی ضروری ہے۔ ورنہ یہ ایک عضو فاسد باقی جسم کو بھی فاسد کر دے گا۔ ان لوگوں کا اعدام اوفق من الوجود ہے۔ ان کا خاتمہ ان کے زندہ ہونے سے زیادہ قرین مصلحت ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام
کی دعائے مغفرت

نوح علیہ السلام نے دوسری دعایہ کی کہ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ اے پروردگار مجھے اور میرے والدین کو بخش دے کہ وہ بھی نیک اور صالح تھے۔ لوگوں کو شرک سے منع کرتے تھے۔ نوح علیہ السلام کی یہ دعا بھی اپنے منصب کے مطابق تھی پیغمبر صغیر یا کبیرہ گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ البتہ بعض اوقات چھوٹی موٹی لغزشیں ہو جاتی ہیں، جن سے وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ مقربین بارگاہ الہی ہوتے ہیں انہیں معمولی لغزش پر بھی بڑی بے چینی لاحق ہو جاتی ہے۔ اسی لیے عرض کیا کہ اے اللہ! میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما دے۔

نیز فرمایا کہ اس کی بھی بخشش فرما دے۔ وَلَمَّا دَخَلَ بَيْتِي مُؤْمِنًا جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہو۔ گھر میں آنے والے کے لیے مومن ہونا شرط ہے۔ کیونکہ کافروں کے لیے تو تباہی و بربادی کی بددعا ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ فرمایا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ یعنی گھر میں آنے والوں کے علاوہ عام مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بھی ان کے ایمان کی بدولت معاف فرما دے یہ عام دعا ہے جو اللہ کے اس نیک بندے نے مانگی، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس کا مصداق بنائے۔ ہر مسلمان کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ کہ اپنی دعائیں عام مومنین اور مومنات کو یاد کیا کرے۔ ان کی بخشش کی دعا کیا کرے۔ یعنی یوں کہ اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ الْأَحْيَاءِ مِنْهُمْ وَالْأَمْوَاتِ۔

ظالموں کے لیے تباہی
کی بددعا

دعا کا تیسرا حصہ نوح علیہ السلام نے یہ عرض کیا وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا يَعْنِي

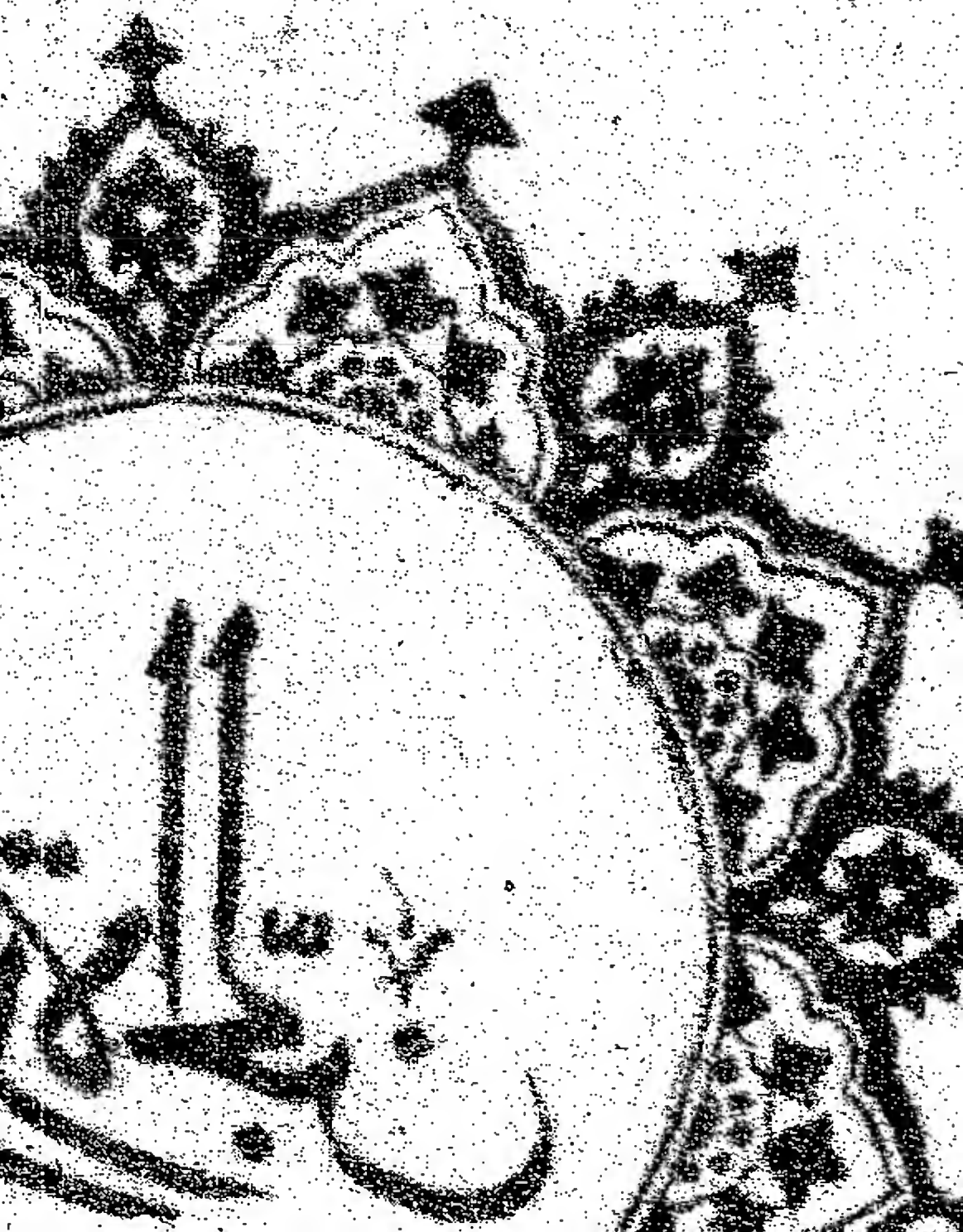
ظالموں کے لیے تباہی کے سوا کچھ زیادہ نہ کر یہ بھی جو شش اور غضب الہی ہے۔ یہ ظالم ہر حالت میں کفر و شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ظالم جب تک ظلم پر قائم ہے گا، اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا اُسے ہدایت نہیں دے گا سب سے بڑے ظالم تو کافر ہیں جیسا فرمایا وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ سب سے بڑے ظالم تو کافر ہیں جیسا فرمایا إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ شرک سے بڑا ظلم کون سا ہو سکتا ہے۔ جو لوگ کفر و شرک کے ظلم پر ڈٹے ہوئے ہیں، اُن کے لیے سولے تباہی کے اور کچھ اضافہ نہ کر۔

الغرض حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعا کے تیسرے حصے میں ظالموں کی مکمل تباہی کی درخواست کی۔ آپ کی دعا منظور ہوئی اور پوری قوم کو سوائے ستر مومنین کے غرق ہو گئی۔

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ



۲۹۵۷



سُورَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ ثَمَلَا وَعَشْرُونَ آيَةً فِيهَا كُوعَانِ
سورة جن مکی ہے اور یہ اٹھائیس آیتیں اور اس سورۃ میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا
قُرْآنًا عَجَبًا ① يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ وَلَنْ
نُشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ② وَأَنَّهُ تَعَالَى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ
صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا ③ وَأَنَّهُ كَانَ يَقُولُ سَفِيهُنَا عَلَى اللَّهِ
شَطَطًا ④ وَأَنَّا ظَنَنَّا أَن لَّنْ نَقُولَ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللَّهِ
كَذِبًا ⑤

ترجمہ :- اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف اس بات کی وحی کی گئی ہے کہ
جنات کے ایک گروہ نے قرآن پاک سنا۔ تو کہنے لگے، ہم نے تو بڑا عجیب قرآن پاک سنا ہے ①
نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے لہذا ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو ہرگز
شریک نہیں بنائیں گے ② اور بے شک ہمارے رب کی شان بلند ہے۔ نہیں بنائی
اس نے اپنے لیے کوئی بیوی اور نہ اولاد ③ بیشک ہم سبے وقوف شخص اللہ پر بڑی زیادتی
کی بات کہا کرتا تھا ④ اور ہم گمان کرتے تھے کہ انسان اور جن سارے کے سارے خدا کے
بارے میں گھجھوٹ نہیں بولیں گے ⑤

اس سورۃ کا نام سورۃ جن ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق جن، ان کے عقائد اور ہمت
قبول کرنے کا ذکر ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی، اس کی اٹھائیس آیات، دو رکوع،

دو صد سچاسی الفاظ اور آٹھ سو ستر حروف ہیں۔ پہلی سورۃ کی طرح اس کا موضوع بھی بنیادی عقائد ہیں، جن میں سب سے زیادہ توحید ہے۔ اس کے بعد قیامت اور رسالت کا بیان ہے۔ قرآن پاک کا کلام الہی اور برحق ہونا بھی اس کے موضوعات میں شامل ہے۔

جن کا لفظی معنی پوشیدہ یا ستور ہے، یعنی وہ چیز جو مستور ہو۔ اسے جن کہتے ہیں۔ جن کے مادے سے کئی ایک چیزیں مشتق ہیں۔ مثلاً جنت کو جنت اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اپنے گنجان اور گھنے درختوں سے اس میں موجود چیزوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اس کا مادہ جن ہی ہے۔ اسی طرح لفظ جنوں بھی اسی مادہ سے ہے۔ یہ بھی عقل کو ڈھانپ لیتا ہے۔ پوشیدہ کر دیتا ہے۔

لفظ جن کا معنی

جن اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ نگاہوں سے مستور ہے، نظر نہیں آتی۔ مگر شکل تبدیل کرنے کے بعد نظر بھی آتی ہے۔ جنات چونکہ انسانوں اور حیوانات سے زیادہ لطیف ہیں، اس لیے اس جہاں میں یہ پوشیدہ ہیں۔ عالم دنیا کے اختتام پر اگلے جہاں میں یہ سب چیزیں نظر آئیں گی، کیونکہ اس جہاں میں انسانی قوتوں میں بھی بہت زیادہ لطافت پیدا ہو جائے گا۔ ملائکہ تو جنوں سے بھی زیادہ لطیف مخلوق ہے۔ اگلے جہاں میں ان کا بھی مشاہدہ ہو سکے گا۔

جنات کی حقیقت

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی مختلف قسمیں ہیں، کسی میں عقل غالب ہے تو کسی میں وہم کا مادہ زیادہ ہے کسی مخلوق میں باقی صفات کی نسبت شہوت اور غضب غالب ہے۔ اور کوئی مخلوق معجون مرکب ہے کہ اس میں ساری صفات پائی جاتی ہیں۔

مخلوق کی مختلف قسمیں

۱۔ ملائکہ۔ ملائکہ وہ مخلوق ہے جس میں دیگر صفات کی نسبت عقل غالب ہے۔ اس میں شہوت کا مادہ بالکل نہیں۔ اگر غضب بھی ہے تو وہ مغلوب ہے۔ اس پر عقل غالب ہے۔ ملائکہ میں عقل و فہم اور علم کی فراوانی ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ملائکہ کی سات قسمیں ہیں۔ سب سے عالی ملائکہ حاملین عرش ہیں اس کے بعد ان فرشتوں کا نمبر ہے جو حَافِیْنَ حَوْلِ الْعَرْشِ یعنی عرش الہی کے گرد گھومنے والے ہیں پھر وہ فرشتے ہیں جو آسمانوں کے اوپر ہیں۔ ان میں ہفت آسمان کے ملائکہ کا نمبر ہے۔ اس کے بعد فضا والے ملائکہ آتے ہیں اور اس کے بعد زمین والے۔ ان میں بھی کئی طبقات ہیں۔ یہ ملائکہ

سفلیہ کھلاتے ہیں اور عالم بالا میں رہنے والے ملائکہ اعلیٰ کھلاتے ہیں۔

بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی مخلوق ہے۔ جس کا مادہ تخلیق بہت ہی لطیف ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ درجہ اول کے ملائکہ کا مادہ ایسا ہے۔ جیسے وہ آگ جو موسیٰ علیہ السلام کے لیے کوہ طور کے ایک درخت پر ظاہر ہوتی تھی۔ وہ نار تھی یا حجاب ناری تھا یا کیا چیز تھی۔ وہ روشن آگ کی طرح تھی مگر جلانے والی آگ نہیں تھی۔ آگ درخت پر ظاہر ہوئی، اجول جوں وہ زیادہ روشن ہوتی جاتی تھی درخت کی سرسبزی بڑھتی جاتی تھی۔ درجہ اول کے ملائکہ کا مادہ اس سے بھی لطیف تر نورانیت ہے۔ البتہ جو ملائکہ ان سے کم تر ہیں یعنی عالم مثال کے ملائکہ تو ان کا مادہ تخلیق کم تر ہے الغرض یہ ایسی مخلوق ہے جس پر عقل غالب ہے۔ وہ اطاعت ہی کرتے ہیں۔ ان میں معصیت کا مادہ ہی نہیں ہے۔ وہ ہر لحاظ سے کامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کمال کے اندر پیدا کیا ہے۔

۲۔ جنات :- دوسری قسم کی مخلوق وہ ہے جس پر باقی صفات کی نسبت وہم غالب ہے۔ یہ جنات ہیں جن کا مادہ تخلیق آگ اور ہوا ہے۔ لہذا یہ النان اور حیوانات کی نسبت زیادہ لطیف ہیں اس لیے نظر بھی نہیں آتے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو اختیار دے رکھا ہے کہ وہ شکل تبدیل کر سکتے ہیں، اسی طرح جنات بھی جس شکل میں چاہیں متشکل ہو جائیں۔ انسان کی شکل میں آ سکتے ہیں جانور کی شکل میں آ سکتے ہیں۔ کیرے مکوڑوں، درندوں حتیٰ کہ سانپ کی شکل میں بھی آ سکتے ہیں۔ مادہ تخلیق کے متعلق قرآن پاک میں موجود ہے۔ **وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارٍ نَّارٍ** اور جنوں کو شعلہ مارنے والی آگ سے پیدا کیا۔ شعلہ میں ہوا بھی شامل ہے۔ لہذا جنات کے مادہ تخلیق میں آگ اور ہوا دو چیزیں شامل ہیں۔

امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں، آدم کے دور سے پہلے زمین پر جنات کا دور تھا، جنات سے پہلے جن اور بن اللہ کی کوئی مخلوق تھی۔ ان کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ لیکن تصریح نہیں ہے کہ جن اور بن کیسی کیسی مخلوقات تھیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ثناء ولی اللہ فرماتے ہیں۔ کہ الیا انسان بڑا حکیم ہو گا جو صرف ایک دور کی بات کو سمجھ سکے یعنی آدم علیہ السلام کے دور کی۔ دوسرے

ادوار کے حالات نہ تو کسی کتاب میں منقول ہیں، نہ کسی پر ظاہر کئے گئے ہیں، لہذا انہیں کوئی آدمی نہیں جان سکتا۔ بہر حال اس زمین پر کوئی قوم حق اور بن آباد تھی، اس کے بعد جنات کا زمانہ آیا، پھر آدم علیہ السلام کا دور آیا۔ جب یہ دور ختم ہو گا تو قیامت واقع ہوگی۔

الغرض جنات ایک ایسی مخلوق ہے، جس پر وہم غالب ہے۔ اور وہم ایسی کمزور چیز ہے جس کی وجہ سے جنات میں چھوڑ پھینچ اور دیگر مختلف قسم کی حرکات پائی جاتی ہیں۔

۳۔ حیوانات :- حیوانات میں شہوت اور غضب کا مادہ غالب ہے۔ اور ان کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ اگر غضب اور سببیت غالب ہوگی تو درندہ ہے۔ اگر خفت ہوگی تو پرندہ ہے۔ اور اگر محض کھانے پینے اور جفتی کی صفت غالب ہے تو بہیمہ ہوگا جیسے عام جانور ہوتے ہیں۔

۴۔ انسان :- اللہ تعالیٰ کی چوتھی مخلوق معجون مرکب ہے، اس میں ساری صفات پائی جاتی ہیں اور وہ انسان ہے۔ اس میں وہم، عقل، شہوت، بہیمیت، ملکیت سب موجود ہیں اور انسان ان تمام صفات کا جامع ہے۔

الغرض اس سورۃ میں رب العزت نے جنات کی مخلوق کا ذکر فرمایا ہے۔ کہ یہ مخلوق بھی اس کی صفات کا منظر ہے۔ اور پھر ان جنات کی بھی مختلف قسمیں ہیں جیسا کہ سورۃ کی بعض آیات سے واضح ہوتا ہے۔ اور ان کے کام بھی مختلف ہیں۔ جنات عموماً ہوا اور فضا میں رہتے ہیں۔ بعض زمین پر بھی رہتے ہیں اور ویسے ہی کام کرتے ہیں جیسے انسان کرتے ہیں۔ کوئی مزدوری کرتا ہے، کوئی کاشتکاری کرتا ہے۔ کوئی جانوروں کا سلسلہ کرتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جس طرح انسان کرتے ہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ عام ہے، اس لیے انسانوں کی طرح جنات بھی آپ کی امت میں داخل ہیں۔ آپ جنات کی طرف بھی مبعوث ہوئے ہیں۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مکی اور مدنی زندگی میں چھ مواقع پر آپ جنات کو تبلیغ کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ ان میں ایک واقعہ سفر کا ہے، ایک جنت البقیع کے قریب کا۔ بعض واقعات مکی زندگی کے ہیں۔ بعض اوقات قرآن کریم اور دین کی تعلیم کے لیے ساری ساری رات آپ نے جنات کے ہاں گزاری۔

جنات بھی حضور علیہ السلام کے امتی ہیں

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک رات حضور علیہ السلام مجھے ہمراہ لے گئے آپ نے ایک جگہ لکیر کھینچ کر مجھے اُس کے اندر بٹھا دیا اور حکم دیا کہ اس لکیر سے باہر نہیں نکلتا۔ فرمایا اس لکیر سے اندر تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا، جو بھی آئے گا، اس لکیر تک ہی آئے گا، اس کے اندر داخل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام تشریف لے گئے اور ساری رات جنات کو تلقین کرتے رہے۔ رات کے بالکل آخری حصے میں آپ واپس تشریف لائے اور پھر مٹھوڑی دیر کے لیے وہیں لیٹ گئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ مختلف قسم کی شکلیں آتی تھیں کوئی ایسے آدمی آتے تھے جیسے ہندوستان کے جاٹ ہوتے ہیں۔ بالکل ویسی وضع قطع کے۔ کوئی کسی اور شکل میں۔ اُس لکیر کے گرد گھوم گھام کر چلے جاتے تھے اور میں اُس لکیر کے اندر ہی رہا۔ اس قسم کے اور بھی واقعات ہیں۔ یہاں صرف اس ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا۔ مجموعی طور پر حضور علیہ السلام نے چھ مرتبہ جنات کو تعلیم دی۔

سابقہ سورۃ
سے ربط

اس سورۃ کا سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط یہ ہے کہ سورۃ نوح میں اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام اور آپ کے ماننے والوں کو مخالفین کی ایذا رسانی پر صبر کی تلقین کی تھی اور تسلی دی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی تکالیف کا حال بیان کر کے حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کو برداشت کی نصیحت کی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے مخالفین تباہ و برباد ہوئے اس کا مقصد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتلانا تھا کہ جس طرح حضرت نوح کی قوم مخالفت کی وجہ سے تباہ ہوئی، اسی طرح اگر مشرکین عرب بھی آپ کی مخالفت پر ڈٹے رہے تو ان کا حشر بھی قوم نوح سے مختلف نہ ہوگا، اس طرح گویا حضور علیہ السلام کو اور آپ کے ماننے والوں کو تسلی دی گئی۔

اس سورۃ میں جنات کا قرآن پاک سن کر ایمان لانے کے واقعہ کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے یہ بات اشارۃً سمجھائی ہے کہ جنات غیر جنس اور غیر قوم ہو کہ جب تعصب غالی الذہن ہو کہ کلام الہی کو سنتے ہیں تو وہ بھی ایمان قبول کر لیتے ہیں۔ مگر مکے والے حضور علیہ السلام

کی قوم، برادری اور ہم زبان ہو کر قرآن کریم کو سنتے ہیں، سمجھتے بھی ہیں، مگر تعصب، ضد اور عناد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ تو گویا اس سورۃ کا پہلی سورۃ کے ساتھ ربط یہ ہے۔ کہ جس طرح نوح علیہ السلام کی قوم انسان ہونے کے باوجود آپ کی دعوت کو قبول نہیں کرتی تھی، اسی طرح حضور علیہ السلام کی قوم بھی آپ کا انکار کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ تو قادر ہے کہ ان کو بھی ہدایت دے مے جو نہ ہم قوم ہیں، نہ ہم زبان ہیں، نہ ہم جنس۔ ایک یہ مکے والے ہیں کہ یہ بھی اگر تعصب الگ ہو کر اور خالی الذہن ہو کر قرآن کو سنتے تو ان کو بھی ہدایت نصیب ہوتی۔

طائف کا تبلیغی سفر

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سنہ ۱۰ میں طائف کا تبلیغی سفر اختیار کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب حضور علیہ السلام کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ وفات پا چکی تھیں، آپ کے چچا ابوطالب مشرک ہونے کے باوجود آپ کے ہمدرد تھے۔ اور آپ کی حمایت کرتے تھے۔ وہ بھی فوت ہو چکے تھے ہشترین مکہ کی ایذا میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ ان حالات میں آپ نے مکے والوں سے مایوس ہو کر طائف کا سفر کیا۔ تاکہ تبلیغ دین کا فریضہ وہاں جا کر ادا کر سکیں۔

طائف میں تین بڑے سردار تھے۔ آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی مگر وہ بد نصیب بڑے طریقے سے پیش آئے۔ شہر کے لٹے لٹنے والوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ انہوں نے پتھر مارے گالیاں دیں، نہایت بدسلوکی کی، آپ وہاں سے چل کر ایک باغ میں درختوں کے سائے میں آ بیٹھے یہ باغ مکہ کے عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ اس سفر میں حضور علیہ السلام کے ہمراہ آپ کے غلام حضرت زیدؓ تھے آپ زخمی ہو گئے، خون بہہ رہا تھا۔ جس جگہ آپ تشریف فرما ہوئے وہاں اب درخت نہیں ہیں۔ مسجد بنی ہوئی ہے۔ لوگ وہاں تبرکاً نفل پڑھتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر اب بھی وہاں باغ ہے وہاں اس وقت بھی درخت موجود ہیں۔

الغرض باغ کے مالکان شیبہ، عتبہ وہاں موجود تھے اور یہ سارا واقعہ دیکھ رہے تھے انہوں نے اپنے نصرانی غلام عداس کو انگور کا گچھا دے کر بھیجا۔ غلام عیسائی مذہب رکھتا تھا اور ینوی کا سہنے والا تھا۔ ینوی عراق میں صوبہ موصل کی ایک بستی ہے، جو حضرت یونس علیہ السلام کا وطن ہے۔ وہاں آپ کی قبر بھی ہے۔ بہر حال غلام انگور کا گچھا تھاں میں رکھ کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گیا اور عرض کیا کہ یہ میرے مالکوں نے آپ کے لیے بھیجا ہے آپ تناول فرمائیں۔ آپ نے

انگوڑ لیتے ہی بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا۔ عداس بڑا متعجب ہوا اور عرض کیا کہ یہاں کے لوگ تو اس قسم کی بات نہیں کہتے۔ حضور علیہ السلام نے پوچھا، تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ عرض کیا، منیویٰ کا ہوں آپ نے فرمایا، وہ تو میرے بھائی یونس علیہ السلام کا گاؤں ہے۔ غلام نے عرض کیا، آپ ان کو کیسے پہچانتے ہیں۔ فرمایا، وہ میرا بھائی اور اللہ کا نبی تھا، میں بھی اللہ کا نبی ہوں۔ اس بات سے عداس اتنا متاثر ہوا کہ آپ کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔ شیبہ اور عتبہ وغیرہ مشرکین دور سے دیکھ رہے تھے جب غلام واپس آیا تو انہوں نے پوچھا کہ تم اس شخص کے ہاتھ پاؤں کیوں چوم رہے تھے۔ کہنے لگا کہ اُس نے مجھے وہ بات بتائی ہے جو نبی کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔ کہنے لگے معلوم ہوتا ہے تم پر بھی اُس کا جادو چل گیا ہے۔

تو یہ طائف کا سفر بھی بظاہر ناکام ہوا۔ طائف والوں میں سے کسی نے بھی آپ کو پناہ نہ دی حالانکہ خاندان قریش کی ایک عورت بھی وہاں بیاہی ہوئی تھی، آپ اُس کے پاس بھی تشریف لے گئے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آپ طائف کے تینوں سرداروں عبدیلیل، مسعود اور حبیب کے پاس بھی گئے۔ ان کو اسلام کی دعوت دی مگر سب نے آپ سے بدسلوکی کی۔ اس طائف کے سفر کی ناکامی کے بعد آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی۔

جنت کا واقعہ
کہاں پیش آیا

جنت کے قرآن سننے کا واقعہ کہاں پیش آیا۔ اس کے متعلق ارار مختلف ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ جس کا ذکر سورۃ احقاف میں مذکور ہے ”وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ طَائِف“ کے سفر میں پیش آیا۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ اُس موقع پر پیش آیا جب آپ تبلیغ دین کے لیے عکاظ کی منڈی میں تشریف لے گئے۔ یہ جگہ مکے اور طائف کے درمیان واقع ہے۔ جہاں ہر سال پورے بیس دن تک منڈی لگتی تھی اور اس میں سارے عرب کے لوگ آتے تھے۔ روایت ہے کہ حضور علیہ السلام صحابہ کی ایک جماعت کے ہمراہ اس منڈی میں تشریف لائے تھے تو راستے میں وادی نخلہ کے مقام پر آپ فجر کی نماز پڑھا ہے تھے، قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ اس دوران جنوں کی ایک جماعت وہاں سے گزر رہی تھی تو انہوں نے قرآن کریم سنا۔ یہ جن نصیبین کے مقام کے تھے، جو کہ عراق اور شام کے درمیان ایک جگہ ہے۔

جنات قرآن پاک
سُن کر ایمان لانا

احادیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی بعثت سے پہلے جنات آسمان پر جاتے تھے۔ وہاں ملائکہ کی گفتگو سنتے تھے اور اس میں انہیں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی۔ حضور علیہ السلام کی بعثت کے بعد پہرے سخت ہو گئے۔ اب جو جن اور پر جاتا تھا، آگے سے شہاب پڑتے تھے، کسی ہلاک ہو جاتے تھے، کسی بھاگ جاتے تھے۔ فرشتوں سے بات سُن کر وہ اپنے کاہنوں کے کان میں پھونک دیتے تھے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جب پہرے سخت ہو گئے تو جنات کو تشویش ہوئی۔ جنات نے آپس میں مشورہ کے بعد فیصلہ کیا کہ *فَاَضْرِبُوا حَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَعَادِبَهَا* یعنی زمین کے مشرق و مغرب میں گھوم پھر کر دیکھو کہ کیا بات ہوئی ہے۔ کہ اب ہم اوپر نہیں جاسکتے۔ چنانچہ جنات کی مختلف جماعتوں کو زمین کے اکناٹ و اطراف کی طرف بھیجا گیا تاکہ معلوم کریں کہ دنیا میں کون سی نئی بات ہوئی ہے۔

تو جنات کا یہ گمراہ جن کی تعداد نو یاسات تھی، اسی تفتیش میں وادی نخلہ سے گزر رہا تھا۔ حضور علیہ السلام صبح کی نماز میں تلاوت فرما رہے تھے صبح کا وقت فرشتوں کی حاضری کا وقت ہوتا ہے *وَقُرْآنَ الْفَجْرِ* اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا اسی لیے فجر کی نماز میں قرأت ذرا لمبی کرنے کا حکم ہے تو اس موقع پر جب جنات نے حضور علیہ السلام سے قرآن پاک سنا، تو سمجھ گئے کہ یہی وجہ ہے کہ ہم اوپر جانے سے روک دیے گئے ہیں۔ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ قرآن سُن کر سارا گمراہ ایمان لے آیا اور واپس چلا گیا، مگر حضور علیہ السلام کو اس کا علم نہ ہوا۔ جنات کے چلے جانے کے بعد معجزے کے طور پر وہاں کے ایک درخت نے اللہ کے حکم سے حضور علیہ السلام کو خبر دی کہ جنات آئے تھے اور انہوں نے کلام الہی سنا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ پر جب وحی نازل فرمائی تو اس میں جنات کا ذکر کیا۔

تو اس سورۃ میں یہی ارشاد ہوتا ہے۔ *قُلْ اَوْحِيَ اِلَيَّ* اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف اس بات کی وحی کی گئی ہے *اِنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ* کہ جنات کے ایک گروہ نے قرآن پاک سنا *فَقَالُوا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا* تو کہنے لگے، ہم نے تو بڑا عجیب قرآن

قرآن پاک عجیب کتاب ہے

سنا ہے نذر کا اطلاق تین سے لے کر دس تک کی تعداد پر ہوتا ہے۔ یہ جنات فوتھے، اس لیے ان پر نذر کا لفظ استعمال کیا گیا۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ کتابیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو پڑھی جاتی ہیں اور دوسری وہ جو دیکھی جاتی ہیں اور مطالعہ کی جاتی ہیں قرآن کریم اس لحاظ سے عجیب کتاب ہے۔ کہ اس میں پڑھی جانے والی کتابوں کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ اور مطالعہ کرنے والی کتابوں کی بھی، پڑھی جانے والی کتابوں میں قرآن پاک آسان بھی ہے اور ورد بھی۔ کلام الہی کو پڑھنے کے برابر کوئی ورد نہیں۔ یہ سب افضل ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو خالص نیت اور حسن عقیدت سے کلام پاک پڑھتا ہے۔ میں اُسے ان سے افضل دوں گا جو مانگتے ہیں اور دعائیں کہتے ہیں یا دوسرا اور دکرہتے ہیں اگرچہ میرا کلام پڑھنے والا نہ بھی مانگے۔ اور پھر یہ ورد بھی ایسا ہے کہ ایک حرف پڑھو، تو کم از کم دس نیکیاں حاصل ہوں گی۔ الف، لام، میم حروف مقطعات میں سے ہیں، فرمایا جو آدمی اس کو عقیدت سے پڑھیگا، اُسے تیس نیکیاں نصیب ہوں گی۔ کلام پاک میں ایک اور خوبی ہے۔ باقی اوراد کو جب تک آدمی سمجھ کر نہیں پڑھے گا، اُس کا اثر نہیں ہوگا، مگر کلام الہی ایسی چیز ہے۔ کہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، اس کا فائدہ ہر حالت میں ہوگا، نیز علمی لحاظ سے بھی یہ بہت بلند کتاب ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ بسا اوقات جب میں غور کرتا ہوں، تو قرآن پاک کی ہر ہر آیت میں مجھے علم و عرفان کے اتنے وسیع خزانے نظر آتے ہیں جیسے سمندر کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ حقائق و دقائق کے لیے بحر بیکراں نظر آتے ہیں، جن کا کوئی ساحل نہ ہو۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو بلند درجے کی دعات والے انسان تھے، امام اور محدث تھے، انہیں تو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک بھی ہے، کہ قرآن پاک ایسا کلام ہے کہ لا تَنْقُضُ عَجَائِبُہُ کہ اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ یہ ابد الابد تک قائم رہیں گے۔ یہ کلام الہی ہے۔ خدا کی صفت ہے۔ چونکہ خدا غیر محدود ہے، اس کا کلام بھی غیر محدود ہے۔ اس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ اس کی مہربانی ہے۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز پر اتنا راضی نہیں ہوتا، جتنا بندے کی زبان سے اپنا کلام سُن کر۔ تو گویا اس میں ایک تو دردِ والی خصوصیت پائی جاتی ہے اور دوسرے علمی خصوصیت جس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ نہ تو دردِ والے طبقے سے ملتا ہے اور نہ مطالعہ والی اور دیکھنے والی کتاب سے۔ بلکہ تمام کی خصوصیت خود اس میں پائی جاتی ہیں، اسی لیے فرمایا کہ ہم نے ایک ایسا عجیب قرآن سنا جو یٰہْدِیْ اِلَی الرُّشْدِ نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ فَاٰمَنَّا بِہِ لَمَّا ہَمَّ سِنَتْہِ ہِی اِس پر ایمان لے آئے۔

اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک ہے

ایمان لانے کے بعد جنات نے اقرار کیا کہ وَلٰکنْ تَشْرِکُ بِرَبِّنَا اَحَدًا ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے۔ اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک ہے وَاِنَّہٗ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا اور بیشک ہمارے رب کی شان بلند ہے۔

جد کا لفظ مشترک ہے۔ اس کا معنی داد بھی ہوتا ہے اور کوشش بھی۔ اسی طرح جد کا معنی بخت بھی ہوتا ہے اور عظمت و بڑائی بھی۔ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معانی بھی ہوتے ہیں جو اپنے اپنے محل پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس موقع پر عظمت اور بڑائی مراد ہے، یعنی ہمارے رب کی شان اور مرتبہ بڑا بلند ہے۔

جنات نے اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت یہ بیان کی مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا یعنی اُس کی نہ کوئی بیوی ہے اور نہ اولاد ہے۔ بیوی تو ضرورت کے لیے ہوتی ہے، مگر خدا تعالیٰ صمد ہے۔ اُسے کوئی ضرورت نہیں۔ اولاد کی خواہش اس لیے ہوتی ہے کہ بڑھاپے میں کام آئے گی اور میرے بعد میری قائم مقام ہوگی۔ مگر اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔ وہ غنی ہے وہ نہ حاجت مند ہے، نہ محتاج۔

جنات نے مزید بیان کیا وَاِنَّکَ کَانَ یَقُوْلُ سَفِیْہُنَا عَلٰی اللّٰہِ شَطَطًا یعنی ہم میں سے بیوقوف شخص اللہ پر بڑی زیادتی کی بات کرتا ہے۔ کوئی کہتا ہے اللہ نے بیوی بنالی، کوئی کہتا ہے، بیٹا بنالیا۔ کوئی اُس کا شریک ٹھہراتا ہے۔ کوئی اس کا سہم بناتا ہے، یہ سب بیوقوفی کی باتیں ہیں، کیونکہ

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے **وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ سَفِهَ نَفْسَهُ** یعنی ملت ابراہیمی سے صرف وہی اعراض کرتا ہے جس نے اپنے آپ کو احمق بنالیا ہے جو کہنا ہے کہ اللہ کا شریک ہے یا اُس کے بیوی بچے ہیں وہ فطرت کے خلاف گیا۔

جنات نے یہ بھی واضح کیا **وَ اَنَّا ظَنَنَّا اَنْ لَّنْ نَّقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اللّٰهِ كَذِبًا** یعنی ہم گمان کرتے تھے کہ انسان اور جن سارے کے سارے خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بولیں گے۔ لیکن اب پتہ چلا کہ انس و جن واقعی جھوٹ بولتے ہیں۔ شرک اور کفر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کوئی اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک ٹھہراتا ہے کوئی عبادت میں اور کوئی استعانت میں غیروں کو شریک بناتا ہے۔ یہ سب جھوٹ بولتے ہیں۔

وَإِنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ
رَهَقًا ۝ ۶ ۚ وَإِنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا ظَنَنْتُمْ أَن لَّنُ يَّبْعَثَ اللَّهُ
أَحَدًا ۝ ۷ ۚ وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَا مُلْأَتْ حَرَسًا
شَدِيدًا وَشُهَبًا ۝ ۸ ۚ وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ
فَمَن يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ ۹ ۚ وَأَنَّا لَا نَدْرِي
أَشْرَأُ رَيْدٍ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝ ۱۰ ۚ
وَأَنَّا مِنَّا الصَّالِحُونَ وَمِمَّا دُونَ ذَلِكَ كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا
۝ ۱۱ ۚ وَأَنَّا ظَنَنَّا أَن لَّنْ نَّعْجِزَ اللَّهَ فِي الْأَرْضِ وَلَنَ لَّعُجْزُهُ
هَرَبًا ۝ ۱۲ ۚ وَأَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدَىٰ أَمْنًا بِهِ ط فَمَن
يُؤْمِنُ بِرَبِّهِ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا ۝ ۱۳ ۚ وَأَنَّا
مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِمَّا الْقَاسِطُونَ ط فَمَن أَسْلَمَ فَأُولَٰئِكَ
تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝ ۱۴ ۚ وَأَمَّا الْقَاسِطُونَ فَكَالُوا لِجَهَنَّمَ
حَطَبًا ۝ ۱۵ ۚ

ترجمہ: اور یہ بات بھی ہے کہ کچھ مردانوں میں سے پناہ پکڑتے تھے جنوں میں سے
کچھ مردوں کے ساتھ پس بڑھا دیا۔ انہوں (انسانوں) نے اُن کے لیے سرکشی کو ۶
— اور اسی طرح جنات نے بھی خیال کیا جس طرح تم نے خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ
مرنے کے بعد ہرگز کسی کو نہیں اٹھائے گا ۷ اور بیشک ہم نے آسمان کو چھوا
تو اسے ہم نے سخت پیریاہوں اور شہابوں سے بھرا ہوا پایا ۸ اور بیشک ہم پہلے
بیٹھا کرتے تھے آسمان کے ٹھکانوں میں باتیں سننے کیلئے پس اب جو کوئی بات سنتا ہے
تو وہ اپنے گھات میں شہاب کو موجود پاتا ہے ۹ اور بیشک ہم نہیں جانتے کہ
زمین والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا گیا ہے، یا ان کے پروردگار نے ان کے ساتھ

بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے ⑩ اور بیشک ہم میں نیکو کار بھی ہیں اور اس کے علاوہ (یعنی بدکار) بھی ہم مختلف راستوں پر بٹے ہوئے تھے ⑪ اور بیشک ہم نے اب یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو زمین میں ہرگز عاجز نہیں کر سکتے اور نہ ہم کہیں بھاگ کر اللہ تعالیٰ کو عاجز کر سکتے ہیں ⑫ اور جو نبی ہم نے ہدایت کی بات سنی، فوراً اس پر ایمان لے آئے، پس جو اپنے رب پر ایمان لے آئے گا وہ کسی نقصان کا خوف نہیں کھائے گا، اور نہ اس کو کسی زبردستی کا کھٹکا ہوگا۔ ⑬ اور بیشک ہم میں سے فرمانبردار بھی ہیں اور بے انصاف بھی۔ پس جس نے فرمانبرداری کی تو انہوں نے نیکی کی راہ تلاش کر

لی ⑭ اور جو بے انصاف ہیں وہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے ⑮

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے جنوں کے ایمان لانے کا ذکر کیا۔ کہ انہوں نے حضور علیہ السلام سے نماز کی حالت میں قرآن پاک سنا اور کہنے لگے بے شک ہم نے عجیب قرآن سنا ہے جو نیکی کے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ لہذا ہم اس پر ایمان لائے ہیں ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے۔ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ بیوی اور اولاد سے پاک ہے۔ اُس کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور ہم میں سے بے وقوف لوگ اللہ کے بارے میں زیادتی کی باتیں کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ انسان اور جن خدا پر جھوٹ نہیں بولتے ہوں گے مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں خدا کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ سب باتیں جنوں کے اس گمراہ نے کہیں جو ایمان لایا۔

جنت استعلاؤہ

اس درس کی آیات میں جنات کا کلام ہی دہرایا جا رہا ہے۔ یعنی انہوں نے یہ بات بھی کی، وَإِنَّكَ كَانِ رِجَالًا مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ یعنی یہ بات بھی ہے کہ کچھ مرد انسانوں میں سے پناہ پکڑتے تھے جنوں میں سے کچھ مردوں کے ساتھ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا پس زیادہ کیا ان انسانوں نے ان کے لیے سرکشی کو۔ رَهَق کا معنی ہے زیادتی اور اس سے مراد نافرمانی اور سرکشی ہے، یعنی ان آدمیوں نے ان جنات کو اور زیادہ سرکشی میں ڈال دیا۔ یا ان جنات نے ان آدمیوں کو اور زیادہ سرکشی میں مبتلا کر دیا۔ تو گویا زَادُوهُمْ کی ضمیر جنوں اور انسانوں دونوں کی طرف لوٹ سکتی ہے۔ اگر یہ انسانوں کی طرف منسوب کی جائے تو معنی یہ ہوگا کہ وہ فائسے کی بجائے زیادہ خسلے میں مبتلا ہوئے۔ جیسے أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ یا وَالْكَٰفِرُونَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ

يَا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ” خدائے میں اس وجہ سے کہ شرک میں مبتلا ہوئے۔ اور ان کے علاوہ جنات کو بھی خدا کا شریک بنایا۔ لہذا بڑے خدائے میں ہے۔

اگر زاد و فہم کو جنات کی طرف منسوب کیا تو معنی یہ ہوگا کہ انسانوں نے جنات کی تعاقب و استعاذہ پکڑ کر اور زیادہ سرکشی میں مبتلا کر دیا جن اور زیادہ مغرور ہو گئے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان ہم سے ڈرتے ہیں ہمارے ساتھ استعاذہ کرتے۔ ہمارے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں۔ ہمارے نام کی نذر کرتے ہیں۔ لہذا ان میں اور زیادہ اکثر پیدا ہو گئی۔ اور وہ اور زیادہ سرکشی میں مبتلا ہو گئے۔

اس قسم کا استعاذہ ناجائز اور شرک ہے۔ کوئی بتی وغیرہ جلا کر جنات کو بلاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے نذر و نیاز کرتے ہیں۔ بعض لوگ مکان یا کارخانہ بناتے وقت اس کی بنیادوں میں خون ڈالتے ہیں۔ اس میں یہی تصور کارفرما ہوتا ہے کہ جنات راضی ہوں اور ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ پرانے زمانے میں عرب کے مشرکین اس قسم کا استعاذہ کرتے تھے۔ یہ سب شرک اور کفر ہے۔

پناہ پکڑنے کی کئی صورتیں تھیں جو آج بھی رائج ہیں۔ منجملہ ان کے جب کوئی بیمار ہو جاتا تھا، تو جنات سے مدد طلب کرتے تھے۔ اگر آئندہ کی کوئی بات معلوم کرنا ہوتی تو کاہنوں کے پاس جا کر جنات سے معلوم کرتے۔ گویا کہ وہ غیب دان ہیں۔ اسی طرح سفر کے دوران اگر کسی جگہ اقامت کرتے تو اس طریقہ سے پناہ پکڑتے اَعُوْذُ بِسَيِّدِ هٰذَا الْوَادِيْ یعنی میں اس وادی کے سردار کے ساتھ پناہ پکڑتا ہوں۔ تاکہ جنات وغیرہ نقصان نہ پہنچائیں گویا ہر جگہ جنات ہوتے ہیں، ان کا سردار ہوتا ہے۔ اگر اُس کی پناہ میں آجائیں گے تو شر سے محفوظ رہیں گے۔ ورنہ تکلیف ہوگی۔ مکانات کی بنیادوں میں جانوروں کا خون ڈالنا، جنات کو قربانی پیش کرنا ہے۔ تاکہ وہ خوش ہوں اور ہماری عمارت صحیح سلامت ہے۔ آج بھی بعض لوگ یہ تصور رکھتے ہیں کہ جنات مشکل کشائی کرتے ہیں اور یہ کہ مصیبت کے وقت پہنچتے ہیں۔ یہ سب مشرکانہ عقائد ہیں۔ اسلام نے اسے باطل قرار دیا ہے۔ نہ تو جنوں کے ہاتھ میں شفا ہے۔ نہ وہ غیب دان ہیں اور نہ وہ مشکل کے وقت کام آتے ہیں نہ آسکتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص چل کر کسی جگہ ٹھہرتا ہے۔ اگر وہ ان الفاظ کے ساتھ استعاذہ کرے گا تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ

استعاذہ کا بال طریقہ

استعاذہ کا صحیح طریقہ

مِنْ شَيْءٍ مَا خَلَقَ یعنی میں اللہ تعالیٰ کے کلمات نامہ کے ذریعے پناہ چاہتا ہوں ہر اُس چیز کے شر سے جسے اللہ نے پیدا کیا۔ یہ چیز جن ہو یا کچھ اور ہو، ان کے شر سے حفاظت کے لیے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔ یہ استعاذہ کا صحیح طریقہ ہے۔ جس کی تعلیم حضور علیہ السلام نے دی۔

حضرت سعید ابن جبیر کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت مافع ابن عمیرؓ کا اس وقت کا واقعہ ہے جب انہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ کہیں بیابان میں سفر پر تھے۔ ایک اونٹنی بھٹی اور خود تھے۔ اور کوئی ساتھ نہیں تھا۔ رات ہوئی تو اونٹنی کا گھٹنا باندھ دیا اور خود لیٹ گئے۔ خواب میں دیکھا کہ ایک شخص نیزہ پکڑے آرہا ہے۔ اور اونٹنی کو مارنا چاہتا ہے۔ گھبرا کر اٹھے۔ خیال کیا کہ یہ خواب ہے۔ لہذا پھر سو گئے۔ دوبارہ وہی خواب دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ اٹھ کر دیکھا تو واقعی ایک آدمی نیزہ پکڑے ہوا تھا اور وہ اونٹنی کو مارنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی بھی تھا، وہ نوجوان کو روکتا تھا کہ اونٹنی کو مت مار۔ اتنے میں تین خرگوش یا گور خر سامنے آئے۔ تو بوڑھا آدمی کہنے لگا کہ ان میں سے کوئی لے لو اور اس شخص کی اونٹنی کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ چنانچہ اُس جوان آدمی نے ایک گور خر لے لیا۔ اور چلا گیا۔

در اصل حضرت مافع بن عمیرؓ نے اُس مقام پر قیام کرتے وقت وہی کلمہ کہا تھا جو مشرکین کہتے تھے یعنی اَعُوْذُ بِسَيِّدِ هٰذَا الْوَادِيْ۔ گویا جہات کی پناہ پکڑی تھی۔ جب وہ جوان آدمی گور خر لے کر چلا گیا تو اُس بوڑھے نے حضرت مافعؓ سے کہا کہ بیوقوف آدمی، تم نے سوتے وقت جنوں سے استعاذہ کیا تھا۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، بلکہ یوں کہتے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرَبِّ مُحَمَّدٍ یعنی اے پروردگار! میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رب کے ساتھ پناہ پکڑتا ہوں تاکہ مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ حضرت مافعؓ نے پوچھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں۔ بوڑھا آدمی بولا کہ وہ نبی ہیں۔ ان کا دور آگیا ہے، وہ شرک سے منع کرتے ہیں۔ اور تم نے تو کفر و شرک کی بات کی تھی۔ یہ کہہ کر بوڑھا شخص بھی غائب ہو گیا۔ وہ جن ہی تھا۔

حضرت مافعؓ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ میں اونٹنی کو تیز تیز چلاتا ہوا شراب پہنچا۔ حضور علیہ السلام اُس وقت مدینہ میں تشریف فرما تھے۔ اللہ تعالیٰ نے میرا واقعہ میرے پہنچنے

سے پہلے ہی حضور علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتلادیا چنانچہ جب میں حاضر خدمت ہوا، تو آپ نے انکشاف فرمایا کہ تمہارے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ تو اس طرح حضرت رافع بن عمرؓ اسلام سے مشرف ہوئے (شاہ عبدالعزیزؒ اور امام بیہقیؒ نے اور بھی ایسے کئی واقعات بیان کیے ہیں۔

حضرت عثمانؓ کا واقعہ بھی بیان ہوا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں جب وہ شام کا سفر کرتے تھے تو وہاں کسی کاہن سے غیب کی خبریں دریافت کیا کرتے تھے۔ اب کی بار بھی گئے تو کاہن کے پاس پہنچے۔ اس کی فیس دی اور اُس سے بعض واقعات پوچھے۔ تو کاہن کہنے لگا کہ اب وہ کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ جو جن میرے پاس آیا کرتا تھا، وہ اب نہیں آتا۔ جب میں نے اُس سے پوچھا کہ اب کیوں نہیں آتے تو اس جن نے بتایا کہ اب بنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہو گئے ہیں۔ اور اب ہمارے لیے کوئی ایسی بات کرنا ممکن نہیں رہا۔

بہر حال وہ لوگ جنات سے استعاذہ کرتے تھے، جو کہ کفر ہے۔

جنات کے بیان کا سلسلہ جاری ہے۔ وَأَنَّهُمْ خُفُّوا كَمَا ظَنَنْتُمْ جس طرح تم خیال کرتے ہو، اسی طرح جنات نے بھی خیال کیا أَنَّ لَّنْ يَبْعَثَ اللَّهُ أَحَدًا کہ اللہ مرنے کے بعد کسی کو نہیں اٹھائے گا۔ یعنی جس طرح انسانوں میں سے بھی بعض لوگ قیامت کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی قیامت نہیں۔ مرنے کے بعد کوئی نہیں اٹھایا جائے گا۔ اسی طرح بعض جنات بھی قیامت کا انکار کرتے ہیں۔

لَّنْ يَبْعَثَ اللَّهُ أَحَدًا کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کسی کو رسول نہیں بنائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح بعض کافر انسان بھی رسالت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مَا أَنزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ یعنی خدا تعالیٰ نے کسی انسان پر کوئی وحی نازل نہیں کی۔ ہم نہیں مانتے کہ انسانوں میں بھی کوئی رسول مبعوث ہوتا ہے۔ اسی طرح جنات میں بھی اس قسم کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح انسانوں میں منکرین قیامت اور منکرین رسالت ہیں اسی طرح جنوں میں بھی ہیں۔

جنت پرستی

اپنی بات کے اگلے حصے میں جنات نے اُن پابندیوں کا ذکر کیا ہے جو حضور علیہ السلام کی بعثت کے بعد اُن پر عائد کی گئیں۔ ارشاد ہے کہ جنوں نے کہا وَإِنَّا لَمُسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلْتَأَ حَرَسًا شَدِيدًا وَشُهَبًا۔ یعنی ہم نے آسمانوں کو چھوا تو اسے ہم نے پیریداروں اور شہابوں سے بھرا ہوا پایا۔ وَإِنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ اور ہم سننے کے لیے ٹھکانوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ فَمَنْ يَسْمَعُ الْإِنِّ يَجِدُ لَهُ شُهَابًا رَّصَدًا مگر اب صورت حال یہ ہے کہ جو کوئی بات سنتا ہے وہ اپنے گھات میں شہاب کو موجود پایا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی بعثت سے قبل شیاطین یا جنات آسمان میں بندی پر جلتے تھے۔ اس کے لیے غنائ کا لفظ آتا ہے۔ تو وہاں پر جو فرشتے اترتے تھے وہ آپس میں مکالمہ کرتے تھے۔ جنات اور شیاطین میں کوئی فرشتوں کی کوئی بات سنتا تھا اور اس میں کچھ جھوٹ وغیرہ ملا کر اپنے کاہن کے کان میں پھونک دیتا تھا۔ مگر حضور علیہ السلام کی بعثت کے بعد پیرے سخت کر دیے گئے۔ اب جو کوئی آگے جاتا تھا تو بڑے زور سے شہاب پڑتے تھے۔ کوئی بھاگ جاتا، کوئی زخمی ہو جاتا، کوئی مر جاتا۔ اس صورت حال کی تحقیق کے لیے جنوں کا گروہ وادی تھلمہ میں سے گزر رہا تھا۔ کہ حضور علیہ السلام سے قرآن پاک سنا، تو سمجھ گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ اور اُن کے اوپر آسمان کی طرف جانے پر کیوں پابندی لگ گئی ہے۔ الغرض ان آیات میں جنات نے اپنی اس حالت کا تذکرہ کیا ہے

جنت میں فرقہ بندی

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جس قدر فرقے انسانوں میں موجود ہیں، اسی قدر جنات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً انسانوں میں رافضی اور شیعہ ہیں۔ تو جنات میں بھی ایسے ہی ہیں۔ اسی طرح انسانوں میں مجوسی اور پارسی ہیں اور پھر فروعی اختلافات ہیں تو جنات میں بھی ہیں۔

انسانوں کی طرح جنوں میں بھی غیر مقلد یعنی اہل حدیث، حنفی، مالکی، بریلوی، دیوبندی وغیرہ سب فرقے موجود ہیں۔ پہلے بھی ایسے فرقے تھے اور آج بھی ہیں۔ جیسا کہ انسانوں میں کوئی نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے، جنات میں بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا ہے۔ لہذا اگر کسی کو اس قسم کی کوئی بات معلوم ہو جاتے تو استعجاب کی بات نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے سادہ جنات کا کلام نقل کیا ہے۔

انسانوں کی طرح جن نیک بھی ہیں اور بد بھی ہیں۔ مطیع بھی ہیں اور نافرمان بھی ہیں، قاتل اور زانی وغیرہ ہر قسم کے جنات پائے جاتے ہیں۔ اخلاقی لحاظ سے بھی انسان جنوں کے مشابہ ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے جنات کے کاروبار بھی انسانوں کی مانند مختلف ہیں، مثلاً تاجر پیشہ، کاشتکار، صنّاع، کوئی ایک جگہ مقیم ہے کوئی سفر کرتا ہے۔ وَإِنَّا لَأَنذَرِي أَشْرَارٍ مِّمَّنْ فِي الْأَرْضِ أَمَّا رَادِبُهُمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا اور بے شک ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ

برائی کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے

انہیں مختلف کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے جنات نے کہا وَإِنَّا مِّنَا الصَّالِحُونَ وَمِمَّا دُونَ ذَلِكَ یعنی ہم میں نیکو کار بھی ہیں اور اس کے علاوہ یعنی بدکار بھی۔ كُنَّا صَرَافِيْنَ قَدَدًا ہم مختلف راستوں پر بٹے ہوئے تھے۔ کوئی نیک اور شائستہ، کوئی بُرے اور بدکار، کوئی ناہنجار، کوئی مشرک، کوئی مومن، کوئی عیسائی، کوئی یہودی، کوئی رافضی الغرض انسانوں کی طرح مختلف جماعتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔

جناتی حق شناسی

اور آخر کار جنات کو اقرار کرنا پڑا وَإِنَّا ظَنَنَّاهُ أَن لَّنْ نُّعْجِزَ اللَّهَ فِي الْأَرْضِ۔ کہ ہم اللہ تعالیٰ کو زمین میں عاجز نہیں کر سکتے وَلَكِنْ نُّعْجِزُهُ هَرَبًا۔ اور نہ ہم بھاگ کر اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم کہیں بھاگ کر اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ جائیں ہم تو ہر وقت خدا کے قبضے میں ہیں، وہ جب چاہے ہمیں پکڑ لے، سزا دے۔ گرفت کرے یا ہلاک کر دے، یہ سب اس کے قبضہ قدرت میں ہے لَنذَاقُهَا وَإِنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدَىٰ آمَنَّا بِهِ جو ہم نے ہدایت کی بات سنی، فوراً ایمان لے آئے۔ ہمارے لیے یہ چیز قابلِ فخر ہے۔ کہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ اور ایمان لا کر داعی بن گئے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہم کلام بھی نہیں ہوئے، محض کلام پاک سن کر ایمان کی دولت سے مشرف ہو گئے۔

جنات کے اس طریقے سے ایمان لانے کا اطلاق عام انسانوں اور خاص طور پر میکے کے لوگوں پر ہوتا ہے۔ کہ جنات تو قرآن پاک سن کر ایمان لے آئے مگر یہ انسان ہیں کہ قرآن پاک سنتے ہیں مگر اُس پر ایمان نہیں لاتے۔ اس بات میں اُن کے لیے تذبذب کا پہلو ہے۔ کہ ان کا بھی فرض ہے کہ وہ فوراً ایمان لے آئیں۔ اور اُس کا فائدہ یہ ہوگا۔ فَمَنْ يُؤْمِنْ بِرَبِّهِ فَلَا يَحْزَنُ

یعنی جو اپنے رب پر ایمان لے آئے گا، وہ کسی نقصان کا خوف نہیں کھائے گا۔ وَلَا رَهَقًا
اور نہ اس کو کسی زبردستی کا کھٹکا ہوگا۔ یعنی اس پر کوئی زیادتی کی جائے۔ یا اُس کی محنت لڑیگاں
جائے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ اُسے کسی دوسرے کے جرم میں پھانس لیا جائے۔
یا کسی ناکردہ گناہ میں ملوث کر لیا جائے۔ اگر ایمان لے آیا ہے۔ تو اُسے اُس کا پھل ضرور ملے گا۔

اس کے بعد جنات نے مزید بیان کیا وَأَنَّا مِنَ الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ ط

اور بے شک ہم میں سے فرمانبردار بھی ہیں اور بے انصاف بھی ہیں۔ قاسط کا معنی ظلم کرنے والا
بے انصاف فَمَنْ أَسْلَمَ فَأُولَٰئِكَ تَحَرَّوْا شَرًّا۔ پس جس نے فرمانبرداری اور اطاعت
کی، انہوں نے نیکی کو حاصل کر لیا۔ تحری کا معنی کوشش کرنا، جانفشانی کرنا اور حاصل کرنا ہے۔
گر یا اطاعت کر کے انہوں نے نیکی کے راستہ کو تلاش کر لیا۔ وَأَمَّا الْقَاسِطُونَ اور جو کفر و شرک
کرنے والے ہیں۔ گناہ اور ظلم میں آلودہ ہے۔ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا۔ وہ دوزخ کا
ایندھن بنیں گے۔ یعنی جنات نارہمی ہونے کے باوجود دوزخ میں جائیں گے۔ اور اُن کو بھی
وِسی ہی سزا ملے گی جیسی انسانوں کو

اس موقع پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے۔ کہ جنات تو نارہمی مخلوق ہے۔ اُن کو آگ میں
ڈالنے سے انہیں کیا سزا ملے گی۔ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے۔ کہ جنات کی
پیدائش کی آگ اور دوزخ کی آگ کے ٹپتر پچر میں بہت زیادہ فرق ہوگا۔ دوزخ کی آگ بہت سخت
ہے۔ اس لیے نارہمی مخلوق کو اس دوزخ کی آگ میں تکلیف پہنچے گی۔ دوسری بات یہ ہے۔ کہ
جہنم کے مختلف طبقات ہیں اور اُن میں ایک طبقہ زہریہ ہے جو کہ بہت سرد ہے۔ لہذا یہ بھی
ممکن ہے۔ کہ جنات جیسی نارہمی مخلوق کو زہریہ میں پھینک دیا جائے تاکہ اُن کو سرد مقام پر سزا
دی جاسکے۔ بہر حال شرک اور کفر کرنے والے جنات دوزخ میں جائیں گے چاہے وہ نار کے طبقہ
میں ہوں یا زہریہ کے طبقہ میں۔ اُن کو سزا ہر حالت میں ملے گی۔

وَأَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَأَسْقِينَهُمْ مَّاءً غَدَقًا ۝۱۶ لِنَقِيتَهُمْ
فِيهِ ۖ وَمَنْ يُعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۝۱۷
الْمَسْجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا ۝۱۸ وَآلَهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ
يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۝۱۹ قُلْ إِنَّمَا أَدْعُوا رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ
بِهِ أَحَدًا ۝۲۰ قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا ۝۲۱ قُلْ
إِنِّي لَنْ يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ ۖ وَلَنْ أَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۝۲۲
إِلَّا بَلَاغًا مِّنَ اللَّهِ وَرِسَالَاتٍ ۖ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ
خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۝۲۳

ترجمہ :- اور اگر یہ لوگ سیدھے رہتے رہتے پر، البتہ ہم ان کو دافر پانی سے سیراب کرتے ۱۶
تاکہ ہم اس میں ان کی آزمائش کریں اور جو شخص اپنے رب کے ذکر سے اعراض کرے گا
اللہ تعالیٰ اس کو سخت عذاب میں چلائے گا ۱۷ اور بیشک مسجدیں اللہ تعالیٰ کے لیے
ہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو مت پکارو ۱۸ اور بیشک جب کھڑا ہوا اللہ تعالیٰ
کا بندہ اللہ تعالیٰ کو پکارنے کے لیے قریب تھا کہ یہ لوگ ہجوم کر کے اس کے گرد
اکٹھے ہو جائیں ۱۹ اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے بیشک میں اپنے
رب کو پکارتا ہوں اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا ۲۰ آپ کہہ
دیجئے (اے لوگو) میں تمہارے لیے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں ۲۱ آپ
کہہ دیجئے کہ بیشک مجھے خدا کے سامنے ہرگز کوئی بھی پناہ نہیں دے گا اور میں خدا
کے سوا ہرگز کوئی جائے پناہ نہیں پاتا ۲۲ مگر میرے ذمہ اللہ تعالیٰ کی طرف
سے پہنچانا اور اس کے پیغامات ادا کرنا ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول
کی نافرمانی کرے گا۔ پس بیشک اس کے لیے جہنم کی آگ ہے ہمیشہ ہمیشہ اس میں

گزشتہ سیرت

گزشتہ درس تک کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جنات کا کلام دہرایا تھا۔ نبی علیہ السلام کو ارشاد ہوا کہ آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے کلام الہی سنا اور کہا کہ ہم نے تو عجیب قرآن سنا ہے۔ لہذا ہم ایمان لاتے ہیں۔ جنات انسانوں کے بارے میں اور خود جنوں کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ شاید وہ جھوٹ نہ بولتے ہوں، مگر معلوم ہوا کہ وہ دونوں ہی جھوٹ بولتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں۔ شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد آسمانوں پر جا کر فرشتوں کی بات چیت سننے کا ذکر تھا۔ اور پھر اُس رکاوٹ کا ذکر تھا جو شہاب پڑنے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ یہ سب حضور علیہ السلام کی بعثت اور نزول قرآن پاک کی وجہ سے تھا۔ جنات نے خود اقرار کیا کہ اُن میں نیک بھی ہیں اور بد بھی۔ دوسری مخلوقات کی طرح جن بھی عاجز ہیں اور اُن میں ایسی کوئی خوبی نہیں، جس کی وجہ سے اُن کی پرستش کی جائے یا اُن کے ساتھ استعاذہ کیا جائے۔

جنوں نے کہا کہ قرآن کریم سننے کے بعد ہم ایمان لے آئے اور جو ایمان لائے گا۔ وہ کامیاب ہوگا۔ اُسے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ اور اُس پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ جنات میں فرمانبردار بھی ہیں، اور نافرمان بھی۔ جو فرمانبردار ہی کرتے والے ہیں، انہوں نے نیکی کو تلاش کر لیا۔ اور جو ظلم کرنے والے بے انصاف ہیں، وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

صرط مستقیم پر چلنے والوں کے لیے الغات

یہاں تک جنات کا کلام تھا جو اللہ جل شانہ نے ذکر فرمایا اور اُن کا حال بذریعہ وحی اپنے پیغمبر علیہ السلام کو بتلادیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے۔ وَإِنْ لَّوِ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَأَسْقِينَهُمْ شَرَابًا تَدْفَقُ۔ یعنی اگر یہ لوگ سیدھے راستے پر، تو ہم ان کو خوب پانی سے سیراب کریں گے۔ لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ تَاكُمُ اسْمِ اسْمِ ان كِي اَزْمَالَش كَرِيں وَمَنْ بُعْرَضُ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ يَسُدُّ كُهُ عَذَابًا صَعَدًا اور جو شخص اپنے رب کے ذکر سے اعراض کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اُس کو سخت اور دشوار عذاب میں چلائے گا۔

وَإِنْ لَّوِ اسْتَقَامُوا کا تعلق اوجھل الی س سے ہے۔ یعنی اے پیغمبر علیہ السلام آپ کہہ دیں کہ میری طرف اس بات کی بھی وحی کی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ سیدھے — ہے یعنی اس راستے پر الطَّرِيقَةُ الْمَرْضِيَّةُ عِنْدَ اللَّهِ جو اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ راستہ ہے، توحید کا راستہ اور صراط مستقیم ہے

تو ہم انہیں بہت سے پانی سے سیراب کریں گے۔

اِسْتَقَامُوا کا تعلق انسان کے ساتھ بھی ہے اور جنوں کے ساتھ بھی۔ یعنی اگر انسان اور جن اللہ کے پسندیدہ راستے پر قائم رہے تو اللہ تعالیٰ اُن کے رزق میں فراوانی فرمائیں گے۔ اور اُن سے تکلیف کو دور فرمائیں گے۔ مَاءٌ عَذَقًا کا معنی کثیر پانی ہے مگر یہاں صرف پانی ہی مراد نہیں بلکہ ہر قسم کے رزق کی وسعت مراد ہے۔ جس میں پانی بھی ایک اہم جزو ہے۔ کیونکہ پانی ہر جاندار کے لیے عظیم نعمت ہے۔ الغرض ایمان اور اطاعت کا راستہ اختیار کرنے والوں کے لیے اس آیت میں ظاہری اور باطنی انعامات کی خوشخبری ہے۔

اگلی آیت کے پہلے حصے میں لِنَفْتِنَهُمْ فِيْہِ کہہ کر اس بات کی وضاحت فرمادی کہ مذکورہ انعامات ان کی آزمائش کے لیے ہیں۔ کہ حصولِ نعمت پر کون شکریہ بجالاتا ہے اور کون کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہر نعمت میں امتحان کا پہلو ضرور ہوتا ہے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں، مکے میں قحط پڑا ہوا تھا۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ یہ قحط اہل مکہ کے ظلم و شرارت کی وجہ سے ہے۔ جب لوگ نافرمانی کرتے ہیں، تو اس کے اثرات مختلف قسم کی پریشانیوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جن میں قحط سالی، اور پانی کی قلت بھی ہے جس کی وجہ سے انسان، حیوان، چرند، پرند، کیرے، مکوڑے سب تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ لوگ کفر و شرک اور ظلم و شرارت سے باز آجائیں اور اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ راستے پر چلنے لگیں جس طرح جنات کلامِ الہی سن کر راہِ راست پر آگئے۔ تو اللہ تعالیٰ بارانِ رحمت کا نزول فرمائیں گے جس سے زمین کو سرسبز و شاداب کر دیں گے اور قحط کو دور فرما دیں گے۔

اہل انجیل کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہی ارشاد فرمایا تھا کہ اگر یہ اللہ کی کتاب کو صحیح طور پر قائم کرتے تو ہم ان کے لیے ہر طرح سے خیر و برکات نازل فرماتے۔ بعض بستیوں کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ ٹھیک راستے پر چلتے تو ہم ان کے لیے زمین و آسمان سے خیر و برکات نازل فرماتے۔ ان آیات میں بھی یہی اشارہ ہے کہ اے نبی علیہ السلام! آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف یہ حکم بھی

ایسا ہے کہ معصیت اور گناہوں کی وجہ سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، قحط پڑتے ہیں، پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں۔ تو اللہ نے فرمایا کہ ان لوگوں کو میرا یہ پیغام بھی پہنچا دیں کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ راستے پر چلتے ہیں تو ہم ان کو بہت سے پانی سے سیراب کریں گے یعنی اسبابِ رزق کثرت سے مہیا کریں گے۔

یاد الہی سے لعن
کرنے والوں کیلئے وعید

آیت کے دو سکر حصے میں یاد الہی سے اعراض کرنے والوں کے لیے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ وَمَنْ يُعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ جو شخص اپنے رب کی یاد سے روگردانی کرتا ہے۔ یعنی اس کی وحدانیت کا انکار کرتا ہے، اطاعت کے راستے کی بجائے کفر و شرک کے راستے پر گامزن ہوتا ہے، معصیت کا راستہ اختیار کرتا ہے یَسْلُكُهُ عَذَابًا صَعَدًا تو اللہ تعالیٰ اُسے سخت چڑھتے ہوئے عذاب میں چلا تا ہے۔ یعنی آخر کار وہ دشوار عذاب کا شکار بنے گا۔

مساجد میں غیر اللہ کو
پکارنے کی ممانعت

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باتوں کے متعلق ارشاد فرما چکے ہیں۔ کہ آپ ان کا اعلان وحی الہی کے واسطے سے کر دیں۔ ایک یہ کہ جنوں نے قرآن پاک سنا اور ایمان لائے اور دوسری بات یہ کہ اگر لوگ سیدھے راستے پر چلتے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر رزق کی فراوانی فرمائیگا۔ اب تیسری بات یہ فرمائی جا رہی ہے۔ کہ آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ وَإِنَّ الْمَسْجِدَ لِلَّهِ اور مسجدیں اللہ کے لیے ہیں فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا۔ لہذا اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔ لفظ مساجد، مسجد کی جمع ہے اور یہ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مسجد مصدر بھی ہے اور سجدے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہی لفظ سجدہ گاہ کے معنی میں بھی آتا ہے، اور اس سے مراد آلات (اعضاء) سجدہ بھی ہیں اس مقام پر یہ تینوں معنی ہو سکتے ہیں۔ سجدہ گاہ: اگر مساجد سے مراد سجدہ گاہ لیا جائے تو وہ یہی مسجدیں ہیں جن کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا خَيْرُ الْبُقَاعِ الْمَسَاجِدُ یعنی ساری دنیا میں سے زمین کے پسندیدہ ٹکڑے مسجدیں ہیں۔ جہاں عبادت کی جاتی ہے، نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ ویسے تو ساری زمین ہی اللہ کی ہے اَرْضُ كُلِّ لِلَّهِ۔ مگر مساجد کی تعمیر خاص طور پر کی جاتی ہے۔ تاکہ ان میں اللہ کی عبادت کی جائے۔ اور حضور علیہ السلام نے مساجد کی ترغیب بھی دلائی، فرمایا مَنْ بَنَى لِلَّهِ مَسْجِدًا بَنَى اللَّهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ

یعنی جس شخص نے اللہ کے لیے مسجد تعمیر کی، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔

اب یہ مسجدیں جب کہ خالص اللہ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں تو پھر ان مواقع میں کفر و شرک کی بات کرنا نہایت ہی ناپسندیدہ ہے، ویسے تو کفر و شرک کسی مقام پر بھی روا نہیں، مگر اس کا ارتکاب مساجد میں کرنا نہایت ہی قبیح فعل ہے۔ جیسے حرم شریف کے متعلق فرمایا وَمَنْ يُشْرِكْ فِيهِ بِالْحُكْمِ يُخْلِصْهُ نَذْرُهُ مِنْ عَذَابِ إِلَهٍ يَعْنِي جَوْ كَوْنِ حَرَمِ كَے اندر الحاد و کجروی کرے گا، ہم اُس کو دوسرا عذاب دیں گے۔ کیونکہ یہ پاک خطہ ہے، اللہ نے اس کو محترم بنایا ہے۔ بہر حال شرک و کفر تو اللہ کے قدر و غضب کو بھڑکانے والی چیز ہے، مساجد میں مطلقاً معصیت کی بات بھی نہیں ہونی چاہیے۔ مسجدیں اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص ہیں۔

آداب مسجد کے ضمن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جَبُّوا مَسَاجِدَ كُرْصِيَانِكُمْ اپنے چھوٹے بچوں کو مسجدوں سے الگ رکھو کہ وہ بے شعور ہوتے ہیں۔ مسجد میں پیشاب، پاخانہ کریں گے تو بے حرمتی ہوگی۔ اسی طرح پاگلوں کو بھی مسجد میں نہ آنے دو، وہ بھی اس قابل نہیں کہ مسجد کی حرمت بحال رکھ سکیں مسجد میں لڑائی نہ کرو، تلوار مت کھینچو۔ مسجد میں حدودِ دمت جاری کرو کہ ہاتھ کٹے گا، قتل ہوگا تو مسجد آلودہ ہوگی۔ مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان نہ کرو، خرید و فروخت نہ کرو، یہ سب چیزیں مسجد کے آداب کے خلاف ہیں۔

آداب مسجد

اور یہ بھی ارشاد فرمایا نَظَّفُوْهَا یعنی مسجدوں کو پاک صاف رکھو۔ اس میں ظاہری اور باطنی کسی قسم کی گندگی نہیں ہونی چاہیے۔ ظاہری گندگی سے تو مسجد کی پاکیزگی کی کوشش اکثر کی جاتی ہے۔ مگر یہی مساجد باطنی گندگی سے بھری ہوئی ہیں۔ شرک و بدعت، غلط قسم کے وعظ، مساجد میں کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ رسومات باطلہ کی ترغیب دی جاتی ہے، شرک و بدعت کی تعلیم ہوتی ہے، یہ سب ناجائز کام ہیں۔ کیونکہ اَنَّ الْمَسْجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا

مسجد ہے۔ اگر مساجد سے مراد محض سجدہ ہے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ سجدے صرف اللہ کے لیے ہیں، اور کسی کے سامنے سجدہ نہ کرو۔ قطعاً حرام ہے۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سجدہ

سوائے خدا کے کسی کو بھی روا نہیں، نہ سورج کو، نہ چاند کو، نہ مخلوق میں سے کسی اور کو۔ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ۔

الغرض سجدہ صرف اُس ذات کے لیے ہے جو سب کی خالق ہے الَّذِي خَلَقَهُنَّ یہ سجدہ بعض صورتوں میں کفر و شرک بنتا ہے اور بعض صورتوں میں حرام ہوتا ہے اگر تعظیم کا اعتقاد نہ ہو تو اس صورت میں بھی سجدہ حرام ہے۔ بعض قبر کو سجدہ کرتے ہیں۔ بادشاہ، پیر، بزرگ، استاد، باب ہر کسی کو سجدہ حرام ہے۔ سجدہ عبادت تو تمام شریعتوں میں اللہ کے سوا حرام رہا ہے، مگر سجدہ تعظیمی بھی ہماری شریعت میں حرام ہے۔ سجدہ کا مستحق صرف اللہ ہے۔

اعضاء سجدہ۔ مساجد مراد اگر اعضاء سجدہ ہیں تو اعضاء تو سائے اللہ نے ہی پیدا کئے ہیں۔ تو اللہ کے پیدا کردہ اعضاء غیر اللہ کے سامنے کیسے سجدہ ریز ہو سکتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ اُصْرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلَى سَبْعَةِ اَرْبَابٍ۔ یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سات اعضاء پر سجدہ کروں۔ ناک اور پیشانی تو ایک عضو ہی شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دو ہاتھ، دو گھٹنے اور دو پاؤں کل سات اعضاء ہیں جن پر سجدہ کیا جاتا ہے۔ تو اللہ کے پیدا کردہ اعضاء صرف اللہ کے سامنے ہی سجدہ کریں گے۔

غیر اللہ کے پلے رکوع بھی جائز نہیں

ترمذی شریف کی حدیث میں صراحتاً موجود ہے۔ کہ جھک کر ملنا بھی درست نہیں۔ منہ سے سلام کہہ سکتے ہیں، ہاتھ سے مصافحہ درست ہے، معاف کر سکتے ہیں۔

مگر حضور علیہ السلام نے جھک کر ملنے سے منع فرمایا ہے۔ کہ اس طرح رکوع ہوتا ہے سجدہ تو ویسے ہی حرام ہے، مگر یہ جھک کر ملنا بھی مکروہ ہے۔ انحناء کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

بزرگوں کی قبروں کے ساتھ معاملہ

اب حالت یہ ہے بڑی بڑی قبروں پر سجدے ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک صاحب میرے ساتھ الجھڑ گئے۔ تین سال سے زیادہ عرصہ کی بات ہے۔ کہنے لگے کوئی شخص قبر پر سجدہ نہیں کرتا، یہ خواہ مخواہ الزام تراشی ہے۔ چنانچہ میں اُن کو سید علی ہجویریؒ کی قبر پر لے گیا۔ ہم وہاں صرف پانچ منٹ ٹھہرے اور اتنے عرصہ میں سات آدمیوں نے وہاں سجدہ کیا۔ وہ صاحب

کہنے لگے، تم ٹھیک کہتے ہو، واقعی لوگ قبروں پر سجدہ کرتے ہیں۔ وہاں عجیب و غریب حالت ہوتی، کوئی بوسہ دے رہا ہے، کوئی ہاتھ مل رہا ہے، کوئی چادر چڑھا رہا ہے، کوئی نذرانہ پیش کر رہا ہے۔ کوئی کچھ کر رہا ہے کوئی کوئی حرکت کر رہا ہے یہ حکومت کیا کرتی ہے، اُسے کمانی سے غرض ہے، کبھی بیس ہزار روپے کی آمدنی ہے، کبھی چالیس ہزار کی، عرس کے موقع پر لاکھ دو لاکھ یومیہ آمدنی ہوتی ہے۔ محکمہ اوقاف نے کیا اصلاح کی ہے۔ کیا لوگوں کو شرک سے روکا ہے۔ لوگ اسی طرح کفر و شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ حکومت خود بڑے نمونے قائم کرتی ہے۔ پختہ مزار بنائے جاتے ہیں۔ حالانکہ حضور علیہ السلام کا واضح ارشاد موجود ہے اِنَّ يَجْصَصُ الْقُبُورُ قُبُورًا يَنْبَغِي بِنَاؤُهَا، یہ حرم ہے۔ اور شرک کی ترویج کا ذریعہ ہے۔

آپ نے سنا ہو گا کہ پچھلے دنوں ڈیڑھ سو زائرین کا جو وفد اجمیر شریف گیا، وہ مزار پر چڑھنے کے لیے دو لاکھ روپے مالیت کی چادر ہمراہ لے کر گیا۔ آپ ہی بتائیں کہ اس میں کیا ٹمک ہے۔ لوگ بھوکوں میں، کھانے کو کچھ نہ ملے اور آپ دو لاکھ روپے کی چادر چڑھا رہے ہیں۔ یہ کس شریعت میں جاتے ہیں۔ یہ تو کفر و شرک کی بات ہے۔ قبروں پر بے شک جاؤ مگر فاتحہ پڑھنے کے لیے ایصالِ ثواب کے لیے۔ اس کے علاوہ کسی چیز کی اجازت نہیں۔ باقی تمام چیزیں کفر، شرک، بدعت ہیں۔ اس سلسلہ میں حکومت کے وزراء حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ جب حکومت خود چادریں چڑھائیگی تو باقی لوگ کیا کریں گے۔ کیا قبروں پر چادریں چڑھانا دزیروں کا کام ہے۔ کیا عرس کہنا ایڈمنسٹریٹروں کا کام ہے مگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ لوگوں کو توحید کے راستے سے ہٹا کر کفر کے راستے پر ڈالا جا رہا ہے اور حکومتیں سرپرستی کر رہی ہیں۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں بڑی بات کیا ہو سکتی ہے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے پیغمبر علیہ السلام آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے۔ کہ مسجدیں یا سجدے یا اعضاء سجدہ اللہ کے لیے ہیں، لہذا سجدہ سوائے خدا کے کسی کو روا نہیں، اپنی حاجتوں میں صرف خدا کو پکارو۔ اپنی عبادتوں میں صرف خدا کے سامنے ہی جھکو۔ وہی عبادت کا مستحق ہے۔ جب ہم ذاتِ الہی کے لیے اِلَّا کاللفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا معنی ایسی ہوتا ہے

مستحق عبادت صرف اللہ تعالیٰ ہے

کہ مستحق عبادت صرف وہی ہے، اور کوئی نہیں باقی تو ساری مخلوق ہے۔ اور مخلوق ہونے میں سب برابر ہیں۔ تو ایک مخلوق دوسری مخلوق کی معبود کیسے ہو سکتی ہے۔ مخلوق تو عابد ہے اور تم اس کو معبود بنائے ہو۔ کہیں قبر کی پرستش ہو رہی ہے، کہیں پیر صاحب کے سامنے سجدہ ہو رہا ہے۔ کہیں نیاز ہو رہی ہے، چڑھاوا چڑھایا جا رہا ہے۔ دہائی دی جا رہی ہے، کہیں مشکل کشائی کے لیے پکارا جا رہا ہے۔ یہ تمام باتیں مشرکانہ ہیں اور ناجائز ہیں۔ عابد اور معبود میں تفریق لازم ہے۔

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ“ اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ ایسا کون سا انسان ہے جس کی عبادت کی جائے۔ سجدہ ہو یا کوئی عبادت، اس کا مستحق صرف اللہ ہے۔ عبادت کا مفہوم غایت درجے کی تعظیم ہے، یہ قول سے بھی ہوتی ہے اور فعل سے بھی۔ اس کے مختلف طریقے ہیں۔ سجدہ، رکوع، نیاز، انداز سب عبادت میں داخل ہیں۔ اگر کسی افعال غیر اللہ کے لیے کئے جائیں تو شرک ہے۔ شرک کی کم و بیش بیس قسمیں ہیں۔ کتاب دلیل المشرکین میں اس کی تشریح موجود ہے۔ ”اَوْحِيَ اِلَيَّ“ کے سلسلے میں چوتھی بات یہ کہ آپ کہہ دیجئے ”وَ اِنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ“ اور جب کھڑا ہوا اللہ کا بندہ۔ اور اس سے مراد حضور نبی کریم علیہ السلام ہیں۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام نے بھی ثبوت کو اللہ کا بندہ کہا تھا اِلَيَّ عَبْدُ اللّٰهِ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ حضور علیہ السلام نے بھی یہی فرمایا کہ اے لوگو! عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں عیسائیوں نے مبالغہ آرائی کی اور کفر میں مبتلا ہوئے، خبردار! میری تعریف میں مبالغہ آرائی نہ کرو نا اَنَا عَبْدُ اللّٰهِ فَقُولُوا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُولُهُ میں تو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ تم بھی مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہو۔ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا، انہوں نے تعریف و مدح سرائی میں غلو کیا، خبردار! تم ایسا نہ کرنا۔

عبداللہ سے مراد
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

حضور علیہ السلام کا
اعلانِ توحید

تو فرمایا جب اللہ کا بندہ کھڑا ہوا یَدْعُوْهُ اُسے یعنی اللہ تعالیٰ کو پکارنے کے لیے کَا دُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لَبْدًا۔ قریب تھا کہ یہ لوگ اس کے گرد لبدے کی طرح ٹھٹھ بانڈھ کر اکٹھے ہو جاتے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اللہ کا بندہ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب کلام الہی پڑھتا تھا۔ تو لوگ ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہو جاتے تھے۔ مومن تو اس لیے جمع ہوتے کہ آپ کے ساتھ مل کر اللہ کی عبادت کریں اور کفار طعن و تشنیع اور ازیت پہنچانے کے لیے بعض فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جنات کی طرف اشارہ ہے کہ جب آپ وادعی نخلہ میں کھڑے ہو کہ خدا کو پکار رہے تھے تو جنات کی جماعت

حقیقی چچا تھا۔ اُس کے متعلق بھی ارشاد خداوندی ہے ”تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ“ اور ”سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ“ وہ اور اس کی بیوی دونوں دوزخ میں جائیں گے۔ کیونکہ وہ شرک سے باز نہیں آئے۔ ابوطالب نے باوجود حضور علیہ السلام کا وفادار ہونے اور حمایت کرنے کے ایمان قبول نہیں کیا۔ لہذا دوزخ کا شکار ہوا۔ اسی لیے فرمایا کہ میں تمہارے لیے کسی نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ نافع اور ضار ہونا صفتِ خداوندی ہے۔

دنیا میں انسانوں نے کیسے کیسے یہودہ عقیدے بنائے ہوئے ہیں۔ کوئی پیر کے متعلق نفع و نقصان کا عقیدہ رکھتا ہے، کوئی قبر والے کے بارے میں کوئی جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام کے بارے میں، کوئی جنات کے بارے میں تعویذ وغیرہ۔ جلا کر جنات کو طلب کرنا، انہیں مشکل کشائی میں شریک کرنا وغیرہ وغیرہ سب شرکیہ باتیں ہیں کیونکہ نفع و نقصان کا مالک صرف خداوند قدوس ہے۔ اُس کے علاوہ مافوق الاسباب کوئی فریادرس نہیں۔

آج کل تو بچوں کو کیٹ (CAT) میٹ (MAT) ریٹ (RAT) پڑھایا جاتا ہے، پہلے زمانے میں کریم پڑھایا جاتا تھا جو توحید خالص کی طرف راہنمائی کرتا تھا۔

نداریم غیر از تو فریادرس

توئی عاصیاں را خطا بخش و بس

اے مالک الملک! تیرے سوا کوئی فریادرس نہیں ہے، گناہگاروں کے گناہ معاف کرنے والا تو ہی ہے۔ اور کوئی نہیں جیسا فرمایا اَمَّنْ يَجِيبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ اَیْکَ مجبور آدمی کی پریشانی میں جب سائے ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں تو پریشانی کو کون دور کرتا ہے۔ اَللّٰہُ مَعَ اللّٰہِ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ اگر نہیں ہے۔ تو پھر یہ لوگ کیوں شرک میں مبتلا ہیں۔

بنی علیہ السلام کو مزید ارشاد ہوا کہ آپ اس بات کا بھی اعلان کر دیں کہ قُلْ اِلٰہِیْ لَنْ يَّجِیْرَکَ مِنْ اللّٰہِ اَحَدٌ۔ مجھے خدا کے سامنے کوئی بھی پناہ نہیں دے گا اگر میں نے کوئی ایسی کفر و شرک والی بات کی، معصیت کا ارتکاب کیا۔ وَلَنْ اَجِدَ مِنْ دُونِہٖ مُلْتَحِذًا۔ اور میں خدا کے سوا کوئی جائے پناہ بھی نہیں پاتا۔ ہر نبی نے یہی کہا اِلٰہِیْ اَخَافُ اِنْ عَصِیْتُ رَبِّیْ عَذَابُ یَوْمٍ عَظِیْمٍ اگر میں اپنے رب کی ذرا بھی نافرمانی کروں گا، تو بڑے عذاب کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ حضرت

مجاہد کے عمل سے
انبیاء علیہم السلام
بھی متشنی نہیں

شعیب علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور خود حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی کہا تھا کہ خدا کے سوا کوئی پناہ نہیں اور اگر میں کوئی ایسی بات کروں، تو کوئی بچانے والا نہیں۔ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ اگر آپ ذرا بھی شرک کریں گے تو خدا آپ کے سارے اعمال ضائع کر دے گا۔ خدا تعالیٰ باسکل رعایت نہیں کرتا۔ اگر انبیاء علیہم السلام کا یہ حال ہے۔ تو باقی لوگوں کو سمجھ لینا چاہیے۔ کہ اگر وہ شرک کا ارتکاب کریں گے، تو اُن کا کیا حال ہوگا۔ کیا ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ کفر کرنے کے باوجود اللہ کے پیارے ہی رہیں گے اور اُس کے نبی کے مقبول ہی ہوں گے۔

اور ہمیں معافیاں ملتی ہی رہیں گی؟

فرمایا کہ میرا کام تو یہ ہے۔ إِلَّا بِلَاغِ أَهْلِ اللَّهِ وَرِسَالَتِهِ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ ہدایت دینا میرا کام نہیں، نہ میرے بس کی بات ہے۔ کسی کو منزل مقصود تک پہنچانا بھی میرے اختیار سے باہر ہے۔ اور مَنْ لَّعَنَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا۔ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ اس کے لیے جہنم کی آگ ہے خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے لہذا لوگوں کی بھلائی اسی میں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اُسکی وحدانیت کو مان لیں، اس کے رسول کی بات کو بھی تسلیم کریں کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والا اور مادی ہے۔ اور جو اُن کی نافرمانی کرے گا، اُس کے لیے جہنم کی آگ تیار ہے جس سے خلاصی ممکن نہیں۔

نبی کا کام پیغام الہی
پہنچا دینا ہے

حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ فَيَسْئَلُونَ مَنْ أَعْصَىٰ وَاقِلٌ عَدَدًا ۖ
 ۲۴ قُلْ إِنْ أَدْرِيٓٓٓ أَقَرِيبٌ مَّا تُوعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّيٓٓٓ أَمَدًا ۚ ۲۵
 عَلَيْهِ الْغَيْبُ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۚ ۲۶ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ
 فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ۚ ۲۷ لِيَعْلَمَ
 أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رَسُولَاتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ
 عَدَدًا ۚ ۲۸

ترجمہ :- یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے پس یہ لوگ
 اس وقت جان لیں گے کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور تعداد میں کم ۲۴ اے پیغمبر (علیہ السلام)
 آپ کہہ دیجئے میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب
 اس کے لیے مدت دراز بنائے گا ۲۵ غیب کو جاننے والا ہے پس اپنے غیب پر کسی
 کو مطلع نہیں کرتا ۲۶ مگر اپنے رسولوں میں سے جسے پسند کرتا ہے تو اس کے آگے
 اور پیچھے اللہ تعالیٰ چوکیدار بھیجتا ہے ۲۷ تاکہ ظاہر کر دے کہ انہوں نے اپنے رب
 کے پیغامات پہنچا دیے ہیں اور اس نے احاطہ کیا ہے ان کے تمام احوال کا۔ اور اللہ تعالیٰ
 نے ہر چیز کی گنتی کر رکھی ہے ۲۸

گزشتہ سیر پرستہ

ابتداءً سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ میری
 طرف اس بات کی وحی کی گئی ہے کہ جنات کے ایک گروہ نے کلام الہی سنا اور اُس پر ایمان لائے
 اور کفر و شرک سے بیزاری کا اعلان کیا۔ دوسری بات آپ یہ بھی فرمادیں کہ اگر انسان اور جن اللہ تعالیٰ
 کے پسندیدہ راستے یعنی اُس کی وحدانیت عبادت اور اطاعت کے راستے پر رہیں گے تو ہم اُن کے لیے
 وسائلِ رزق کو آسان کر دیں گے۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ آپ یہ بھی کہہ دیں کہ مساجد اللہ کے لیے
 ہیں۔ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، کسی کو نہ پکارو۔

اس کے بعد نبی علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ اللہ کا بندہ جب اُسے پکارنے کے لیے کھڑا ہوا،
 تو یہ لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے، حکم ہوا کہ آپ کہہ دیں کہ میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں، اور اس کے

ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا۔ نیز یہ کہ میں تمہارے لیے نفع، نقصان یا ہدایت کا مالک نہیں ہوں۔ اور اگر میں نے نافرمانی کی تو مجھے ہرگز کوئی پناہ نہیں دے گا اور کوئی نہیں بچائے گا۔ میرا کام تو پیغام الہی کو پہنچانا ہے۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، اس کے لیے نار جہنم کی وعید ہے جس میں ہمیشہ رہے گا۔

نصرت الہی ہی کامیابی کی دلیل ہے

سورۃ کے آخری حصہ میں نبوت و رسالت، اللہ تعالیٰ کی صفات اور قیامت کا ذکر ہے۔ اور ساتھ مشرکین کا شکوہ بھی ہے۔ فرمایا حَتَّىٰ اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فِيْهَا تَمَكَّنْ مِنْهَا فَمَا يَكُنْ لَكُمْ فِيْهَا غَوْلٌ مُّوَعَدٌ۔ یعنی یہ حالت اسی طرح قائم رہے گی، نافرمان لوگ مخالفت کرتے رہیں گے، شرک میں مبتلا رہیں گے، حق سے گمراہ رہیں گے۔ کھٹا مذاق کریں گے، ایذا پہنچائیں گے۔ یہاں تک کہ وعدے کا دن آجائے گا یعنی قیامت برپا ہو جائے گی۔ وعدے کے دن سے مراد یوم الحساب ہی ہے کہ قبرستان کی بعض مسنونہ دعاؤں میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ اَنْتُمْ مَّا تُوْعَدُوْنَ غَدًا تَمُوْعَدُوْنَ یعنی تمہارے پاس وہ چیز اچھی ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اور جس کے لیے مہلت دی گئی تھی۔ تم تو یہاں قبرستان میں پہلے پہنچ چکے ہو اور اِنَّا اَنْشَاءُ اللّٰهُ بِكُمْ لَلْاَحْقُوْنَ ہم بھی تم سے عنقریب ملنے والے ہیں۔ یعنی موت ہر ایک کے لیے برحق ہے۔ اس کے بعد بد مذہب بھی برحق ہے اور پھر جزا و سزا کی منزل بھی برحق ہے جس کے لیے دنیا میں مہلت دی گئی تھی۔ ہر شخص اور ہر قوم کو مہلت دی جاتی ہے، اور اس کے بعد جب وقت آجاتا ہے۔ اِنْ اَجَلَ اللّٰهُ اِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ پھر اس میں تاخیر نہیں ہوتی۔

وعدے والی چیز کا وقوع اجتماعی بھی ہے اور انفرادی بھی۔ اجتماعی طور پر تو قیامت واقع ہوگی جب ہر چیز فنا ہونے کے بعد دوبارہ قائم ہوگی۔ اور انفرادی طور پر یہ وعدہ ہر شخص کی موت پر آجاتا ہے۔ جیسے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے، مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ یعنی جو آدمی مر گیا، اس کی قیامت برپا ہوگئی۔ کیونکہ سوال و جواب کی منزل شروع ہو جاتی ہے۔ محاسبہ کا

عمل بھی جزوی طور پر شروع ہو جاتا ہے اگرچہ مکمل محاسبہ حشر کے دن ہوگا۔ مگر محاسبے کے عمل سے کوئی شخص نہیں بچ سکتا۔ بد زرخ میں ہر ایک کا محاسبہ ہوتا ہے جس میں جزا و سزا کا مکمل احساس ہوتا ہے۔ تو اسی واسطے یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ لوگ مخالفت کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ آجائے وہ چیز جس کا وعدہ کیا گیا ہے فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ أَصْعَفُ نَاصِرًا پس یہ لوگ اس وقت جان لیں گے کہ کس کی مدد کمزور ہے۔ آج تو یہ نبی علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو کمزور سمجھتے ہیں۔ کہ ان کے پاس دنیوی مال و اسباب کی کمی ہے ان کے پاس فوج نہیں ہے، مگر اُس دن پتہ چلے گا کہ کمزور کون ہے وَاقِلْ عَدَدًا اور تعداد میں کون کم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایمان کے بغیر تعداد کی کثرت اور مال و دولت کی فراوانی وبال ہے۔ جیسا کہ سورۃ حاقہ میں گذر چکا ہے کہ انسان کہے كُفِّ اَفْسُوسَ مَلَأَ ہُوا کہے گا مَا اَغْنٰ عَنِّي مَالِیْہٖ افسوس! میرے مال نے مجھے کچھ فائدہ نہ دیا۔ تِزْہَلْکَ عَنِّي سُلْطَانِیْہٖ میری حکومت بھی مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی۔ نہ فوج کام آ سکی۔ نہ پارٹی کا فائدہ ہوا، نہ کثرت تعداد اور کثرت مال مفید ثابت ہوا۔ وہاں پر پتہ چلے گا کہ مدد و نصرت کس کی کام آتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ رَاٰنَا لَنَنْصُرَنَّ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیْوٰۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُومُ السَّعْدُ یعنی ہم اپنے رسولوں اور ایمانداروں کی دنیا میں بھی مدد کرتے ہیں اور قیامت کے دن بھی کریں گے۔ اُس دن ایمان داروں کی مدد اللہ کی جانب سے ہوگی، سب معاملات درست ہو جائیں گے۔ بد خلافت اس کے منکرین کی نہ کوئی جماعت ہے گی، نہ فوج، نہ مال و دولت کام آئے گا۔ چنانچہ اُس دن انہیں معلوم ہوگا کہ مدد کس کی کمزور ہے اور تعداد کس کی کم ہے لہذا دنیا میں اگر حق پرستوں کی حمایت قلیل ہو تو انہیں گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ اللہ کی مدد پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

مشرکین اعتراض کرتے تھے۔ کہ جب آپ کے کہنے کے مطابق جزائے عمل کی منزل برحق ہے تو پھر قیامت برپا کیوں نہیں ہوتی۔ جیسے سورۃ ملک میں آتا ہے، مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہوگا یعنی قیامت کب برپا ہوگی۔ اسی نوعیت کے اعتراضات کے جواب میں یہاں فرمایا قُلْ اِنْ اَدْرِیْ اَقْرِبُ مَّا تُوعَدُوْنَ

وقوع قیامت کا وقت
نبی کے علم میں نہیں تھا

آپ کہ دیجھے کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے اَمْ یَجْعَلُ
لَهُ رَجَبًا اٰمِدًا۔ یا میرا رب اس کے لیے مدت دراز بنائے گا۔ اس قدر تو میں جانتا ہوں کہ
جس نے عمل اور محاسبہ قطعی طور پر واقع ہو گا، مگر اُس کے وقت انعقاد کے بارے میں نہیں جانتا۔
گذشتہ سورۃ میں بھی اسی قسم کا مضمون گذر چکا ہے اَللّٰهُمَّ یُرُوْنَهُ بَعِیْدًا وَّاَنْتَ رَاقِبٌ
یعنی یہ لوگ اُسے بعید خیال کرتے ہیں حالانکہ ہمارے نزدیک وہ قریب ہے۔ تاہم فرمایا کہ مجھے اُس
گھڑی کا علم نہیں ہے جس میں قیامت واقع ہوگی۔

سزا کا مقررہ وقت
بھی اللہ تعالیٰ ہی
کے علم میں ہے

ایک تو قیامت کا انعقاد ہے اور دوسرے سزا کا واقع ہونا۔ اگر شخصی طور پر بھی سزا واقع ہوگی
تو وہ بھی اللہ کے علم میں ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ کس وقت اُن پر افتاد آتی ہے۔ اور کس قسم
کی سزائے دوچار ہوتے ہیں۔ بسا اوقات انسانوں کو انسانوں کے ہاتھ سے سزا ملتی ہے بشرطیکہ
کوہد میں سزا دی گئی۔ کسی کو بیرونی ذرائع یعنی آفاتِ ارضی و سماوی سے سزا دی گئی جیسا کہ بعض قوموں
کا حال گذر چکا ہے۔ تو ان تمام انفرادی آفتوں کے آنے کا وقت بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور مجموعی طور
پر وقوع قیامت بھی اللہ ہی کے علم میں ہے۔ نبی علیہ السلام کو حکم ہوا کہ آپ کہہ دیں کہ اس بات
کا علم مجھے نہیں ہے کہ قیامت قریب ہے یا دور ہے۔

علم غیب خاصہ خداوندی ہے

اس ضمن میں مزید وضاحت فرمائی عَالَمُ الْغُیْبِ یعنی غیب کو جاننے والا صرف اللہ
ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وقوع قیامت کے وقت کو میں نہیں جانتا حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کے بیان میں بھی یہی ہے اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیْبِ یعنی اے مولا کریم! تمام غیبوں کا جاننے
والا تو ہی ہے۔ یہاں لفظ الغیب استغراق اور جنس کے لیے ہے۔ یعنی جنس غیب اور تمام غیب
کا جاننے والا صرف وہی ہے۔ اُس کے سوا باقی مخلوق کے لیے غیب کی نفی کی گئی۔ لہذا مخلوق میں سے
کسی کو عالم الغیب کتنا درست نہیں ہے۔ فرمایا قُلْ لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
الْغُیْبُ اِلَّا اللّٰهُ اَرْض و سماء کی ساری کائنات میں غیب سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ ہتھائے
کرام اور علم عقیدہ والے بھی یہی کہتے ہیں کہ عالم الغیب کا اطلاق صرف ذاتِ خداوندی پر ہوتا ہے
غیب کا لفظ اضافی طور پر بھی بولا جاتا ہے اور مطلق بھی۔ اضافی طور پر اس طرح کہ بعض
چیزیں بعض مخلوق جانتی ہے اور بعض نہیں جانتی، لہذا بعض کے لیے وہ غیب ہے اور دوسروں

کے لیے غیب نہیں۔ آسمانی مخلوق بہت سی ایسی باتوں کو جانتی جو دوسری مخلوق نہیں جانتی۔ بعض چیزیں زمین والے جانتے ہیں، آسمان والے فرشتے نہیں جانتے، تو یہ گویا غیبِ اصنافی ہے اسی طرح ہر شخص بعض چیزیں دوسرے کی نسبت جانتا ہے یعنی کسی چیز کا علم بعض لوگوں کو ہوتا ہے بعض کو نہیں ہوتا۔ یہی اصنافی غیب ہے۔ البتہ ”الغیب“ یعنی کلی غیب سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ ذرے ذرے کا علم صرف خدا تعالیٰ کو ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے عالم الغیب والشہادۃ کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ غیب اور حاضر کو جاننے والا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی چیز غائب نہیں۔ اس ضمن میں فقہائے کرام فرماتے ہیں۔

کہ غیب اور شہادت کے الفاظ مخلوق کی نسبت سے آئے ہیں کہ مخلوق کے نزدیک بعض چیزیں حاضر ہیں اور بعض غائب، بعض چیزوں کا علم مخلوق کو ہوتا ہے۔ بعض چیزوں کا نہیں ہوتا۔ تو اللہ تعالیٰ کا عالم الغیب والشہادۃ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو جانتا ہے جو مخلوق کے نزدیک غیب کا درجہ رکھتی ہیں یا وہ حاضر ہیں اور ان کے محسوسات میں آتی ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کا علم انبیا غیب ہوتا ہے

امام ابو بکر حباص فرماتے ہیں کہ یہ ایک یقینی اور قطعی بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام غیب نہیں جانتے اَلَا مَا اَعْلَمَهُمُ اللہ سوائے اس کے جو اللہ ان کو بتلا دیتا ہے۔ چنانچہ انبیاء کو جو چیز بتائی جاتی ہے اس پر قرآن پاک میں انباء غیب کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق فرمایا ذَلِكْ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ یعنی یہ غیب کی خبروں میں سے ہے۔ یعنی ایسا واقعہ ہے جو تاریخ سے معلوم نہیں اور انسانی روایات بھی منقطع ہیں۔ اس طرح آئندہ پیش آنے والے واقعات مثلاً جنت، دوزخ، عالم برزخ، خدا کی ذات، صفات، عالم لاہوت، عالم ملکوت، عالم مثال وغیرہ سب غیب میں مگر انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی ان سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں، جو ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں۔ دوسری جگہ حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت مریمؑ کے متعلق صاف صاف فرمایا ذَلِكْ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا

کُنْتُ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقَوْنَ اَقْلَامَهُمْ يُعْنِي بِهٖ غَيْبِ الْخَبْرِ هِيں جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں اور آپ وہاں موجود نہیں تھے جب وہ اپنی قلمیں ڈال رہے تھے یعنی قرعہ اندازی کر رہے تھے کہ کس کا قلم پانی میں رکتا ہے اور کس کا چلتا ہے۔ اے بنی کریم علیہ السلام! آپ کو کوئی علم نہیں تھا، یہ تو ہم نے وحی کے ذریعے آپ کو بتایا۔ یہ چیزیں آپ نے نہ کسی کتاب میں پڑھیں اور نہ کسی استاد سے، بلکہ اللہ نے بذریعہ وحی آپ کو بتائیں اور یہی غیب کی خبریں کہلاتی ہیں۔ البتہ ذرہ ذرہ کا علم اللہ ہی کو ہے وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ حَاطٌ۔ ”وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ“ علیم کل ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اسی طرح قدرت نامہ اللہ تعالیٰ کی صفات مختصہ میں سے ہے قادر مطلق اللہ کی ذات ہے۔ مخلوق کا علم قلیل اور محدود ہوتا ہے۔ مگر اللہ کا علم ہر چیز پر حاوی ہے، اُسے ایک ایک ذرے کا علم ہے۔

الغرض کلی علم صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ آپ کہہ دیں کہ قیامت کے وقوع کا علم مجھے نہیں دیا گیا۔ قرآن پاک نے مزید فرمایا لَا يُجَلِّیْہَا لَوْ قُبِہَا اِلَّا هُوَ ”اللہ نے اس کا وقت کسی کو نہیں بتایا، نہ جبرائیل کو، نہ میکائیل کو، بلکہ صور پھونکنے والا اسرافیل فرشتہ بھی منتظر ہے۔ کہ کب حکم ہو تو بگل بجائوں۔ اللہ نے اُس کو بھی علم نہیں دیا۔ کیونکہ عالم الغیب وہی ہے۔

انبیائے علیہم السلام
کے عطائے علم کی حقیقت

آیت کے اگلے حصے میں انبیاء علیہم السلام کو عطائے علم کی حقیقت بتائی جا رہی ہے۔

فَاِذَا يَظْہَرُ عَلٰی غَيْبِہٖ اَحَدًا یَعْنِی اللّٰہُ تَعَالٰی اپنے خاص غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔

اِلَّا مَنْ ارْتَضٰی مِنْ رُّسُوْلٍ مَّوَدَّہٗ رَسُوْلُوْنَ مِیْنِیْ جِسْمِہٖ لَسْنَا ہِیْ۔ رسول تو سارے ہی پسندیدہ ہیں۔ یہاں پر مرنے والا یہ ہے تبعیض کے لیے نہیں۔ (یعنی جن رسولوں کو پسند کرتا ہے) اب رسول عام ہے اور نبی خاص۔ رسول ملائکہ میں بھی ہیں۔ ان کو بھی اللہ تعالیٰ علم عطا کرتا ہے۔

جیسے جبرائیل علیہ السلام ہیں اور پھر وہ انسانوں تک لاتے ہیں۔ اور رسول انسانوں میں بھی ہیں نبی کی تعریف یہ ہے کہ اِنْسَانٌ بَعَثَہُ اللّٰہُ لِیَبْلَغَ الْاَحْکَامَ الشَّرْعِیَّۃَ مِنَ اللّٰہِ یعنی نبی وہ انسان ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے مبعوث فرماتے ہیں اور رسول عام ہے کہ انسان بھی ہوتا ہے اور غیر انسان بھی جیسے فرمایا اللّٰہُ یُصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ

رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ یعنی اللہ تعالیٰ اپنا پیغام پہنچانے کے لیے ملائکہ میں سے بھی رسول منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔

متکلمین نبی اور رسول کی تشریح اس طرح فرماتے ہیں کہ نبی وہ ہوتا ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہے اور رسول وہ ہوتا ہے جس پر وحی بھی نازل ہوتی ہے اور اُس کو مستقل شریعت بھی دی جاتی ہے۔ یا کتاب دی جاتی ہے۔ نبی کے لیے مستقل شریعت کا ہونا لازمی نہیں۔ بنی اسرائیل میں ہزاروں نبی آئے ان پر وحی الہی نازل ہوتی تھی۔ مگر مستقل شریعت نہیں ملتی تھی۔ ان کو حکم تھا کہ وہ تورات کی تبلیغ کرتے رہیں۔ ہاں رسولوں کو نزول وحی کے علاوہ مستقل شریعت بھی دی گئی جیسے حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت داؤد، حضرت ادریس، حضرت ہود، حضرت صلح علیہم السلام یہ سب رسول تھے۔

نبیاء علیہم السلام کو تمام شرعی علوم سے نوازا جاتا ہے

الغرض ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے پسند کر لیتا ہے اُسے وہ علم عطا کرتا ہے، جو اُس کے منصب کے لائق اور مناسب ہو، ذرہ ذرہ کا علم نہ نبی کو ضرورت ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے۔ ان شریعت کی تکمیل اور امت کی تربیت کے لیے تمام علوم انبیاء علیہم السلام کو عطا کئے جاتے ہیں۔ تکمیل شریعت اور تربیت امت سے متعلق کوئی ایسا علم نہیں جو نبی کو نہ دیا جائے۔ اور پھر یہ نبی کی ذمہ داری ہے کہ وہ آگے لوگوں تک پہنچائے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا مَا مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا أَنْبَأْتُكُمْ (او کما قال) یعنی جو چیزیں تمہیں خدا تعالیٰ کی رحمت کے مقام تک پہنچانے والی ہے اور خدا کے غضب سے بچانے والی ہے، وہ سب چیزیں میں نے تم کو بتا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا مکمل علم حضور علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ شریعت اور دین کے متعلق کوئی علم اللہ نے اپنے نبی کو نہیں دیا۔ تو یہ غلط ہے۔ دین کا علم اللہ تعالیٰ نے مکمل کر دیا۔ اس کے علاوہ جو غیر شرعی احکام ہیں، ان کا علم بھی اللہ تعالیٰ نے باقی مخلوق کی نسبت انبیاء علیہم السلام کو زیادہ ہی دیا ہے۔ مگر ذرے ذرے کا علم نہیں دیا، کہ یہ خاصہ خداوندی ہے۔

شعر گوئی منصب نبوت
کے خلاف ہے

ہاں جو چیزیں منصب نبوت کے خلاف ہیں اور اس منصب کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی
اُن کا علم اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دیا۔ جیسا کہ سورۃ یس میں اس کی تصریح موجود ہے
وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ اَلَمْ يَكُنْ مِنْ بَنِي اٰدَمَ اَمْ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنُ۔ کہ شاعروں کے پیچھے
اُن کی شان کے شایان ہے۔ کیونکہ وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنُ۔ کہ شاعروں کے پیچھے
لگنے والے اکثر فضول لوگ ہی ہوتے ہیں۔ واہ واہ کرنے والے۔ شراب پینے والے، جو اُکھیلنے والے
اکثر شعراء کی یہی حالت ہوتی ہے، وہ کوئی اچھے اعمال والے لوگ نہیں ہوتے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
ہاں جو مومن ہیں، ان کی شاعری میں کچھ اچھی باتیں بھی ہیں ورنہ اکثر شاعری تخیلات پر مبنی ہوتی
ہے جو بنی کی شان کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ نبوت کی بنیاد حقائق حقہ پر ہوتی ہے۔ اور شعر و شاعری
کا مبنی التخیل پر ہوتا ہے۔ جس قدر خیالی اور وہمی چیز ہوگی۔ اتنا ہی شعر لذیذ معلوم ہوگا۔ اسی لیے
اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے شعر و شاعری بنی کو سکھائی ہی نہیں۔ یہ کتنا بڑا فن ہے، اس میں ہزاروں
لاکھوں کتابیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو نہیں سکھایا۔ سحر اور جادو کا علم، مسمریزم
کا علم، کمانت کا علم، جعفر اور رمل کا علم بڑے بڑے علوم ہیں مگر منصب نبوت کے منافی ہیں، لہذا اپنے
بنی کو نہیں سکھائے کہ یہ اس کی شان کے مناسب نہیں۔ لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر
عالم الغیب کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے۔

دنیوی علوم منصب نبوت
سے خارج ہیں

بعض لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جب کائنات پیدا ہوئی ہے اُس وقت سے لے کر
قیامت تک کے ذرے ذرے کا علم حضور علیہ السلام کو دیا گیا۔ یہ تو قرآن پاک کی تکذیب ہے
اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں، کہ ہم نے شعر کا علم بنی کو نہیں دیا۔ یہ اُس کی شان کے منافی ہے، تو پھر
ذرے ذرے کا علم کیسے ثابت ہوا۔ ہاں دینی احکام کے متعلق آپ کو مکمل علم عطا کیا گیا۔ کائنات
کی بہت سی چیزوں کا علم دیا اور بہت سی چیزوں کا نہیں دیا۔ مسلم شریف کی بیوند کاری والی حدیث
موجود ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ درختوں کی بیوند کاری شاید کسی غلط رسم کی بنا پر
کی جاتی ہے لہذا آپ نے فرمایا کہ اگر لوگ نہ کریں تو اچھا ہے۔ حالانکہ اس بارے میں وحی نازل

نہیں ہوئی تھی۔ تو لوگوں نے پیوند کاری ترک کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پھل کے موسم میں درختوں پر پھل ہی نہ آیا۔ حضور علیہ السلام نے دریافت فرمایا تو لوگوں نے عرض کیا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے ارشاد کی تعمیل میں ہم نے پیوند کاری چھوڑ دی، لہذا پھل نہیں آیا۔ یہ تو قدرت کا نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زوجین یعنی جوڑے پیدا کئے ہیں۔ نہ کھجور کا بور مادہ کھجور پر پڑتا ہے تو تلقیح (پیوند کاری) ہوتی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ پھل پیدا فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: **أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ** کہ یہ تو دنیوی بات تھی اور اُسے تم بہتر جانتے ہو۔

اسی طرح اور بہت سی چیزیں ہیں، جن کا علم نبی کے لیے ضروری نہیں۔ مثلاً تجارت کا علم کاروبار ہے، ساتس اور ٹیکنا لو جی ہے۔ صنعت و حرفت ہے۔ اگر نبی ان میں سے کوئی علم نہیں جانتا۔ تو اس سے منصب نبوت میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ ہاں دین کے احکام تقرب الی اللہ، حلال و حرام، جائز و ناجائز وغیرہ کے متعلق اگر کوئی کہے کہ نبی کو علم نہیں تو وہ کفر ہو گا۔ دنیوی معاملات کو نبی کی نسبت دوسرے لوگوں کا بہتر جانا عین ممکن ہے۔

علم غیب کا بطلان عقیدہ

بہر حال عالم الغیب صرف خدا کی ذات ہے۔ تخلیق کائنات سے قیامت تک کا علم حضور علیہ السلام کو نہیں دیا گیا۔ ایسا عقیدہ شریک اور باطل عقیدہ ہے کیونکہ علیم کل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور یہ اُس کی صفتِ مختصہ ہے۔ ہاں جو چیز اللہ نے حضور علیہ السلام کو بتادی وہ انبیا و غیب میں آگئی۔ اور غیب کی تعریف یہ ہے کہ بغیر ذریعہ اور سبب کے معلوم ہو۔ نہ وحی ہو نہ مشاہدہ ہو، نہ الہام ہو، نہ آنکھ سے ہو نہ عقل سے ہو کسی بھی ذریعے سے حاصل نہ ہو، جو علم بغیر سبب اور بغیر ذریعے کے حاصل ہو، وہی غیب کہلاتا ہے۔ اور جو کسی ذریعہ سے حاصل ہو وہ غیب نہ رہا، لہذا انبیا و غیب میں شمار ہو گا **تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ** یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم نے بذریعہ وحی آپ کو بتا دیں

نبی کا علم محدود ہوتا ہے

اس آیت سے بھی لوگ غلط مطلب لیتے ہیں، حالانکہ **إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوا رَسُولَهُ** کے ساتھ ہے۔ کہ میں نہیں جانتا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس آیت میں رسولوں پر غیب ظاہر کرنے سے مراد کلی غیب ہے یعنی اللہ تعالیٰ جس رسول کو پسند کرتا ہے اس پر کلی غیب ظاہر کر دیتا

ہے۔ یہ بالکل باطل معنی ہے۔ کیونکہ پہلی آیت خود بتا رہی ہے کہ مجھے قیامت کے واقع ہونے کا علم نہیں۔ ”إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ“ اسی طرح بارش نازل ہونے کی گھڑی اور اس کی پوری کیفیت سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ کہ کتنے قطرے نازل ہوں گے۔ کوئی سائنس دان نہیں بتا سکتا کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے۔ مومن ہے یا کافر، نیکو کار ہے یا بد بخت۔ اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ سوائے خدا کے کسی کے علم میں نہیں۔

بعض ایسے آلات ہیں جن کے ذریعے ڈاکٹر، حکیم معلوم کر لیتے ہیں کہ پیٹ میں بچہ ہے یا بچی مگر یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ نیک ہے یا بد اس کی عمر کتنی ہوگی، یہ دنیا میں کیا کام کرے گا، اسی طرح بارش کے کتنے قطرے برسیں گے، کون سا قطرہ مفید اور کون سا مضر ہے، کس سے سیرابی ہوگی اور کون سا طوفان کی شکل میں تبدیل ہوگا۔ اول سے آخر تک کون جان سکتا ہے قیامت کب واقع ہوگی۔ ہر شخص کی موت کہاں آئے گی۔ یہ سب کچھ اللہ ہی جانتا ہے کیونکہ ”إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ“ یہ تمام چیزیں ذات خداوندی کے ساتھ مختص ہیں۔ لہذا عالم الغیب والشہادۃ وہی ہے۔ وہ نبیوں کو سب سے زیادہ علم عطا کرتا ہے، مگر وہ بھی محدود ہوتا ہے کیونکہ بہت سی چیزوں کا علم اللہ نے انبیاء علیہم السلام کو بھی نہیں دیا۔

غیب کو رسولوں پر ظاہر کرنے کی علت بیان فرمائی فَإِنَّهُ يَسْأَلُكُم مِّن بَيْن يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا کہ نزول وحی پورے اہتمام کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب فرشتہ اللہ کے احکام لے کر آتا ہے، تو اس کے آگے اور پیچھے اللہ تعالیٰ چوکیدار بھیجتا ہے، ہر طرف پیرے لگا دیتا ہے، تاکہ جنات اور شیاطین کوئی دخل اندازی نہ کر سکیں۔ اور احکام الہی محفوظ طریقے سے پہنچ جائیں۔ نیز یہ کہ لِيَعْلَمَ أَنَّ قَدْ أَتٰهُم بِرِسَالَةٍ یعنی خدا تعالیٰ ظاہر کر دے کہ نبیوں نے اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا ہے۔ تو گویا جو علم اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کو محفوظ طریقے سے پہنچاتا ہے وہ قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔ کیونکہ نبی معصوم ہوتا ہے، اس کا ظرف بڑا ہوتا ہے اور اس میں فراغ کی ادائیگی کی پوری صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے ولی کو جو الہام ہوتا ہے، اس کے سمجھنے، ادا کرنے اور ظاہر کرنے میں گڑبڑ کا امکان ہوتا ہے حضرت مجتہد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ بعض چیزیں اللہ تعالیٰ اولیاء اللہ کو بذریعہ الہام بتا دیتا ہے، مگر وہ قطعی نہیں ہوتیں۔

انبیاء علیہم السلام اور
اولیائے کرام کے
علم میں فرق

کیونکہ ولی کا ظرف نبی کے ظرف کے برابر نہیں ہوتا۔ اور یہ یقین نہیں ہوتا کہ اسنوں نے باطل و لیا ہی اسے سمجھا ہے جیسا منشاء ایند دی ہے۔ اور پھر جب وہ اسے ادا کرتا ہے تو اس بات کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ اسنوں نے ویسے ہی ادا کیا ہے جیسے انبیاء علیہم السلام کرتے ہیں۔ اس میں غلطی کا امکان ہے۔ لہذا وہ قطعی بات نہیں ہوتی۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے اللہ کا منشاء اپنے صحابہ پر ظاہر کر دیا، مگر صحابہؓ نے اسے صحیح طور پر سمجھا نہیں، وہ شخص اہل بدعت میں سے ہے اہل حق میں سے نہیں ہے۔ کیونکہ یہ عقیدہ آیت ”لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ“ کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا منشاء مکمل طور پر نبی پر ظاہر کیا اور نبی نے اسے مکمل طور پر صحابہ تک پہنچایا۔ صحابہ نے اسے پورے طور پر سمجھا اور اسے دوسروں تک پہنچایا، اسی لیے شیعہ، رافضیہ یا معتزلہ کا اعتقاد باطل ہے۔

محیط کل اللہ کی ذات ہے

فرمایا تاکہ خدا تعالیٰ ظاہر کر دے کہ نبیوں نے اپنے رب کے احکام پہنچا دیے ہیں وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ اور وہ احاطہ کرتا ہے جو کچھ ان نبیوں اور رسولوں کے حالات ہیں، ہر چیز کا احاطہ اس کے پاس ہے جس قسم کے حالات ان کے سامنے پیش آتے ہیں یا آنے والے ہیں یا آچکے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کا احاطہ کرتا ہے۔ ”وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ“ یعنی علیم کل صرف خدا کی ذات ہے، وہ قادر مطلق، جو چاہے اپنے اختیار اور ارادے سے کرے یہ بھی اس کی صفات مختصہ میں ہے وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی گنتی کر رکھی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں کل کتنے درخت ہیں، درختوں پر کتنی ٹہنیاں اور کتنے پتے ہیں۔ کوئی شمس دان، کوئی ماہر علم نباتات بتا دے کہ پہاڑ میں ریت کے کتنے ذرے ہیں، سمندر میں پانی کے کتنے قطرے ہیں، سارے نفوس کتنے ہیں۔ ان کے احوال کیا ہے۔ ان تمام چیزوں کا علم خدا تعالیٰ کے پاس ہے۔ وہ محیط کل ہے۔ وہ ہر چیز کا شمار رکھنے والا ہے اور پھر جتنا علم مناسب سمجھتا ہے مخلوق کو دے دیتا ہے اور وہ انبائے غیب ہوتی ہیں۔ غیب دکان فقط وہی ذات ہے۔

الغرض سورۃ مبارکہ کے آخر میں معاد کا ذکر بھی آگیا کہ اس کے وقوع کا علم صرف اللہ کو

ہے۔ شرک کی تردید بھی ہو گئی کہ کس طرح جنات نے شرک سے بیزار ہی کا اظہار کر دیا۔ بعد میں دعوت الی التوحید بھی آگئی کہ سجدے صرف اللہ کے لیے ہیں۔ سجدہ لغیر اللہ شرک کے مترادف ہے۔ بنی کا طریقہ بھی یہی ہے اَللّٰہُ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَا تُشْرِكُوْا بِہٖ اَحَدًا یعنی میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں بناتا۔ اے لوگو! اگر بچنا چاہتے ہو، تو اسی راستے کو اختیار کرو۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالْمُصَوَّبِ

سُورَةُ الْمَزْمَلِ
(مَكِّي)

سُورَةُ الْمَزْمَلِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ عَشْرُونَ آيَةً فِيهَا ثَلَاثُونَ كُوفَةً

سورة منزل مکی ہے یہ بیس آیتیں ہیں اور اس سورۃ میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

يَا أَيُّهَا الْمَزْمَلُ ① قُمْ أَلَيْدًا قَلِيلًا ② نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ
مِنْهُ قَلِيلًا ③ أَوْزِدْ عَلَيْهِ وَرِثَ الْقُرْآنِ تَدْتِيلًا ④ إِنَّا سُنُلُقُ
عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ⑤ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلًا
⑥ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ⑦ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ
إِلَيْهِ تَبَتُّلًا ⑧ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ
فَاخْذُهُ وَكِيلًا ⑨

ترجمہ: اے کھیل اور ڈھنسنے والے ① آپ رات کو کھڑے ہوں مگر تھوڑا حصہ ② نصف شب
یا نصف کچھ کم کر دیں ③ یا نصف کچھ زیادہ کریں اور قرآن پاک تر تیل سے پڑھیں ④ بے شک
ہم آپ پر ایک بوجھل بات ڈال رہے ہیں ⑤ بیشک رات کو اٹھنا رونہ کے اعتبار
سے زیادہ سخت ہے اور زیادہ درست ہے بات کرنے کے اعتبار سے ⑥ بیشک آپ
کے لیے دن کے وقت بہت شغل رہتا ہے ⑦ اور اپنے رب کے نام کو یاد کریں اور سب سے
ہٹ کر صرف اسی کی طرف الگ ہوں ⑧ مشرق اور مغرب کا رب وہی ہے۔ اس کے
سوا کوئی معبود نہیں لہذا اسی کو اپنا کارساز پکڑو۔ ⑨

کوائف اور مضامین سورۃ
اس سورۃ کا نام سورۃ منزل ہے۔ سورۃ کی پہلی آیت میں ہی لفظ منزل آیا ہے، جس کے نام
پر سورۃ کا نام ہے۔ یہ مکی سورۃ ہے۔ اس کی بیشکل آیات اور دو رکوع ہیں۔ اس میں دو سو پچاس
الفاظ اور آٹھ سو اڑتیس حروف ہیں۔

سابقہ سورۃ جن کی طرح اس سورۃ میں بھی بنیادی عقائد کا ذکر ہے۔ جس طرح اس سورۃ میں

توحید، اہمالت، قرآن کریم کی حقانیت و صداقت اور دلائل توحید مذکور تھے اسی طرح اس سورۃ میں بھی ان بنیادی عقائد کا ذکر ہے اس طرح گویا اس سورۃ کو سابقہ سورۃ کے ساتھ مناسبت ہے۔ سورۃ جن میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا شکوہ کیا کہ وہ قرآن کریم کو اللہ کا کلام نہیں مانتے اور نہ اُسے سنتے ہیں۔ حالانکہ غیر جنس کے جنات نے جب خالی الذہن ہو کر اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تو اُس سے متاثر ہوئے اور ایمان قبول کر لیا۔ جو بھی شخص اپنی ذاتی خواہشات اور تعصب الگ ہو کر کلام الہی کو سُننے گا، اُس کے لیے ہدایت کا راستہ ضرور واضح ہو جائے گا۔ جس طرح وہاں حضور علیہ السلام کے نماز میں قرآن پاک پڑھنے کا بیان تھا، اسی طرح یہاں بھی قیام الیل اور قرآن پاک پڑھنے کا بیان ہے۔ قرآن کریم کو سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُسے نماز میں پڑھا جائے اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں اس کے پڑھنے کا طریقہ بتا دیا ہے۔ تو یہ بھی اس سورۃ کی سابقہ سورۃ کے ساتھ مناسبت اور ربط ہے۔

یہ سورۃ قرآن کریم کی نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ سورۃ منزل کا پہلا رکوع نزول کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر آتا ہے پہلے اور دوسرے رکوع میں بارہ مہینے کا فرق ہے۔ امام جلال الدین سیوطی تفسیر القان میں اور دوسرے مفسرین بھی لکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام پر سب سے پہلی وحی جو غار حرا میں نازل ہوئی وہ سورہ اقرا کی پہلی پانچ آیتیں ہیں یعنی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ لے کر مَالَهُ يَحْكُمُ يَكُنْ۔ اس کے متصل دوسرے نمبر پر سورۃ فاتحہ بھی وہیں نازل ہوئی۔ اور آپ کو وضو کا طریقہ بھی وہیں بتلایا گیا۔ نزول وحی سے دوسرے دن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔ اور امام المؤمنین خدیجہ الجری نے نماز ادا کی۔ نزول کے تیسرے نمبر کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ تیسرے نمبر پر سورۃ ن نازل ہوئی، مگر صحیح بات یہ ہے کہ تیسرا نمبر اس سورۃ کا ہے۔ یعنی تیسرے نمبر پر سورۃ منزل کا پہلا رکوع نازل ہوا، اس کے بعد سورۃ مدثر، پھر سورۃ ن اور پھر دوسری سورتیں اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ایک انقلابی پروگرام دیا ہے۔ اس سورۃ میں ارشاد ہے

اسلام کا انقلابی پروگرام

يَا أَيُّهَا الْمُسْلِمُونَ قُمْ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا یعنی اے کھل یا لحاف اوڑھنے والے کھڑے ہوں
 رات کے وقت اور نماز ادا کریں سورۃ مدثر کے الفاظ ہیں قُمْ فَإِنْ ذُرُوعِي كَمْ طے ہوں
 اور اللہ کی مخلوق کو بڑے نتائج سے خیردار کریں۔ تو گویا نزول کی طبعی ترتیب بھی یہی ہے۔ کہ پہلے
 رات کو نماز کے ذریعے ذاتی تکمیل کا حکم ہوا ہے اور اس کے بعد انداز کے ذریعے مخلوق خدا کی
 تکمیل کا ذکر ہے۔ تو گویا اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے لیے جماعت
 کی تیاری اور اُس کے پروگرام کا ذکر کیا ہے۔ انقلاب ایک فرد واحد کے بس کی بات نہیں اس
 کے لیے جماعت کی ضرورت ہے۔ وہ کون سی جماعت ہے اور اُسے کس قسم کی تربیت کی ضرورت ہے
 اس سورۃ میں ہی باتیں بیان کی گئی ہیں جیسا کہ سورۃ کے دو سر رکوع میں موجود ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ
 يَعْلَمُ اَنْتَ تَقُومُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثِي اللَّيْلِ وَنُصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ
 اس آیت میں طائفہ سے مراد وہی گروہ صحابہ ہے جو آپ کے ساتھ تھا۔

قرآن کریم یا انبیاء علیہم السلام کا پروگرام انقلابی پروگرام ہوتا ہے۔ انقلاب کا معنی تبدیلی
 پیدا کرنا ہے، یعنی سابقہ غلط روش یا غلط عقیدہ یا بد اخلاقی کو تبدیل کرنا ہے اور اس قسم کا انقلاب
 ایک تربیت یافتہ جماعت ہی برپا کر سکتی ہے۔

الغرض دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے لیے پہلی منزل تربیت ہے اگر انقلاب لانے والوں
 کو معیاری تربیت حاصل نہ ہو، تو وہ کوئی اچھا انقلاب نہیں لاسکیں گے، بلکہ فساد برپا کریں گے جیسا کہ
 غیر اسلامی حکومتیں کرتی آتی ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم میں جاپان میں کیا ہوا تھا۔ وہی جاپان جس کا وزیر عظم
 کل مر گیا ہے۔ وہ جاپانی النسل تھا، مگر عیسائی مذہب اختیار کر رکھا تھا۔ ہم نے اخباروں میں پڑھا۔ آپ
 نے بھی پڑھا ہو گا، آپ کو یاد ہو گا کہ امریکہ کے جاپان پر حملے کے نتیجے میں سو لاکھ جاپانی عورتیں عالمہ
 ہوئی تھیں اور پھر ان کے بچے پیدا ہوئے۔ یہ تعداد وہ ہے جن کے بچے پیدا ہوئے، اور جن کے نہیں
 ہوئے ان کا آپ خود اندازہ لگالیں، تو یہ تھا وہ انقلاب جو امریکی سپاہیوں نے حرام کاری کی صورت
 میں جاپان میں برپا کیا۔ اس کے بعد ان بچوں کی حفاظت کا مسئلہ پیدا ہوا، تو امریکہ نے جاپانیوں کو
 امریکہ میں رہائش کے کچھ حقوق بھی دیے، تو بہر حال بغیر تربیت کے انقلاب برپا کرنے کا یہ حشر ہوا
 اس مقام پر وہ اصول بتائے جاتے ہیں۔ جن کے مطابق حضور علیہ السلام اور آپ کی جماعت

انقلاب کے لیے معیاری
 تربیت کی ضرورت ہے

”طَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ“ کی تہ بیت مطلوب ہے۔ قابل غور یہ بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے دنیا میں کس قسم کا انقلاب برپا کیا۔ تو یہ گویا انقلاب کی تیاری کی منزل ہے۔ جس میں ذاتی تکمیل یعنی اپنی اصلاح مقصود ہے۔ جب یہ پہلا مرحلہ طے ہو جائے گا تو پھر دوسرا مرحلہ اصلاح عالم کا آئے گا۔ جہاں کی اصلاح وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کی اپنی ذاتی اصلاح ہو کہ روحانی ترقی نصیب ہو چکی ہو۔ اسی لیے امام رازیؒ، امام بیضاویؒ جیسے مفسرین بیان کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں انسانوں کی قوت نظری اور قوت عملی کی تکمیل کرتے رہے۔ جب یہ تکمیل ہو جاتی ہے تو انسان انقلاب برپا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور اگر اپنی ہی اصلاح نہیں ہوئی تو دوسروں کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ وہی مرحلہ ہے جس میں ذاتی اصلاح کی ضرورت ہے۔

لفظ منزل کے معانی

لفظ منزل کے دو معنی آتے ہیں اور دونوں ہی اس مقام پر صادق آتے ہیں۔ زَمَلٌ اور پیرا اور ٹھ لیا جس سے منزل ہے یعنی کپڑا اور ٹھنے والا۔ دوسرا تَزَمَلٌ ہے۔ زمیل ساتھی کو کہتے ہیں اور منزل ساتھی اکٹھا کرنے والے کو۔

پہلا معنی تو عام ہے جیسا کہ احادیث اور تفاسیر کی کتابوں میں موجود ہے کہ ابتداء میں جب حضور علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی تو اس کی دہشت تھی چونکہ یہ نئی چیز تھی اور طبیعت پر بوجھ تھا، جسم مبارک پر کچھ طاری تھی۔ اسی حالت میں آپ گھر تشریف لائے، اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ مجھے سردی لگ رہی ہے، مجھ پر کپڑا ڈال دو، کھیل اور ٹھادو۔ لہذا حضرت خدیجہؓ نے آپ کو کھیل اور ٹھادیا لفظ منزل کا ایک معنی تو یہ ہے، یعنی کھیل اور ٹھنے والے۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جب آپ نے لوگوں کے سامنے نزول وحی کا اظہار کیا، تو مخالفین نے طرح طرح کی باتیں بنائیں۔ جیسا کہ سورۃ ن میں گزر چکا ہے، کسی نے مجنوں کہا، کسی نے شاعر کہا اور کسی نے کاہن کہا۔ ان باتوں سے آپ کو غم لاحق ہوا اور آپ کھیل اور ٹھ کر گھر میں لیٹ گئے۔

لہذا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یَا یٰہَا الْمَزْمَلُ کہہ کر خطاب کیا یعنی اے کھیل اور ٹھنے والے قیام الیل کا حکم

قُمِ اللَّيْلُ یعنی آپ رات کو کھڑے ہوں اِلَّا قَلِيْلًا محکمہ حقوڑا حصہ۔ کھڑا ہونے سے مراد نماز کے لیے کھڑا ہونا ہے تاکہ اس سے آپ کو روحانی ترقی حاصل ہو اور تکمیل ذات ہو سکے اور اس سے آئندہ پیش آنے والے مشکل کام میں آپ کو آسانی ہو۔ لفظ منزل کا دوسرا معنی یعنی ساتھی تلاش کرنے والا بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی اے ساتھی تلاش کرنے والے آپ رات کا حقوڑا حصہ نماز کے لیے کھڑے ہوں نصفہ اوّل نقص منہ قلیلہ نصف یا نصف سے کچھ کم اوزد علیہ یا نصف سے زیادہ۔

قیام الیل کی فضیلت

چنانچہ رات کے وقت ادا کی جانے والی نماز کے لیے قیام الیل کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے عَلَیْكُمْ بِقِيَامِ اللَّيْلِ یعنی اے ایمان والو! تم بھی رات کے وقت کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو اپنے اوپر لازم کر لو۔ فَإِنَّهُ دَابُّ الصَّالِحِينَ قَبْلَكُمْ کیونکہ یہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ رہا ہے۔ وَهُوَ قُرْبَةٌ لَّكُمْ إِلَىٰ رَبِّكُمْ اور تمہارے لیے قرب الہی کا ذریعہ ہے وَهَكَفَرَةُ لِلْسَّيِّئَاتِ وہ گناہوں کو مٹانے والی ہے وَمَنْهَاكَا عَنْ الزُّنْهِ اور معاصی سے روکنے والی چیز ہے۔ لہذا تم بھی رات کی نماز یعنی تہجد پڑھا کر وہ اور نماز میں قرآن پڑھنے کا اسلوب یہ ہے وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا یعنی قرآن پاک ترتیل سے پڑھیں۔ ترتیل سے مراد ہے آہستہ آہستہ، واضح واضح اور صاف صاف کیونکہ اس طریقے سے تلاوت قرآن سے اس کا مطلب اور مفہوم سمجھ میں آئے گا تیزی سے پڑھنا بہتر نہیں ہے۔ جیسا کہ روایت میں آتا ہے۔ تم میں سے تلاوت کرتے وقت کسی کا یہ مقصد نہیں ہونا چاہیے کہ جلدی میں اخیر تک عبور کر جاؤں، بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں آتا ہے کہ قرآن پاک اس طرح نہ پڑھو، جس طرح آدمی کھجوریں پھینکی جاتی ہیں۔ یا جیسے شکرگوئی کی جاتی ہے۔ بلکہ اطمینان کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا چاہیے تاکہ ذہن پر اس کا اثر ہو۔ اور اس کا مفہوم بھی سمجھ میں آجائے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ اُس آدمی کا مسلمانی میں کیا حصہ ہو گا جس نے کتاب اللہ کے مفہوم ہی

ترتیل قرآن

کو نہ سمجھا۔ اور وہ کونسی شریعت اور مٹھاس حاصل کرے گا جس نے کلام اللہ کے مدلول کو نہ جانا۔ نزول قرآن کا اصل مقصد تو اس سے نصیحت اور ہدایت حاصل کرنا ہے، اگرچہ خالی الفاظ کو پڑھنا بھی غنیمت ہے۔ مگر اصل مقصد نہیں ہے۔ قرآن پاک کو پڑھنے کا بہترین طریقہ، دوران نماز پڑھنا ہے۔ تو بات یہ ہو رہی تھی کہ دنیا میں بہتر انقلاب اس وقت آئے گا جب انقلاب لانے والوں میں اس کی صلاحیت پیدا ہوگی اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کا تعلق اللہ کے ساتھ درست ہوگا تو گویا قیام الیل اور تم تیل قرآن تعلق باللہ کا ذریعہ ہے۔ جب انسان یہ ذریعہ حاصل کر لے گا تو اس میں روحانیت آئے گی۔ وہ مہذب ہوگا، تربیت یافتہ کسلائے گا اور اسلامی انقلاب برپا کر سکے گا۔ لہذا اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کلام الہی نماز میں پڑھے، اس کا مفہوم اپنے ذہن میں بٹھائے اور تعلق باللہ قائم کرے، کیونکہ اس کے بغیر اسلامی انقلاب نہیں لایا جاسکتا۔ اور اگر کوئی انقلاب آئے گا تو وہ فساد اور ظلم کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ دنیا میں عدل قائم نہیں ہوگا۔ خدمت خلق کی بجائے خدمت نفس ہوگی۔ اللہ کی اطاعت کی بجائے شیطان کی اطاعت ہوگی۔ لہذا دنیا میں اللہ تعالیٰ کے قانون کو جاری کرنے کے لیے ضروری ہے۔ کہ سب سے پہلے اللہ کے ساتھ تعلق درست ہو جس کا ذریعہ قیام الیل ہے۔

قیام الیل کے ذریعے ذاتی تکمیل کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا یعنی ہم آپ پر ایک بوجھل بات ڈال رہے ہیں۔ جو کہ کئی طرح سے ہے۔ مثلاً قرآن پاک کے پروگرام کو دنیا میں رائج کرنا ایک بڑا بوجھل کام ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ قرآن کو پہلے اپنے اندر جذب کرنا بجائے خود ایک ثقل ہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی، تو اس سے اس قدر پیش پیدا ہوتی تھی کہ سخت سردی میں پسینے کے قطرے ٹپکتے تھے۔ اور اگر آپ کا سر مبارک کسی کی ران پر ہوتا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ران ٹوٹی جا رہی ہے۔ احادیث میں حضرت زیدؓ یا حضرت علیؓ کی ران پر آپ کے سر مبارک رکھنے کے واقعات ملتے ہیں۔ اسی طرح سواری کی حالت میں اگر وحی نازل ہوتی تھی، تو اونٹنی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ حضور

قیام الیل تعلق باللہ کا ذریعہ ہے

صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک اونٹنی بڑی مضبوط تھی اور نزول وحی پر اُسکی بھی یہ حالت ہوتی تھی کہ گھر دن اور پاؤں اکڑ جاتے تھے اور وہ اس طرح کھڑی ہو جاتی تھی۔ جیسے بہت بڑا وزن پڑ گیا ہو۔
 نزول وحی کی کیفیت اس قدر ثقیل ہوتی تھی کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہو جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ نزول وحی کے وقت انخلع ہوتا تھا۔ شاہ ولی اللہ کی اصطلاح میں انخلع بشریت ملکیت کی طرف منتقلی کا نام ہے۔ اور اس طرح گویا فرشتے کے ساتھ مناسبت پیدا ہونے سے بڑا بوجھ پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ مخالفین کے طعن کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اسی لیے اگلی آیتوں میں فاصد کا حکم بھی آتا ہے مزید برآں قرآن کریم کا پڑھنا پڑھانا۔ اس کے احکام کا اجرا کرنا، اس کی تعلیم کو عام کرنا، جماعت کو منظم کرنا یہ تمام امور قولاً لَفِیْدٌ میں آتے ہیں۔

اسی لیے فرمایا کہ ہم آپ پر طویل ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالنا چاہتے ہیں۔ لہذا پہلے آپ اپنی تکمیل کر لیں اور روحانیت کے بلند مقام پر فائز ہو جائیں۔ آپ کی جماعت کی تربیت بھی اسی درجہ کی ہونی چاہیے کہ اُن میں ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

اگلی آیت میں وہ حکمت بھی بیان کر دی ہے، جسکی بناء پر رات کو قیام کا حکم دیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّیْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَاَقْوَمُ قِیْدًا بیشک رات کو اٹھنا روندنے کے اعتبار سے زیادہ سخت ہے اور زیادہ درست، بات کہنے کے اعتبار سے مطلب یہ کہ رات کے وقت اٹھ کر نماز پڑھنا بڑا دشوار کام ہے، ویسے تو عام نماز پڑھنا بھی بڑا مشکل ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے اِنَّهَا لَکَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلٰی الْخَشِیْعِیْنَ

یعنی نماز کی ادائیگی بڑا بوجھل کام ہے۔ سوائے خوف خدا والوں کے۔ جس انسان میں خشیت کا جتن مادہ ہوگا، اتنا ہی وہ نماز کا پابند ہوگا، ورنہ منافق قسم کے آدمی کے لیے یہی نماز بوجھ ہے۔ نماز پڑھنے سے اسے راحت میسر نہیں آتی۔ بلکہ بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ یہ تو عام نمازوں کی بات ہے مگر رات کے وقت جب کوئی آرام کو چھوڑ کر تہجد کے لیے بیدار ہوتا ہے، تو یہ اُس کے نفس کے لیے گویا روندنے والی چیز ہوتی ہے بس یہی ہے وہ تربیت جس کی قرآنی پروگرام پر عمل کرنے کے لیے ضرورت ہے۔ جب انسان اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پالے گا، تو وہ جس میدان میں بھی چلے گا۔

کامیاب ہوگا۔ اسی لیے فرمایا آپ کرات کے وقت اٹھنا زیادہ شدید ہے، روہنے کے اعتبار سے رات کے پرسکون ماحول میں جو بات زبان سے نکلتی ہے، وہ موثر ہوتی ہے، کیونکہ دن کے وقت شور و شغب کی وجہ پوری دلجمعی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ رات کو نماز میں قرآن پاک کی تلاوت بڑی موثر چیز ہے۔

اسی بات کو واضح کیا کہ ان لک فی التہار سبھا طویلاً بے شک آپ کے لیے دن کے وقت بہت سے اشغال ہیں منجملہ ان کے عبادات، جہاد کی تیاری، مقدمات کا تصفیہ، حقوق کی اورائی، عوام الناس سے میل ملاقات، تبلیغی پروگرام پر عمل درآمد، بیرونی وفود سے گفت و شنید وغیرہ امور ہیں، لہذا تکمیل ذات اور حصول روحانیت کا مناسب موقع رات کو میسر آ سکتا ہے اسی لیے فرمایا کہ آپ رات کو قیام کریں تاکہ تعلق باللہ درست طریقے پر قائم ہو سکے۔

ذکر الہی کے ذریعے
تجلی الہی سے
تعلق قائم ہوتا ہے

اس کے بعد وہ اصول بتائے جا رہے ہیں جن کے ذریعے تعلق باللہ قائم ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے **وَ اذْکُرْ اسْمَ رَبِّکَ** یعنی اپنے رب کے نام کو یاد کریں۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نام یا اس کی صفت، جس کے ذکر کا حکم دیا گیا ہے، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی تجلی ہوتی ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ ذکر الہی کے ذریعے اللہ کی تجلی کے ساتھ تعلق قائم کریں۔ اور یہ تعلق ہی مدار فلاح ہے۔ خصوصاً تجلی اعظم کے ساتھ تعلق جو عرش الہی پر پڑتی ہے اور سب چیزوں کو رنگین کرتی ہے۔ تو آخرت میں اس تجلی کے ساتھ جب انسان بلند درجات پر پہنچے گا۔ تو اس کے ساتھ براہ راست تعلق قائم ہوگا۔ اس وقت انسان اسے سمجھ سکیں گے، اور اس کا عکس محسوس کریں گے۔ یہ تعلق اس مادی دنیا میں محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا حکم ہوا کہ اپنے رب کا نام لیں اور اس کی تجلی کے ساتھ اپنا تعلق قائم کریں۔

الغرض اپنے رب کا نام لیں وَ تَبْتَکِلْ اِلَیْہِ تَبْتِیلاً اور سب سے ہٹ کر صرف اُسی کی طرف الگ ہوں، یہاں الگ ہونا طہارت مراد نہیں ہے، کیونکہ دن کے وقت تو باقی تمام امور سرانجام دینا ہوتے ہیں۔ لہذا علیحدگی رات کے وقت ہی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ رات کے وقت اٹھیں اور سب الگ ہو کر اپنے رب کا نام یاد کریں، نماز پڑھیں تاکہ تجلی الہی کے ساتھ تعلق قائم ہو۔

باطل قوتوں کے
مقابلے میں جماعت جیت

جس رب کے ذکر کی ترغیب دی جا رہی ہے، اُس کی صفت کاملہ یہ ہے کہ **رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ** یعنی مشرق و مغرب کا رب وہی ہے، مشرق میں ایران اور مغرب میں روم دو بڑی

سلطنتیں تھیں، انہوں نے دنیا میں بڑا فساد مچا رکھا تھا، اور ان کو ملیا میٹ کرنا حضور علیہ السلام کے پروگرام میں شامل تھا۔ آج بھی دنیا میں دو حکومتوں نے فساد برپا کر رکھا ہے، ایک اشتراکی نظام کی حامل اور دوسری سرمایہ دارانہ نظام کی۔ یہ دونوں ظالم حکومتیں اپنا اُلُوسیدھا کرنے کیلئے کمزور ملکوں کو استعمال کرتی ہیں۔ کسی زمانے میں برطانیہ اپنی طاقت اور وسعت کی بنا پر برطانیہ عظمیٰ کہلاتا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اُس کی بد اعمالیوں کی بدولت اُسے سیکڑ دیا ہے۔ اور کمزور کر دیا ہے۔ اب اس کا جانشین امریکہ ہے۔ وہ بھی انگریز نہیں۔ یہ روسی بھی بگڑے ہوئے انگریز ہیں، یہودی اور نصرانی ہیں منہج ہو چکے ہیں۔ یہی حال حضور علیہ السلام کے زمانہ میں تھا۔ کيسر و قصری، دو بڑی سلطنتیں تھیں۔ ساری دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ آدھی قیصر کے ساتھ اور آدھی کسری کے ساتھ انہوں نے دنیا میں فساد مچا رکھا تھا، جس کا نقشہ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کھینچا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں تھا کہ ان دونوں ظالم حکومتوں کو درہم بہ درہم کر کے ان کی جگہ نبی امی کو کھڑا کیا جائے اور ایسی جماعت کو برسرِ اقتدار لایا جائے، جن میں ظالم حکومتوں والی کوئی خرابی نہ ہو لَاشَرِّ قِیَّتَةٍ وَلَا عَذِیْبَةٍ یعنی ایسی جماعت جس میں مشرقیوں والی برائیاں ہوں، نہ مغربیوں والی خرابیاں۔ وہ ایسی جماعت ہو۔ جو چست و چالاک مستعد اور جفاکش ہو اور پھر ان کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کے ذریعے دنیا میں انقلاب پیدا کیا جائے۔

معبود اور کار ساز
اللہ کی ذات ہے

فرمایا کہ مشرق و مغرب کا رب وہ ہے کہ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ مشرق و مغرب والے شرک میں مبتلا ہیں، کوئی انسان پستی کرتے ہیں، کوئی اصنام پرستی میں مبتلا ہیں۔ کوئی حیوانات کو پوجتے ہیں تو کوئی مردوں کی پستش میں ملوث ہیں، کوئی ملائکہ، جنات اور پھقروں کے پرستار ہیں یعنی ہر حال میں غیر اللہ کی پوجا کرتے ہیں۔ مگر آپ اپنے رب کا نام یاد کریں، مشرق و مغرب کا مالک وہی ہے۔ اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ نہ کوئی نافع ہے، نہ ضار، نہ حاجت روا، نہ ہمہ دان، نہ ہمہ بین، نہ ہمہ توان، نہ قادر مطلق، نہ علیم کل اور نہ مشکل کشا، فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ہ اسی کو اپنا کار ساز پکڑو۔ مادی وسائل کو اختیار کرو مگر ان پر بھروسہ نہ کرو۔ بھروسہ صرف خدا کی

ذات پر کرو۔ وہ چاہے گا تو اثر پیدا کر دے گا۔ ورنہ سارے اسباب و صرے کے دھرے رہ جائیں گے اور کوئی کامیابی سنیں ہوگی لہذا کار ساز اُسی کو بناؤ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو گویا یہ اصول بتائے جا رہے ہیں کہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے قیام لیل کرو۔ تہمیت حاصل کرو۔ اپنے رب کا نام یاد کرو، تاکہ تجلی الہی کے ساتھ تعلق قائم ہو۔ مشرق و مغرب کا خدا ایک ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اُسی کو کار ساز سمجھو، مادیت پرستین مت رکھو، مخلوق میں سے کسی چیز پر بھروسہ مت کرو۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اگلی آیات میں دوسرے اصول بھی بیان فرمائے ہیں۔

وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَبِيلًا ⑩

ترجمہ :- اور اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ صبر کریں اُن باتوں پر جو مخالفین کہتے ہیں۔ اور

آپ خوش اسلوبی کے ساتھ ان سے کنارہ کش ہو جائیں ⑩

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے پانچ باتیں بیان فرمائیں تھیں۔ اس درس میں چھٹی بات کا تذکرہ ہوگا۔ گزشتہ پانچ امور کی تفصیل یہ ہے۔

گزشتہ سے پورے

(۱) قیام الیل :- ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے پہلا حکم قیام الیل کا دیا ہے۔ اور نبی علیہ السلام کو ارشاد ہوا کہ آپ رات کا مکتوڑ حصہ نماز کے لیے وقت کریں۔ رات کا مکتوڑ حصہ رات کے اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے اور انسانی عمر کے اعتبار سے بھی۔ ابتداء میں حکم یہ تھا کہ آپ رات کا نہ یا دمہ حصہ عبادت کریں اور مکتوڑ حصہ آرام کریں۔ لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی رات کو عبادت کرتے رہتے تھے۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے آسانی پیدا فرمادی۔ چنانچہ دوسرے رکوع میں ارشاد ہوا کہ آپ رات کو اس قدر قیام کریں جس قدر میسر ہو، مگر یہ قیام ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جنہوں نے دنیا میں کام کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنا ہے، انقلاب برپا کرنا ہے۔ یہ اُن کی تربیت کا سامان کیا جا رہا ہے اور اُن کو مہذب بنانے کا ذریعہ ہے تاکہ انسانی کائنات اپنے رب کے ساتھ درست ہے۔

اگر مکتوڑ حصہ سے مراد عمر کا حصہ لیا جائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ آپ تندرستی اور توانائی کی حالت میں قیام الیل کا اہتمام کریں۔ اور عمر کے کسی حصے میں اگر بیماری آجائے، یا بڑھاپا لاحق ہو جائے تو پھر ضروری نہیں ہوگا عام حالات میں آپ قیام الیل کرتے رہیں۔

(۲) ترتیل قرآن :- اللہ تعالیٰ نے دوسرا حکم یہ دیا کہ قیام الیل کے وقت قرآن پاک کو ترتیل کے ساتھ پڑھیں۔ ترتیل سے مراد ہے، واضح واضح، ٹھہر ٹھہر کر اور الفاظ کی مکمل ادائیگی کے ساتھ پڑھنا تاکہ اس تلاوت کا دل پر اثر ہو۔

(۳) ذکر الہی: تیسرا حکم ذکر الہی کا دیا "وَ اذْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ" اپنے رب کا نام لیں، اللہ تعالیٰ کا اسم پاک یاد کریں تاکہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی تجلی کے ساتھ تعلق قائم ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر اسم اور ہر صفت اُس کی کسی نہ کسی تجلی کو واضح کرتی ہے، لہذا اُس کا ذکر کرنا اس کی تجلی کے ساتھ تعلق قائم کرنا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا "اَيَّامَاتٍ دُعُوا فِيْهَا اِلَٰهَ السَّمٰوٰتِ الْحُسْنٰی" اُسے جس نام سے بھی یاد کرو، اُس کے سامنے نام بھلے ہیں۔ رحمان کے نام سے یاد کرو یا رحیم یا غفار سے یا اُس کے ذاتی نام اللہ کے ساتھ یاد کرو، یہ اس کی صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۴) علیحدگی: چوتھا حکم یہ دیا "وَتَبْتَئِلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا" یعنی باقی چیزوں سے الگ ہو کر صرف اسی کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ علیحدگی بھی ضروری ہے تاکہ دل جمعی حاصل ہو۔ جب دن کے وقت دوسرے امور کی سرانجام دہی کرنا ہوتی ہے تو تنہائی میسر نہیں آتی۔ مگر رات کو قیام کے ذریعہ سے یہ علیحدگی حاصل ہو سکتی ہے اور ہر شخص تمام اشغال سے فارغ ہو کر قیام لیل کی صورت میں کچھ وقت اپنے رب کو یاد کرے۔

(۵) تربیت: پانچویں بات یہ ارشاد فرمائی کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے تربیت ضروری ہے۔ اس تربیت کے ذریعے ہی انسان مہذب، شائستہ اور انقلاب برپا کرنے کا اہل ہو سکتا ہے۔ غیر مہذب اور غیر تربیت یافتہ شخص صحیح انقلاب نہیں لاسکتا۔ بلکہ وہ فساد کرے گا، برائی کو پھیلانے کا سبب بنے گا جس کی اصلاح نہیں ہوگی، اُس کی مغفرت بھی نہیں ہوگی۔ "وَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ" اس کے لیے ایمان اور اصلاح کی ضرورت ہے اور حالات کی درستگی بھی لازمی ہے جیسا دوسری جگہ فرمایا "وَاَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ" ایک دوسرے کے ساتھ بھی تعلق درست کرو۔ سوائی کو بھی درست رکھو اور اپنے آپ کو بھی تہذیب یافتہ بناؤ۔

یہ بالکل ابتدائی سورۃ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی تربیت فرماتے ہیں کہ یہ یہ کام کرو تاکہ تمہاری تربیت ہو سکے جس کے نتیجے میں آخرت میں خدا تعالیٰ کی رضا اور تقرب حاصل ہوگا اور دنیا میں بھی اصلاح احوال ہوگا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ اللہ ہی کو مالک اور متصرف کائنات سمجھو مشرق و مغرب یعنی قیصر و کسریٰ کا مالک وہی ہے۔ یہ قیصر و کسریٰ والے تو جھوٹے لوگ ہیں کفر و شرک میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" اُس کے سوا کوئی معبود نہیں

”فَاتَّخِذْهُ وَكِيدًا“ لہذا اُسی کو اپنا کار ساز بناؤ۔ مادیت پر بھروسہ مت کرو۔ کیونکہ مومن اور کافر میں یہی فرق ہے۔ کافر مادے پر بھروسہ کرتا ہے اور مومن اللہ پر توکل کرتا ہے۔ اسباب تو سب ہی استعمال کرتے ہیں مومن بھی، کافر بھی اور دہریے بھی، مگر مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان اسباب پر اعتماد نہیں کرتا، ان کو کار ساز نہیں سمجھتا بلکہ کار ساز حقیقی اللہ ہی کو سمجھتا ہے۔ برخلاف اس کے کافر تلوار پر اعتماد کرتا ہے مگر مومن کا عقیدہ یہ ہے کہ تلوار فتح حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے، فتح اللہ کے ہاتھ میں ہی ہے ”وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ“ مدد و معاونت اللہ ہی ہے۔ البتہ اس مادی جہان میں (PHYSICAL WORLD) میں ہوتے ہوئے ظاہری اسباب کو ترک نہیں کرتا کہ یہ حرام ہے، مگر اسباب پر اعتماد نہ رکھو۔ جیسے کھانا پیٹ بھرنے کا سبب ہے مگر علت نہیں۔ یہ سمجھنا کہ روٹی سے ہی پیٹ بھرنے کا یا پانی ہی سے سیرابی ہوگی، درست نہیں ہے۔ بلکہ ہر شے میں اللہ تعالیٰ کا حکم اور اس کا ارادہ کار فرما ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ تو ظاہری اسباب میں اثر پیدا کر دے گا۔ یہ نہ سمجھو کہ شفا دینے والی دوائی ہے بلکہ لَا شَافِيَ إِلَّا هُوَ شفا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دوائی کا استعمال تو ظاہری سبب ہے دوائی میں اثر پیدا کرنا مالک الملک کے قبضہ قدرت میں ہے۔ لہذا اُسی کو ہی اپنا کار ساز بناؤ۔ یہ تمام باتیں تربیت کے ضمن میں بیان کر دیں جو کہ اللہ تعالیٰ کا ان آیات میں پانچواں حکم ہے۔

صبر کی تقنین

(۶) صبر :- اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے چھٹی بات یہ فرمائی وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ اے پیغمبر علیہ السلام! آپ صبر کریں ان باتوں پر جو مخالفین کہتے ہیں۔ نبی علیہ السلام کو خطاب کر کے بات آپ کے ساتھیوں کو سمجھائی جا رہی ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے ”وَأَصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ“ یعنی آپ صبر کریں اور خدا سے صبر کی توفیق مانگیں۔ کیونکہ اُس کی توفیق کے بغیر صبر بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ کا پاک کلمہ موجود ہے۔ اس کے ذریعے سے بھی اللہ سے توفیق طلب کی جاتی ہے۔

اہم غزالی فرماتے ہیں کہ صبر کے تین محل ہیں، پہلا محل مصیبت کی آمد پر ہوتا ہے، اُس وقت صبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جزع فزع نہ کرے بلکہ تکلیف کو برداشت کرے۔ جس انسان کا تعلق

اللہ تعالیٰ کے ساتھ قوی ہوگا، وہ برداشت کرے گا۔ وہ سمجھے گا کہ یہ سب تصرف خدا تعالیٰ کا ہے کیونکہ مصیبت کو لانا اور اُس کو ہٹانا اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ لہذا جس کا عقیدہ درست ہوگا اس کا تعلق اللہ کے ساتھ قائم ہوگا، اور وہ صبر کرے گا۔ اور جس کا تعلق خدا تعالیٰ سے محذور ہوگا یا بالکل نہیں ہوگا اور وہ معصیت میں ڈر رہا ہوگا، وہ صبر نہیں کر سکے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ مصیبت کے آنے پر صبر کرو اور اسے برداشت کرو۔ دوسری جگہ فرمایا "وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ" یعنی مصیبت کے وقت صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ نماز تعلق باللہ کا قوی ذریعہ ہے۔ اسی ضمن میں مزید حکم ہوا کہ مصیبت کے وقت یوں کہا کرو "وَأَنَا لِلَّهِ وَرَأَا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" یعنی ہم اللہ ہی کا مال ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ دنیا کی ہر چیز فانی ہے کُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَئِنَّ اللَّهَ

تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونا چاہیے۔
 حضور علیہ السلام نے فرمایا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُولَى صبر وہ ہے جو مصیبت کے آنے پر پہلے کیا جائے۔ اگر مصیبت آنے پر جزع فزع شروع کر دی، بے صبری کا اظہار کیا۔ اور بعد میں تھک مار کر کہا کہ اچھا صبر ہی ہے۔ تو یہ کوئی صبر نہیں۔

صبر کے تین مادے

صبر کا پہلا مادہ تو وہی ہے جو پہلے بیان ہوا یعنی مصیبت کے آنے پر صبر کا اظہار کرنا ان معانی میں کہ مصیبت کو لانے والا اور اسے دور کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تو اس لحاظ سے صبر بہت بڑی چیز ہے۔ ملتِ ابراہیمی اور دینِ اسلام میں صبر بڑے بڑے اصولوں میں سے ہے۔ صبر، شکر، ذکر، تعظیم شعاۃ اللہ یہ سب بڑے بڑے اصول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
 إِنَّمَا يُوفِي الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ یعنی صبر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ بے حد و شمار اجر عطا فرمائے گا۔

صبر کا دوسرا مادہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنا ہے۔ خدا کی اطاعت بغیر صبر کے نہیں ہو سکتی۔ صبر کے بغیر نماز نہیں پڑھ سکتا، حج نہیں کر سکتا، روزہ نہیں رکھ سکتا۔ تو گویا اپنے آپ کو اطاعت پر جمانا اور ثابت قدم رہنا صبر کا دوسرا مادہ ہے۔

اہم غزالی فرماتے ہیں کہ تیسرا مادہ اپنے نفس کو برائی اور معصیت سے روکنا ہے۔ نفس ہمیشہ آزادی چاہتا ہے اور برائی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ”إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ“ لہذا نفس کو انسانی خواہشات اور برائی سے روکنا صبر ہے۔ ارشاد ربانی ہے ”وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَلَهُى النَّفْسُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ“۔ یعنی جو شخص خدا کے سامنے کھڑا ہونے یعنی محاسبے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا، تو اس کا ٹھکانا جنت المادوی ہوگا۔

مخالفین کی جن باتوں پر صبر کی تقین کی گئی ہے، وہ کیا ہیں۔ مثلاً پہلی سورتوں میں گزر چکا ہے کہ وہ کہتے تھے ”إِنَّكُمْ لَمَجْنُونُونَ“ یعنی آپ نعوذ باللہ مجنون ہیں۔ حالانکہ خدا کا نبی عقل الناس یعنی تمام نوع انسانی سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے۔ تمام لوگوں سے زیادہ دانشور، دانا اور ذہین ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس قدر ذہانت نبیوں کو عطا کرتا ہے، باقی مخلوق کو اس کا عشر عشر بھی نہیں دیتا۔ مگر مخالفین آپ کو دیوانہ کہتے تھے۔ اور جب دیکھتے تھے کہ کیا دیوانوں کے حالات، نظریات، خدمت خلق اور عبادت ایسی ہوتی ہیں تو پلٹ کر کہہ دیتے تھے کہ آپ کا ہن ہیں۔ جب دست شناسی کرنے والوں سے مقابلہ کیا، جو انتہائی خود غرض اور جھوٹے ہوتے ہیں تو پھر بھی بات نہ بنی کیونکہ آپ کے اخلاق حمیدہ تو روز روشن کی طرح عیاں تھے، لہذا شاعر کہہ دیا۔ یہ شخص شاعری کرتا ہے اور اس کا کلام بڑا موثر ہے مگر جب شاعروں والی صفات بھی نہ پاسکے تو شاعر یعنی جادوگر کا خطاب دے دیا۔ کسی بد بخت نے کہہ دیا کہ اس پر جادو کیا گیا ہے۔ ”إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا“ کہنے لگے یہ سحر زدہ آدمی ہے، اس کی بات نہ مانو۔

مخالفین بعض اوقات معبود برحق کے بارے میں طعن کرتے۔ کبھی پیغمبر کی ذات اور آپ کی جماعت پر طعن کرتے۔ جب مومن پاس سے گزرتے تو ان پر ٹھٹھا کرتے۔ جیسے فرمایا ”إِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ“ یعنی کافر ایک دوسرے کو اشارے کرتے۔ اور کہتے یہ حوروں کے خاوند جا رہے ہیں، جنت کے مالک جا رہے ہیں۔ کپڑے پھٹے ہوئے رہنے کے لیے گھر نہیں ہیں مگر جنت کے مالک ہیں۔ اس قسم کے تمسخر کرتے اور بیہودہ باتیں بناتے۔ اسی لیے فرمایا کہ آپ مخالفین کی باتوں پر صبر کریں۔

مخالفین کی ایذا رسانیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”لَتَسْمَعَنَّ مِنَ الَّذِينَ آوَوْا إِلَيْكَ مِنَ قَبْلِكَ ۚ وَمِنَ الَّذِينَ آمَنُوا كُفَرًا“ یعنی مسلمانوں کو اہل کتاب اور مشرکین کی زبانی بڑی

مخالفین کی الزام تراشیاں

مخالفین کی ایذا رساتیاں

مکلیف وہ باتیں سننی پڑیں گی، مگر اس کا علاج یہی بتایا ان تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا کہ اگر تم صبر کرو گے خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے، بُرائی کا جواب نیکی سے دو گے۔ بد اخلاقی کا جواب حسن اخلاق سے دو گے، تو پختہ بات یہ ہے کہ تم کامیابی سے ہم کنار ہو جاؤ گے۔

ایذا رسانی کی مثالیں آج کے زمانے میں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد احمد آباد میں ایک انگریز نے اپنے کتے کا نام ”احمد“ رکھا (العیاذ باللہ) اس بد بخت کے خلاف ساری دنیا میں احتجاج ہوا اور آخر میں اس نے معافی مانگ لی، افسوس کا اظہار کر دیا (I AM SORRY) مجھے علم نہ تھا، میں آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ یہ محض ایذا پہنچانے والی بات تھی، ورنہ اسے کس چیز کا علم نہ تھا۔ جس پاک ذات کو دنیا کے کر دڑ کا انسان اپنا رہبر و راہنما مان رہا ہے وہیں اور جس کا چہرہ چاہتا ہے درمیان بھی ہوتا ہے، کیا اُس کا تمہیں علم نہیں تھا۔

اسی طرح ایک خبیث جرمنی انگریز نولڈک نامی گذرا ہے، اُس نے کہا کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ محمد کو مرگی کے دورے پڑتے تھے اور اس دورے کی حالت میں وہ جو کچھ بڑبڑاتے تھے اسے لوگوں نے قرآن بنالیا (معاذ اللہ) یہ تو آج کے تعلیم یافتہ دور کی باتیں ہیں اور اُس وقت کے مشرکین تو تھے ہی جاہل وہ پیغمبر علیہ السلام کے متعلق طرح طرح کی بیہودہ باتیں بناتے تھے۔ کبھی کہتے مَا لَہَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْسُحُ فِي الْأَسْوَاقِ یعنی یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

اُن کے نزدیک کھانا پینا اور چلنا پھرنا محبوب بات تھی، اُن کا خیال تھا کہ نبی کوئی فرشتہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر زمین میں بسنے والے فرشتے ہوتے تو ہم فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیتے، لیکن زمین پر چونکہ انسان آباد ہیں، اس لیے اُن کی طرف نبی بھی انسان ہی آئے گا۔ کیونکہ انسان دوسری جنس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اسوۂ نہیں پکڑ سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ یعنی تمہارے لیے رسول بہترین نمونہ ہے۔ تو بہر حال مخالفین اس قسم کی باتوں سے ایذا پہنچاتے تھے۔

الغرض ان تمام تر الزام تراشیوں اور ایذا رسانیوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا کہ آپ صبر کریں وَاصْبِرْ لَهُمْ وَهَجْرًا جَمِيلًا یعنی آپ

ان کو اچھی طرح چھوڑ دیں، ان سے الگ ہو جائیں اور ایک حد تک قطع تعلق کر لیں۔ مگر اچھے اور احسن طریقے سے یعنی لڑائی بھڑائی سے نہیں بلکہ اس طریقے سے ”لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِی دین تمہارے لیے تمہارا سلسلہ اور ہمارے لیے ہمارا طریقہ ہے مطلب یہ کہ علیحدگی بھی اختیار کرنی ہے تو ہجراً جمیلاً“ والی، منہب اور شائستہ لوگوں والی، لڑائی جھگڑا تو جاہلوں کا شیوہ ہے لہذا اِذَا خَاطَبَهُ الْجَاهِلُونَ قَالَ اَسْلَمَا یعنی جاہلوں کے پاس سے وفار کے ساتھ گزر جاؤ اور کہہ دو کہ بھائی! تم اپنا کام کرتے رہو، ہم اپنا کام کریں فَاَعْمَلْ اِنْتَا عَمَلُكَ“ نتیجہ خود بخود سامنے آجائے گا کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون لہذا خوش اسلوبی کے ساتھ علیحدگی اختیار کریں۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ یہ اُن سے ترک تعلقات بھی ظاہر اکریں اور دل میں یہ خیال کریں کہ اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت ہی دے دے تو اچھا ہے۔ دل سے قطع تعلق نہ کریں۔ دل سے ان کے لیے ہدایت کی دعا ہی کریں۔ نیز لوگوں کے سامنے اُن کی بدسلوکی کا شکوہ بھی نہ کریں۔ ہاں اللہ کے حضور التجا کر سکتے ہیں کہ انہوں نے یہ تکلیف پہنچائی ہے۔ عوام کے سامنے شکوہ نہ کریں۔ کہ ہجر جمیل کے منافی ہو گا۔ ہاں! قطع تعلق کے باوجود جب بھی موقع ملے خیر خواہی کی بات کرتے رہو، کلمہ حق کہتے رہو، اور ان سے اظہار ہمدردی کرتے رہو کہ اسی کا نام ہجر جمیل ہے۔

یہاں پر ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ صبر کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں ابھی پوری طاقت نہیں ہے۔ ابھی جماعت کی تربیت اور تنظیم کی ضرورت ہے، اس کی طرف توجہ دیں اور ان کی تکالیف پر صبر کریں۔ دوسری جگہ موجود ہے۔ ”قُلْ لَهُمْ كُفُوًا اِیْدِیْكُمْ وَاَقِمْوُ الصَّلٰوةَ“ یعنی ان سے کہا گیا کہ ابھی ہاتھ نہیں اٹھانا، مقابلہ نہیں کرنا۔ بلکہ نماز پڑھتے رہو۔ تربیت حاصل کرو اور جماعت کو منظم کرو۔ جب یہ مراحل طے ہو جائیں گے اور مقابلے کے قابل ہو جاؤ گے، تو اس وقت مقابلہ بھی ہو گا اور ان کو سزا بھی دی جائے گی۔ تو گویا مہجی زندگی کا سارا دور تنظیم و تربیت کا دور ہے۔ اور اس کے بعد آخری مرحلہ مدینہ طیبہ میں ہجرت کا آیا۔ بنیوں کی زندگی میں ہجرت آخری موڑ ہوتا ہے۔ اب ہر چیز بدداشتت سے باہر ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ وطن، مال، جائداد ہر چیز کو چھوڑا جا رہا ہے۔ ”اِذْ لِلَّذِیْنَ یُقْتُلُوْنَ بِاَنفُسِهِمْ ظُلُمًا“

جماعتی تنظیم کی اہمیت

اور اب ان مظلوموں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ ظالموں کا محاسبہ کریں اب ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے۔ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ پہنچ کر تنظیم و تربیت کا کام مکمل ہوا، تو مقابلہ کی اجازت دی گئی۔ مہی دور میں بدداشت اور صبر و تحمل کی تلقین ہی کی گئی کیونکہ جماعت منظم نہیں تو مقابلہ میں شکست کی صورت میں مشن ہی ختم ہونے کا ڈر ہے۔ ہر چیز کی کامیابی کا ایک معین وقت ہوتا ہے۔ لہذا آپ کو ارشاد ہوا کہ فی الحال آپ ہجر جمیل اختیار کریں، جب موقع آئے گا تو مقابلہ کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔

المزمل ۳،
آیت ۱۱ تا ۱۴

تَبٰرَكَ الَّذِیْ
دَرَسِ سُوْم ۳

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِيَ النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ⑪ إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا
وَجَحِيمًا ⑫ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ⑬ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ
وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ⑭

ترجمہ :- اور آپ مجھے چھوڑ دیں اور ان جھٹلانے والے اصحاب نعمت کو، اور انہیں تھوڑی سی

مہلت دیں ⑪ بے شک ہمارے پاس بیڑیاں اور جہنم کی آگ ہے ⑫ اور گلے

میں اٹکنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے ⑬ جس دن زمین اور پہاڑ کانپنے لگیں

آگے اور پہاڑ ریت کے منتشر ٹیلے ہو جائیں گے ⑭

گذشتہ سے پورے

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے وہ چھ اصول بتائے ہیں جن کے ذریعے دنیا میں انقلاب

برپا کیا جاسکتا ہے۔ اس انقلابی پروگرام کے متعلق سورۃ توبہ اور سورۃ فتح میں ارشاد ہے

”وَالَّذِي أَرْسَل رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ

الْمُشْرِكُونَ“ (یعنی اس پروگرام پر عمل کرنے کے لیے اللہ نے اپنے رسول کو مبعوث فرمایا ہے۔

تاکہ اس کو سارے دینوں کے مقابلے میں غالب کر دے۔ ان مبینہ اصولوں میں رات کا قیام، قرآن

پاک کو تمیل سے پڑھنا، رب تعالیٰ کے اسم کو یاد کرنا، کچھ علیحدگی اختیار کرنا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ

تعلق کو قوی بنانا، خدا تعالیٰ کو مالک اور متصرف سمجھنا، اُس کو معبود بہ حق جاننا اور اُسی کو کارساز سمجھنا۔

اور ایک اہم اصول صبر کا کہ اس راستے میں جو بھی تکلیف آئے اُس کو برداشت کرنا اور لوگوں سے

احسن طریقے سے علیحدگی اختیار کرنا شامل ہیں۔

مکذبین کے لیے مہلت

اب اگلی آیات میں مخالفت کرنے والے لوگوں کے متعلق ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِيَ النَّعْمَةِ یعنی آپ مجھے چھوڑ دیں اور ان جھٹلانے والوں

اور دولت والوں کو بھی چھوڑ دیں۔ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا اور انہیں تھوڑی سی مہلت دیں۔

مطلب یہ کہ مجھے چھوڑ دیں، میں ان سے خود سمجھ لوں گا یعنی سزا دوں گا۔ آپ ان کے متعلق

جلد بازی نہ کریں اور یہ خیال نہ کریں کہ ان کو فوراً سزا ملنی چاہیے، یہ میرا کام ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ" آپ کا کام خدا کا پیغام پہنچانا ہے، مجرموں کو سزا دینا ہمارا کام ہے۔ ہم اپنی تحت کے مطابق سزا دیں گے۔

سزا کے دو طریقے ہیں۔ حق کے پروگرام کی مخالفت کرنے والوں کو دنیا میں بھی سزا ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو یونہی نہیں چھوڑ دیں گے۔ کیونکہ یہ مکذب ہیں۔ بعض اوقات اللہ دنیا میں ہی جہاد کے ذریعے سزا دے دیتے ہیں یا پھر کسی دوسرے خارجی ذریعہ یعنی افتاد اور مصیبت کی صورت میں سزا مل جاتی ہے۔ اور آخرت کی سزا تو ابھی باقی ہے۔ وہ آگے چل کر ملے گی۔

تو فرمایا آپ ان جھٹلانے والے صاحب دولت لوگوں کو چھوڑ دیں۔ کہ سچے عقیدے اور سچے دین کی مخالفت میں یہی لوگ پیش پیش ہوتے ہیں۔ ہم ان سے بات پرس کریں گے۔ دنیا میں بھی ان کو مصیبت میں مبتلا کریں گے اور آخرت میں بھی جواب طلبی ہوگی۔ یہ کہتے ہیں کہ "نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ" یعنی ہمارے پاس مال و اولاد کی فراوانی ہے ہمیں کوئی سزا نہیں مل سکتی۔ قرآن پاک میں موجود ہے "الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ" یہ لوگ مال جمع کرتے اور گنتے رہتے ہیں۔ انہیں آرام و آسائش کی ساری چیزیں میسر ہیں۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، قیامت کے عقیدے کو جھٹلانے والے مترفین ہیں یعنی آسودہ حال لوگ ہیں۔ فرمایا آپ ان کو چھوڑ دیں "إِنَّ كَذِبَنَا أُنْكَارًا وَبَحْثِنَا هَمَزٌ" ہمارے پاس بیڑیاں اور جہنم کی آگ ہے۔ "وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ" اور گلے میں اٹکتے والا کھانا ہے۔ "وَعَذَابًا أَلِيمًا" اور دردناک عذاب ہے۔ ہم ان کو ان میں مبتلا کریں گے۔

یہ آسودہ حال لوگ جو توحید، قیامت اور رسالت کو جھٹلاتے ہیں، یہ ہمیشہ سب سے پہلے تکذیب کرنے والوں میں ہوتے ہیں۔ نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر اللہ نے جتنی بھی قوموں کا ذکر کیا ہے۔ اولین مکذبین یہی دولت مند ہوتے ہیں۔ وہ خیال کرتے تھے کہ سردار ہی کا حق ہمارا ہے۔ ہم انسان کو رسول کیسے مان لیں۔ اور کیوں اس کی اطاعت کریں لوط علیہ السلام کی قوم نے کہا "إِنَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" ہم اس ایک انسان کا اتباع کیسے کریں۔ جب کہ اسے کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں۔ ہمارے پاس ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ اور یہ فلاں فلاں ہے۔

ہو و علیہ السلام کی قوم نے کہا "مَا نَرِي لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ" تمہاری کوئی برتری بھی ہم نہیں دیکھتے۔ ہمارے مقابلے میں تمہارے پاس نہ مال و دولت ہے۔ نہ حکومت ہے، نہ فوج ہے۔ گویا اس طرح مال و دولت اکثر لوگوں کو بہکانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اولین متبعین غریب
لوگ ہوتے ہیں

بخاری شریف کی حدیث میں ابوسفیانؑ اور ہرقل کا مکالمہ منقول ہے۔ ہرقل نے پوچھا کہ جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اُس کے پیچھے لگنے والے کیسے لوگ ہیں۔ یعنی بڑے لوگ ہیں یا کمزور۔ ابوسفیانؑ نے کہا کہ کمزور لوگ ہیں۔ ہرقل عیسائی ملک رکھتا تھا۔ پہلی کتابوں کا عالم تھا، اس نے فوراً کہا وَهُمْ أَتْبَاعُ الرَّسُولِ یعنی رسولوں کے تابعدار ابتدا میں ایسے ہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ جب کوئی طریق کار نہیں رہ جاتا تو امیر لوگ مجبور ہو کر آخر میں اسلام کی دعوت قبول کرتے ہیں۔ جو آخر تک پیغمبر کی بات کو نہیں مانتے، وہ مقابلہ کرتے ہیں اور ہلاک ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں فرعون، ہامان اور نمرود وغیرہ کا حال مذکور ہے۔ یہی لوگ اولی النعمۃ ہیں۔

سرمایہ پرستانہ ذہنیت

مکے کے بڑے بڑے مخالفین ابوجہل، ولید، ابوسفیان وغیرہ ایس سال تک مقابلہ کرتے رہے۔ آخر میں جب اور کوئی راستہ باقی نہ رہا، تو پھر یا ہلاک ہوئے یا اسلام کا راستہ اختیار کیا۔ یہی دولت مند لوگ تھے جنہوں نے حضور نبی علیہ السلام کا انکار کیا۔ ایسے ہی سرمایہ دار لوگ ہوتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ دولت کو نعمت نہیں سمجھتے، نہ حقوق ادا کرتے ہیں، نہ اس کو حاصل کرنے کے لیے جائز ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ یہی سرمایہ پرستانہ ذہنیت ہے آج کے دور میں امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی وغیرہ اسی ذہنیت کا شکار ہیں۔ اُن کا واحد مقصد حصول زر ہے۔ اُن کے ہاں ذرائع آمدن میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں۔ جیسا کہ پہلی سورۃ میں گزر چکا ہے "تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ يَاجِرٌ" جمع فاعلی "دوخ" ایسے ہی لوگوں کو بلائے گی جو منہ پھیر کر پیچھے ہٹنے والے اور ہر طریقہ سے مال جمع کرنے والے ہیں۔ اور سمیٹ سمیٹ کر رکھنے والے ہیں۔

ہاں اگر ذرائع آمدن جائز ہوں اور اس میں سے حقوق بھی ادا کیے جائیں، تو ایسا شخص سرمایہ پرست نہیں ہوگا، بلکہ خدا پرست ہو جائے گا۔ قرآن کریم میں متعدد جگہ ارشاد ہوا ہے "لَا تَأْكُلُوا

اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ یعنی باطل طریقوں سے ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد بھی ہے اَتَقُوا اللَّهَ وَاجْعَلُوا فِي الطَّلَبِ رَوْزَ كَارٍ کے حصول میں جائزہ راستہ اختیار کرو۔ حرام راستے کے ذریعے مال مرت کماؤ۔ ہمارے ہاں تو عام طور پر ذرائع آمدنی میں الشورنس، بنکاری، قلم اندٹری، قمار بازی ہے۔ شراب کے لائسنس، فوٹو گرافی، مجسمہ سازی، گانا بجانا جیسی معروف چیزیں ہیں۔ یہ تمام ذرائع ناجائز اور حرام ہیں۔

حقوق العباد

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تک ان ناجائز ذرائع سے چھٹکارا حاصل نہ ہو، سوائی ط کی حالت ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اکابر صدارہ میں گداگری، چوری، ڈاکہ، دھوکہ فریب سب کچھ شامل ہیں۔ ایک اچھی حکومت کا فرض ہے کہ ناجائز ذرائع کو ختم کر کے جائزہ ذرائع مہیا کرے، جن سے دولت کما کر حقوق بھی ادا کئے جائیں۔ مگر یہاں تو حقوق بھی ادا نہیں کئے جاتے، دولت کو تقسیم نہیں کیا جاتا، وراثت کی تقسیم صحیح نہیں ہوتی، لوگ وصیت نہیں کرتے۔ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے جو فرض ہے، قربانی نہیں کرتے جو واجب ہے۔ صدقہ فطر ادا کرنے میں پس و پیش کرتے حقوق واجبہ ادا نہیں کرتے "وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ قُرْبَتٌ" داروں، مسکینوں اور مسافروں کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ "وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ" سائل اور محروم کو حق نہیں دیتے حالانکہ ان دولت مندوں کے مال میں اللہ تعالیٰ نے حق مقرر کر رکھا ہے جو شخص کھانے میں قانون خداوندی کی پابندی کرتا ہے وہ خرچ کرنے میں بھی سرمایہ پرستانہ ذہنیت سے نکل جاتا ہے۔ وہ خدا پرست ہو جاتا ہے۔ یہ سرمایہ دار سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے حق کا اتباع کیا تو ہمارے ذرائع ختم ہو جائیں گے۔ یہود کی مخالفت کی بھی یہی وجہ تھی۔ وہ سرکشی کرتے تھے یہود و نصاریٰ اپنی زبان سے کہتے تھے کہ اگر ہم نے اس نبی کا اتباع کیا تو ہماری ریاست ختم ہو جائے گی۔ مدینے کا سود خوار یہودی کعب بن اشرف سب سے زیادہ مخالفت کرتا تھا۔ کیونکہ اس کا سودی کاروبار سائے عرب میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسلام قبول کرنے سے اسے کاروبار سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ حضور علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا کہ آج

سے سارا سود مٹا دیا گیا ہے۔ آج کے بعد کسی کو سود لینے کی اجازت نہیں۔ جو دیا ہوا ہے، وہ ختم ہے۔ صرف اصل رقم واپس لینے کا حق ہے۔ تو گویا اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرنے والے سرمایہ دار سچائی کی مخالفت کرتے ہیں۔

ہر جمعہ کے خطبہ میں آپ سنتے ہیں۔ ”اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِيتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ الْبَغْيِ“ یہ سب کیا ہے اس میں تین چیزیں مثبت ہیں اور تین منفی احسان کرنا ضروری ہے۔ مگر یہ لوگ بنی نوع انسان کے ساتھ احسان نہیں کرتے یہ دولت کو عیاشی، فحاشی اور ذاتی خواہشات کی تکمیل پر صرف کرتے ہیں۔ حکومتیں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔ اپنے ذاتی عیش و آرام کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔ قوم عادی کے لوگ کیوں مخالفت کرتے تھے۔ ہود علیہ السلام نے فرمایا، تم نے یہ بڑی بڑی عمارت بنائی ہوئی ہیں، مینار اور گنبد بنائے ہیں۔ بے تحاشا دولت صرف کی ہے۔ فرعون بھی یہی کرتا تھا۔ اُس زمانے میں عام انسان کو بیل اور گدھے کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ اُن سے کام لیا جاتا تھا مگر اُن کا حق ادا نہیں کیا جاتا تھا۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں قیصر و کسریٰ کی یہی حالت تھی۔ ان کے سرور عیش کرتے تھے اور عام انسان ظلم کی چکی میں پستے تھے۔ وہ آج بھی مظلوم ہیں۔ آپ کے ملک میں سیکریٹریٹ کی تعمیر پر اربوں روپیہ صرف ہوا ہے، تھوڑے پینتالیس کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے۔ اُس زمانے میں بھی یہی کچھ تھا۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ کوئی بڑا آدمی اس سے کم پر راضی نہیں ہوتا تھا کہ اُس کا باغ ہو، عمدہ حمام ہو، بڑی بلڈنگ ہو، نوکر چاکر ہوں۔ ان لوازمات کے حصول کے لیے جائز و ناجائز کی تمیز ختم کر دی جاتی تھی۔ لوگوں کو حیوانوں کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ ایسی باتیں ہیں۔ جن پر مؤاخذہ ہو گا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ صحیح نظام قائم ہو جائے تو قیام پل کرنے والی جماعت جو اللہ پر ایمان رکھتی ہے اور اس کے پروردگار پر عمل پیرا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک سمجھتی ہے، ایسے سرمایہ پستوں سے جواب طلبی کرے گی۔ اور انہیں سزا دے گی۔ اُن سے پوچھا جائے گا کہ انہوں نے لوگوں کے حقوق کیوں تلف کئے۔ جائز و ناجائز کا امتیاز کیوں روا

نہیں رکھا، یہ تو دنیا میں جواب طلبی ہوگی اور آخرت میں اور برزخ میں خدا تعالیٰ سزا دے گا۔
 صاحب حکومت لوگ تو بگڑے ہوئے ہوتے ہیں، یہ لوگ صحیح نظام کس طرح قائم کر سکتے
 ہیں۔ درست نظام تو وہ قائم کریں گے، جن کا تعلق خدا کے ساتھ درست ہوگا۔ ایسے نظام کو قائم
 کرنے کے لیے جماعت کی ضرورت ہے، اس جماعت کے افراد کی تربیت کی ضرورت ہے۔ آپ
 پہلی سورۃ میں پڑھ چکے ہیں کہ ان لوگوں کو سزا ملنے کی کیا وجہ ہے۔ ارشادِ ربانی ہے ”اِنَّهٗ كَانَ
 لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝ وَلَا يَحْضُ عَلٰی طَعَامِ الْمَسْكِيْنِ“ یعنی یہ بد بخت دوزخ
 میں اس لیے جا رہے ہیں کہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے
 تھے حکمِ کریم تھا ”وَ اذْكُرْ اِسْمَ رَبِّكَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ“ یعنی خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ مگر
 انہوں نے تو کئی معبود بنائے تھے۔ مذہبی لوگوں کی ناکامی کی وجہ بھی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی۔
 ”قَوْلِیْ لِلْمُصَلِّیْنَ“ ایسے نمازیوں کے لیے جہنم ہے جو صحیح معنوں میں خدا کے انصاف پر یقین نہیں
 رکھتے ”وَلَا یَحْضُ عَلٰی طَعَامِ الْمَسْكِيْنِ“ اور مسکینوں کے ساتھ ہمدردی نہیں کرتے۔ طعام
 میں کھانا، پینا، پہننا اور دیگر تمام ضروریات شامل ہیں قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں
 گے کہ اے دولت مند! میں جہان تھا تو نے میری جہانی نہیں کی۔ میں بیمار تھا تو نے بیمار پرسی نہیں
 کی۔ انسان حیران ہوگا کہ گَا اَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ تو تو رب العالمین ہے، بے نیاز ہے، تو کیسے بھوکا پیاسا
 ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میرا فلاں بندہ بھوکا تھا۔ تو نے اس کو کھانا
 نہیں دیا۔ فلاں بندہ پیاسا تھا، فلاں بیمار تھا۔ اور یہ کمزور آدمی مسافر بن کر تمہارے پاس آیا تھا تم
 نے جہانی نہ کی۔ اگر تم اس کی جہانی کرتے۔ تو تم کو میری رضا حاصل ہوتی۔ اور آج کامیابی سے ہم کنار
 ہوتے۔ حکم ہوگا، پکڑو ان کو، بیڑیاں ڈالو، اور جہنم میں ڈال دو۔ اس دن اس طرح فیصلے ہوں گے
 کھانے کا معاملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بنیادی حقوق ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے
 قرآن پاک کی آیات بتاتی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بہشت میں رکھا، تو فرمایا۔
 ”اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوعَ فِیْہَا وَلَا تَعْرٰی ۝ (۱۸) وَاَنْتَ لَا تَظْمَا فِیْہَا وَلَا تَصْحٰی ۝ (۱۹)“
 چار چیزیں بیان فرمائیں کہ اے آدم (علیہ السلام) یہاں تم کو بھوک نہیں لگے گی۔ تمہارے کھانے
 کا سامان ہوگا۔ پیاسے نہیں ہو گے، یہاں پانی ملے گا، بے ہنہ نہیں ہو گے، لباس ملے گا۔

انسان کے بنیادی حقوق

اور یہ کہ دھوپ نہیں لگے گی، تمہیں سہنے کے لیے جگہ ملے گی۔ یہ چار حقوق ہو گئے۔ یہ چار باتیں ترمذی شریف کی روایت میں بھی مذکور ہیں ان کے علاوہ تعلیم اور صحت دو باتیں اور ہیں۔ یہ کل چھ باتیں آج بھی عالمی اداروں میں بنیادی حقوق تسلیم کی جاتی ہیں۔ آج امریکہ والے اور میکسیکو والے بنیادی حقوق کی بات کرتے ہیں یہ تو چودہ سو سال پہلے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی تھیں۔ کوئی شخص ان حقوق سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ ہر شخص کو سہنے کے لیے جگہ چاہیے۔ اُسے ضروری تعلیم حاصل ہونی چاہیے۔ اور اس کی صحت کی حفاظت کی ضمانت ملنی چاہیے۔ اُس کی خوراک اور لباس کا بندوبست ہونا چاہیے۔ مگر آج یہ حقوق انسان کو نہیں ملتے۔ ایک طبقہ ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور دوسرے محروم رہتے ہیں۔ ہمیشہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔ دوسری طرف اشتراکی نظام میں اگر بیگاری کا سدباب کیا گیا ہے تو وہ ایمان کے پروگرام کو سکرے ختم ہی کر دیتے ہیں۔ اس نظام کی بنیاد ہی انکارِ خدا اور دہریت پر ہے۔

دین اسلام میں دونوں چیزیں ملتی ہیں۔ یہاں تعلق باللہ پہلی منزل ہے پہلے اپنا تعلق خدا کے ساتھ درست کرو۔ اپنا تعلق خدا کی تجلی کے ساتھ جوڑو۔ اس کے بعد بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی کرو۔ ایسی ہمدردی جو تعلق باللہ پر مبنی ہو۔ اشتراکی ہمدردی کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ ابتدائی سورتیں ہیں ان میں یہ تمام اخلاقیات کی تعلیم موجود ہے۔ یہ سارا پروگرام انہیں مکی سورتوں میں ملتا ہے۔ جہاں ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے میں ساری بات سمجھا دی گئی ہے۔ آگے مدنی سورتوں میں پوری تفصیل آئے گی۔

الغرض اولی النعمۃ کے لفظ کے ذریعہ واضح کر دیا کہ یہ وہی دولت مند لوگ ہیں۔ جو حق کو جھٹلانے والے ہیں۔ غرور، فرعون، ابوجہل، یہ سب اولی النعمۃ کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہی لوگ بنیوں کا مقابلہ کرنے والے، توحید کے منکر اور بنی نوع انسان کے ساتھ ظلم کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ ہمدردی اور احسان جیسی پسندیدہ چیزوں سے ناواقف ہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمہ فرماتے ہیں کہ انبیاء کی بعثت کا ایک اہم مقصد لوگوں کے درمیان سے

ظلم کا سدباب

ظلم کو مٹانا ہے۔ ہر شخص کو انصاف میسر ہو۔ آج ہی نوع انسان ظلم کی چکی میں پس رہی ہے۔ مگر اس ظلم کو مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص کھانے پینے، پہننے اور رہائش جیسے بنیادی سامان سے آراستہ نہ ہو، وہ آخرت کے متعلق کوئی فکر نہیں کر سکتا وہ تو انہیں چیزوں کے حصول میں مصروف ہے گا، آخرت کی تیاری کب کرے گا۔

لہذا ایک سچے نظام میں انسان ان بنیادی ضرورتوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ ایسا نظام جس میں عدل و انصاف کی حکمرانی ہو اور جس میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کو جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیا گیا ہو۔

انسانی ہمدردی کا پروگرام

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِي يَبِيتُ شَبْعَانَ وَجَارَهُ اِلَى جَبَلٍ جَاوِعٍ۔ تم میں سے کوئی صحیح ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک تمہارا پڑوسی بھوکا ہو۔ اور تم پیٹ بھر کر کھاؤ۔ یہی ظلم ہے۔ پڑوسی بھوکا ہے اور تم سوتے ہوئے ہو۔ یہ منافقوں کا ایمان ہے۔ اس سے بھی یہی مراد ہے کہ ایسا نظام رائج ہونا چاہیے جس میں کوئی بھوکا پیاسا نہ ہے۔ کوئی مظلوم نہ ہو اور ایک کو عدل و انصاف میسر ہو۔

یہ دولت مند مکتدبین اپنی عیش و عشرت میں محو ہیں، انہیں دوسروں کی کیا فکر ہے۔ ان سے باز پرس ہوگی۔ صحیح نظام وہ ہوگا جو خلافت راشدہ کے نمونہ پر ہوگا، وہی نظام جو عمر بن عبدالعزیزؒ نے قائم کیا۔ اور ہندوستان میں ناصر الدین التمشؒ نے اپنایا۔ تاریخ میں موجود ہے کہ التمشؒ کی بیوی نے کہا کہ مہمان بہت آتے ہیں، کھانا پکانے کے لیے کوئی نوکر عطا کر دیں، تو سلطان نے کہا، کہ دنیا میں تکلیف برداشت کر لو، تاکہ تمہاری آخرت اچھی ہو جائے۔ اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کر کے مہمانوں کو کھلاؤ۔

مکتدبین کے لیے سزا

فرمایا چھوڑ دو مجھے اور جھٹلانے والوں کو، جو دولت مند ہیں۔ ان کو تھوڑی سی مہلت اور مے دو۔ یہ مہلت دنیا کی مہلت ہے۔ جب تک ایسی جماعت کا نظام نہ قائم ہو جائے، جو کہ مطلوب ہے۔ اِنَّ كَذِبًا اَنْكَالًا وَجَحِيْمًا ہمارے پاس ایسے لوگوں کے لیے بیڑیاں ہیں، اور جہنم ہے۔ وَطَعَامًا ذَا عَصَصَةٍ اور گلے میں اٹکنے والا کھانا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب دوزخی تھوہریا زقوم کا لقمہ حلق میں ڈالے گا تو وہ سو سال تک وہیں اٹکا ہے گا۔ اس کو

نیچے اتارنے کے لیے جب پانی کا گھونٹ پئے گا تو وہ ایسا گرم ہوگا، جو آنٹوں کو کاٹ کر نیچے پھینک
 دیجئے۔ وَعَذَابًا اِیْمًا اور فرمایا اسکے علاوہ طرح طرح کا عذاب الیم ہوگا مجرموں کو ذلت کے ساتھ بیڑیاں
 پہنائی جائیں گی۔ اور یہ اس دن ہوگا یَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ جس دن زمین اور پہاڑ
 کانپنے لگیں گے، وَكَانَتْ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا اور پہاڑ ریت کے ٹیلے کی مانند منتشر ہو
 جائیں گے، جس طرح ہوا کا جھونکا آتا ہے۔ تو ریت کا ٹیلہ بکھر جاتا ہے اسی طرح پہاڑ بھی بکھر جائیں
 گے۔ اس دن ان مذبہین کو اور اولی النعمۃ کو سزا ملے گی۔ کیونکہ یہ انسانیت کے دشمن ہیں۔ انہوں نے
 اپنا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست نہیں کیا۔ اور مخلوق کے ساتھ بھی احسان نہیں کیا۔

تذکرہ الدینی

المزمّل ۷۳

درس چہارم ۴

(آیت ۱۵ تا ۱۹)

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا
 ①۵ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ①۶ فَكَيْفَ
 تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ①۷ السَّمَاءُ مَنفُطَةٌ
 كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ①۸ إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمِنْ شَاءِ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ
 سَبِيلًا ①۹

ترجمہ: بیشک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جو شہادت دینے والا ہے تمہارے اوپر جیسا
 کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا ①۵ پس فرعون نے اس رسول کی مخالفت کی تو ہم نے فرعون
 کو پکڑ لیا وبال والا پکڑنا ①۶ پس تم کیسے بچو گے اگر تم نے (توحید و رسالت کا) انکار کیا اس
 دن سے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا ①۷ اس دن آسمان پھٹ جائے گا اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو کہ
 رہیگا ①۸ بے شک یہ نصیحت کی باتیں ہیں لہذا جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف راستہ بنالے ①۹

گذشتہ سے پیوستہ

اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں چند اہم اصول بیان فرمائے، اس کے بعد مخالفت کرنے والے مکذبین
 کا ذکر فرمایا اور کہا "وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِيَ النَّعْمَةِ" یعنی آپ چھوڑ دیں مجھے اور ان مکذبین
 کو جو نعمت والے ہیں۔ اور انہیں بھڑکی سی مہلت دیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان کے ساتھ ابھی مقابلہ
 نہیں کرنا ہے، بلکہ صبر کرنا ہے، آپ برداشت کریں، میں خود ان کو سزا دوں گا۔ ان لوگوں سے
 جواب طلبی ہوگی جس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس جماعت کے ذریعے باز پرس کریں گے جن کی تربیت
 سابقہ اصولوں کے مطابق آپ کریں گے۔ یہ چھ اصول ہیں جو اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔
 انہی اصولوں کی روشنی میں انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے لہذا فی الحال آپ اپنی جماعت کو تیار کریں۔

شاہد رسول

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اور اصول کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ إِنَّا أَرْسَلْنَا
إِلَيْكُمْ رَسُولًا بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے شَاهِدًا عَلَيْكُمْ
 جو شہادت دیتا ہے تمہارے اوپر۔ شہادت کا ایک معنی تو یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ کا

بنی شہادت دے گا۔ جنہوں نے مانا اُن کے بائے میں اور جنہوں نے نہیں مانا اُن کے متعلق بھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا دوسری جگہ ارشاد ہے "جَنَّاتٍ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ الشَّاهِدُ" ہم ہر امت میں سے گواہ لائیں گے اور وہ گواہ بنی ہو گا۔ یہ بھی فرمایا "وَجَنَابُكَ عَلٰی هٰؤُلَاءِ شٰهِدٌ"۔ ان پر ہم آپ کو بھی گواہ بنا کر لائیں گے۔ ایک تو یہ قیامت کی گواہی ہے۔ اور دوسرے حق و صداقت کی گواہی ہے۔ جو حضور علیہ السلام کے سپرد کی گئی ہے۔ شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ "رَسُولًا شَهِدًا عَلَیْكُمْ" کا معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں بتلانے والا اور آگاہ کرنے والا ہے۔ تمہیں تعلیم دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلم بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔

اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے مثال دی ہے۔ "کَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا"۔

موسیٰ علیہ السلام
سے مماثلت

جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ یعنی فرعون کی طرف موسیٰ علیہ السلام کی بعثت بھی اس وجہ سے تھی کہ وہ کذب تھا۔ اور اولی النعمۃ میں سے تھا، بڑا جابر اور ڈکھڑکھڑا، بڑا ظالم بادشاہ تھا۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دو قوموں کی طرف بھیجا تھا۔ ایک بنی اسرائیل جو آپ کا اپنا خاندان تھا۔ اور دوسرے قبیلۂ جو مصر کے اصلی باشندے تھے اور جن میں فرعون بھی شامل تھا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام تو براہ راست بنی اسرائیل کی طرف ہی مبعوث تھے، اور فرعون کو صرف پیغام پہنچانا مقصود تھا۔ مگر یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن پاک میں صاف موجود ہے۔ "فَقَدْ هَدٰی اِلٰی اَنْ تَزٰکَہُ وَ اِهْدٰی اِلٰی رَبِّکَ فَتَخْشٰی"۔ جب موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس پہنچے تو یہ فرمایا۔ جیسے سورۃ شعراء میں آتا ہے۔

"فَقَوْلًا اِنَّا رَسُوْلٌ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"۔ ہم دونوں بھائیوں کو رب العالمین نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اور فرعون کے سامنے کہا کہ تیرے اندر پاک ہونے کا کوئی جذبہ موجود ہے کہ میں تیری راہنمائی کروں۔ تاکہ تو ہدایت پا جائے۔ "فَكَذَّبَ وَعَصٰی" فرعون نے تکذیب کی اور نافرمانی کی۔

جس طرح مکے کے سرداران حضور علیہ السلام کے مکذبین تھے۔ اسی طرح فرعون بھی موسیٰ علیہ السلام کا مکذب تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ بات اشارۃً بتادی کہ جو حشر فرعون مکذب کا ہوا تھا، مکے کے مکذبین

کا شتر بھی اُس سے مختلف نہیں ہو گا۔

موسیٰ علیہ السلام سے مماثلت کی بعض دوسری وجوہات بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اور موسیٰ علیہ السلام کی امت کے حالات بھی ملتے جلتے ہیں۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے اپنی امت کے بارے میں فرمایا کہ تم بھی اسی طرح بگڑو گے جس طرح یہود و نصاریٰ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم بگڑی تھی تم بھی اُن کے نقش قدم پر چلو گے۔ اور اُن سے مشابہت اختیار کر دو گے۔ لَتَتَّبِعَنَّ سُنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَذًّا وَاجْذُوبًا کُلِّ اِشْيَیْ اِیَّیْہِمْ اِذَا جِئْتُمْہُمْ مِنْ اَمَامِہُمْ۔ (سورہ ابراہیم: ۴۱)۔
 دوسرے کے ساتھ مشابہہ ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے حالات بھی موسیٰ علیہ السلام سے ملتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر نبی اور رسول اور صاحب خلافت بھی ہیں۔ اُن کو اللہ تعالیٰ نے نظام حکومت عطا فرمایا تھا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور صاحب خلافت بھی۔ جس قسم کی مخالفت کے حالات موسیٰ علیہ السلام کو پیش آئے۔ اسی قسم کے حالات سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوچار ہوئے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرنے والے دولت مند لوگ تھے تو آپ کا مخالفت بھی یہی طبقہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے مخالفین میں ملوک بھی تھے۔ تو حضور علیہ السلام کے زمانے میں بھی قیصر و کسری تھے۔ اُن کی سلطنتوں کو درہم بہم نہ دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے پروگرام میں شامل تھا، ابوجہل، ابولہب اور دیگر مخالفین اگرچہ ملوک نہیں تھے تاہم یہ بھی اُن کے قائم مقام تھے، ان کی ذہنیت بھی سرمایہ دارانہ تھی۔ ان کے مکانات تھے، تجارت تھی، خزانے دولت دے رکھی تھی۔ تو فرمایا ابھی اُن کے ساتھ مقابلہ ہے۔ اس کے بعد ملوک کی بارہی آئے گی اور اُن کے ساتھ جہاد کی منزل آئے گی۔

اس کے ساتھ ایک دوسری حقیقت بھی سمجھا دی گئی کہ ”وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ اُولِيَ النَّعْمَةِ“ آپ ان دولت مند مکذبین کو چھوڑ دیں، کیونکہ میں ان کو سزا دوں گا۔ ”اِنَّ لَدَيْنَا اَنْكَالًا وَحَجِیْمًا“ یہ مجرم ہیں، آپ جلد بازی نہ کریں، لڑائی بھی نہ کریں، ابھی جنگ کی منزل نہیں آئی بلکہ تیاری کی منزل ہے۔ ابھی جماعت تشکیل دینے اور اُسے تربیت دینے کی منزل ہے، اُن کو اکٹھا کرنے کی منزل ہے۔

جماعتی تنظیم کی ضرورت

لَئِنْ كَانَتْ هَٰؤُلَاءِ لَأَكْثَرُ مِمَّنْ لَمَّا كُنْتُمْ فِيهَا ۚ فَاعْبُدُونَهُ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۚ
 ابھی ان سے مقابلہ نہیں کرنا۔ ہم خود ان سے باز پرس کریں گے۔ چنانچہ ان آیات کے نزول کے تیرہ
 برس بعد میدان بدر میں ان لوگوں سے باز پرس ہوئی۔ اور ان کو سزا دی گئی۔

قومی اور بین الاقوامی نبی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک
 حیثیت میں آپ قومی نبی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قریش اور عربوں کی طرف مبعوث فرمایا۔ عربی
 زبان بولتے ہیں۔ عربی زبان میں وحی الہی سنا تے ہیں، عربوں کے ماحول میں رہتے ہیں۔ اور قریش
 کی سعادت آپ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لحاظ سے آپ قومی نبی ہیں۔ جیسا کہ خود قرآن پاک نے
 بیان فرمایا "وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ" یعنی ہم ہر نبی کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجتے
 ہیں۔ آپ کی دوسری حیثیت بین الاقوامی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام اقوام کی طرف مبعوث
 فرمایا، جیسا کہ "قُلْ يَٰ أَيُّهَا النَّاسُ ۖ إِلَيَّ رُشُودُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا" نیز یہ بھی فرمایا
 "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا" یعنی اے نبی کریم ہم نے آپ کو تمام بنی
 نوح انسان کی طرف مبعوث فرمایا۔ تو گویا پہلی حیثیت سے آپ قومی نبی (NATIONAL PROPHET) ہیں

اور دوسری حیثیت میں بین الاقوامی (INTERNATIONAL PROPHET) ہیں۔

غلیہ اسلام بذریعہ
 اسلامی فتوحات

شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی تصریح یوں فرمائی ہے کہ بنی ایک ایسا شخص ہے
 یہ ساری غیر محدود اقوام کا خود مقابلہ نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ تو اس کا طریقہ یہ
 ہے کہ بنی پہلے اپنی قوم کے لوگوں کو تربیت دے جب یہ لوگ اصلاح پذیر ہو جائیں تو انہیں لوگوں
 کو اپنا جارح بنائیں یعنی ان لوگوں کو اپنا دست بازو بنائیں، اسے آج کل کی زبان میں مجلس عاملہ
 (WORKING COMMITTEE) کہہ سکتے ہیں۔ اور انہیں لوگوں کے ذریعے دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کریں

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ حضور علیہ السلام کے اپنے زمانہ مبارک میں عرب میں انقلاب آیا، کفر و شرک
 ختم ہوا اور مرکز اسلام قائم ہو گیا۔ بیرون عرب لڑائیوں میں سے صرف ایک غزوہ بنو نضیر میں آپ
 نے شرکت فرمائی۔ ایک ہزار میل کا سفر طے کیا، آپ کے ساتھ تیس ہزار، چالیس ہزار یا کسٹھ ہزار

صحابہ کرامؓ تھے، تین مختلف روایات ہیں۔ واقعہ کی روایت کے مطابق تترہ ہزار آدمی تھے۔ باقی بیرونی دنیا سے معرکہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ہوا۔ قیصر دوسری سے مقابلہ خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں ہوا۔ اسی طرح ایران حضرت عمرؓ کی خلافت میں سعد بن ابی وقاصؓ کی کمان میں فتح ہوا۔ یہ قادیسہ کی جنگ مشہور ہے۔ جو تین دن تک لڑی گئی۔ یہ ایسی زبردست جنگ تھی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ تین دن رات متواتر لڑائی ہوئی اور آخر ایران فتح ہوا۔ یہ کسریٰ کی شکست تھی، البتہ قیصر چھ صدیاں بعد مغلوب ہوا۔ اگرچہ عرب علاقوں یعنی مصر، شام، فلسطین، حمص وغیرہ میں قیصر مغلوب ہو چکا تھا مگر خود روم ترکوں کے عہد میں مغلوب ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا تھا کہ جب کسریٰ ہلاک ہوگا، تو کوئی دوسرا کسریٰ نہیں کھڑا ہوگا، اور جب قیصر ہلاک ہوگا تو کوئی قیصر نہیں اٹھے گا۔ لیکن وَالرُّومُ ذَوَاتِ الْقُرُونِ یعنی عیسائی قرناً بعد قرن آئیں گے۔ ان سے مسلمانوں کی ٹکڑے جاری ہے گی حتیٰ کہ ان کا آخری حصہ مسیح علیہ السلام کے ساتھ لڑائی کرنے کے لیے تیار ہوگا اور تباہ ہو جائے گا۔ تو گویا عیسائی مسیح علیہ السلام کے زمانے میں جا کر مکمل طور پر مغلوب ہوں گے۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ قرب قیامت میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچے گی۔ پھر جب مسیح علیہ السلام کا زمانہ آئے گا۔ تو دنیا میں کفر باقی نہیں ہے گا وَيَكُونُ الْدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ اور صرف اللہ کا دین ہی باقی رہ جائے گا۔ الغرض اگرچہ بطور دلیل اسلام ہر زمانے میں غالب رہا مگر سیاسی غلبہ اسے خلفائے راشدین کے زمانے میں حاصل ہوا، اس زمانے میں کسی دوسری قوم کو مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی، وہ دب کر رہتے تھے یا صلح کر لیتے تھے۔

کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ میں ایسی خلافت بخشوں گا۔ کہ دین مستحکم ہوگا یہ اُسی زمانے کا جما ہوا دین ہے۔ جو آج تک آرہا ہے۔ اگر اُس زمانے میں دین اسلام کو راسخ حاصل نہ ہوتا۔ تو بعد میں تو بڑی خرابیاں پیدا ہو گئیں، مسلمان خلافت کو ترک کر کے ملوکیت کی طرف واپس آ گئے۔ درمیان میں کوئی اچھا آدمی آگیا تو حالات بہتر ہو گئے۔ بہر حال دین مٹا نہیں کیونکہ خلفائے راشدین کے زمانے میں اسے مستحکم کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے يَسْتَكِينُ لَهُمْ دِينُهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ

چنانچہ اس دور کا مستحکم شدہ دین ہی اب تک چل رہا ہے۔

الغرض بنی علیہ السلام کو تسلی دی جا رہی ہے۔ کہ دیکھو! موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ دولت مند طبقہ سے تھا، حالانکہ اُن کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کی مالی حیثیت کچھ نہ تھی۔ نہ اُن کے ساتھ کوئی جماعت تھی۔ لیکن انقلاب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ برپا کیا۔ اتنے بڑے دشمن کو نیست و نابود کیا۔ اس مثال سے سمجھانا یہ مقصود ہے۔ کہ عرب کے قریش اگرچہ ملوک نہیں ہیں، مگر ان کی ذہنیت سرمایہ دارانہ ہے۔ فرعون کی طرح بالآخر یہ بھی مغلوب ہوں گے۔ ان کی دنیا میں بھی گرفت ہوگی، جیسا کہ مقام بدر پر ہوئی اور آخرت میں بھی سزا ہوگی۔

از نکاز دولت

از نکاز دولت بجائے خود ایک لعنت ہے۔ جہاں یہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے، وہاں مال کے جمع کرنے میں حلال و حرام کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ اور خرچ کرنے میں مستحقین کے حقوق ادا نہیں کیے جاتے۔ اسی لیے اسلام نے اس ذہنیت کو ناپسند کیا۔ اسلام نے دولت کے از نکاز سے منع کیا ہے اور تقسیم کا حکم دیا ہے۔ ”کَلَّا لَا يَكُونُ دَوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ“ تاکہ یہ دولت امیر طبقہ میں ہی گردش نہ کرتی ہے بلکہ اس کا بہاؤ غریب، مساکین، یتامی کی طرف ہونا چاہیے، مال سے اپنی جائز ضروریات پوری کرنا فطری امر ہے۔ مگر دولت اپنے پاس مہر تکرر کرنے کے مت رکھو۔ ایسا کرو گے تو اولی النعمۃ کے گروہ میں شامل ہو جاؤ گے۔ ”جَمَعَ فَأَوْجَعِيَ“ کی زد میں آ جاؤ گے، ”جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ“ میں پڑے جاؤ گے۔ یہی وہ ظالمانہ ذہنیت ہے جسے اسلام ختم کرنا چاہتا ہے۔ اسی ذہنیت سے حرص پیدا ہوتی ہے اور دوسرے کی ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ یکسر ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

سود کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے سود کے متعلق فرمایا ”يُحَقِّقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرِي الصَّدَقَاتِ“۔ یعنی اللہ تعالیٰ سود کو گھٹاتا ہے۔ اور صدقہ خیرات کو بڑھاتا ہے یعنی اس کا اجر دگن تگن کر دیتا ہے۔ سود خور کی ذہنیت ایسی بیان فرمائی جیسے کسی کو جن چٹا ہوتا ہے۔ اور آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سود خور کو اپنی دولت سے غرض ہوتی ہے، انسانی ہمدردی سے یکسر محروم ہوتا ہے ان سا ہمو کار مہاجرین کو دیکھو، جو سود حاصل کرنے کے لیے کسی غریب بڑھیا کی جھونپڑی تک نیلام کر لیتے ہیں۔ حالانکہ جس کے پاس لاکھوں روپیہ ہو، وہ کسی قرض خواہ کو کچھ غرض نہ دیتا ہے۔

سکتا ہے کہ وہ قرض چکا سکے۔ مگر یہاں تو خود عرضی انتہا کو پہنچ جاتی ہے کہ غریب شخص سائے سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ** یعنی ایک مومن دوسرے کے حق میں عمارت کی اینٹوں کی مانند ہے۔ کہ ایک دوسرے کی مضبوطی کا باعث ہوتی ہیں۔ اسی طرح مومن بھی ایک دوسرے کا سہارا ہوتے ہیں۔ اس کی مثال انسانی جسم کے خلیات کی بھی ہے میڈیکل سائنس والے بتاتے ہیں کہ انسانی جسم میں چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی مانند خلیات ہیں جن میں خون، رطوبت وغیرہ جاتے ہیں۔ یہ خلیات اسی وقت تک درست رہتے ہیں جب تک وہ اپنی ضرورت کے مطابق مادہ حاصل کرتے ہیں۔ اگر یہ خلیات ضرورت سے زیادہ خون اکٹھا کرنے لگیں گے، تو جسم میں ورم آجائے گا۔ اور جسم کا وہ حصہ بیمار ہو جائے گا، جہاں خون کی مقدار ضرورت سے زیادہ جمع ہو جائے گی۔ یہی حال ارتکاز زر کا ہے۔ جب یہ کسی جگہ ضرورت سے زیادہ جمع ہو جائے گا اور حرام و مکروہات میں صرف ہو گا، تو نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ جسم میں ورم آجائے گا۔ اور اس کی اصلاح کی ضرورت پیش آئے گی۔

فرعون کی ہلاکت

تو ارشاد ہوتا ہے۔ بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک عظیم الشان رسول بھیجا ہے۔ آپ کی بعثت کی پیش گوئی تو رات میں آج بھی موجود ہے۔ کہ ”اے موسیٰ! میں تیرے بھائی بندوں میں سے تیرے جیسا ایک رسول برپا کروں گا، اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔“ بھائی بندوں سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ لہذا فرمایا تمہاری طرف اسی طرح رسول بھیجا ہے۔ جس طرح فرعون کی طرف موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ **فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ** پس فرعون نے رسول کی مخالفت کی۔ اسی طرح اے مکہ والو! تم بھی اپنے رسول کی مخالفت کر رہے ہو مگر یاد رکھو جس طرح اس مخالفت کی پاداش میں **فَاَخَذْنَاهُ أَخَذًا وَبِيلًا** ہم نے فرعون کو پکڑ لیا۔ اسی طرح تمہیں بھی آخر کار اپنے رسول کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہو گا۔ **اَخَذًا وَبِيلًا** سے مراد وبال والا پکڑنا ہے یعنی سخت ہلک گرفت میں لیا ہے۔ اور پھر فرعون کو نہ صرف موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے غرق کیا

بلکہ اُس کی لاش کو آئندہ آنے والوں کے لیے باعث عبرت بنا دیا۔ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ
لَتَكُونَ لِمَنْ خَلَقَكَ آيَةً اور اُسے پانی سے باہر نکال کر رکھ دیا۔ تو مجھے والوں کو فرمایا
فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ یعنی اگر تم نے دین حق، توحید و رسالت کا انکار کیا، تو کیسے بچو گے۔
اُس دن سے یَوْمَئِذٍ يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ رِثِيًّا جو اپنی شدت کی وجہ سے بچوں کو بوڑھا کر دے گا
السَّمَاءُ مُنْقَطِعَةٌ اُس دن آسمان پھٹ جائے گا۔ پہلے درپچے درپچے ہو گا، پھر درہم بہم ہو
جائے گا۔ نیا آسمان اور نئی زمین قائم ہوگی، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، اس دن کان وَعْدُهُ
مَفْعُولٌ اللہ کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔

دوزخیوں کی غالب
اکثریت

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو طلب کریں گے۔
تو آدم علیہ السلام کہیں گے لَبَّيْكَ یعنی اے اللہ میں حاضر ہوں۔ اللہ فرمائے گا۔ اٹھو اور جہنم والوں
کو الگ کر دو۔ آدم علیہ السلام عرض کریں گے، کہ اے مولا کریم! دوزخ میں جانے والے کون لوگ ہیں۔
حکم ہو گا، ہزارہ میں سے نو سو ننانویں۔ یہ سن کر صحابہ کہ تم پر نشان ہو گئے کہ کل مخلوق میں اتنی کثرت
دوزخیوں کی ہوگی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اے ایمان والو! تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ کیونکہ اس تعداد
میں یا جوج ماجوج بھی شامل ہیں۔ ایک انسان کے مقابلے میں یا جوج ماجوج کی تعداد ۹۹۹ ہے۔ یہ
بھی انسانوں کے ساتھ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ آج بھی دنیا کی کل پانچ ارب آبادی میں سے سو چار
ارب کافر ہیں جو جہنمی ہیں۔ ایمان والے آج بھی اقلیت میں ہیں کل آبادی کا پانچواں حصہ یا اس سے
بھی کم۔ مزید یہ کہ اہل ایمان میں سے بھی صحیح ایمان والے قلیل ہی ہیں، اکثریت تو مکذبین کی ہے۔
الغرض فرمایا کہ اُس دن حالت یہ ہوگی کہ السَّمَاءُ مُنْقَطِعَةٌ آسمان پھٹ جائے گا۔
زمین بھی اپنی حالت پر قائم نہیں رہے گی۔ پہاڑ پھٹ جائیں گے۔ سارا نظام درہم بہم ہو جائے گا۔
اس کے بعد نئی زمین پیدا ہوگی، اُس پر محاسبہ ہو گا۔ اور کان وَعْدُهُ مَفْعُولٌ خدا کا وعدہ
برحق ہے، اُس دن پورا ہو جائے گا۔

یہ تمام حقائق بیان کرنے کے بعد فرمایا إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ یہ نصیحت کی باتیں

قرآن پاک کی نصیحت

میں اس سورۃ مبارکہ میں بیان کی گئی ہیں۔ اللہ کا اپنی لوگوں کو یاد دلانا ہے اور نصیحت کرنا ہے کہ
 قیام میل کرو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق درست کرو علیحدگی میں خدا کا ذکر کرو۔ اُسی کو کارساز بناؤ
 مصیبت کے وقت صبر کرو۔ حقوق ادا کرو۔ قیامت آنے والی ہے۔ بڑا انقلاب آنے والا ہے۔ اگر
 کفر کرو گے تو بیچ نہیں سکو گے۔ لہذا مَنْ شَاءَ اخذْ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا جو شخص چاہے اپنے
 رب کی طرف راستہ بنائے۔ کیونکہ اس کی آخری منزل اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی ہے۔ اس لیے اُسے
 وہی راستہ اختیار کرنا ہو گا جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے، اُسی راستے پر چل کر انسان اپنے رب کے
 ہاں مسرور ہو سکتا ہے ورنہ اس کا حال وہی ہو گا۔ جو اِنْ كَفَرْتُمْ میں بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنْتَ تَقُومُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثِي الْاَيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ
مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الْاَيْلَ وَالنَّهَارَ ۖ عَلِمَ اَنْ لَّنْ خُصُوهُ
فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاَقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ
مَّرْضٰی ۚ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۚ
وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاَقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ

ترجمہ۔ بے شک آپ کا پروردگار جانتا ہے کہ آپ اور آپ کے صحابہ میں سے کچھ لوگ۔
— دو تہائی رات کے قریب اور کبھی نصف رات اور کبھی ایک تہائی رات قیام کرتے ہیں۔

— اور اللہ تعالیٰ ہی رات دن کا اندازہ کرتا ہے اللہ جانتا ہے کہ تم اس کو پورا نہ کر سکو گے
تو اس نے تمہارے اوپر مہربانی کے ساتھ رجوع فرمایا پس جتنا تمہارے لیے آسان ہو قرآن پاک پڑھ
لیا کرو۔ اللہ۔ جانتا ہے کہ تم میں سے کئی بیمار ہوں گے اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو زمین میں سفر
کریں گے۔ تلاش کریں گے اللہ کا فضل اور کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے
لہذا قرآن پاک میں سے اتنا۔ پڑھو جتنا آسان ہو۔

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے رات کو قیام کا حکم دیا۔ یہ حکم سال بھر تک نافذ رہا۔ اور نماز
تہجد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ پر فرض رہی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں
کہ سورۃ کے پہلے اور دوسرے رکوع کے درمیان بارہ مہینے کا وقفہ ہے۔ اور اس دوران تہجد کی مناسبت
فرض رہی۔ البتہ دوسرا رکوع نازل ہونے پر اس آیت کے ذریعہ فرضیت ختم ہو گئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ
نے آسانی فرمادی، محکمت کے حق میں اس کا استحباب باقی ہے۔ بلکہ تمام نفلی نمازوں میں نماز
تہجد کی فضیلت سب سے زیادہ ہے۔

کیا نماز تہجد
فرض ہے

اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا قیام لیل کی فرضیت صرف امت کے لیے منسوخ ہوئی ہے یا خود پیغمبر علیہ السلام کے لیے بھی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ فرضیت کا حکم نبی علیہ السلام کے لیے منسوخ نہیں ہوا۔ اور اس پر وہ سورۃ بنی اسرائیل کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔
 وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ قَعَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا
 یعنی آپ رات کو قرآن کے ذریعے تہجد ادا کریں کہ یہ آپ کے لیے زاید ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائے گا۔ لہذا یہ نافلۃ لک حضور علیہ السلام کے لیے تو فرض ہے۔ مگر باقی امت کے لیے مستحب ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ اگرچہ حضور علیہ السلام اس نماز کے اجر و ثواب کی وجہ سے اس کا التزام فرماتے ہیں، مگر یہ آپ کے لیے بھی فرض نہیں ہے۔ بہر حال یہ نماز امت کے حق میں استحباب کا درجہ رکھتی ہے۔ اور استحباب بھی ایسا کہ ایک روایت میں حضور علیہ السلام نے فرمایا رُكْعَتَانِ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا یعنی رات کے درمیان دو رکعت نماز دنیا اور ما فیہا سے بہتر ہے۔ اس قدر فضیلت بیان فرمائی ہے۔ مگر فرض نہیں ہے۔

اس کی مثال دوسرے احکام میں ایسی ہی ہے جیسے ابتداء میں عاشورہ کا روزہ فرض تھا۔ پھر بعد میں جب رمضان کے روزوں کی فرضیت نازل ہوئی تو عاشورہ کے روزہ کی فرضیت اُلٹ گئی تاہم اس کا استحباب باقی رہا۔ اسی طرح تہجد بھی ابتداء میں فرض تھی۔ مگر ایک سال بعد اس کی فرضیت ختم کر دی گئی۔

ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُومُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ
 بے شک آپ کا پروردگار جانتا ہے کہ آپ رات کو دو تہائی حصہ یا نصف حصہ یا ایک تہائی حصہ قیام کرتے ہیں اور نہ صرف آپ خود قیام کرتے ہیں۔ بلکہ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ آپ کے ساتھ جو صحابہ کرام کا گروہ ہے، وہ بھی ایسا ہی کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ حکم ابتداء میں سب کے لیے تھا۔ یعنی حضور علیہ السلام کے علاوہ صحابہ کرام بھی

قیام لیل کی تصدیق

کبھی دو تہائی رات، کبھی نصف رات اور کبھی ایک تہائی رات قیام کرتے تھے۔ اور یہ قیام اللہ کے ارشاد **يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ** کی تعمیل میں تھا۔ اور اس کا مقصد تربیت صحابہ تھا جس کے اصول بھی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیے جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمام دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں انقلاب لانا چاہتا تھا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام رات کی نماز میں اتنا لمبا قیام کرتے کہ آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے۔ یہی حال صحابہ کرامؓ کا تھا۔ سردی کے موسم میں بعض اوقات پاؤں بھٹ جاتے تھے، اور اُن سے خون رسنے لگتا تھا۔ آپ کی اور آپ کے متبعین کی یہ حالت تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا انقلابی گروہ

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ دنیا میں انقلاب برپا کرنا اکیلے نبی کا کام نہیں۔ اسی لیے آپ کو ارشاد ہوا کہ آپ ایک جماعت منظم کریں، اس کی تربیت کریں اس کو اپنا جارہ بنائیں۔ تاکہ دنیا میں انقلاب لایا جاسکے۔ چنانچہ **طَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ** وہی گروہ ہے اس گروہ کا ذکر سورۃ فتح میں بھی آیا ہے **مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ** یعنی محمد اللہ کے برگزیدہ اور آخری رسول ہیں۔ اور جن کو آپ کی معیت نصیب ہوئی ہے، اُن کا خاصہ یہ ہے کہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں راہنوں کے درمیان (رحمدل) آگے اُن کے اور اوصاف بھی بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ انہی اصحاب کبار کے متعلق تخفیف کا حکم نازل ہوا کہ بعض اوقات صحابہ کرامؓ اس فکر میں ساری ساری رات بیدار رہتے تھے کہ کہیں دو تہائی یا نصف یا تہائی کے قیام سے محروم نہ رہ جائیں۔ اُس وقت۔ وقت کے اندازے کے لیے گھڑیاں تو ہوتی نہیں تھیں، اس لیے صحابہ کرامؓ فکر مند رہتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ** کہ رات دن کا اندازہ کرنا تو اللہ کے پاس ہے۔ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے اتنے لمبے عرصہ کے قیام میں تخفیف کر دی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ **هُوَ اعْلَمَ أَنَّ لَكُمْ تَخْصُوهُ** یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اُس کو پورا نہ کر سکو گے، یعنی یہ سخت حکم ہے رات کو اتنا لمبا عرصہ قیام کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس کے بعد ان وجوہات کا تذکرہ بھی کر دیا جن کی وجہ سے یہ کام مشکل ہے۔ لہذا ارشاد ہوا۔

نماز تہجد میں تخفیف

فَتَابَ عَلَيْكُمْ اللّٰهُ تَعَالٰی نے تمہارے اوپر مہربانی کے ساتھ رجوع فرمایا ہے تَابَ کا معنی رجوع کرنا ہے۔ توبہ کا بھی یہی معنوم ہے۔ یعنی اللّٰہ تعالیٰ مہربانی کے ساتھ رجوع فرماتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں۔ خطا و لغزش کو معاف فرماتے ہیں۔ یہاں بھی تَابَ کا معنوم یہی ہے۔ کہ قیام میں مہربانی کے ساتھ تخفیف کر دی گئی ہے اب دو تہائی یا نصف یا ایک تہائی رات کا قیام ضروری نہیں ہے بلکہ فَاقْرَءْ وَاَمَّا تَبَسُّوْا مِنَ الْقُرْآنِ یعنی جتنا میسر ہو، تمہارے لیے آسان ہوا اتنا ہی قرآن پاک پڑھ لیا کرو۔

قیام لیل کا اصل مقصد تو تلاوت قرآن پاک ہی ہے اور اس کی بہترین تلاوت وہ ہے جو نماز میں کی جائے، لہذا فرمایا کہ جس قدر ممکن ہو، اسی قدر پڑھ لیا کرو اس سے مراد تہذیب دینا ہے۔ جس کے ذریعے اسلام کو ساری دنیا میں پھیلا نا ہے۔ اس کو خوب ٹھہر ٹھہر کر، واضح واضح پڑھنا ضروری ہے۔ تاکہ اس کا معنوم ذہن میں اتر جائے اور اسے آگے دوسروں تک پہنچایا جاسکے۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے۔ کہ قیام لیل کو اپنے لیے لازم پکڑو، کہ تم سے پہلے نیک لوگوں کی عادت بھی یہی تھی۔ قیام لیل شیطان کو بھگانے، گناہوں کو مٹانے اور قرب خداوندی حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے اور اس کا اصل مقصد بھی اللّٰہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنا ہے۔ اگر تعلق باللّٰہ درست ہو جائے گا تو دنیا میں صحیح کام ہوگا۔ اگر یہی درست نہ ہو تو ہر کام شیطانی منشہ کے مطابق ہوگا، اسی لیے اللّٰہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جتنا ہو سکے قرآن پاک پڑھ لیا کرو۔ اور غافل سرگزن نہ ہو جانا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص کے بارے میں حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا۔ کہ یہ شخص ساری رات سوتا رہا ہے۔ اور بیدار نہیں ہوا، حتیٰ کہ صبح ہو گئی اور سورج نکل آیا۔ آپ نے فرمایا، اس شخص کے کان میں شیطان نے پیشاب کیا ہے۔ یعنی اس پر شیطان کا اثر غالب رہا۔ شیطان ہی دوسرے انداز ہی کرتا ہے، اور جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو آخر میں پیشاب کر کے چلا جاتا ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ نماز تہجد اگرچہ فرض نہیں ہے۔ مگر اس کو ترک نہیں کرنا۔ اسے ادا کرتے رہو

قیام لیل شبیہ
سلف صالحین ہے

شیطانی دوسرہ

خواہ تھوڑا ہی قرآن پاک پڑھو۔

نماز میں
مطلق قرأت فرض ہے

فرض نماز ادا کر لینے سے باز پرس نہیں ہوگی۔ مگر قیام لیل ان لوگوں کے لیے جنہوں نے دنیا میں کام کرنا ہے، ایک حد تک لازم قرار دیا۔ مقصد یہ ہے کہ قرآن پاک کا مطالعہ کریں۔ اس کو سمجھیں تاکہ پروردگار کو آگے چلانے میں آسانی ہو۔ اسی لیے فرمایا فَاقْرَءْ وَامَّا تيسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ جتنا میسر ہو قرآن پاک پڑھ لیا کرو۔

ارکان صلوٰۃ میں قرآن پاک کا پڑھنا ایک رکن ہے۔ جیسے نماز کے دیگر ارکان ہیں تیسرے تحریمہ، رکوع، سجدہ وغیرہ، اسی طرح قرأت، امام ابو حنیفہؒ نے اس آیت سے استدلال کیا کہ نماز میں مطلق قرأت فرض ہے۔ اسی لیے سورۃ فاتحہ نماز کا رکن نہیں ہے بلکہ واجب کے درجے میں ہے۔ خداج والی حدیث بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی اگر سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز ناقص ہوگی، باطل نہیں ہوگی۔ یہ بات دوسری روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ مطلق قرأت یعنی کوئی بھی سورۃ یا آیت پڑھنے سے فرضیت ادا ہو جاتی ہے۔

تخفیف کا جوہات

اس کے بعد وہ وجوہات بیان ہو رہی ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرأت قرآن میں تخفیف کا حکم دیا۔ فرمایا عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَّرْضَىٰ ۖ يَعْنِي اللَّهُ خُوب جانتا ہے کہ تم میں سے کئی بیمار ہوں گے۔ اگر ہر شخص پر تہجد فرض ہوتی، تو بیمار آدمی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا۔ بیماری انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خلاف ہے کہ بیمار آدمی کو کسی کام پر مجبور کیا جائے۔ وہ تو فرائض بھی مشکل سے ادا کرے گا۔ بعض اوقات فرض نماز بھی بیٹھ کر یا لیٹ کر ادا کرنا پڑتی ہے تو اس حالت میں قیام لیل کیسے ممکن ہوگا۔ لہذا بیماروں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو زمین میں سفر کریں گے وَانْخَرَوْنَ يَضُوبُونَ فِي الْأَرْضِ تو سفر کی حالت میں بھی دشواری ہے۔ اگر تہجد فرض ہو تو مسافر مشقت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ بعض اوقات سفر رات اور دن متواتر جاری رہتا ہے۔ تو اس حالت میں تہجد کیسے ادا کریں گے۔ لہذا اس وجہ سے بھی اللہ نے تخفیف فرمائی۔

اب سفر کے کئی مقاصد ہو سکتے ہیں جیسے فرمایا يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ یعنی اللہ کا فضل تلاش کرنے کے لیے سفر کریں گے۔ تلاش فضل سے ایک تو مراد رزق حلال ہے۔ رزق حلال

میں تجارت کرنا، ملازمت پر جانا، مزدوری کرنا یہ سب باتیں ظاہری طور پر فضل میں آتی ہیں۔ باطنی طور پر فضل میں حصول علم، سفر حج و عمرہ یا کسی بزرگ عالم دین سے ملاقات کا سفر ہے۔ کہ اس سے باطنی طور پر اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے تو فرمایا کہ سفر میں ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مشقت میں نہیں ڈالنا چاہتا، لہذا تخفیف فرمادی۔

فرضیت جہاد

نماز تہجد میں تخفیف کی تیسری وجہ یہ بیان فرمائی وَالْخُدُودُ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ یعنی کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ قتال کے لیے نکلیں گے۔ اس حالت میں انہیں تخفیف کی ضرورت ہے۔ قتال میں بھی بڑی مشقت اٹھانا پڑتی ہے۔ اور جہاد فرض ہے اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام ایک انقلابی دین ہے۔ اس لیے عہد مد کی درستج اور امن و امان کے قیام کے لیے جہاد بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً حُضُورِ عَلَيْهِ السَّلَام کا ارشاد ہے۔ الْجِهَادُ مَكْنُصٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ یعنی جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔ کسی عدل کرنے والے کا عدل اور ظلم کرنے والے کا ظلم اسے مٹانے میں سکتا۔ جہاد کو ترک کرنے سے ذلت، مصیبت اور علامی آئے گی، ہر چیز میں خرابی پیدا ہوگی۔ حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جو پہلا خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا، اُس میں فرمایا مَا تَرَكَ قَوْمُ الْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ إِلَّا ضَرَبَهُمُ اللَّهُ بِالْذِّلَّةِ یعنی جو قوم جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ دے گی، ذلیل ہو جائے گی۔

جہاد کا موقع تو اس ارشاد کے تقریباً بارہ سال بعد میدان بدر میں آیا۔ مگر پہلے ہی اس کے لیے تیاری کا حکم دے دیا۔ اور بتا دیا کہ جہاد کا وقت آنے والا ہے۔ اس کے بغیر امن قائم نہیں ہوگا۔ حدود قائم نہیں ہو سکیں گی۔ دین کی حفاظت نہیں ہوگی۔ سرکشوں کی سرکوبی کے لیے جہاد کے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔ اسی لیے فرمایا کہ کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے لہذا اب لمبا قیام سبیل منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اور آسانی دے دی گئی ہے۔ فرمایا فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ لَهَذَا قُرْآنِ پاک میں سے اتنا ہی پڑھو یعنی اُسی قدر قیام کرو، جتنا آسان ہو تاہم اس کا کچھ نہ کچھ حصہ تربیت کیلئے ضروری ہے۔

وَاقِمُْوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاقْرَأُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا وَمَا
تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ وَأَعْظَمُ
أَجْرًا وَاسْتَغْفِرُوا لِلَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَحِيمٌ ⑤

عَلَمٌ

ترجمہ :- اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو قرض دو اچھا قرض اور تم جو بھی نیکی اپنے
لیے آگے بھیجو گے ۔ اسے اللہ کے ہاں پاؤ گے وہ بہتر ہے اور اجر کے اعتبار سے بڑھی ہے
اور اللہ سے معافی مانگتے رہو ۔ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور پُر مہربان ہے ⑤

گزشتہ سے پیوستہ

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت میں تصریح کے ساتھ موجود ہے کہ سورۃ منزل
نزول کے اعتبار سے ابتدائی سورتوں میں سے ہے ۔ اس سورۃ مبارکہ کی بیس میں سے پہلے رکوع
کی اُنیس آیتیں مکی دور کے ابتدائی حصے میں نازل ہوئیں، جب کہ آخری آیت اس کے ایک سال
بعد نازل ہوئی۔ ابتدائی آیات میں قیام لیل کا حکم فرض کے طور پر دیا گیا تھا کہ خود بنی علیہ السلام اور
آپ کے صحابہ جو آپ پر ایمان لائے، وہ دو تہائی رات یا نصف یا ایک تہائی ضرور قیام لیل
میں گزار دیں۔ مگر اس آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ یعنی اللہ تعالیٰ
خوب جانتا ہے کہ تم اس کی پابندی نہیں کر سکو گے، لہذا اس عمل میں تخفیف فرمادی۔ اب یہ
نماز فرض تو نہیں رہی تاہم اس میں اتنی سہولت دے دی کہ فاقئ وَاَمَّا تيسِّرُ مِنَ الْقُرْآنِ
یعنی جتنا میسر آئے، اتنا ہی پڑھ لیا کرو۔ پانچ دس منٹ، آدھا گھنٹہ آدمی و صلوٰۃ کے دور کو
ہی پڑھ لے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے رَكْعَتَانِ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا
وَمَا فِيهَا۔ جوف لیل کے اندر ادا کی گئی یہ دو رکعتیں دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں۔

نماز پنجگانہ کی فرضیت نماز تہجد میں تخفیف کے بعد فرمایا وَاقِمُْوا الصَّلَاةَ یعنی فرض نماز کو ہر حالت میں

قائم رکھو۔ یہ معاف نہیں ہوگی۔ ابتدائے اسلام میں تین نمازیں فرض تھیں۔ یعنی نماز تہجد اور قبل طلوع الشمس و قبل غروب فجر اور عصر کی نمازیں۔ بعد میں نماز تہجد کی فرضیت تو اٹھ گئی، البتہ معراج شریف کے موقع پر پانچ نمازیں فرض ہو گئیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ خَمْسَ صَلَواتٍ فِیْ یَوْمِہٖ وَ لَیْلَہٖ یعنی چوبیس گھنٹے میں یہ پانچ نمازیں ہر مسلمان عاقل و بالغ مرد و زن پر فرض ہیں۔ انہیں قائم رکھو۔ اقامت کا معنی درست کرنا ہے اور اقموا الصلوة سے مراد نماز کو حتی الامکان درست طریقے سے ادا کرنا ہے۔ کہ اس میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ وقت کی پابندی کرو، طہارت کا خیال ہے۔ اس کے شرائط، واجبات، مستحبات وغیرہ سب کو احسن طریقے سے ادا کرو گے تو اقامت ہوگی۔ سنن ابوداؤد کی روایت میں آتا ہے۔ کہ آدمی نماز پڑھ کر فارغ ہوتا ہے۔ مگر اس کا کسی نماز سے صرف دسواں حصہ قبول ہوتا ہے نو حصے لغو ہوتے ہیں۔ بعض آدمیوں کی نماز کا اس سے زیادہ حصہ قبول ہوتا ہے۔ اور بعض کا اس سے زیادہ۔ حتی کہ فرمایا جس کی آدمی نماز قبول ہو جائے، وہ بڑا عظیم المرتبت انسان ہے۔ نماز ہی ایک ایسی عبادت ہے کہ اُمُّ الْعِبَادَاتِ الْمُقَرَّبَةِ اِلَی اللّٰهِ تمام عبادتوں کی جڑ ہے اور اللہ کا قرب دلانے والا عمل ہے۔ لہذا یہ فرض نماز کسی بھی حالت میں فوت نہیں ہونی چاہیے۔ نماز خدا تعالیٰ کی حضور کی اور اس کی طرف متوجہ ہونے کی ایک صورت ہے۔ یہ خدا کے غضب اور ناراضگی کو دور کرتی ہے۔ جس طرح مالک سے بھاگا ہوا کوئی غلام خود بخود واپس آکر اس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو جائے تو مالک کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور آکر کھڑا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا غضب

ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یہ نماز ایک ایسی عبادت ہے۔ جو کہ ہر ایک مسلمان پر فرض کی گئی ہے باقی عبادات مثلاً زکوٰۃ اور حج صرف مالداروں پر فرض ہے۔ ناداروں پر نہیں۔ اسی طرح بیمار اور اندھے پر جہاد فرض نہیں ہے۔ لیس علی الاعنی حرج ولا علی المریض حرج

اس کے بعد اَلتَّوَاتُّوۃ۔ یعنی زکوٰۃ ادا کرو۔ اگر صاحب مال ہو، صاحب نصاب ہو، زکوٰۃ کی فرضیت

سال گزر گیا ہے۔ تو زکوٰۃ فوراً ادا کرو۔ یہ مالی فریضہ ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ مالی فریضہ ہے
 زکوٰۃ بھی مکی دور میں فرض ہو گئی تھی مگر اس کا نصاب اور مقدار مقرر نہیں کی گئی تھی، ہجرت
 کے دو ستر سال زکوٰۃ کا نصاب وغیرہ متعین ہوا۔ اس سے پہلے صرف یہی حکم تھا کہ اپنے مال
 کا کچھ حصہ محتاجوں کی اعانت کے لیے خرچ کرو۔ نصاب زکوٰۃ ساڑھے باون تو لے چاندی یا
 بیس مثقال سونا مقرر ہوا۔ _____ مقدار زکوٰۃ کے طور پر سونے
 اور چاندی کا چالیسواں حصہ، مویشیوں کا نصاب الگ مقرر ہوا۔ اونٹوں کا نصاب پانچ،
 گائے بھینس کا تیس اور بکریوں کا چالیس

زمین کی پیداوار میں سے عیشر یعنی دسواں حصہ اور اگر
زمین میں کان نکل آئے تو پانچواں حصہ نہ کو ادا کی جائے گی۔

نماز کی برکات

نماز کے متعلق فرمایا کہ یہ تعلق باللہ کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ پاکیزگی طہارت، اتفاق و اتحاد فکر کی یکسانیت، انسانی ہمدردی، وقت کی پابندی یہ ہیں وہ دنیوی فوائد جو نماز سے حاصل ہوتے ہیں۔ نماز تہ پڑھنے والے طہارت تک سے محروم ہوتے ہیں۔ کتنی بڑی سعادت ہے جو ان کو نصیب نہیں ہوتی۔ جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتے۔ وہ اتحاد فکر سے محروم ہوتے ہیں۔ صف بندی اتحاد فکر کا ایک بڑا نمونہ ہے۔ نماز ایک عظیم نعمت ہے۔ خدا تعالیٰ کا ذکر ہے۔ اس میں مناجات ہے تعظیم الہی ہے۔ لہذا ارشاد فرمایا **وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ** نماز پابندی سے ادا کرو زکوٰۃ ادا کرنے میں کمی نہ کرو۔ یہ دونوں چیزیں **فَرَضَ** میں داخل ہیں۔

قرض حسن

اس کے بعد فرمایا **وَاقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا** یعنی اللہ کو قرض دو، اچھا قرض۔ یہاں قرض سے مراد قرض حسن بھی ہے۔ اور مطلقاً صدقہ خیرات بھی۔ زکوٰۃ کے علاوہ جو مال اللہ کی رضا کے لیے غریب و مساکین پر خرچ کیا جائے وہ قرض حسن ہے، قرض حسن دینے والے کو پورا اعتماد ہوتا ہے۔ کہ یہ مجھے واپس مل جائے گا۔ یعنی جب مقروض اپنی ضرورت پوری کر لے گا۔ تو قرض کی رقم واپس لوٹائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو جو قرض یعنی صدقہ خیرات کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ اس کا اجر و ثواب بھی اللہ کے ہاں ضرور ملے گا۔ اسی لیے فرمایا **مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا**

حَسَنًا فِضْلُهُ لَكَ أَضْعَافًا كَثِيرَةً“ یعنی جو اللہ کو قرض حسن دے گا، وہ اس کا دگن چوگنا واپس لوٹائے گا۔

قرض سے مراد وہ قرض بھی ہے جو ایک شخص دوسرے کو دیتا ہے تاکہ وہ اپنی ضرورت پورا کرنے کے بعد قرض کی رقم واپس کر دے۔ یہ قرض جو بغیر کسی مفاد کے دیا جائے، وہ قرض حسن کہلاتا ہے۔ آج کل تو سودی کاروبار کا زمانہ ہے۔ قرض حسن کی رسم مٹ چکی ہے۔ کوئی شخص قرض حسن دینے کے لیے تیار نہیں۔ مال سے مفاد دو طرح کا ہوتا ہے۔ مال خرچ کرنے والا یا تو اس سے دنیوی مفاد حاصل کرتا ہے یا اخروی۔ جو شخص صدقہ خیرات کرے گا، اس کا مقصد اخروی مفاد حاصل کرنا ہوگا۔ اگر وہ رقم منافع پر دے گا تو اس سے دنیوی مفاد حاصل کرے گا۔ قرض حسن میں دنیوی مفاد کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ یہ حرام ہے کُلُّ قَرْضٍ جَوْنَفَعًا فَهُوَ حَرَامٌ یعنی ہر قرض جو نفع کھینچ کر لائے وہ حرام ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے متعلق منقول ہے کہ آپ جس آدمی کو قرض دیتے تھے، اس کی دیوار کے سائے میں بھی نہیں بیٹھتے تھے، کہیں یہ بھی مفاد میں نہ آجائے۔ آپ بہت بڑے سخی، صوفی اور بزرگ امام تھے۔ اور بہت بڑے تاجر بھی تھے۔ آپ نے اپنی تجارت کے ذریعے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ اہل علم کی ایسی خدمت کرتے تھے، جس کی نظیر سنیں ملتی حصول علم کے لیے طلباء کی مالی امداد کرتے تھے مگر کسی کو پتہ سنیں لگنے دیتے تھے۔ نیکی کے کاموں میں بے پناہ خرچ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو مال بھی وافر دیتا تھا۔ امین الیہ تھے کہ آپ کے پاس بے شمار امانتیں جمع رہتی تھیں وفات کے وقت تقریباً پانچ کمرہ دار ہم کی امانتیں امام صاحب کے پاس موجود تھیں۔ ہر چیز پر متعلقہ آدمی کی چٹ لگی ہوتی تھی۔ وصیت میں لکھا تھا کہ یہ امانتیں امانت داروں تک پہنچادی جائیں۔

الغرض قرض حسن کے معاملہ میں امام صاحب اس قدر محتاط تھے کہ مقرض کی دیوار کے سائے میں بھی نہیں بیٹھتے تھے۔ کیونکہ قرض دیکر اس سے مفاد حاصل کرنا روا نہیں۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے معراج کے موقع پر دیکھا کہ بہشت کے قرض حسن کا دروازہ

ایک دروازے پر لکھنا تھا کہ جو شخص اللہ کی رضا کے لیے ایک درہم صدقہ کرے گا، اُس کو کم از کم دس درہم کا اجر ملے گا۔ اور جو کوئی ایک درہم قرض حسن دے گا، اُس کو اٹھارہ درہم کا اجر ملے گا۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ حضور علیہ السلام نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے اس کی وجہ دریافت کی کہ صدقہ کے مقابلہ میں قرض حسن دینے والے کا اجر کیسے بڑھ گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ صدقہ خیرات کا معاملہ یہ ہے کہ یہ کبھی مستحق کو پہنچتا ہے۔ اور کبھی غیر مستحق بھی لے جاتے ہیں۔ مگر قرض ایک ایسی چیز ہے جو صرف مستحق ہی حاصل کرتا ہے جس کو ضرورت نہ ہو، وہ قرض حاصل نہیں کرتا۔ تو قرض کا اجر دوما ہوتا ہے۔ ایک درہم جو قرض میں دیا تھا، جب وہ واپس لے لیا تو باقی نو درہم کا اجر باقی رہا جو دگنا ہو کر اٹھارہ درہم بن گیا۔ اسی لیے فرمایا **وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا**۔

قرض کے لین دین
میں مشکلات

اس زمانے میں قرض کے لین دین میں بھی سخت مشکلات پیش آرہی ہیں۔ اب خلوص و خیر خواہی کا فقدان ہے۔ ذہنیت سود خوری والی عام ہو گئی ہے۔ اسی طرح قرض لینے والے بھی نیک نیت نہیں ہے۔ قرض لے کر واپس نہیں کرتے۔ یہ بھی بڑا ظلم ہے **مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ وَلِيَ الْوَجْدِ يُجِلُّ عِرْضَهُ** جب ضرورت پوری ہو گئی ہے۔ تو قرض کی رقم واپس کر نی چاہیے۔ قرض دینے والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ قرض دے کر کوئی مفاد حاصل کیا جائے۔ سود یا منافع لیا جائے۔ یہ خود غرضانہ ذہنیت کی غمازی ہے۔

سود قطعی حرام ہے

جب سے یہودیوں کا ایجاد کردہ بنکاری کا سسٹم جلدی ہوا ہے "زر زر راحی کشہ" والا معاملہ ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کی بڑی بڑی رقمیں بینک میں جمع ہیں۔ رقم محفوظ رہتی ہے۔ اور اس پر سال بہ سال سود ملتا رہتا ہے۔ بس سود کھاتے بہتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے **أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا** یعنی اللہ نے تجارت حلال کی ہے اور سود قطعاً حرام قرار دیا ہے جو سود کو حلال سمجھ کر کھانا ہے۔ وہ دائرہ اسلام ہی سے خارج ہو جاتا ہے، اور جو ایسے حرام سمجھ کر کھاتا ہے۔ وہ گنہگار ہے۔ اُسے توبہ کرنی چاہیے۔ اور آئندہ کے لیے باز آجانا چاہیے۔ کسی مسلمان کے لیے سود کھانا روا نہیں۔ اگر کہیں سے سود کی رقم مل ہی جائے تو یہ سمجھ کر کسی غریب آدمی کو دے دے کہ اس سے کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ اس سے ایسی توقع رکھنے سے بھی کفر میں داخل ہونے کا خطرہ ہے۔ اس کو یوں سمجھ

کی ہے۔ اگر کپڑا پاک صاف ہے تو تھوڑی سی خوشبو بھی کارآمد ہوگی۔ اور اگر کپڑا ہی گندا ہے۔ تو خوشبو لگانے سے اس کی بدبو میں اضافہ ہوگا۔ اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک مجلس میں سو سو مرتبہ استغفار کرتے تھے۔ رَبِّ ارْحَمْهُ وَتُبْ عَلَيَّ اے اللہ مجھے معاف کر دے۔ یا اَسْتَغْفِرُ اللہَ میں اللہ سے بخشش طلب کرتا ہوں۔ اور پھر یہ الاستغفار بھی ہے اَسْتَغْفِرُ اللہَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَالتَّوْبُ اِلَیْهِ یہ اتنا کارگر و وظیفہ کہ فرمایا اگر کسی کے گناہ سمندر کی جھاگ کے برابر بھی ہوں گے تو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا، استغفار کے جتنے بھی کلمات ہیں، کہتے رہنا چاہیے۔ اور اس کے ساتھ دل کی توجہ بھی ہونی چاہیے۔ کہ اے مولا کریم! مجھ سے کوتاہیاں اور غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، میں ان سے معافی مانگتا ہوں۔ انہیں اپنی مہربانی سے ڈھانپ لے۔ بخضر کر دے بخضر کا معنی معاف کر دینا۔ ڈھانپ دینا ہے۔ لہذا استغفار کثرت سے کیا کرو۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے کہ استغفار تنقیہ ہے۔ اگر آدمی تنقیہ کرتا ہے۔ تو اس کے بدن میں فضلات نہیں رہیں گے اور وہ صحت مند ہوگا۔ بالکل اسی طرح کہ اگر جسم میں خون، بلغم، خوراک کے فضلات جمع رہیں گے، قبض ہے گی اور آدمی بیمار ہوگا۔ اگر اس کی تنقیہ ہوتی ہے تو صحت بحال رہے گی۔ اسی طرح استغفار کے ذریعے سے انسان کی غلطیوں کی تنقیہ ہوتی رہے گی اور اس کی روحانی صحت قائم رہے گی۔

تو فرمایا اللہ نے بخشش طلب کرو۔ اِنَّ اللہَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔ جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ معافی مانگتا ہے۔ التجا کرتا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں۔



سُورَةُ الْمَدَّثِ مَكِّيَّةٌ سِتُّ وَخَمْسُونَ آيَةً فِيهَا رُكُوعَانِ

سورۃ مدثر مکی ہے اور یہ پچپن آیتیں ہیں اور اس سورت میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبُّكَ فَكْبَرُ ۝
وَشَيْبَاكَ فَطَهِّرْ ۝

اے لحاف اوڑھنے والے ۱ آپ اٹھ کھڑے ہوں اور مخلوق کو ڈرائیں ۲ اور اپنے

رب کی بڑائی بیان کریں ۳ اور اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھیں ۴

اس سورۃ کا نام سورۃ المدثر ہے۔ پہلی آیت میں مدثر کا لفظ مذکور ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی

کوالف سورۃ

کے ابتدائی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔ اس کی پچپن آیات اور دو سو پچپن الفاظ ہیں۔ یہ سورۃ ایک ہزار دس حروف پر مشتمل ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات نازل ہوئیں۔ اس

زمانہ نزول

کے بعد نازل ہونے والی سورتوں میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ سورۃ مدثر نازل ہوئی

مگر صحیح بات یہ ہے جیسا کہ امام جلال الدین سیوطیؒ نے تفسیر القان میں اور بعض دیگر مفسرین نے

بھی بیان کیا ہے کہ سورۃ علق کی ابتدائی آیتوں کے بعد متصلاً سورۃ فاتحہ نازل ہوئی۔ اور حضور علیہ السلام

کو وضو اور نماز کا طریقہ سکھایا گیا۔ اس کے بعد سورۃ مزمل کا پہلا رکوع نازل ہوا۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ سورۃ

نازل ہوئی، اور درمیان میں کچھ عرصہ تک وحی منقطع رہی۔ اس عرصہ کو فترت وحی کا زمانہ کہا جاتا ہے جس کی مقدار تین سال تک بتائی جاتی ہے۔ اس دوران میں نبی علیہ السلام کو وحی کے انقطاع کی وجہ سے پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ آپ اس کے لیے بہت زیادہ شائق تھے۔ لہذا آپ غار حرا میں ایک مہینہ تک اعتکاف بیٹھے تھے۔ اُسی غار حرا میں جسے آج کل جبل نور کہتے ہیں۔ اور جہاں آپ نبوت ملنے سے پہلے اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ آپ کا رخ اور خانہ کعبہ کی طرف ہوتا تھا۔ اُسی حالت میں آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی تھی فَجَاءَ الْحَقُّ وَهُوَ فِي الْحَرَاءِ یعنی حضور علیہ السلام کے پاس حق آگیا اور آپ غار حرا میں تھے۔ نبوت ملنے کے بعد فترت وحی کے زمانہ میں آپ ایک دفعہ پھر غار حرا کی طرف متوجہ ہوئے اور توشہ وغیرہ لے کر مہینہ بھر کے لیے اعتکاف کیا۔

اس اعتکاف کے بعد جب آپ پہاڑ سے نیچے اترے تو آپ نے ایک آواز سنی۔ آپ کو یہ آواز اُسی فرشتے کی معلوم ہوئی جو پہلی دفعہ وحی لایا تھا، آپ نے دائیں بائیں دیکھا، مگر کچھ نظر نہ آیا، وہی آواز جب دوبارہ آئی تو آپ نے نگاہ اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا، تو فرشتہ زمین و آسمان کے درمیان فضا میں کہ سی پر بیٹھا تھا۔ اور ساری فضا اُس سے پُر تھی۔ اُسے دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دہشت کی کیفیت سی طامی ہوئی۔ آپ گھر تشریف لائے اور گھر والوں سے فرمایا دَرْتُوْنِیْ بَیْطِیْ پھر اڑال دو، مجھے سردی لگ رہی ہے۔ دُعا موٹے کپڑے یا کھیل کو کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق لحاف پر بھی ہوتا ہے۔ بلکہ ہر اُس کپڑے پر ہوتا ہے جو اوپر اوڑھا جاتا ہے۔ جو کپڑا جسم کے ساتھ پیوستہ ہوتا ہے، اُسے شعار کہتے ہیں۔ اس کا ثبوت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ملتا ہے جس میں فرمایا اَلْاَنْصَارُ شِعَارُ النَّاسِ دُثَارٌ یعنی عام لوگ دُثَارٌ (بیرونی کپڑے) کی مانند ہیں اور اَنْصَارُ مدینہ شعار (اندرونی کپڑے) کی طرح ہیں۔ مدینہ کے لوگوں کو اسلام کے ساتھ ایسا ہی قریبی تعلق ہے۔ جیسا اندرونی کپڑے کو جسم کے ساتھ۔ چنانچہ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ اسی لفظ دُثَار سے مدثر ہے۔ یعنی کھیل اوڑھنے والے اور اسی لفظ کو سورۃ کا عنوان بنایا گیا ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ مدثر، تدثیر کا معنی ہلاک کرنا بھی ہوتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

نے فرمایا میرے بہت سے نام ہیں۔ میں محمد بھی ہوں۔ احمد بھی ہوں۔ میں مقفی بھی ہوں، سب سے پیچھے آنے والا، عاقب کا معنی 'آخر میں آنے والا'۔ اور میں حاشر ہوں الَّذِیْ یُحْشِرُ النَّاسَ عَلٰی قَدْحِیْ لوگ میرے قدموں میں اکٹھے کئے جائیں گے یعنی دنیا میں مختلف قومیں اور آخرت میں سارے لوگ۔ فرمایا اَنَا الْمَاحِیْ میں ماحی بھی ہوں یعنی مٹانے والا، مہلک الَّذِیْ یَمْحُ اللَّهُ بِی الْکُفْرَ اللہ تعالیٰ میرے ذریعے کفر کو مٹا دے گا۔ تو گویا آپ کا لقب کفر کو مٹانے والا بھی ہے۔ مدثر کا بھی یہی معنی ہے۔ یعنی کفر و شرک کو مٹانے والا، مدثر کا پہلا معنی 'کمیل یا لحاف اور ڈھنے والا' اور دوسرا معنی 'کفر و شرک کو مٹانے والا' ہے۔ تو فرمایا یَا یٰہَا الْمَدْثَرُہ قُوْا فَانْذَرُوْا لِحَافٍ اور ڈھنے والے یا کفر و شرک کو مٹانے والے آپ اٹھ کھڑے ہوں۔ اور مخلوق خدا کو ڈرائیں۔

پہلی منزل ذاتی تکمیل

مفسرین کرام اس سورۃ کی تطبیق سابقہ سورۃ منزل کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں کہ وہاں ارشاد تھا یَا یٰہَا الْمَدْثَرُہ اور منزل کے بھی دو معنی ہیں۔ ایک شَقِّ مَثَلٍ کمپل اور ڈھنے والے اور دوسرا ساتھی اکٹھا کرنے والے۔ وہاں یہ دونوں معنی درست ہیں۔ کیونکہ ابتدا میں یہی حکم تھا کہ پہلے ساتھی اپنے ساتھ ملائیں تاکہ اس پر وگرا م کو آگے بڑھایا جاسکے۔ غیر محدود لوگوں کے ساتھ مقابلہ کرنا ایک بے بسی کا کام نہیں، بلکہ ساتھ جماعت بھی درکار ہے، لہذا جماعت کا تذکرہ ہوا، اور تربیت کا پر وگرا م وضع ہوا۔ کہ قُمْ اِلَیْہِمْ آپ خود بھی رات کو قیام کریں وَطَاۤیِفُہُمْ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ اور ایک گروہ بھی جو آپ کے ساتھ ہے۔ قیام لیل کا سب سے بڑا مقصد قرآن پاک میں غور و فکر کرنا ہے۔ "وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلًا" اور قرآن کو ترتیل سے پڑھیں، پر وگرا م سمجھ میں آجائے گا۔ یہ ضروری ہے۔ کیونکہ آگے دنیا میں انقلاب برپا کرنا ہے۔

تو گویا پہلی منزل ذاتی کمال کی ہے، تربیت کی ہے۔ اسی لیے پہلی سورۃ میں فرمایا کہ آپ رات کو کھڑے ہوں، اس سے تہذیب نفس حاصل ہوگی، کمال حاصل ہوگا، روحانیت حاصل ہوگی۔ اور تعلق باللہ مضبوط ہوگا۔ جس کی ضرورت ہے۔ اور جس کے بغیر کوئی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ تو فرمایا پہلے آپ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تکمیل کے لیے قیام لیل کریں۔ جب ذاتی تکمیل کا مرحلہ طے ہو جائے گا۔ تو

دوسروں کی تکمیل کا موقع آئے گا۔ کیونکہ دوسروں کو کامل بنانے کے لیے پہلے خود کمال حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جو یہ فرمایا ہے ”هَدَيْنَاكَ السَّبِيلَ“ یعنی ہم نے انسان کو دو اونچے راستے دکھائے یا دو گھاٹیوں کی طرف رہنمائی کی، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ انسانی خود اپنی ذات میں کامل ہو اور کمال حاصل کرنے کا طریقہ یہ بتایا کہ ”الْيَدِ إِلَّا بِقَيْدِ“ رات کا کچھ حصہ قیام کرو ”وَرَقِيلُ الْقُرْآنِ تَرْتِيلًا“ اور قرآن پاک کو ترتیل سے پڑھو۔ اس کے بعد فرمایا ”وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ“ اپنے رب کے نام کو یاد کرو، کیونکہ تعلق باللہ اور کمال حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ ”وَتَبْتَئِلُ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا“ اور یہ تعلق تنہائی میں پیدا ہونا زیادہ آسان ہے۔ اللہ کے ساتھ تنہائی میں تعلق جوڑو۔ اور اس کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرو۔ اس کے بعد فرمایا ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا“ یعنی خدا کو ہی کارساز بناؤ، اُس کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ عقیدے کو مضبوطی سے پکڑو۔ اور کسی چیز پر بھروسہ نہ کرو۔ مادی اسباب ایک درجے تک استعمال کرو۔ تاثیر اللہ نے پیدا کرنی ہے۔ چاہے تو تاثیر پیدا کرے، چاہے تو نہ کرے۔ یہ تمام باتیں ذاتی تکمیل کی تربیت کے لیے ہیں۔ اُس کے بعد جب مخالفین سے مقابلہ ہوگا تو ”وَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ“ جو وہ کہتے ہیں، اس پر صبر کرو۔ اپنے اندر برداشت پیدا کرو۔ ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کر لو، مگر اچھے طریقے سے۔ یہ سب تربیت کے اصول ہیں، جو ذاتی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔

جب ان اصولوں پر کسی جماعت کی تکمیل ہو جائے گی تو پھر دوسرا پروگرام شروع ہوگا۔ جس کا مقصد دوسروں کی تکمیل ہے۔ سورۃ نزل میں ذاتی تکمیل کا پروگرام تھا۔ اس سورۃ میں دوسروں کی تکمیل ہے۔ وہاں بھی لفظ ”قُمْ“ سے ابتداء کی گئی، اور یہاں بھی ”قُمْ“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ وہاں پر حکم تھا کہ رات کو قیام کریں اور اس میں قرآن پاک تلاوت کریں۔ اب جب کہ قرآن پڑھ لیا، سمجھ لیا، روحانیت میں کمال حاصل کر لیا تو اس سورۃ میں فرمایا ”قُمْ فَأَنْذِرْ“ کہ آپ اٹھ کھڑے ہوں اور ذاتی تکمیل کے بعد دوسروں کی تکمیل کا ذمہ اٹھائیں، مخلوق خدا کو ان کے انجام سے ڈرائیں۔ گویا دوسروں کو راہِ راست کی دعوت دینے سے پہلے ذاتی تکمیل ضروری ہے۔ اگر یہ نہیں ہوگا۔ تو قول و فعل میں تضاد واقع ہوگا۔ اور یہ کسی صورت میں مستحسن نہیں ہے۔

قول و فعل میں
مطابقت

اسی تضاد کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی مذمت فرمائی: **أَتَاْمُرُونَ النَّاسَ بِالسَّبْرِ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ** کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ پہلے خود نیکی کرو، پھر دوسروں کو تلقین کرو، تو اس کا اثر ہوگا۔ اگر خود عمل نہیں کرو گے تو تمہاری بات رائیگاں جائے گی۔ تمہاری نصیحت بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔ اسی لیے بزرگان دین فرماتے ہیں کہ جو شخص خود عمل نہیں کرتا اور محض دوسروں کو نصیحت کرتا ہے۔ اس میں کما حقہ کامیابی نہیں ہوتی اگرچہ محض اچھی بات کہنے کو بھی ایک درجے تک اچھا مان لینا چاہیے۔ حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ جو خود عمل نہیں کرتا، صرف اچھی بات کہہ دیتا ہے۔ وہ بھی کسی حد تک قابل قبول ہے۔ مگر اس میں کمال نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ بزرگ فرماتے ہیں۔ کہ جو شخص خود عمل نہیں کرتا اس کی نصیحت اسی طرح ضائع ہو جاتی ہے جس طرح چٹان پر پڑی ہوئی مٹی بارش سے اتر جاتی ہے۔ اور وہاں کوئی فصل نہیں ہو سکتی۔

انباء والے سائیں تو کل شاہ مشہور بزرگ ہوئے ہیں۔ نیک اور صالح مرد تھے۔ کسی حد تک مجذوب بھی تھے۔ ایک عورت بچے کو آپ کے پاس لائی کہ حضرت! یہ گڑ بہت کھاتا ہے اسے دم کر دیں۔ اس کے دانت خراب ہو گئے۔ مگر یہ گڑ کھانے سے باز نہیں آتا۔ آپ نے فرمایا، اس بچے کو کل میرے پاس لانا، دم کروں گا۔ وہ عورت چلی گئی تو شاگردوں نے پوچھا کہ کیا بات تھی آپ نے اس عورت کو کل آنے کو کہا۔ فرمایا، آج تو میں نے خود گڑ کھایا ہوا تھا، بچے کو دم کیسے کرتا۔ تو گویا یہ ان کے کمال کا معیار تھا۔ کہ جو کام خود کیسے ہے۔ اس سے دوسرے کو کیسے منع کروں۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام کامل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود ان کی تربیت فرماتا ہے۔ ان کی تربیت نبوت سے پہلے بھی کمال درجے کی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مکروہات اور بری باتوں سے بچاتا ہے۔ انہیں مکمل گارنٹی حاصل ہوتی ہے۔ وہ بذاتہ کامل ہوتے ہیں کیونکہ انہیں دوسرے لوگوں کے لیے نمونہ بننا ہوتا ہے۔ اور اس طرح وہ دوسروں کی تکمیل کرتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا زِينَتَكُمْ لِكُلِّ مَسْجِدٍ وَلِكُلِّ مَوْضِعٍ يُكْرَمُ** کہ تم لوگوں کو یاد دلاؤ کہ ہر مسجد اور ہر مقدس جگہ پر تم کو زیب زیب پہنانا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی خبر دے گا۔ **وَلِكُلِّ مَوْضِعٍ يُكْرَمُ** کہ تم لوگوں کو یاد دلاؤ کہ ہر مسجد اور ہر مقدس جگہ پر تم کو زیب زیب پہنانا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی خبر دے گا۔ **وَلِكُلِّ مَوْضِعٍ يُكْرَمُ** کہ تم لوگوں کو یاد دلاؤ کہ ہر مسجد اور ہر مقدس جگہ پر تم کو زیب زیب پہنانا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی خبر دے گا۔

دوسری منزل
اصلاح عالم

بھی سناتے ہیں اور ڈراتے بھی ہیں۔ جس زمانے میں یہ سورۃ نازل ہوئی، اُس زمانے میں کفر و شرک کی بہت تھی، لہذا موقع کی مناسبت سے انداز کا حکم دیا کہ ساری دنیا بُرائی سے پُرس ہے انہیں برائی کے انجام سے ڈرائیں۔ ہاں جب نیکی کا دور دورہ ہوگا، تو انہیں شدت بھی سنائی جائے گی۔ بَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ یعنی جو لوگ ایمان قبول کر چکے ہیں توحید کو مان چکے ہیں۔ نیکی کے کام انجام دیتے ہیں، ان کو بشارت بھی سنائیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ سورۃ منزل میں قیام لیل کے آداب ہیں اور سورۃ مدثر میں قیام نہار کے آداب ہیں۔ یعنی رات کو قیام لیل کے ذریعے تعلق باللہ کو مضبوط کریں۔ اور دن کی روشنی میں مخلوق خدا کو ڈرائیں۔ کہ اصلاحِ عالم کے لیے ضروری ہے۔

اس کے بعد فرمایا وَدَبَّكَ فَكَيِّدٌ یعنی اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ اس وقت دنیا کی حالت یہ ہے۔ کہ کوئی بادشاہوں کی تعریف کرتا ہے، کوئی شہنشاہوں کی اور کوئی سرمایہ داروں کی۔ کوئی کسی ڈکٹیٹر کی تعریف میں رطب اللسان ہے، اور کوئی اپنی قوم کی بڑائی بیان کر رہا ہے۔ لہذا حکم ہوا کہ ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ وہی بڑا ہے اللہ اکبر چنانچہ نماز جس میں اِخبات اور طہارت دونوں عناصر شامل ہیں، اُس کی ابتدا اللہ اکبر سے ہی ہوتی ہے۔ یہ تکبیر تحریمہ فرض ہے۔ اس کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی۔ یہ نماز کی شرائط میں سے ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى حضرت اہم اعظم فرماتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت اللہ اکبر اللہ کبیر، اللہ الکیور یا اِلَہَ اِلَّا اللہ وغیرہ (اللہ کے ناموں) ان میں سے کوئی بھی لفظ کہہ سکتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ایسا لفظ ہونا چاہیے۔ جو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی پر دلالت کرتا ہو۔ اس سے آدمی نماز میں داخل ہو جاتا ہے۔

حضرت اہم مالک فرماتے ہیں۔ کہ صرف اللہ اکبر ہی کہہ سکتے ہیں اور کسی لفظ کی اجازت نہیں دیتے۔ اہم ابو یوسف فرماتے ہیں کہ اللہ اکبر کے علاوہ اللہ الکیور یا اللہ اِلَّا کبیر

کہہ سکتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔

الغرض آپ کو حکم ہوا کہ صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ کسی شہنشاہ، سربراہ دار یا خاندان یا قبیلے کی بڑائی بیان نہ کریں۔ بلکہ خدا تعالیٰ ہی بڑا ہے۔ ”وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ ارض و سما میں بڑائی کے لائق صرف اللہ وحدہ لا شریک ہے۔ البتہ نبی کی تعظیم ضروری ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا ہوتا ہے۔ نبی کی تعظیم رسالت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کسی بادشاہ، استاد، مال باپ کی تعظیم ہوگی، تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوگی، کہ اُس نے تعظیم کا حکم دیا ہے۔ ان کو بھی چاہیے کہ وہ خدا کی فرمانبرداری کریں۔ اگر حاکم خدا کا فرمانبردار ہو، تو فرمایا اُسکی اطاعت کرو۔ اگر نافرمان ہے اس کی اطاعت مت کرو۔ کیونکہ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ یعنی اگر کوئی امیر خدا کی نافرمانی کا حکم دے، تو مت مانو۔ انکار کرو، کیونکہ اطاعت صرف معروف میں ہے۔ اس لیے یہ بات قانون کے طور پر بتا دی کہ خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار کرو ایسی اخبات ہے۔ اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔ کہ بڑائی کا مالک وہی ہے۔ اُس کے علاوہ اور کسی کی بڑائی بذاتہ نہیں۔ اگر حکم خداوند کے تابع ہوگا، تو احترام کیا جائے گا۔ ورنہ نہیں تو گویا اخبات یعنی خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار کرنا پہلا خلق ہے۔

لباس کی پاکیزگی

دوسرا خلق لباس کی پاکیزگی ہے۔ فرمایا وَثِيَابُكَ فَطَهِّرْ یعنی اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھو۔ لباس کی پاکیزگی بدن کی پاکیزگی چاہتی ہے۔ اور بدن کی پاکیزگی ماحول کی پاکیزگی چاہتی ہے۔ اسی طرح ظاہری پاکیزگی باطنی پاکیزگی کی خواہش مند ہوتی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ پاکیزگی کی ضرورت ہر مقام پر ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی فرماتے ہیں کہ باطن کو پاک کرو۔ اگر باطن میں شرک یا کوئی شائبہ، نفاق، الحاد، شک، تردد یا بدعتیہ کی کا ہوگا تو بدن ناپاک ہوگا۔ اسی لیے مشرکوں کے متعلق فرمایا اِنَّهَا الشُّرُكُوْنَ يَجْسُوْا وِرْمًا فِیْٓ اَعْيُنِنَا وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اور منافقوں کے متعلق فرمایا اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَمَا وَاٰهُمْ جَهَنَّمُ یعنی وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ لوگ ظاہر میں اگر نہ بھی پلید ہوں مگر باطن میں پلید ہیں۔ لہذا فرمایا کہ اپنے باطن کو کفر و شرک سے پاک کرو۔ اپنے دل کو نور

ایمان و توحید سے منور کرو، تو ظاہر میں بھی پاکیزگی آئے گی۔

ہول کی پاکیزگی

جس طرح لباس اور بدن کی طہارت ضروری ہے۔ اسی طرح مکان کی طہارت بھی لازمی ہے گندی جگہ پر نماز بھی نہیں ہو سکتی۔ لہذا مکان کو صاف رکھو، اس کے بعد گلیوں کو صاف رکھو، ورنہ گندی پھیلے گی، اپنے شہر کو صاف رکھو، میونسپلٹی کو صاف رکھو کہ بیماری نہ پھیلنے پائے۔ پھر آگے بڑھ کر اسمبلی کو صاف رکھو تاکہ گندے اور غلیظ آدمی وہاں نہ جاسکیں۔ وہاں اچھے لوگوں کو بھیجو جن کا ظاہر اور باطن پاک ہو، نجس لوگ اسمبلیوں میں جائیں گے تو گندی پھیلاؤں گے۔ ملک کو پاک رکھنے کا مطلب یہی ہے۔ کہ اس کے قانون ساز اداروں میں اچھے لوگ جائیں جو ایسے قانون وضع کریں جن کی وجہ سے ملک سے غلاظت دور ہو۔ برائی، عیاشی اور فحاشی سے طہارت حاصل ہو۔ اگر ایک ملک میں پاکیزگی کا دور دورہ ہوگا۔ تو اس کے اثرات دوسرے ملکوں تک بھی پہنچیں گے۔

خوراک کی پاکیزگی

اسی طرح ہر شخص کے لیے خوراک کی پاکیزگی بھی ضروری ہے۔ اگر لباس اور بدن تو صاف ہو مگر کھانا حرام کمانی کا ہو یعنی رشوت، دھوکے فریب، ناجائز تجارت کا ہو، تو طہارت نہیں ہو گی۔ لہذا اپنی غذا کو پاک بنانا بھی ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ ثَبَّتَ لَحْمَهُ مِنَ السُّمِّتِ فَالْثَّارُ أَوَّلَىٰ بِهِ یعنی جس شخص کا گوشت حرام مال سے پلے گا، وہ دوزخ میں جانے کا زیادہ مستحق ہے۔ لہذا لباس کے ساتھ ساتھ خوراک کی طہارت بھی ضروری ہے۔

علیٰ ہذا القیاس خیالات کی پاکیزگی، ریاست کی پاکیزگی، مذہب کی پاکیزگی بھی لازمی ہے طہارت کا مطلب صرف استنجاء اور وضو کر لینا نہیں یا کپڑے دھو لینا اور نہالینا نہیں، بلکہ طہارت اپنے وسیع معنوم میں ہر جگہ ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "اللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ" اللہ تعالیٰ طہارت پسند لوگوں کو محبوب رکھتا ہے۔ نجس آدمی پاکیزہ مقام میں بھی نہیں جاسکتا۔ وہاں پر پاک ہو کر پاک لوگ ہی جائیں گے۔

بہر حال وَثِيَابُكَ فَطَهِّرْ میں طہارت کا اصول اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا کہ طہارت کس طرح اختیار کرنی چاہیے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کے اظہار کی تعلیم دی۔ اور فرمایا کہ بڑائی صرف اللہ ہی کی بیان کرو، اُسی کے سامنے عاجزی اختیار کرو اور طہارت حاصل کرو۔

(آیت ۵ تا ۱۰)

درس دوم

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ⑤ وَلَا تَمْنُنْ تَسْكَثِرُ ⑥ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ⑦
فَإِذَا انْقَرَضَ النَّاقُورُ ⑧ فَذَلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ⑨ عَلَى الْكَافِرِينَ
غَيْرُ يَسِيرٍ ⑩

ترجمہ :- اور گندگی سے دور رہیں ⑤ اور کسی پر احسان مت کرو کہ اس سے نیادہ مفاد حاصل کرو
⑥ اور اپنے رب کے لیے صبر کریں ⑦ پھر جب پھونکا جائے گا ناقور کے اندر ⑧
پس وہ دن بڑا سخت ہوگا ⑨ کافروں پر وہ سخت دشوار ہوگا ⑩

گزشتہ سے پورتہ

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۖ ارْجِعْ ۖ فَاذْكُرْ ۖ قَوْمُ آبِ ائِمَّةٍ كُفِّرُ ۖ هَؤُلَاءِ، فَإِنَّذِرُ اللّٰهِ
کی مخلوق کو بڑے انجام سے ڈرائیں۔ وَرَبِّكَ فَكَبِّرُ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ اُسی
کو سبے بلند اور برتر خیال کریں۔ اور اس بات پر یقین رکھیں۔ وَشِيَابِكَ فَطَهِّرُ اور اپنے پٹروں
کو پاک رکھیں۔

اخلاق کی پاکیزگی

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ شیب سے مراد جسم پر پہننے والے ظاہری کپڑے بھی ہیں۔
اور ان کا اطلاق اخلاق پر بھی ہوتا ہے۔ یعنی اخلاق کو پاک رکھو۔ جیسا کہ محاورے کے طور پر کہتے
ہیں فَلَانٌ نَّقَى الذِّيلَ طَاهِرُ الثَّوْبِ یعنی فلاں شخص پاکیزہ کپڑے والا ہے یعنی اچھے
اخلاق کا مالک ہے پاک دامن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ عمدہ اخلاق کا حامل ہے۔ تو گو یہ طہارت
سے مراد ظاہری اور باطنی دونوں طہارتیں ہیں، اور اسلام نے دونوں کا حکم دیا ہے۔

ظاہری طہارت

ظاہری طہارت تو یہ ہے کہ انسان کے جسم کے ساتھ کسی قسم کی نجاست نہ لگی ہوئی ہو یعنی
بول و براز، خون یا پیپ، یا قے وغیرہ۔ نیز اس کا لباس بھی صاف ستھرا ہو۔ کیونکہ جسم اور لباس
کی پاکیزگی کے بغیر انسان اپنے مالک کے حضور نماز میں بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ یہ نماز کے شرائط میں
داخل ہے۔ اسی طرح مکان کا پاک ہونا بھی ضروری ہے کہ ناپاک جگہ پر نماز نہیں ہوتی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ
والسلام نے نماز کی جگہ کے متعلق فرمایا نَظِّفُوهَا یعنی اسے پاک رکھو۔ وہاں کسی قسم کی گندگی نہیں

ہونی چاہیے۔ اسی لیے بوچڑ خانہ جیسی نجاست آلود جگہوں پر نماز پڑھنے کی ممانعت فرمادی۔ اسی طرح راستے میں نماز پڑھنے سے منع فرمادیا، کہ وہ بھی نجاست سے آلودہ ہو سکتا ہے گھر کے صحن کے متعلق فرمایا نَظَّفُوا أَفْنِيتَكُمْ اپنے صحنوں کو پاک رکھو۔ اور یہودیوں سے مشابہت اختیار نہ کرو۔ خیبر اور دوسرے علاقوں کے یہودی کاشتکاری کرتے تھے، ان کے صحن اکثر گندگی اور گوبر وغیرہ سے بھرے ہوتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے ان کی مشابہت وغیرہ سے منع فرمادیا۔ مگر آج کل تو انٹی حالت ہے۔ یہود و نصاریٰ صفائی کی پابندی کرتے ہیں، اور مسلمان نجاست میں آلودہ ہو گئے ہیں۔ اس زمانے میں ظاہری اور باطنی گندگی مسلمانوں کے حصے میں آئی ہے، حالانکہ طہارت دین اسلام کا ایک اہم ترین اصول ہے۔

باطنی طہارت، ظاہری طہارت سے بھی اہم ہے۔ جس شخص کا عقیدہ گندہ ہے وہ حقیقۃً القدس تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ کفر، شرک، نفاق، بدعات جیسی چیزوں سے انسان کا دل و دماغ ناپاک ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کی روح ناپاک ہو جاتی ہے حالانکہ اس کی طہارت سب سے پہلے ہونی چاہیے۔ باطنی طہارت کے لیے ضروری ہے کہ کھائی حلال ہو، لباس مشکوک اور حرام مال سے مبرا ہو، خوراک حلال اور طیب مال سے ہو۔ اسی لیے اللہ جل شانہ نے فرمایا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ یعنی پاک اور طیب چیزوں کو اپنی خوراک کا جزو بناؤ۔ عبادت کی قبولیت کا یہی ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا يُحِبُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْجَبَلِيَّاتِ یعنی اللہ کا پیغمبر طیب چیزوں کو حلال و حرام قرار دیتا ہے۔ اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ یہ ایک عام قانون بنا دیا کہ طیب چیزیں استعمال کرو، اور حرام، مشکوک اور مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرو۔ طہارت سے محبت فرشتوں سے مشابہت پیدا کرتا ہے

تیسرا خلق یہ بیان فرمایا وَالرَّجْزَ فَاهُجْرٌ یعنی گندگی سے دور رہیں۔ اس گندگی سے مراد بھی بدعقیدگی کی گندگی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ وَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ یعنی شرک و کفر کی گندگی سے بچو۔ اسی طرح ایک جگہ رجز کا اطلاق عذاب پر بھی ہوا ہے جیسا کہ فرمایا فَانْزَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ یعنی بنی اسرائیل پر آسمان سے طاعون کی صورت

میں رجز اتاری گئی، جس سے آٹا قاتا ہزاروں لوگ موت کا شکار ہو گئے۔ اسی لیے فرمایا کہ گندگی کو اپنے قریب نہ آنے دیں اسے دور ہی رکھیں۔ خاص طور پر بدعتیہ کی اور اخلاقِ رذیلہ کی گندگی سے بچیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اسے سماحت سے تعبیر کرتے ہیں کہ اپنے اندر سماحت کا اخلاق پیدا کریں۔ سماحت کا لفظ حدیث میں آتا ہے جس کے عام معنی تو فیاضی ہے۔ مگر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ انسان پر بہیمیت اور خیس خواہشات غالب نہ ہونے پائیں۔ کیونکہ یہ چیزیں غالب آجائیں تو انسان میں حرص، لالچ اور خود غرضی جیسی قبیح عادات پیدا ہونگی۔ لہذا انسان کے اندر سماحت کی صفت پیدا ہونی چاہیے، اسے انبیاء علیہم السلام اس کی تعلیم دیتے آئے ہیں۔ اس کے بغیر انسان اجتماعی حیثیت کے حامل کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ اعمال کی درستگی حقوق کی ادائیگی اور خوش معاملگی کے لیے صفتِ سماحت کا ہونا لازمی ہے۔

احسان

اخلاقِ عالیہ میں چوتھا خلق یہ بیان فرمایا وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ یعنی کسی پر ایسا احسان نہ کریں جس کا بدلہ زیادہ طلب کریں۔ کسی کے ساتھ احسان کرنا نوعِ انسانی کا تقاضا ہے، مگر اُس احسان کے عوض میں کوئی مفاد حاصل کرنا یا اس کی خواہش ہی دل میں رکھنا نفسِ احسان کے خلاف ہے۔ احسان کر کے جتنا نا احسان کو ضائع کر دیتا ہے۔ اور یہ عدل کے بھی خلاف ہے۔ کہ مہربانی کیے اور پھر اس کا معاوضہ یا بدل طلب کرے۔ اور عدل ہی ایسی چیز ہے جس سے اجتماعی کام آسانی سے ہو سکتے ہیں۔ اگر عدل نہیں ہوگا، تو اجتماعی مفادات کو نقصان پہنچے گا۔ اور سارا نظام ہی خراب ہو جائے گا۔

شادی کی رسوم میں نیوزرے کا کیا مقصد ہے۔ یہ دیا ہی اس نیت سے جاتا ہے کہ اس سے بڑھکر وصول کیا جائے گا۔ اور اگر دوسرا شخص نہ دے سکے تو لگہ شکوہ شروع ہو جاتا ہے۔ غیبت ہوتی ہے ناراضگی تک لو بت پہنچتی ہے۔ یہ سب مکروہ ہے۔ اور صفتِ عدل کے منافی ہے۔ لہذا کسی پر احسان کرنے کے بعد نہ اُسے جتاؤ۔ نہ اُس سے مفاد حاصل کرو۔ یہ صفتِ عدالت کے خلاف ہے۔ حالانکہ یہ صفت تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعت کا جزو رہی ہے اور دینِ حق کی ایک اہم ترین صفت ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ نیکی کرنے کے بعد اس کا احسان مت جتلاؤ۔ خدا کے سامنے اس بات کا اظہار کہ بہت زیادہ نیکی کی ہے، کسی طرح مناسب نہیں۔ کیونکہ کیا معلوم وہ نیکی شرائط کے مطابق تھی یا نہیں۔ اور کیا وہ بارگاہ الہی میں مقبول ہوئی ہے یا نہیں۔ لہذا عجز و انکساری سے بارگاہ رب العزت میں درخواست کرو کہ وہ اسے قبول فرمالے۔ یہ کبھی نہ کہو کہ ہم نے بہت نمازیں پڑھی ہیں اور عبادت سے رکھے ہیں یا صدقہ خیرات کیا ہے۔ یہ سب اُسی کی توفیق سے ہے۔ اور ان نیکیوں کے مفید ہونے کا انحصار ان کی قبولیت پر ہے۔

دین کا خلاصہ

یہ چاروں اخلاق دین کا لب لباب ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ دین کے تمام شرائع اور احکام اپنی کے تحت آتے ہیں۔ کوئی حکم اجابات کے تحت آتا ہے، کوئی سماحت کے، کوئی عدالت کے تحت۔ (کوئی طہارت کے تحت)۔

حکم انذار کے تحت جب ان لوگوں کو ڈرایا جائے گا، تو ظاہر ہے۔ کہ ان میں سے ایسے خود غرض مغرور اور نجس لوگ ہوں گے جو مخالفت کریں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح قرآن پاک میں فرعون کا حال بیان ہوا ہے۔ وہ کہتا تھا۔ خدا کون ہے جسے تم بار بار پکارتے ہو، مجھ سے بڑا کون ہے۔ مَارَبُّ الْعَالَمِينَ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَهِ غَيْرِي میں ہی تمہارا الہ ہوں۔ میرے سوا اور کون ہے۔ آج بھی بڑے لوگ اپنی ہی بڑائی کے خواہشمند ہیں۔ یہ کسی اور کی بڑائی کو پسند نہیں کرتے۔ جب ان کو کہا جائے کہ رب کی بڑائی بیان کرو تو ان کو غصہ آجاتا ہے۔ مقابلہ کرتے ہیں اور حقیقت کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب انہیں کہا جاتا ہے۔ کہ نجاست اور گندگی سے دور رہو، گندے عقیدے کو چھوڑ دو تو وہ اس پر عمل نہیں کرتے، بلکہ اس پر ڈٹے رہتے ہیں۔ جب انہیں انصاف کی بات بتائی جاتی ہے تو اس پر آمادہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنی غلط روش پر قائم رہتے ہیں۔

ظلم کی تیج کنی

شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔ کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ایک اہم مقصد ظلم کا خاتمہ ہے رَفْعُ الظَّالِمِ مِنْ بَيْنِ النَّاسِ۔ انسانیت پر جو کبھی ظلم ہوتا ہے۔ وہ حق تلفی ہوتی ہے۔ جب تک ظلم کا دور دورہ ہے گا، حق تلفی ہوتی رہے گی۔ انبیاء علیہم السلام کا فرض رہا ہے۔

کہ وہ جو روستم کے خلاف جہاد کریں۔ لہذا آج بھی مظلوم کا حق دلانا انبیاء علیہم السلام کی سنت پر عمل کرنا ہے۔ مزدور اور کسان کا حق دلانا، کمزور طبقہ کی مدد، ظلم کو دفع کرنا بہترین عمل ہے۔ اسی لیے فرمایا: **وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ** کسی پر احسان مت بٹلاؤ کہ اس سے مفاد حاصل کرو، مفاد پرستی انصاف کے خلاف ہے۔ ہر شخص کو انصاف میسر آنا چاہیے انسانیت سے ظلم کو دور کرنا ضروری ہے۔

صبر کی تلقین

اس کے بعد فرمایا کہ **وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ** یعنی اپنے رب کے لیے صبر کریں۔ اس راستے میں تکالیف آئیں گی، مخالفت ہوگی مگر اس کے باوجود صبر کا دامن نہیں چھوڑنا پچھلی سورۃ میں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام اور آپ کے متبعین کو تسلی دلائی تھی کہ **وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ** یہ جو کچھ کہتے ہیں۔ اس پر صبر کریں۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کے واقعہ میں بھی صبر کی تلقین کی تھی۔ یہاں بھی یہی ارشاد ہوا کہ مخالفین کی ایذا رسانی پر برداشت کریں، استقلال سے کام لیں صبر ملت ابراہیمی کا ایک اہم ترین اصول ہے۔ جس طرح اللہ کی وحدانیت، ذکر الہی، نعمتوں پر شکر، نماز اور تعظیم شعار اللہ بڑے بڑے اصول ہیں۔ اسی طرح صبر بھی اہم اصول ہے۔ اسی لیے فرمایا: **وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ** صبر و نماز سے کام لیں، گھبراہٹیں نہیں۔ سورۃ ق میں بھی گزر چکا ہے **فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ** یعنی پچھلی والے کی طرح بے صبری نہ کرنا۔ انہوں نے بھی ذرا سی بے صبری کا مظاہرہ کیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں امتحان میں ڈال دیا۔ نبی علیہ السلام کو خطاب کر کے ساری امت کو صبر کی تلقین کی جا رہی ہے۔ تکلیف اور مصیبت کو برداشت کرنا، اطاعت پر جبرے رہنا اور ناگوار حالات میں بھی صبر کا دامن نہ چھوڑنا۔

شاہ عبدالعزیزؒ نے محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ عام صبر اور اللہ کے لیے صبر کرنے میں فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے صبر کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں ایسی قوت برداشت پیدا ہو جائے جس میں امیر اور غریب کا امتیاز ختم ہو جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ امیر آدمی کی طرف سے زیادتی ہو تو صبر کرے اور غریب کی طرف سے تعدی ہو تو صبر کا دامن چھوڑ بیٹھے۔ یہ رب کے لیے صبر نہیں ہوگا۔ رب کے لیے صبر وہ ہوگا جو سب کے لیے یکساں ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ **وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ** یعنی اپنے رب کے لیے صبر کریں۔

قیامت کا ذکر ہر شخص کے ایمان کا جزو ہے۔ لہذا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے قیامت کی ہولناکی کا ذکر فرمایا۔ یعنی جو کچھ پیچھے بیان ہو چکا ہے اس کا نتیجہ آگے چل کر نکلے گا۔ فرمایا فَإِذَا نُفِثَ فِي السَّاقُوتِ پھر جب پھونکا جائے گا اُس ناقور کے اندر۔ ناقور کا معنی کمو کھلی چیز جیسے بگل ہونا ہے یا سینگ جو اندر سے خالی ہوتا ہے تو فرمایا جب اس کریدی ہوئی چیز میں پھونکا جائے گا یعنی قیامت برپا ہو جائے گی فَذُكِّرْتُمْ بِذُنُوبِكُمْ پس یہ دن بڑا سخت دن ہو گا۔ جنہوں نے اپنے اندر اخلاقِ حسنہ پیدا نہیں کئے اور جنہوں نے صبر نہیں کیا انہیں پتہ چل جائے گا۔ کہ یہ کتنا دشوار دن ہے۔ اور خاص طور پر عَلَى الْكَافِرِينَ کافروں پر یہ دن سخت دشوار ہو گا۔ جنہوں نے حق کے مشن کی مخالفت کی ان کے لیے بڑا ہی سخت دن ہو گا۔ ان کے لیے آسانی کی کوئی گنجائش نہ ہوگی کیونکہ انہوں نے دنیوی زندگی میں دشواری کے کام ہی سرانجام نہیں دیے تھے۔ لہذا اُس روز ایسا ہی بدلہ دیا جائے گا۔

البتہ ایمان والوں پر یہ دن نرم ہو جائے گا۔ کیونکہ ایمان کی بدولت انہیں فلاح حاصل ہونے والی ہے۔ ان کے اعمال نامے دائیں ہاتھ میں ملیں گے۔ اس کے بعد انبیاء علیہم السلام بھی ان کی سفارش کریں گے۔ ایمان اور توحید کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مہربانی بھی ان کے شامل حال ہو جائے گی۔ لہذا اس دن ایسے لوگوں کی سختیاں کم ہو جائیں گی۔ مگر کافروں پر یہ دن بہت ہی دشوار ہو گا۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۝ ۱۱ ۝ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ۝ ۱۲ ۝
 وَبَنِينَ شُهُودًا ۝ ۱۳ ۝ وَمَهَّدْتُ لَهُ تَہِيدًا ۝ ۱۴ ۝ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ
 أَزِيدَ ۝ ۱۵ ۝ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِإِيْتِنَاعِنِي ۝ ۱۶ ۝ سَارُهُنَّ صَعُودًا
 ۝ ۱۷ ۝ إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ ۱۸ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ۱۹ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ
 قَدَّرَ ۝ ۲۰ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ۲۱ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَكَسَرَ ۝ ۲۲ ۝ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝
 ۲۳ ۝ فَقَالَ إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْتَرُ ۝ ۲۴ ۝ إِنْ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ ۲۵ ۝

ترجمہ :- مجھے اور اس شخص کو چھوڑ دیں جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ۱۱ اور میں نے اسے لمبا
 چوڑا مال دیا ۱۲ اور (مجلس میں) حاضر ہونے والے بیٹے دیے ۱۳ اور ہموار کر دیا میں نے
 اس کے لیے ہر قسم کا دینیوی سامان ۱۴ پھر وہ طمع کرتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں ۱۵
 ہرگز نہیں بیشک یہ شخص ہماری آیات کے ساتھ عناد رکھتا تھا ۱۶ میں اسکو بڑی چڑھائی چڑھاؤں
 گا ۱۷ بیشک اس نے غور و فکر کیا اور اندازہ لگایا ۱۸ پس یہ مارا جائے اس نے کیا اندازہ
 لگایا ۱۹ پھر مارا جائے اُس نے کیا اندازہ لگایا ۲۰ پھر اُس نے دیکھا ۲۱ پھر اس نے تیوری
 چڑھائی اور منہ بسوا ۲۲ پھر پشت پھیری اور تکبر کیا ۲۳ پس اس نے کہا یہ جادو ہے جو نقل ہوتا
 چلا آتا ہے ۲۴ یہ تو انسان کا ہی کلام ہے ۲۵

گذشتہ سے پورنتہ

ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ذاتی تکمیل کے بعد بنی نوع انسان کی خیر خواہی اور ہمدردی
 کے لیے اندازہ کا حکم دیا۔ فرمایا یَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ یعنی اے لحاف یا کپڑا اوڑھنے والے
 آپ اٹھ کھڑے ہوں۔ اور اللہ کی مخلوق کو بُرے انجام سے خبردار کریں۔ اس کے بعد اس راستے
 کی سختیوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لیے فرمایا وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ اس راستے میں اپنے
 رب کے لیے صبر کریں۔ درمیان میں اچھے اخلاق اختیار کرنے کی تعلیم دی۔ بنیادی اصول بتا دیے
 گئے۔ اور مشن کی بات کو واضح کر دیا گیا۔ نیز فرمایا کہ اس حالت میں "وَرَبِّكَ فَكَبِّرْ" اپنے رب کی
 بڑائی بیان کریں۔ وہی سب سے بڑا ہے۔

سابقہ سورۃ سے
مطابقت

پچھلی سورۃ میں یہ اصول بیان کیا گیا تھا کہ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ
وَكَيْدًا یعنی مشرق و مغرب کا رب وہی اللہ ہے۔ لہذا اُسی کو اپنا کارساز بناؤ۔ اس کے سوا کوئی
معبود نہیں ہے۔ اور اُسی کے بھروسے پر کام کریں۔ وہاں تھا فَاتَّخِذْهُ وَكَيْدًا اور یہاں اس
سورۃ میں فرمایا وَرَبُّكَ فَكَبِّرْ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ کیونکہ عظمت و کبریائی اُس کے علاوہ
کسی اور کے لیے نہیں۔ کسی قوم، قبیلے، خاندان یا سردار کے لیے بڑائی نہیں ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا
وَتَشَابَهَكُمْ فِطْرًا اپنے لباس کو پاک صاف رکھیں۔ اپنے ماحول کو پاک رکھیں اور اس طرح طہارت
کا اصول اختیار کریں۔

یہ بھی فرمایا وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ گندگی کو دور پھینکیں۔ یہ گندگی خواہ کفر و شرک کی ہو یا حرص
و لالچ کی، خود غرضی کی ہو یا نفاق کی، ہر قسم کی نجاست سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔ وَلَا تَمْنُنْ
تَسْتَكَثِّرْ اور کسی پر ایسا احسان نہ کریں، جس کا بدلہ زیادہ طلب کریں۔ یہ عدل کے خلاف ہے۔
النَّانِيتِ کی بھلائی کے لیے احسان کریں کہ یہ النانیت کا تقاضا ہے۔ أَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ
جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا ہے۔ اسی طرح تم مخلوق خدا پر احسان کرو۔ اُن سے کسی
معاوضہ یا تعریف کی امید نہ رکھو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کی صفت میں فرمایا لَا تَرْيَدُ مِنْكُمْ جَزَاءً
وَلَا شُكُورًا یعنی ہم جو احسان کرتے ہیں، ہم اُس کے عوض میں شکریہ یا بدلہ نہیں چاہتے۔

یہ چار بنیادی اخلاق بیان کرنے کے بعد اس راستے میں سختی برداشت کرنے کا حکم دیا۔
اور قیامت کے متعلق آگاہ کیا۔ فَإِذَا انْقَضَى السَّاعُورُ یعنی جس دن صور پھونکا جائے گا۔ وہ بڑا
سختی کا دن ہوگا۔ خاص طور پر کافروں کے لیے بڑی دشواری ہوگی۔

گذشتہ سورۃ میں تھا ذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِيَ النَّعْمَةِ یعنی ان دولت مند مکہ میں
کو چھوڑ دیں۔ یہ حق و صداقت کی مخالفت کرتے والے لوگ ہیں۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور
پاکیزگی کے پروگرام میں حائل ہوتے ہیں۔ انہیں چھوڑ دیں اور یہاں فرمایا ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا
یعنی مجھے اور اس شخص کو چھوڑ دیں جسے میں نے اکیلے پیدا کیا۔ وہاں پر بھی دولت مند طبقے کی ذہنیت
بیان کی گئی تھی، اس سورۃ میں بھی دولت مندوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ وہاں بھی انہیں مہلت
دینے کا ذکر تھا، یہاں بھی مہلت کا ذکر کر کے صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ یہاں جس دولت مند شخص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ ولید ابن مغیرہ ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ان آیات میں مذکورہ باتیں اسی شخص کے ساتھ ہوتی تھیں ارشاد ہوتا ہے ذُرِّیُّیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا آپ چھوڑ دیں مجھے اور اس شخص کو جس کو میں نے پیدا کیا وَحِیْدًا، اکیلا وَحِیْدًا اگر فاعل سے حال بنایا جائے تو اس کا معنی ہوگا، جس کو پیدا کیا میں نے تنہا۔ کیونکہ پیدا کر لے میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ میں نے اس شخص کو پیدا کیا ہے۔ اس کی پیدائش میں کوئی شریک نہیں۔ لہذا میں وحید ہوں، ایگانہ ہوں۔ میں اس سے نپٹ لوں گا۔

وَحِیْدًا مِّنْ سَعۡیِ سے بھی حال بن سکتا ہے۔ یعنی جس کو میں نے اکیلا پیدا کیا ہے۔ جب انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ تو بالکل اکیلا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی فوج یا جماعت نہیں ہوتا۔ کوئی مال و دولت نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ لباس تک نہیں ہوتا۔ بالکل بے مہنہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آج یہ انسان مال و دولت اور فوج و قبیلہ پر فخر کرتا ہے۔ حالانکہ پیدائش کے وقت یہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی۔ یہ سب کچھ اُسے اللہ نے عطا کیا۔

مال کی کثرت

وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا میں نے اُسے لمبا چوڑا مال و دولت دیا۔ مال کی تمام اقسام اُسے عطا کیں۔ ولید ابن مغیرہ مکے کے رؤساء میں سے تھا، اُس کے پاس زمین اور باغات تھے۔ تجارت اور نقدی تھی۔ اور مولیٰ بھی تھے۔ مَمْدُودًا سے مراد وہ مال جس سے امداد ملتی رہتی ہے یُمَدُّ ذَکُوْهُ بِأَمْوَالِ جس مال سے امداد آتی ہے۔ یہ تینوں قسم کے مال ولید کے پاس تھے طائف میں اُس کا باغ تھا۔ سال بھر موسم کے مطابق اس کی پیداوار آتی رہتی تھی۔ کوئی موسم ایسا نہ تھا، جس میں کوئی نہ کوئی آمدنی نہ ہوتی ہو۔ تجارت بڑی وسیع تھی۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ مجموعی طور پر ایک کروڑ پانچ سو سالانہ اُس کی آمدنی تھی۔ اُس دور میں اتنی بڑی آمدنی والا شخص بڑی پوزیشن کا مالک تھا۔ آج کل تو ارب پتی لوگ بھی موجود ہیں۔ مگر اس زمانے میں ایک کروڑ پونڈ کی آمدنی بہت بڑی بات تھی۔ تجارت میں ہر وقت لاکھ دو لاکھ پونڈ کی سرمایہ کاری ہوتی تھی۔ ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو سو غلام ہوتے

تھے۔ کوئی شام سے قافلہ آرہا ہے کوئی یمن سے آرہا ہے۔ کوئی کہیں جا رہا ہے۔ کہیں سے اناج آرہا ہے کہیں کپڑے کی تجارت ہو رہی ہے۔ کہیں کھانوں کا کاروبار ہے، کہیں دوسرے سامان کا لین دین ہے۔ غرض مال و دولت کی ہر وقت فراوانی تھی جس سے امداد ملتی رہتی تھی۔ مولیشی بھی بہت تھے۔ بھیڑ بکریوں کے کئی گلے تھے۔ یہ سب مَالًا مَسْدُودًا میں آتا ہے۔ کہ ہم نے اُس کو لمبا چوڑا مال سے رکھا تھا۔

ولید کے بیٹے

وَبَنِيْنَ شُهُودًا اور مجلس میں حاضر ہونے والے بیٹے بھی دیے۔ وہ بیٹے جو عزت و وقار کا موجب تھے۔ اور کام کاج میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ بیٹوں کی تعداد بعض روایات میں تیرہ ہے۔ مگر عام مشور دس کی تعداد ہے۔ ولید خود اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وراثت میں بھی کافی مال تھا۔ خود بھی خوب کمایا۔ بڑا چودہری اور سردار تھا۔ ہر کوئی احترام کرتا تھا۔ مال اور اولاد اس کی عزت میں اضافہ کا باعث تھیں۔ ولید خود اور اس کے بعض بیٹے کفر کی حالت میں مرے۔ البتہ اُس کے چار بیٹوں نے اسلام قبول کیا۔ خالد بن ولید اسی ولید کے بیٹے تھے۔ جن کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا سَيِّفٌ مِّنْ سَيِّفِ اللّٰهِ یعنی یہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں۔ یہی خالد بن ولید عظیم المرتبت جرنیل تھے، جنہوں نے شام فتح کیا۔ یرموک کی لڑائیاں سر کیں۔ عراق کی حمات پر غلبہ پایا، کفار کو مغلوب کیا جنگ احد تک تو اسلام کے مخالفین کے ساتھ ہے۔ مسلمانوں کو احد کے میدان میں انہی کی وجہ سے بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو اسلام کی طرف پلٹ دیا تو پھر اللہ کی تلوار ثابت ہوئے۔ دوسرے بیٹوں میں ولید بن ولید اور عمارہ بن ولید ہیں۔ ولید بن ولید مکی زندگی میں قید تھے۔ برادری نے بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے باپ سخت سزائیں دیتا تھا۔ انہوں نے بڑی تکلیف اٹھائی۔ حضور علیہ السلام کافی عرصہ تک ان کی رہائی کے لیے نماز میں قنوت نازلہ پڑھتے رہے اور ان کا نام لے کر رہائی کی دعائیں کرتے رہے۔ اللّٰهُمَّ اِنِّجْ وَلِيْدَ بْنَ الْوَلِيْدِ وَعِيَّاشَ بْنَ رَبِيعَةَ وَهَشَّامَ بْنَ سَلَمَةَ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ صحیح بخاری ص ۵۳۱

کی روایت کے مطابق آپ دعا کرتے کہ اے اللہ! ولید بن ولید، عیاش بن ابی ربحیہ، ہشام بن سلمہ اور دوسرے کمزور مسلمانوں کو نجات دے۔ وہ کافروں کے ہاتھ سے بڑی تکلیف اٹھا رہے ہیں جب آپ نے قنوت نازلہ پڑھنا چھوڑ دی تو ایک شخص نے عرض کیا: حضور! آپ نماز میں قنوت نازلہ پڑھتے تھے، اب آپ نے چھوڑ دی۔ فرمایا وَمَا تَرَاهُمْ قَدْ مُوْا سِحْیَا تَم دیکھتے نہیں کہ جن کے بارے میں پڑھتے تھے، وہ آگے ہیں۔ اللہ نے ان کو کافروں کی قید سے رہائی دے دی ہے اور وہ پہنچ گئے ہیں۔

ولید بن ولید کا حال بھی عجیب لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بدر کی لڑائی میں کفار کی طرف سے آئے تھے۔ مگر — لڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ سمجھتے تھے کہ یہ غلط کام ہے۔ دل سے اسلام کی حقانیت کو تسلیم کر چکے تھے، مگر اس کا اظہار ابھی نہیں کیا تھا۔ بدر کی جنگ میں مسلمانوں کے قیدی بنے اور فدیہ دے کر رہائی حاصل کی۔ مگر معاً بعد اسلام قبول کر لیا۔ کسی نے کہا کہ پہلے اسلام کا اظہار کر دیتے تو فدیہ سے بچ جاتے۔ کہا اگر ایسا کرتا تو لوگ سمجھتے کہ فدیہ سے بچنے کے لیے اسلام قبول کیا ہے حالانکہ میں نے تو محض رضائے الہی کے لیے اسلام قبول کیا ہے۔ ولیدؓ ابن ولید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ہی فوت ہوئے۔ حضور علیہ السلام نے اپنی قمیص مبارک انہیں کفن کے طور پر پہنائی اور دفن کیا۔

فرمایا یہ مال اور اولاد ہی دو چیزیں ہیں، جن کی وجہ سے اکثر لوگ غافل ہو جاتے ہیں۔ حق کی مخالفت کرتے ہیں اور ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کفار اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ”اَنْحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا“ یعنی ہمارے پاس مال و دولت بہت ہے۔ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِیْنَ اور ہمیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ یہ دونوں چیزیں ولید ابن مغیرہ کو حاصل تھیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَهَّدَتْ لَهُ تَتْمِیْدًا کہ میں نے بھی اس کے لیے تیاری کی ہے، خوب تیاری، یہ شخص مال و دولت بیٹے، خاندان، عزت ہر چیز میسر ہونے کے باوجود ایسا کر لیں ہے کہ تَتْمِیْدًا طَمَعٌ اَنْ اَزِیْدَ طَمَعٌ کہتا ہے کہ میں اُسے اور زیادہ دوں، مال چیز ہی ایسی ہے۔ کہ لالچی کی آنکھ

مال و دولت
کی حرص

نہیں بھرتی۔ وہ ننانویں کے چکر میں رہتا ہے۔ کہ جس طرح بھی ہو اور زیادہ مال جمع ہو۔ جیسا فرمایا
 "جَمَعَ قَاوِمٌ" جمع کرنے میں حلال و حرام کی تمیز بھی نہیں کرتا۔ اس کے سر پر ایک ہی دھن سوار
 ہوتی ہے کہ مال میں اضافہ ہو۔ یہی سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ مستحقین کے حقوق ادا نہیں کرتا۔
 غربا و مساکین کا خیال نہیں رکھتا۔ مزدور اور کمزور کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ عیادت پر خرچ
 نہیں کرتا۔ حج پر نہیں جاتا۔ عمرہ ادا نہیں کرتا، قربانی نہیں کرتا۔ مساجد و مدارس پر خرچ نہیں کرتا بلکہ
 اپنے بنک بیلنس کی طرف دھیان رکھتا ہے۔ یا رسم و رواج پر خرچ کرتا ہے۔ شادی بیاہ میں کنجریاں
 بچاتا ہے۔ ٹیلی ویژن اور کھیل تماشے پر خرچ کرتا ہے۔ مکانوں کی ٹیپ ٹاپ کی طرف توجہ ہے مگر
 تبلیغ اسلام کی طرف دھیان نہیں دہ چاہتا ہے۔ کہ نہ اس کی کھائی پر کوئی پابندی ہو، نہ خرچ کرنے
 پر قدغن لگے۔ عیش و آرام کی چیزوں پر خرچ کرتا چاہتا ہے۔ "ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ"۔ چاہتا ہے
 کہ اور زیادہ مال آئے۔ تاکہ میں اور زیادہ عیاشی کروں۔ یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت پہلے بھی تھی اور آج
 بھی موجود ہے۔ ننانویں فیصدی لوگ حقوق ادا نہیں کرتے۔ کوئی خال خال انسان ہی ایسا ہے۔ جو
 پورے طور پر حقوق ادا کرتا ہو۔ ورنہ تجزیہ کر کے دیکھیں کہ دولت کی کثرت کس جگہ پر صرف ہو رہی ہے
 انسان کی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور مال و دولت کی حرص کو بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ کلاً ہرگز
 نہیں یعنی جاہ و مال کے حاملین کو دوام ہرگز حاصل نہیں۔ جو مالک الملک کوئی چیز عطا کر سکتا ہے۔ وہ
 چھین بھی سکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہوا، ولید بن مغیرہ کی زندگی کا آخری دور رو بہ تنزل تھا۔ اُسے موت
 ذلت کی حالت میں آئی۔ جوان اور قابل بیٹے مسلمان ہو گئے۔ جس کی وجہ سے اُسے بڑا صدمہ پہنچا۔ اور
 مال و دولت میں بھی زوال آنے لگا۔ اس کے علاوہ آخرت کی گرفت تو بہر حال قائم ہے۔

فرمایا کلاً إِنَّهُ كَانَ لِذٰلِكَ عَنۡدًا۔ یہ شخص ہماری آیات کے ساتھ غنا رکھتا تھا۔ وہ
 اس بات کا سخت دشمن تھا کہ پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مشن کامیاب ہو جائے۔ وہ تو اپنی
 سرداری قائم رکھنا چاہتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے بھی فیصلہ کر لیا کہ سَادُّهُ قَدْ
 صَعُوْا کہ ہم اس کو چڑھائی پر چڑھائیں گے یعنی دوزخ کے پہاڑوں پر چڑھا کر پٹھے گرا دیں گے۔
 اس کی سزا یہ ہوگی۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ مکذبین آج جس چیز کو ترقی سمجھتے
 ہیں وہی ان کے لیے آخرت میں تنزل کا سبب ہوگی، ترقی تو ایمان، اعمال صالحہ، توحید، اخلاص

بنی نوع انسان کی ہمدردی میں ہے، نہ کہ مال جمع کرنے میں۔

اِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ اُس بدبخت نے ان تمام امور پر غور و فکر کیا اور اس بات کا اندازہ لگایا کہ اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جو مشن پیش کر رہے ہیں، وہ ٹھیک ہے یا غلط ہے۔ فَقَسَدَ

پس یہ مارا جائے کیفَ قَدَّرَ اُس نے کیا اندازہ لگایا ثُمَّ قَتَلَ کیفَ قَدَّرَ پھر مارا جائے اس نے کیسے اندازہ لگایا۔ سوچ بچار کے بعد ثُمَّ نَظَرَ پھر اس نے دیکھا۔ جیسے غرور و تکبر سے دیکھتے ہیں ثُمَّ عَبَسَ پھر تیوری چڑھائی وَكَبَسَ اور منہ بسورہ ترش رو

ہوا۔ ثُمَّ اَدْبَرَ پھر پشت پھری وَاسْتَكْبَرَ اور تکبر کیا۔ کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا بات کرتے ہیں۔ اُن کی بات کچھ معنی نہیں رکھتی۔ تکبر کیا جیسے سورۃ قیامت میں آئے گا ثُمَّ ذَهَبَ اِلَى اَهْلِهِ يَمِطُ گھر کی طرف جا رہا ہے جیسا کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے کر جا رہا ہو، حالانکہ اس نے تکذیب کی۔ نہ تصدیق کی اور نہ نمانہ پڑھی۔ نہ ہی نیکی کی۔ بلکہ اکڑتا ہوا جا رہا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ پروگرام کے مطابق وَرَبِّكَ فَكَبَّرَ اپنے رب کی بڑائی بیان کرتا۔ طہارت اور پاکیزگی کو اختیار کرتا جلال و عرام میں تمیز کرتا، برخلاف اس کے اس نے کفر اور غرور کیا۔

حق کو تسلیم کرنے کی بجائے کہتا ہے فَقَالَ اِنْ هَذَا اِلَّا سِحْرٌ یُّوشَعٰی یعنی یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جادو کی بات کر رہا ہے۔ پہلے بھی جادو گر ہوا کرتے تھے۔ جو اپنے جادو کے ذریعے لوگوں کو مٹا کر دیتے

اسلام کے خلاف
پروپیگنڈا

تھے۔ اسی طرح یہ بھی جادو کر رہا ہے۔ اس قسم کا پروپیگنڈا ایک دولت مند اسلام کے پروگرام کے خلاف کر رہا ہے۔ اس پروگرام کو جادو اس لیے کہتے تھے کہ اور کوئی بات درست نہیں بیٹھتی تھی جیسا کہ پہلی سورت میں گزر چکا ہے۔ کبھی شاعر کہتے مگر شاعری والی بات نہ پاتے۔ پھر کاہن کہتے تو اس میں کامیاب نہ ہوتے، جادو گر کہتے۔ تو اس کا ثبوت بھی پیش نہ کر پاتے۔ اور سوچتے کہ آخر کیا بات ہے کہ آپ کی بات لوگوں کو اپیل کرتی ہے۔ لوگ کیوں گرویدہ ہوئے جاتے ہیں اور آخر میں اس نتیجہ پر پہنچتے کہ اِنْ هَذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ۔ یہ تو انسان کا کلام ہے۔ کلام الہی نہیں۔ اسلام کی مخالفت میں یہ آخری حربہ استعمال کرتے کہ قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کا کلام ماننے سے انکار کر دیتے۔ اس بات

سے ثابت کرتا یہ مقصود تھا۔ کہ اسلام کا پروگرام، اللہ کا پروگرام نہیں بلکہ انسانی ذہن کی تخلیق ہے اور یہ قابل عمل نہیں۔ اس طرح گویا لوگوں کے ذہنوں کو پرواگندہ کرنے کی کوشش کرتے۔ تاکہ ایمان اور اسلام کا مشن یہیں ختم ہو جائے۔ مگر یہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کا بھیجا ہوا پروگرام ہے۔ یہ ضرور کامیاب ہو گا۔ اور ممکن ہیں اور دولت مند کو اپنے مشن میں ناکامی ہوگی۔ اسی لیے پہلے فرمایا کہ قاصد یعنی اے بنی علیہ السلام! آپ ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کریں۔ ہم ان کو ضرور سزا دیں گے۔ آئندہ آیات میں کفار کے لیے سزا کا بیان آئے گا۔

تَبْرَكَ الَّذِي ۲۹

المذکور

درس چہارم ۴

(آیت ۲۶ تا ۳۱)

سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ۝
لَوَاحٍ لِلْبَشَرِ ۝ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا
مَلَائِكَةً ۝ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا ۝ لِيَسْتَيَقِنَ الَّذِينَ
أَوَّلُوا الْكِتَابَ وَيزِدُوا الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا ۝ وَلَا يَرْتَابُ الَّذِينَ أَوَّلُوا الْكِتَابَ
وَالْمُؤْمِنُونَ ۝ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَدَّاءُ اللَّهِ
بِهَذَا امْتِلَاءً ۝ كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۝ وَمَا
يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۝ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْبَشَرِ ۝

ترجمہ: عنقریب میں اس کو سقر میں ڈالوں گا ۲۶ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ سقر کیا ہے ۲۷
نہ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے ۲۸ انسانوں کو حجابینے والی ہے ۲۹ مقرر ہیں اس پر انیس
فرشتے ۳۰ اور ہم نے نہیں مقرر کیے دوزخ کے کارکن مگر فرشتے اور ہم نے یہ تعداد کافروں
کی آزمائش کے لیے مقرر کی ہے تاکہ اہل کتاب یقین کر لیں اور اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ
ہو اور تاکہ اہل کتاب اور مومن اس میں شک نہ کریں اور جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے
یا جو کافر ہیں وہ کہیں گے اس مثال کو بیان کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کیا منشا ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے
چاہتا ہے اسی طرح سے بہکاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے۔ اور تیرے رب کے
لشکروں کو صرف وہی جانتا ہے۔ اور یہ تو انسانوں کے لیے یاد دہانی ہے ۳۱

گذشتہ پوچھتے ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اُن بنیادی اصولوں کا ذکر کیا جن پر یقین رکھنا اور عمل پیرا
ہونا ہر ایک شخص کے لیے ضروری ہے۔ وہ پاکیزہ اصول اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان، اس کی بڑائی
کا تذکرہ، طہارت اور پاکیزگی کا اختیار کرنا۔ ہر قسم کی گندگی اور نجاست سے پرہیز اور ظلم و تعدی سے
پاک رہنا ہیں۔ ان اصولوں کی مخالفت کرنے والے عام طور پر دولت مند لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
نے ان آسودہ حال لوگوں کی ذہنیت کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ صحیح پر و گمراہی کی کس کس طرح مخالفت
کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ انمان کا کلام ہے۔ اس کے الہی

پر وگرم ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ صبر کریں۔ انتقام لینے میں جلدی نہ کریں ہم خود ایسے لوگوں سے منٹ لیں گے اور ان کو سزا دیں گے۔

آگے ان مکذبین کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ سَأَصْلِيْهِ سَقَدٌ۔ یقین جانیں، عنقریب میں ان کو سقر میں ڈالوں گا۔ مقرر دوزخ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جیسے لظی، جہنم، نار، حاویہ اسی طرح سقر بھی ایک نام ہے جس کا معنی بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ سقر دوزخ کے طبقات میں سے پانچواں طبقہ ہے۔ جو لوگ دنیا میں عناد، تکبر اور تکذیب کی آگ اپنے اندر اکٹھی کرتے ہیں، قیامت کو وہ اسی میں ڈالے جائیں گے۔

پھر فرمایا وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَدٌ آپ کو کس نے بتلایا کہ سقر کیا ہے۔ قرآن پاک کا یہ انداز ہے کہ بعض اوقات بات استفہام کی صورت میں سمجھائی جاتی ہے جیسے الْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ اسی طرح یہاں فرمایا وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَدٌ یعنی سقر کیا چیز ہے؟ پھر خود ہی بیان فرمایا لَا تَبْقَىٰ وَلَا تَذَرُ یعنی سقر ایسی چیز ہے جو نہ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے۔ یعنی کوئی بھی مکذب اس کی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ وَلَا تَذَرُ اور نہ چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جلانے کے بعد بالکل فنا نہیں کر دے گی، بلکہ انسان پلٹ کر اپنی اصل حالت پر آجائے گا۔ اس طرح انہیں مسلسل سزا ملتی رہے گی۔ دوسری جگہ اس کی تفصیل یوں بیان کی كُلَّمَا نَضْجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ جب انہی کھالیں جل جائیں گی۔ تو اس کی جگہ نئی کھال دے دی جائے گی۔ اور وہ اپنے کئے ہوئے کا وبال چکھتے رہیں گے۔ جب تک ان کے جسموں میں کفر، شرک اور تکذیب کا بھرا ہوا زہر نکل نہ جائے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے کسی شخص کے جسم میں صفرا کا مادہ ہو، جب تک وہ موجود ہے گا۔ بخار آتا ہے گا۔ اگر بلغم کا مادہ گل سڑ جائے تو بلغمی بخار آئے گا۔ اور جب تک وہ مادہ خارج نہیں ہوگا، بخار نہیں اترے گا۔ ان لوگوں نے اپنے جسموں میں پاکیزہ اخلاق پیدا نہیں کئے بلکہ زہر ملا مادہ پیدا کیا۔ جب تک وہ مادہ باقی ہے گا ان کے جسموں کو سزا ملتی رہے گی اور اس سے رہائی ممکن نہیں ہوگی۔

سقر کی حقیقت

اور وہ آگ ایسی ہے کہ لَوَّاحَةٌ لِلْبَشَرِ انسان کو جھلسا کر رکھ دے گی، جلا ڈالے گی۔ بشر انسان کو کہا جاتا ہے اور بشرہ جسم پر بولتے ہیں۔ ظاہری کھال کو بشرہ کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں معنی یہاں مراد ہو سکتے۔ سقر کے انتظام کے متعلق فرمایا عَلَيْهِمَا تَسْعَةُ عَشْرَ یعنی دوزخ میں سزائینے کے لیے انیس فرشتے مقرر ہیں۔ یہ دوزخ کے بڑے بڑے دروغ یا افسر ہیں، جو سزائیت پر مامور ہیں۔ اس پر مشرکین نے اعتراض کیا۔ ان میں ابوالاسود بن کلدہ، جہمی پہلوان تھا۔ انیس کے عدد پر مذاق کرتا تھا۔ کہنے لگا کہ انیس میں سے سترہ فرشتوں کو تو میں خود پکڑ لوں گا اور تم سب مل کر بھی باقی دو سے نہیں نمٹ سکو گے، اس قسم کا ٹھٹھا کرتا تھا۔ ابوجہل بھی کہتا تھا۔ کہ دوزخ پر مقرر انیس فرشتوں کا مقابلہ ہم کر سکتے ہیں۔

سزائے
انیس فرشتے

فرشتے روحانی مخلوق ہے۔ جن اور فرشتے انسانوں کی نسبت بہت زیادہ طاقتور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنی طاقت بخشی ہے کہ ایک فرشتہ ایک کروڑ آدمی کو ہتھیلی پر رکھ کر جہاں چاہے پھینک دے لہذا سزائینے کے لیے تو ایک فرشتہ بھی کافی ہے۔ احادیث میں فرشتوں کے متعلق جو تفصیل آئی ہیں، ان میں فرشتوں کی خوفناکی بھی پائی جاتی ہے۔ اور خوبصورتی بھی۔ مثلاً موت کے وقت جو فرشتے مومنوں کے پاس آتے ہیں۔ وہ نہایت حسین شکلوں میں ہوتے ہیں۔ اور کافروں اور منافقوں کے پاس آنے والے فرشتے خوفناک شکلوں میں آتے ہیں، ان کی شکلیں سیاہ ہوتی ہیں اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ کافر یا منافق شخص سے قبر میں جب فرشتے سوال کریں گے کہ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور تیرا نبی کون ہے، تو وہ کسی سوال کا جواب نہیں دے سکے گا۔ ہا ہا کرتا ہے گا۔ لا ادری یعنی میں نہیں جانتا۔ افسوس! میں نہیں جانتا۔ لوگ کچھ کہا کرتے تھے، مگر میں نہیں جانتا۔ اس پر فرشتے انہیں مختلف قسم کی سزائیں دیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ بعض کے سروں پر ہتھوڑے پڑیں گے۔ اور بعض پر قبر سمٹ جائے گی۔ بعض کے متعلق فرمایا کہ ان پر ننانویں سانپ مسلط کر دیے جائیں گے۔ حالانکہ ڈسنے

کے لیے ایک سانپ بھی کافی ہے۔ مگر یہاں ننانویں سانپوں کا ذکر کیا ہے۔ فرمایا بعض پر بچھو
چھوڑے جائیں گے۔ بعض پر درندے مسلط ہوں گے، اور بعض کو دوسرے طریقوں سے سزا ملے گی۔
ننانویں کے عدد کی حکمت بعض مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا
اِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ اِسْمًا یعنی اللہ تعالیٰ کے ننانویں نام ہیں مائتہ الہ واحد یعنی
ایک کم سو۔ جس شخص نے ان اسمائے پاک کو مانا، اُن پر ایمان لایا، اور ان کو پڑھتا رہا۔ بہشت
میں داخل ہوگا۔ برخلاف اس کے منافق اور کافر اللہ تعالیٰ کے کسی نام پر بھی ایمان نہ لایا۔ لہذا
ہر نام کے بدلے میں ایک سانپ اُسے ڈستا ہے گا۔ اور اُسے سزا ملتی ہے گی۔

انیس کی حکمت

اسی طرح انیس کے عدد میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوزخ پر انیس
فرشتے کیوں مقرر فرمائے۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری
ہے۔ اُن کی تعداد انیس ہے۔ لہذا ہر ایسی چیز کے مقابلہ میں باز پرس کے لیے ایک فرشتہ ہوگا۔
مثلاً جن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے، ان میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سر فہرست ہے۔ اس
جہان کے حادثات ہونے پر ایمان لانا کہ یہ ہمیشہ سے نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے پیدا کیا۔ ایک
وقت آئے گا جب یہ پھر فنا ہو جائے گا۔

اسی طرح ملائکہ اور کتب سماویہ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا ضروری ہے
تقدیر پر ایمان لانا یعنی کائنات میں جو کچھ ہو چکا ہے اور جو آئندہ ہوگا، سب کا سب اللہ تعالیٰ کے
علم، ارادے اور مشیت کے مطابق ہوگا۔ اسی طرح قیامت، جنت اور دوزخ پر ایمان رکھنا ضروری
ہے۔ یہ کل نو ایمانیات ہو گئیں، جن پر ایمان لانا لازم ہے۔

پانچ چیزوں کا تعلق عملیات سے ہے۔ مثلاً توحید و رسالت کا اقرار زبان سے کرنا، اور
اس پر یقین رکھنا۔ باقی چار عبادات ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ ان سب پر عمل کرنا ضروری
ہے۔ اسی طرح پانچ چیزیں منہیات سے متعلق ہیں، یعنی وہ چیزیں جن سے منع کیا گیا ہے، ان پر
بھی یقین رکھنا ضروری ہے۔ ان میں زنا حرام ہے، چوری حرام ہے، قتل نفس حرام ہے کسی پر

بہتان یا نہ صناعاً حرام ہے۔ اور نیکی کے کام میں مخالفت کرنا بھی حرام ہے۔ یہ تمام باتیں بیعت والی آیت جس میں عورتوں سے بیعت کرنے کی شرائط بیان ہوئی ہیں سورۃ نمختہ میں موجود ہیں۔ تو گویا یہ سب مل کر انیس ہو گئے۔ جن میں سے ہر ایک کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے

حکمائے اسلام اور مفسرِ عالمیؒ کہتے ہیں کہ دوزخ پر انیس فرشتے مقرر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ انسان کے حواس ظاہرہ اور باطنہ پانچ پانچ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں جو قوتیں رکھی ہیں ان کی تعداد نو ہے اس طرح کل انیس ہیں سے ہر ایک قوت کے مقابلہ میں ایک ایک فرشتہ مقرر ہے۔ حواس ظاہرہ میں آنکھ یعنی قوت باصرہ ہے۔ سونگے کے لیے قوت الگ ہے۔ چکھنے کی قوت جدا ہے ٹوٹنے کی قوت جدا ہے۔ اور پانچویں قوت سننے کی علیحدہ ہے۔ ان سب کے محکمے جدا جدا ہیں۔ اسی طرح باطنی حس مشترک ہے۔ وہم، خیال، حافظہ اور قوائے متحرکہ باطنی حواس ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں جو قوتیں رکھی ہیں۔ ان میں جذب کرنے والی قوت ہے۔ غذا اور دیگر ضروریات زندگی کو اپنے اندر روکنے والی طاقت ہے۔ ہضم کرنے والی قوت ہے۔ فضلات کو دفع کرنے اور باہر نکالنے والی قوت ہے۔ جسم کی ساختوں کو غذا پہنچانے والی قوت ہے اور نشوونما دینے والی طاقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو بید و تناسل کے لیے بھی قوت رکھی ہے۔ اس طرح حواس ظاہرہ اور باطنہ کی کل انیس قوتیں ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں رکھی ہیں ہر ایک قوت کے مقابلہ میں ایک فرشتہ مقرر ہے۔ ہر فرشتے کا محکمہ الگ ہے، دوسرے محکمے سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ کان کو آنکھ کے محکمہ سے کوئی تعلق نہیں، اور آنکھ کو لمس کے محکمہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہر ایک کا محکمہ جدا جدا ہے۔ فرشتے اپنے اپنے محکمہ کے مطابق سزا دیں گے۔

جسم انسانی کی بیرونی حفاظت اور اندرونی ساخت کے لیے اللہ تعالیٰ نے بے شمار فرشتے مقرر کر رکھے ہیں۔ صرف جگر کی ساخت پر غور کریں جہاں انسانی جسم کے لیے خون پیدا ہوتا ہے۔ انسان جس قدر غذا استعمال کرتا ہے۔ وہ معدے سے ہو کر باریک نالیوں کے ذریعے جگر میں پہنچتی ہے اور جگر اس کو خون میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ خون بڑی نالیوں کے ذریعے قلب میں پہنچتا ہے۔ اور قلب اس کی پمپنگ کر کے سارے جسم میں بھیجتا ہے۔ فضلات کو باہر نکالتا ہے۔ سانس کے ذریعے

انسانی مشین کو چلانے والے فرشتے

اسکیجن اندر داخل کرتا ہے۔ اور نازہ دم ہو کر انسان کو غذا ملتی ہے۔ صرف ایک جگر کی ساخت میں اتنی بڑی فیکٹری لگی ہوئی ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا کارخانہ اس کے عشر عشر کے برابر بھی نہیں، ہندوستان میں ٹاٹا کے فولاد کے کارخانے میں دس لاکھ مزدور کام کرتے ہیں۔ مگر جگر کی فیکٹری کے مقابلہ میں ٹاٹا کھیتی بھی کر رہے۔ وہاں تو کمروں کا فرشتے کام کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا کارخانہ قائم کر دیا ہے۔ باقی ساختوں کا تو کتنا ہی کیا ہے۔ ایک تولید و تناسل کے اجزاء کے لیے اللہ نے بڑا وسیع سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ بے شمار فرشتے اپنی اپنی ڈیوٹیاں انجام دے رہے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ
کی توجیہ

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انیس فرشتوں کی حکمت یہ ہے کہ انسانیت انیس چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو ظاہری جسم ہے۔ یہ انسان کا خاکی ڈھانچہ ہے۔ اندر لہجہ ہے، روح

لے حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ اور مفسر قرآن حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور بعض دیگر محققین کی تحقیق کے مطابق یہ چند سطور حسب مقام علمی استفادہ کی خاطر لکھی جاتی ہیں۔
الآت کسب نفس میں انیس ہیں۔ دو ہاتھ، دو پاؤں، زبان، دل، اعضاء و تناسل شکم پشت (حواس خمسہ ظاہرہ) باصرہ، لامہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ (حواس باطنہ) حس مشترک، وہم، خیال، فکر، عقل، قوت شہوانیہ، قوت غضبیہ ان آلات کے استعمال میں جو بھی تقصیر کرے گا یا ان کو غیر محل میں صرف کرے گا۔ دوزخ میں ہر ایک پر اللہ تعالیٰ سزا کے لیے الگ الگ موکل مقرر کرے گا۔

اگر انسان کے جسم میں اخلاط (HUMOURS) سڑ جائیں تو بدن میں بخار اور حرارت پیدا ہو جائے گی جس سے انسان کا جسم جلتا ہے گا۔ اسی طرح انسان میں نسیم (Nesmic Body) جو اس مادی (فیزیکل) جسم میں پرورش پاتا ہے۔ اگر انسان کے اخلاق، عقائد، افکار و آراء بگڑ جائیں تو اعمال سوار کے نتائج اس میں جمع ہوتے رہتے ہیں یہ زہریلے مواد ہیں۔ جب ایسے انسان جہنم کے قریب جائیں گے تو یہ مواد بھڑک اٹھیں گے۔

انسانی روح کے مراکز بھی انیس ہیں۔ حواس ظاہرہ و باطنہ، روح، حس، قلب و عقل کا بطن (خفی دہر کا بطن)، اخفی و خفی کا بطن، انانیت کبریٰ، نور القدس، النجر البحت (انانیت کبریٰ اور نور القدس کا بطن جو تجلی الہی کا نمونہ ہے) ان مراکز کے ذریعہ انسان اپنی تکمیل کرتا رہتا ہے اور کر سکتا ہے۔ نفس سے مراد انسان کی انانیت ہے جس کو آنا (ہیں) سے تعبیر کرتا ہے۔

ہے۔ الغرض یہ کل انیس چیزیں ہیں۔ ہر ایک جزو نہایت لطیف ہے۔ اس میں دس تو قوائے ظاہرہ اور باطنہ ہیں، اس کے علاوہ نفس ہے، قلب، عقل اور روح ہے۔ روح کا بطن ہر ہے۔ ہر کا بطن

بقیہ حاشیہ :- جنہوں نے دنیا میں راستی کو اپنا شعار بنایا۔ اور نامہ اعمال ان کو دائیں ہاتھ میں ملا۔ وہ تمام حقوق واجبات کو ادا کر کے جنت کی طرف روانہ ہو گئے اور ”زبانہ“ کی گرفت سے بچ گئے۔ انہیں دخول جنت کا دیڑا مل گیا انسان کی ساخت ہی ایسی ہے، انسان اپنے قصد و ارادہ سے جو کام کرتا ہے۔ اس کی جوابدہی کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان تمام قوتوں (الہی قوتوں) کو جو فطرت کے مطابق کام میں لاتا ہے تو ان قوتوں کو صلاحیت ہے۔ اور اعمال صالحہ کے ثمرات اس کے نسمہ میں جمع اور محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ اصحاب الیمین جنہیں کامیابی کی سند یمین میں ملے گی یہ اصحاب الیمینہ بھی کہلاتے ہیں (مبارک، برکت والے)

(الف) یہ آدم علیہ السلام کی پشت مبارک سے دائیں طرف سے اخذ کئے گئے تھے۔

(ب) راستی شعار۔

(ج) موقف میں عرش کی دائیں طرف۔

(د) اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا۔

(د) جانب راست جنت کی طرف روانہ ہونے والے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْ اَصْحَابِ الْيَمِينِ (حسن بصریؒ)

ان کے مقابل اصحاب الشمال (مشرکہ۔ نخست والے نامبارک لوگ) جہنمی لوگ جب وہاں پہنچیں گے تو ان

سے اصحاب یمین پوچھیں گے۔ اس لیے کہ مجرم کو معلوم ہونا چاہیے کہ کس جرم کی سزا اس کو مل رہی ہے وہاں خود بخود مجرم کو معلوم ہو جائے گا۔ اصحاب الشمال جواب دیں گے۔ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ انسانی بھلائی کے اس پروگرام پر عمل نہیں کرتے تھے۔ جو انسانوں میں اتحاد فکر، اجتماعیت، مساوات، اخلاص سے

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔ **نہ کوئی بندہ رہا نہ بندہ نواز** (اقبال)

طہارت و پاکیزگی۔ وقت کی پابندی۔ تنظیم و ڈسپن جیسی بیسیوں بھلائیاں سکھاتا تھا اور جس کی آخری کڑی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے رتعلق باللہ انسان کی ذاتی ضرورت ہے) الصَّلَاةُ مُعْجَاژُ الْمُؤْمِنِينَ۔ انسان کے دل میں خدا پرستی اور خدا شناسی کی قوت پوشیدہ ہے۔ جب انسان نماز کے ذریعہ اس کو ترقی دیتا ہے تو انسان میں آخر کار ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا اس آئینے میں تجلی الہی کو دیکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کے

باقی حاشیہ مسئلہ ۳۶۳

خفی ہے اخفی کا بطن اخفی ہے۔ اور اخفی اسے آگے باریک اور لطیف چیز انانیت کہہ رہی ہے اس سے آگے نور قدس ہے، اور آخر میں حجر بخت ہے۔ جو کہ تجلی الہی کا نمونہ ہے۔ جو روح انسانی پر پڑتی ہے

بقیہ حاشیہ: بد تقاضوں کو خدا کا حکم سمجھ کر ادا کرتا ہے۔ ایسا انسان خدا کے محزون اور مسکین بندوں کے حقوق ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے آپ کو ان کا خادم جانتا ہے کسی کا حق چھیننے کا کوئی عزم نہیں کرتا۔ لیکن نماز سے پہلے اپنے نفس کو کفر، شرک، انفاق، الحاد، شک، اعتقاد باطلہ، نیات فاسدہ، اخلاق ذمیمہ، بد باطنی (غل)، کینہ (حقہ)، دغا بازی (فراڈ)، حسد و تکبر سے پاک کرنا ضروری ہے۔ پھر جسم و بدن، لباس کو بول و براہ خون، پرپ، مواد منویہ مذی وغیرہ سے پاک کرے حدیث اصغر و اکبر سے بدن کو وضو، غسل اور تیمم کے ذریعے پاک کرے۔

ظاہری جسم کو فضیلت غیر طبعی بال بغل، زیر ناف، ناخن، میل کچیل سے۔

مال کو زکوٰۃ و صدقات ادا کرنے سے۔ اور حرام کی آمیزش سے پاک کرے۔ سود، رشوت، جوا، بدکاری کی کمانی، الشورنس، قمار، دغا، فریب، چوری وغیرہ حرام کی کمانی سے پاک صاف کرنا ضروری ہے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ نماز میں بھی انیس باتیں ہیں | طہارت بدن، جامہ، طہارت اصغر و اکبر، تکبیر تحریمیہ، استقبال قبلہ، ستر عورت قیام، قرأت، رکوع سجود، قعود، اذکار و تسبیحات و تکبیرات، تشہد، درود، دعا، حضور قلب (دل)، نیت، اسلام طہانیت ارکان، ترک کلام و عمل منافی۔ و ترک التفات داییں بائیں طرف۔ رکعات نماز بھی انیس ہیں، دو فجر، چار ظہر، چار عصر، تین مغرب، چار عشاء، اور رکعت رات کی نماز اس پر ایک عدد اضافہ برائے رعایت عدد و طاق یعنی وتر۔

سنن و نوافل تو مکملات و مهمات ہیں۔

ساعات بھی انیس ہیں۔ پانچ نماز کے لیے وضع کر لیے گئے۔ باقی کی باز پرس سے انسان بچ جائیں گے

ورنہ انیس زبانہ سزا کے لیے مسلط ہوں گے۔ ہر ساعت کے لیے ایک ایک علیہا تسعة عشر طعام مسکین — وَلَوْ نَكَ نَطْعُهُمُ الْيُسْكِينُ

اگر ہم محتاجوں کو کھانا کھلاتے تو انیس گھنٹے وہ فراغت سے بسر کرتے اور ان کی انیس قوتیں تازہ دم اور بحال ہوتیں۔ اگر وہ ان انیس گھنٹوں میں ان طاقتوں کو اطاعت میں مصروف رکھتے تو ہمارے نامہ اعمال میں بھی نیکیاں درج ہوتی رہتیں۔

کھانا کھلانے میں بھی انیس باتیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ ہل چلانا، تخم پاشی۔ آب پاشی، حفاظت، گناہ باقی حاشیہ کھانا

انسانیت ان اجزاء سے مرکب ہے۔ کافر و مشرک نے ان انیس اجزاء کو خراب کر دیا۔ یہ خدا پرستی کے مرکز تھے۔ لہذا سزا دینے کے لیے ہر ایک سنٹر کے مقابلہ میں ایک فرشتہ ہو گا۔

بقیہ حاشیہ :- مٹا صاف کرنا۔ کھیاں کی حفاظت کرنا، حمل و نقل، پینا چھاتنا۔ گوندھنا، پکانا، نمک و سالن ملانا، اٹھا کر محتاج کے سامنے عزت سے رکھنا، رخصت کرنے میں عجلت نہ کرنا۔ احسان نہ جملانا۔ بار بار اس کو یاد نہ کرنا۔ ایک مسکین کو کھانا کھلانے سے انیس زبانہ کے مقابلے میں انیس عمل ہوتے ہیں۔

وَالْعَظِيمُ لَا مَرَأِيَّ لِلَّهِ وَالشَّفَقَةُ عَلَى خَلْقِ اللَّهِ
خوض — کُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ

بیودہ باتیں کرتے تھے مثلاً حسن زمان کا ذکر، عیش و دولت مندان، نخوت بادشاہان اور ان کے اسباب افتدار کے تذکرے، جنگ و مشاجرات کے قصے۔ مذاہب باطلہ کا تذکرہ۔ فاسقوں کے فسق کی کہانیاں۔ نکتہ چینی و طعن دوسروں کے کلام پر اور اس کی خرابیاں اور غلطی کا تذکرہ۔ نزاع و جدال۔ مذاہب و اقوال میں تعصب و خصومت اپنے حقوق سے زیادہ کی وصولی کے لیے سخن پروری و سخن سازی۔ شعر و شاعری، ہجو و مدح سے تلذذ۔ فحش و عشاء، مستورہ کا ذکر اور پردہ نشینوں کا ذکر۔ ایک دوسرے کے ساتھ سخت گوئی بے جا۔ احمق و جاہل لوگوں کی طرح۔ گالی و دشنام سب و شتم اور آبرو میں قدر کرنا۔ لعنت غیر مستحق پر۔ حد سے زیادہ مزاح و ہنسی، دل لگی۔ انبساط و مقدار سے زیادہ جو موجب رنج و ملال ہونے لگتا ہے۔ تمت و بہتان اور بے گناہوں کو اموذھیہ کے ساتھ مستہم کرنا۔ استہزاء اور تمسخر اور بیودہ خندہ زنی، مسلمانوں سے وعدہ خلافی، دروغ گوئی و مبالغہ آرائی۔ لوگوں کے اسرار و رموز کا افشاء اور امور مستورہ اور خانگی امور کا بر ملا اظہار کرنا، بددعا کرنا۔ غیبت۔ سخن چینی اور غماندہی و خیلخوری، رو بہ و مدح سرائی کرنا، فخر و مباہلات کا اظہار، قومی و نسلی برتری۔ اپنے بڑوں کے غرور کا طعناں۔ لایعنی سمینار۔ فضول قسم کے کلوکیم۔ ڈرامے، ثقافتی شو۔ عشقیہ ناول، اشعار خوانی، سینما، فلم ایکٹروں کے گانے سنانے، باجے، مضمون خواہ۔ سکولوں، کالجوں، بازاروں، جلسوں، میلوں، عرسوں میں ہو۔ یا سینما، تھیٹر وغیرہ۔

(۱) وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا

سَمِعْتُمْ آيَاتَ اللَّهِ يُكْفِرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ

بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي

بَاقِي حَاشِيہ مشابہ

انیس کا عدد
ایمان کی آواز
کے لئے ہے

بعض فرماتے ہیں، روزِ خ کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازے پر ایک فرشتہ مقرر ہے۔ روزِ خ کے ایک طبقے میں گنہگار مومن بھی جاتیں گے وہ بھی روزِ خ کا فرشتہ دیکھے گا کہ اس مومن نے تصدیق

بقیہ حاشیہ :- حَدِیْثٌ غَیْرُہ ۵

اَنْكُمْ اِذَا مَثَلْتُمْ (پ النسا ۱۴)

بیمٹھ جب تک وہ کوئی اور بات شروع نہ کر دیں

ورنہ تم بھی ایسی حالت میں انہی جیسے ہو گے۔

(۲) اور اے مخاطب جب تو ایسے لوگوں کو دیکھے جو

ہماری باتوں میں بے ہودہ نکتہ چینی کر رہے ہوں تو تو ان

لوگوں سے کنارہ کش رہ یاں تک کہ وہ کسی دوسری بات

میں بحث شروع کر دیں اور اگر شیطان تجھ کو کبھی یہ حکم

بھلائے تو یاد آنے پر پھر ایسے ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔

(۲) وَاِذَا رَاٰیْتَ الَّذِیْنَ یُخَوِّضُوْنَ فِی الْاٰیٰتِ

فَاَعْرِضْ عَنْہُمْ حَتّٰی یُخَوِّضُوْا فِی حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ

وَ اِمَّا یَنْبِیْئُكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرِی

مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِیْنَ

(پ الانعام)

تکذیب قیامت ————— وَ کُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ

اس میں بھی انیس باتیں ہوں گی۔ آسمان کا پھٹنا۔ زلزلہ زمین۔ انتشار کو اکب۔ آفتاب و مہتاب کا بے نور ہونا۔

پہاڑوں کی حرکت۔ سمندروں کا گرم ہونا۔ لوگوں کا زندہ ہو کر فوج در فوج حاضر ہونا۔ پسینے کا بدلوں سے بننا۔

سایہ کا نہ ملنا۔ طول قیام۔ تجلی قمری کے ظہور پر سوال و جواب، وزن اعمال، یقین و یسار اعمال ناموں کا ملنا۔

بہشت یا دوزخ کی طرف روانگی بل صراط سے گزرنا۔ جنت یا دوزخ میں داخل ہونا۔

وَقَوْعُ مَوْتٍ ————— حَتّٰی اَتٰنَا الْیَقِیْنُ

آخر موت و ہلاکت کے انقلاب نے ہماری آنکھیں کھول دیں (اَمَّا هٰذَا فَاَفْقَدُ جَاہُ الْیَقِیْنِ)

مزدوروں، محتاجوں، مظلوموں کی اپیل کے آخری دن اور فیصلے پر ہم یقین نہیں رکھتے تھے۔ اپنے آپ کو

کسی کے آگے جوابدہ نہیں خیال کرتے تھے۔ اور اس ذمہ داری کا جو احساس دلانے والے تھے۔ ہم ان کو

بھی جھٹلاتے تھے۔

قومی اور بین الاقوامی انقلاب کے اصولوں کا خلاصہ

(۱) الْقَلَابِ کَالْاِہْمِ اَصُوْلٌ وَاذْکُرْ اَسْمَ رَبِّکَ وَتَبَسَّلْ اِلَیْہِ تَبَتُّیْدٌ

باقی حاشیہ ۳۶۶

قلبی میں کتنا خلل ڈالا ہے۔ اور اقرار لسانی اور عمل ارکان میں کتنا خلل ڈالا ہے۔ تین تو وہاں مقرر ہوں گے اور ایک فرشتہ یہاں ان تینوں پر ہوگا۔ باقی ہر ایک دروازے میں تین تین فرشتے ہوں گے۔ وہ کافروں کے لیے ہوگا۔ اس لیے انیس فرشتوں کی تعداد مقرر فرمائی ہے۔

بقیہ حاشیہ ۱۔ (۲) تمام اقوام میں عدل و انصاف قائم کرنے کا پختہ ارادہ،
(۳) اپنے اندر اپنے اعمال و افعال کی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا۔

(۴) تعلق باللہ کا قیام

(۵) ظاہری پاکیزگی کے ساتھ خیالات و افکار و افعال کی پاکیزگی۔

(۶) انسانی سوسائٹی میں ذریعہ پرستی و سرپرستی کا استیصال

(۷) مساکین و غریب کی خدمت

(۸) ہر شخص کا اقامت دین کی تبلیغ و تنظیم میں اپنی ذمہ داری سے حصہ لینا۔

(۹) اللہ تعالیٰ کو ہی تمام طاقتوں اور پر جاننا اور اسی پر بھروسہ کرنا۔

(۱۰) سچا مسلمان نہ کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ ظلم کو برداشت کرتا ہے (لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ۔ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ)

(۱۱) ہر قسم کی ظلم و زیادتی کو مٹانا اور سوسائٹی کو تمام گندگیوں سے پاک و صاف کرنا۔ اور ذاتی مفاد کو فترہ بان کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کرنا۔

(۱۲) انسان جب تک تمام نفسانی (نفسیاتی سائیکا لو جیکل) غلاظتوں سے غصہ بھوک، پیاس اور تمام بری خواہشات سے اپنے مزاج و طبیعت کو پاک و صاف نہ کرے۔ تو اس کو آرام و سکون کبھی میسر نہ ہوگا، اس طرح جیت تک اس کو بڑی باتیں سوچتے اور بڑے کاموں کے کرنے سے نفرت نہ ہو اطمینان حاصل نہ ہوگا۔
امام ولی اللہؒ کی وصیت۔

حضرت مولانا شیخ نور اللہ پھلپتیؒ کو امام ولی اللہؒ نے بیعت کے وقت یہ وصیت فرمائی تھی!

”يَدُهُ فِي كُلِّ ذَلِكَ يَدِي“۔ لِسَانُهُ لِسَانِي۔
”اس کا ہاتھ ان سب باتوں میں میرے ہاتھ کی طرح ہے۔“

اور اس کی زبان میری زبان ہے۔ میں سے وصیت
باقی حاشیہ ص ۳۶۷

بعض مفسرین نے یہ حکمت بیان فرمائی ہے کہ نہیں مقرر فرمایا ہم نے دوزخ والے ان فرشتوں کو مگر ملائکہ۔ یہ انیس ملائکہ ہیں، سترائینے کے لیے بڑے بڑے آفیسر ہیں۔ وَمَا جَعَلْنَا
 اصْحَابَ النَّارِ اِلَّا مَلَائِكَةً اس کی حکمت قرآن پاک نے خود بیان فرمائی وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ
 اِلَّا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا یعنی ہم نے یہ تعداد کافروں کی آزمائش کے لیے مقرر کی ہے۔ لَيَسْتَيِقِنَ
 الَّذِينَ اَوْتُوا الْكِتَابَ تاکہ اہل کتاب کو یقین آجائے۔ کیونکہ اہل کتاب کو علم ہے کہ ان کی
 کتابوں میں بھی انیس کا ذکر آیا ہے۔ اب جب کہ قرآن پاک بھی یہی تعداد بیان کر رہا ہے۔ تو
 انہیں اس تعداد پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ یقین آجانا چاہیے۔ اس کی دوسری حکمت
 یہ ہے کہ وَيَزِدُّ الَّذِينَ اٰمَنُوا اِيْمَانًا یعنی اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو۔ ان کا
 ایمان تازہ ہو۔ کہ پہلی کتابوں میں بھی یہی بات ہے۔ اور ہماری کتاب میں بھی یہی ہے تو اس کا
 نتیجہ یہ ہوگا وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ اَوْتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ اہل کتاب اور مومن کسی
 غلط بات سے دھوکا نہیں کھائیں گے۔ البتہ وَلَيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ
 جن لوگوں کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے یا جو کافر ہیں، وہ کہیں گے مَاذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا

کہتا ہوں اس کے اپنے نفس کے بارے میں کہ اللہ تعالیٰ
 سے ڈرتا ہے۔ اور خواہشات سے کنارہ کشی کرتا ہے
 اور اذکار میں مشغول ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے
 غصے کو دباتا ہے۔ اور سنت کے راستے کو لازم پکڑے اور
 لوگوں سے سوال نہ کرے اور محدثین۔ فقہار اسلام اور
 مشائخ کرام صوفیہ کے بارے میں نیک گمان رکھے۔ اور اپنے
 ساتھیوں کو ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا
 ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت پر براہِ نیچتہ کرتا ہے
 اور فقرائے اور عزباء و کمزور طبقوں کے معاملہ کی
 ہمیشہ اصلاح کرتا ہے۔ (سواتی)

بقیہ حاشیہ :- وَجَانِبَةِ الْهَوَى وَالْقِيَامِ
 بِالْاَذْكَارِ۔ وَكُظْمِ الْغِيْظِ لِلّٰهِ فِي اللّٰهِ وَلِزُومِ
 جَادَةِ السُّنَّةِ۔ وَتَرْكِ السُّؤَالِ مِنَ النَّاسِ۔ وَاَنْ
 يَّعْتَقِدَ فِي الْمُحَدِّثِينَ وَفُقَهَاءِ الْاِسْلَامِ
 وَمَشَائِخِ الصُّوْفِيَّةِ خَيْرًا وَاَوْصِيَهُ بِمَنْ
 مَعَهُ اَنْ يَّامُرَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ
 عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحْضِمُهُمْ عَلَى طَاعَةِ اللّٰهِ
 وَيَجْتَهِدُ فِيْ اَصْلَاحِ اَمْرِ الْفُقَرَاءِ وَالْعَبَاةِ
 (تفہیمات الیہ ص ۱)

مطبوعہ حیدر آباد سندھ

مَثَلًا اس مثال کو بیان کرنے میں اللہ کا کیا منشا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مکھی اور مچھر کی مثال بیان کی ہے۔ کیا خدا کے پاس اور کوئی مثال نہ تھی۔ یہاں بھی انہوں نے یہی اعتراض کیا۔ کہ انیس کی تعداد بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے کون سی مثال بیان کی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے اعتراضات کی وجہ سے ان کی گندگی اور نجاست بڑھتی ہے گی، مگر سمجھدار اہل کتاب یقین کر لیں گے کہ واقعی کلام الہی کا بیان پہلی کتابوں کے مطابق ہے۔ ایمانداروں کا تو ہر حکم پر ایمان ہے۔ اور ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

تَوْفَرِّيَا كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ اللَّهُ تَعَالَى جِسے چاہتا ہے، اسی طرح سے بہکا تا ہے، گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری طرف آنا چاہیں گے، ہم ان کے لیے راستے واضح کر دیں گے۔ نیز فرمایا كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ظالموں کو اللہ تعالیٰ اسی طرح گمراہ کرتا ہے۔ یعنی جو آدمی ظلم کرتا ہے۔ اس نے اسی بات پر کمر باندھ لی ہے کہ سچی بات نہیں مانے گا تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ ایسا شخص دوزخ کی طرف ہی جانا چاہتا ہے۔ تو ہم اُسے ادھر ہی لے جائیں گے۔

ہدایت یا گمراہی کسی سبب کی بنا پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو ظالم عنادی اور صندی ہوتے ہیں۔ البتہ جو لوگ ہدایت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ان کو ہدایت سے نوازتا ہے۔ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ کا یہی مطلب ہے۔

انیس فرشتوں کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ کہ فرشتوں کی کل تعداد صرف انیس نہیں ہے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ یعنی تیرے رب کے ان لشکروں کو صرف وہی جانتا ہے۔ اور کسی کے علم میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی خالق، مالک اور علیم کل ہے۔ فرشتوں کی تعداد کو وہی جانتا ہے۔ مگر دوزخ کے یہ انیس بڑے بڑے فرشتے خاص حکمت کے تحت مقرر کئے گئے ہیں۔ اور ان فرشتوں اور ان کی تعداد اور ان کے فرائض وغیرہ کا ذکر محض بے فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ وما ہی إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْبَشَرِ یہ تو انسانوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے۔ تاکہ وہ برے افعال سے بچ جائیں۔ اور اپنے مستقبل کو خراب نہ کریں۔

یہ انسانوں کے لیے
باعث نصیحت ہے

تبرک الذی ۲۹

المعدثر ۴۲

درس پنجم ۵

آیت ۳۲ تا ۴۲

کَلَّا وَالْقَمَرَ ۝۳۲ وَاللَّيْلَ إِذَا دُبِرَ ۝۳۳ وَالصُّبْحَ إِذَا اسْفَرَّ ۝۳۴ إِنَّهَا
لَإِحْدَى الْكُبَرِ ۝۳۵ نَذِيرٌ لِلْبَشَرِ ۝۳۶ لِمَن شَاءَ مِنْكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ
أَوْ يَتَأَخَّرَ ۝۳۷ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهينَةٌ ۝۳۸ إِلَّا صَحْبَ الْيَمِينِ
۝۳۹ فِي جَنَّتٍ طَفَتْ يَسْأَلُونَ ۝۴۰ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ۝۴۱ مَا سَلَكَكُمْ
فِي سَقَدٍ ۝۴۲

۱۶ عن النسخ ۱۲

ترجمہ :- ہرگز نہیں اور چاند کی قسم ہے ۝۳۲ اور رات کی قسم ہے جب وہ پیٹھ پھیر کر چلی
جاتی ہے ۝۳۳ اور قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہو جاتی ہے ۝۳۴ بے شک یہ بہت بڑی
باتوں میں سے ایک ہے۔ ۝۳۵ یہ بنی نوع انسان کو ڈرانے والی ہے ۝۳۶ تم میں سے جو چاہتا
ہے آگے بڑھے یا پیچھے ہٹ جائے ۝۳۷ ہر شخص اپنی کمائی میں پھنسا ہوا ہے ۝۳۸ مگر
— دائیں ہاتھ والے ۝۳۹ یہ لوگ جنت میں (داخل) ہونگے اور پوچھیں گے ۝۴۰
دوزخیوں سے ۝۴۱ کہ تم کو جہنم میں کس چیز نے ڈالا ہے ۝۴۲

گزشتہ سے پورے

پہلی آیات میں ذکر آچکا ہے کہ اے نبی کریم! یَا أَيُّهَا الْمَدَّثِرُ قَدْ فَانَدُنْ لَعْنِ
ان مخالفت کرنے والوں، سرمایہ داروں کو ڈرائیں، ان پر قرآن حکیم کا پردہ گرام پیش کریں۔ اور پھر یہ
پاکیزہ اصول بھی بتا دیا کہ ان لوگوں سے انتقام لینے میں جلد بازی نہ کریں۔ آپ ان کو چھوڑ دیں،
میں خود ان سے نمٹ لوں گا۔ اور ان کو سزا دوں گا۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ یہ مکذبین قرآن پاک کو کلام الہی تسلیم نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں۔ "إِنْ
هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ" کہ یہ تو انسان کا کلام ہے، گویا انہوں نے قرآن پاک کے پردہ گرام کا انکار کر
دیا۔ مگر جیسا کہ پہلی آیات میں گزیر چکا ہے، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا سَأَصْلِيهِ سَقَدٍ
ایسے لوگوں کو میں سقر میں ڈالوں گا، جو کہ دوزخ کے طبقات میں سے ایک طبقہ ہے۔ جب یہ ہے کہ
"إِنَّكَ كَانَ لَا يَتَنَاعِبُنَا" ہماری آیات کے ساتھ عناد رکھنے والے ہیں۔ ان کو جہنم میں ڈالوں گا
جس پر انیس فرشتے مقرر ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ اس میں بھی حکمت ہے، یہ بات پہلی کتابوں میں بھی

موجود ہے۔ لہذا اہل کتاب اس کو دیکھ کر یقین کر لیں گے۔ اور اہل ایمان کا ایمان اور زیادہ ہو جائے گا۔ البتہ نافرمان لوگ محض اعتراض ہی کرتے رہیں گے۔

ان آیات میں فرمایا کلاً یعنی ہرگز نہیں۔ مگر مبین کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ تم کہتے ہو کہ قرآن پاک انسان کا کلام ہے، نیز یہ کہ دوزخ پر انیس فرشتوں کی تعداد کم ہے، ہم ان سے مقابلہ کر لیں گے اور قرآن پاک کے پروگرام کی مخالفت کریں گے تو فرمایا کلاً ہرگز ایسا نہیں۔ مشرکین خیال خام میں مبتلا ہیں، انہیں اپنے کئے کی سزا ضرور چکھنی ہوگی۔

کلام کی کامیابی
کو اہی

قرآن پاک کے پروگرام کی کامیابی پر یہاں تین چیزوں کو بطور گواہ پیش کیا گیا ہے فرمایا وَالْقَبْرُ یعنی چاند کی قسم ہے۔ وَاللَّيْلِ إِذَا أَدْبَرَ اور رات کی قسم ہے جب وہ پیٹھ پھیر کر چلی جاتی ہے۔ وَالصُّبْحِ إِذَا أَصْفَرُ اور قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہو جاتی ہے۔

چاند کی قسم کھانے سے مراد یہ ہے کہ دیکھئے چاند کس طرح آہستہ آہستہ بدر کامل بنتا ہے، یعنی اپنے پورے کمال تک پہنچتا ہے حالانکہ پہلے دن وہ بالکل ہلال ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ آج اگر اسلام اور مسلمان تم کو کمزور نظر آتے ہیں۔ تو یاد رکھو، وہ دن دور نہیں جب یہی لوگ اپنے کمال تک پہنچیں گے چنانچہ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی قوم قریش نے آپ کی مخالفت کی، مگر انہیں میں سے ایسے لوگ بھی تھے، جو ابتداء ہی میں حضور علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے۔ یہی لوگ آپ کے دست و بازو بنے، حتیٰ کہ بدر کے معرکہ میں قریش کلید مغلوب ہو گئے۔ عرب کے باقی قبائل منتظر تھے کہ دیکھیں ان لوگوں کا کیا بنتا ہے، جن کو قریش نے مکہ سے نکال دیا تھا۔ پہلے ہی مقابلہ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی جس سے مسلمانوں کی کامیابی کی منزل قریب آ گئی۔ معاہدہ حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے فتح مبین قرار دیا اور پھر فتح مکہ کے بعد عرب قبائل دھڑا دھڑا اسلام میں داخل ہو گئے۔ عام طور پر لڑائی کی ضرورت باقی نہ رہی اور اس طرح پہلے قریش مغلوب ہوئے، پھر باقی عرب قبائل اور پھر ان لوگوں کے ذریعے باقی دنیا نے اسلام قبول کیا ایران فتح ہوا، روم اور سپین فتح ہوا۔ حتیٰ کہ نصف دنیا پر مسلمانوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ گویا پچاس سال کے عرصہ میں آدھی دنیا اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور باقی آدھی دنیا میں مقابلہ کر سکتی نہ رہی اس طرح عملی طور پر ساری دنیا میں اسلام کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اسلام کے پروگرام کے سامنے سب نے ہتھیار ڈال دیے اور اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ پورا ہو گیا۔ "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ"

کامیابی غلبہ

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَنُكْرِهَ الْمُشْرِكُونَ“ تمام ادیان کے مقابلے میں اسلام کو سیاسی غلبہ حاصل ہوا۔ یہ صرف دلیل کا غلبہ نہیں تھا، کیونکہ دلیل کا غلبہ تو اسلام کو اول روز سے حاصل تھا، اور آج اس گتے گزے زمانے میں بھی ہے، مگر یہ سیاسی غلبہ تھا، کہ اسلام کے مقابلے میں باقی تمام ادیان فی الواقع مغلوب ہو گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ گویا جس طرح ہلال سے بدریں جاتا ہے۔ اسی طرح ابتداء میں مسلمانوں کی بے سرو سامانی صرف پچاس سال کے عرصہ میں دنیا کی سب سے بڑی قوت بن گئی۔ چاند کی قسم کھانے سے یہی مراد ہے۔

اسلام کی روشنی

ان آیات میں غلبہ اسلام کے ثبوت میں دوسری گواہی رات کی پیش کی گئی وَالْيَلِ إِذَا دُبُرُ یعنی رات جب پیٹھ پھیر کر چلی جاتی ہے۔ قرآن پاک نے کفر و شرک کو عام طور پر رات کی تاریکی سے تشبیہ دی ہے۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام پر اپنی کتاب اس لیے نازل فرمائی کہ لِيُخْرِجَهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ۔ تاکہ لوگوں کو کفر و شرک اور بُرائی کے اندھیروں سے نکال کر ایمان اور اسلام کی روشنی کی طرف لائے۔ اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔ أَفَمَن كَانَ مُبْتَلًىٰ يَّعْنِي جُورُهُ تَحْتَا، کُفْرُو شُرْکِ مِیْنِ مَبْتَلَا تَحْتَا، اس کو نور ایمان سے کمرہ زندہ کر دیا۔ وہ لوگوں کے اندر روشنی کے ساتھ پھر رہا ہے۔ کیونکہ اسلام روشنی دیتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم تاریکی سے نکال لیتی ہے۔ الجھاؤ اور تذبذب ختم ہو جاتا ہے، ہر چیز واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔ انسان اندھیروں میں بھٹکنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ گمراہی مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا۔ آج انسان کفر و شرک اور معاصی کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے۔ دنیا کی پانچ ارب کی آبادی میں سے سوا چار ارب انسان آج بھی اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں، کیونکہ ان کے پاس روشنی والی چیز موجود نہیں۔ ادھر مسلمانوں کو لیجئے۔ دنیا میں اسی کمرہ ایک ارب کے قریب آبادی ہے، مگر حالت تمام قوموں سے بدتر ہے۔ حتیٰ کہ افریقہ کے وحشیوں سے بھی حالت گری ہوئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن پاک کے پروگرام سے روگردانی اختیار کر لی۔ آج کسی مسلمان سے دریافت کر کے دیکھ لیں کہ تمہارا پروگرام کیا ہے۔ بس دنیا کھانا، محنت و مشقت کرنا، تجارت کرنا، کھانا پینا، اور بٹہ بٹہ بٹہ بنانا۔ آج مسلمان اپنا پروگرام بھی بھول چکے ہیں۔ اس کے اشارات اگلی آیات میں ملتے ہیں۔

جہنم کی ہولناکی

الْغُرُضُ وَالصُّبْحُ إِذَا اسْفَرَ سَعَرَاتُ يَوْمٍ۔ کہ اسلام صبح کی روشنی کی طرح دنیا میں

پھیلے گا، جس طرح سورج نکل آتا ہے۔ اور ہر ایک کو بیدار ہونا ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی روشنی ہر ایک تک پہنچے گی۔ اس سے کوئی غروم نہیں ہے گا۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن پاک جادو ہے، انسان کا قول ہے۔ اور اس کم پروگرام ناکام ہو جائے گا۔ کلاً ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ بلکہ جس طرح چاند ہلال سے بدرجہا ہے اسی طرح اسلام پھیلے پھولے گا اور بدر کمال بتے گا۔ اور جس طرح طلوع فجر پر رات کی تاریکی چلی جاتی ہے اسی طرح دنیا میں اسلام کی روشنی سے کفر و شرک کے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ کفر مغلوب ہو گا، اور اسلام غالب ہو گا۔

ان تین چیزوں کی قسم اٹھا کر فرمایا۔ اِنَّهَا لَاحْدَى الْكُبْرٰی۔ یعنی یہ ایک بہت بڑی شے ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اِنَّهَا کی ضمیر سقر کی طرف لڑتی ہے۔ یعنی یہ دوزخ بہت بڑی چیز ہے جس میں منافقین کو ڈالا جائے گا۔ ممکنہ بین کو قسم اٹھا کر باور کرایا جا رہا ہے کہ جہنم بڑی ہی خوفناک چیز ہے۔ بس سے مفر تہیں۔ لہذا وہ قرآن پاک کے پروگرام کی مخالفت کر کے اس کی حقیقت کو تسلیم کر لیں کیونکہ نَذِیْرٌ لِّلْبَشَرِ یہ بنی نوع انسان کو ڈرانے والی ہے کہ اس سے بچ جائیں۔ اور قرآن کریم کی مخالفت چھوڑ دیں۔ گویا یہ لوگوں کو خبردار کر رہی ہے۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر قریش مکہ کو اکٹھا کیا، اور فرمایا اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑ کی دوسری جانب دشمن آ رہا ہے، تو کیا تم میری بات کو سچا سمجھو گے، قریش کہتے لگے مَا جَدَبْنَا عَلَيْكَ كَذِبًا ہم نے آپ پر جھوٹ کا کبھی تجربہ نہیں کیا۔ آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر یہ بات ہے فَإِنِّي نَذِيرٌ لَّكُم بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ بے شک میں بڑے سخت عذاب کے سامنے تم کو خبردار کر رہا ہوں۔ اگر میرے پروگرام کی مخالفت کرو گے تو شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو گے اور یہی ہے اِنَّهَا لَاحْدَى الْكُبْرٰی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں اِحْدَى الْكُبْرٰی سے مراد حضور علیہ السلام کا وہ پروگرام ہے جو اللہ تعالیٰ نے قَدْ فَانَدْنٰکُمْ کہہ کر آپ کے سپرد کیا۔ فرمایا اے لحاف اوڑھنے والے آپ اٹھ کھڑے ہوں اور بنی نوع انسان کو آنے والے خطرناک مستقبل سے آگاہ کریں۔ گویا قرآن پاک کے پروگرام کو دنیا میں جاری کرنا تاریخ انسانی کا ایک بہت بڑا واقعہ یعنی لَاحْدَى الْكُبْرٰی ہے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے۔

تاریخ انسانی
کا بڑا واقعہ

کہ حضور علیہ السلام کے انقلاب سے بڑھ کر دنیا میں کبھی اتنے تھوڑے عرصہ میں اتنا بڑا انقلاب برپا نہیں ہوا۔
 اتنے قلیل عرصہ میں دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں ختم ہو گئیں، ان کے تمام پروگرام ختم ہو گئے۔ اور قرآنی پروگرام
 کو عالمی غلبہ حاصل ہوا یہ انسانی تاریخ کا اہم واقعہ ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اسی لیے لَوْ حُدِّيَ الْكُتُبُ
 کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

پوری نوع انسانی
 کے لیے دعوت

اگلی آیت نَذِيرًا لِلْبَشَرِ میں یہ اشارہ موجود ہے کہ قرآن کا پروگرام صرف قومی نہیں، بلکہ
 بین الاقوامی ہے۔ یہ تمام نوع انسانی کو ڈرانے والا ہے۔ اس کا تعلق کسی ایک جگہ، ایک ملک اور ایک
 قوم سے نہیں بلکہ یہ پوری نوع انسانی کا پروگرام ہے، جیسا کہ دوسری جگہ تصریح کے ساتھ موجود ہے۔
 قَدْ يَايَاهَا النَّاسُ اِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيعًا یعنی آپ فرمادیتے ہیں پورے نبی نوع
 انسان کی طرف رسول مبعوث ہوا ہوں۔ یہاں پر نَذِيرًا لِلْبَشَرِ کا بھی یہی مضموم ہے۔ ابتداء میں اولین
 مخاطبین یعنی عرب ایمان لائیں گے اور پھر ان کے ذریعے یہ پروگرام پوری دنیا میں پھیلے گا۔ اس میں یہ اشارہ
 بھی پایا جاتا ہے کہ اس پروگرام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کے لیے مشکلات کا سامنا بھی کرنا ہوگا۔
 جنگیں بھی لڑنی پڑیں گی۔ قادیسیہ اور یرموک جیسے بڑے بڑے محرکے ہوں گے اور اقوام عالم کے ساتھ بڑی
 بڑی لڑائیاں لڑنا ہوں گی۔

دین کے لیے قربانی

فرمایا، بات واضح ہو گئی ہے کہ دین اسلام کو کس طرح غالب کرنا ہے۔ قرآن کے پروگرام کو کس
 طرح دنیا کے کونے کونے میں پہنچانا ہے۔ جب اس پروگرام کی سمجھ آگئی تو لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ اَنْ
 يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ اب تم میں سے جو چاہتا ہے۔ اس پروگرام کو لے کر آگے بڑھے۔ یا اگر وہ اس قدر
 ہمت نہیں پاتا تو پیچھے ہٹ جائے۔ دین کے پروگرام کو بہر حال دنیا کے سامنے پیش ہونا ہے۔
 لِمَنْ شَاءَ سے مراد یہ ہے کہ اپنی رضا و رغبت سے جو اس پروگرام میں حصہ لینا چاہتا ہے۔ وہ
 آگے بڑھے۔ کیونکہ تعرض کی حرکت سے جو کام ہوتا ہے۔ اس پر مواخذہ ہی نہیں ہے۔ جو شخص اپنی مرضی اور
 اختیار سے اس پروگرام میں حصہ لے گا، اسی میں عبادت، پاکیزگی، اخلاق، عدالت اور سماحت ہے۔ اس
 پروگرام کو اختیار کرنے والے کی اگلی منزل بہشت ہے۔ مرنے کے بعد خطیرۃ القدس ہے۔

آگے بڑھنے والوں کی مثال ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعدؓ، معیدؓ، بلالؓ،
 صہیبؓ اور سلمانؓ وغیرہ ہیں۔ کوئی روم کا ہے، کوئی ایران کا، کوئی کسی جگہ کا، کوئی کسی مقام کا، مگر جب

اس پر دگرام کو لے کر آگے بڑھتے ہیں، تو ان کی منزل بہشت ہے، قرب خداوندی ہے اور تجلی اعظم کے ساتھ اتصال ہے۔

پیچھے رہنے والوں کی مثال ابھیل، ابولہب، عتبہ اشیبہ وغیرہ ہے۔ جو پیچھے رہ گئے، پر دگرام کی مخالفت کی، مقابلہ کیا اور جہنم رسید ہو گئے۔ یہ وہی ٹھکانے ہیں۔ جو آگے بڑھ گئے، وہ جنت میں پہنچ گئے۔ اور جو پیچھے رہ گئے وہ جہنم کا نشانہ بنے۔ تو یہاں یہ اشارہ فرمایا کہ جس نے اپنی خوشی سے اس قرآنی پر دگرام میں حصہ لیا۔ وہ کامیاب ہو گا۔ اور جو پیچھے رہ گیا، وہ ناکام ہوا۔

اعمال کی جزا و سزا

اس کے بعد اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ یعنی ہر نفس اپنی کمائی میں پھنسا ہوا ہے، اسی میں بند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت ہی اس قسم کی بنائی ہے۔ کہ اس میں ملکیت اور حیثیت دونوں قوتیں رکھ دی ہیں۔ ان کی کش مکش انسان کے اندر برابر جاری رہے گی۔ انسان اپنے اعمال میں گھرا ہوا ہے۔ اس میں سے نکل نہیں سکے گا۔ جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ حدیث شریف میں وضاحت ہے لَا تَزُولُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ یعنی انسان کا قدم آگے حرکت نہیں کر سکے گا۔ جو اب دہی کرنا ہوگی، إِلَّا أَصْحَابُ الْيَمِينِ۔ البتہ صرف دائیں ہاتھ والے لوگ ایسے ہوں گے۔ جو بیچ نکلیں گے امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ یاور کھو، کہ اعمال انسان کے نفس سے نکلے ہیں، پھر پٹ کر آتے ہیں اور نفس کے دامن کو پکڑ لیتے ہیں۔ پھر ان کو شمار کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ ان کا نتیجہ کل قیامت کو ہی نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ کسی عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ اُس نے نفس کا دامن پکڑا ہوا ہے۔ انسان اس میں پھنسا ہوا ہے۔ اس میں سے نکلنے کی اجازت اُسی کو ملے گی، جو قرآن کے پر دگرام کو ماننے والا اور چلانے والا ہو گا۔ اور یہ دائیں ہاتھ والے لوگ ہوں گے۔ اس کی تشریح میں آتا ہے۔ کہ عالم ذر میں یہ لوگ آدم علیہ السلام کی پشت سے ذرات کی شکل میں اُن کی دائیں طرف سے نکالے گئے تھے۔ قیامت کے روز انہیں لوگوں کو اعمال مانے دائیں ہاتھ میں ملیں گے۔ یہی لوگ اصحاب یمن ہیں، جو کامیاب ہوں گے۔ یہ لوگ دنیا میں بھی اچھے کام کرتے تھے۔ کہ اچھے کام داہنے ہاتھ سے کئے جاتے ہیں۔ انہیں کے متعلق فرمایا فِي جَنَّاتٍ یہ لوگ

جنت میں داخل ہوں گے۔ آرام سے بیٹھیں گے جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے ”عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ“
تختوں پر بیٹھ کر نظارے دیکھیں گے۔ آرام اور راحت نصیب ہوگی۔ غم و فکر دور ہو جائیں گے تو پھر
يَتَسَاءَلُونَ عَنِ الْمُجْرِمِينَ یعنی جنت والے دوزخیوں سے پوچھیں گے۔ ان لوگوں سے سوال
کریں گے جنہوں نے دنیا میں الہی پروگرام کی مخالفت کی تھی۔ نبی کا مقابلہ کیا تھا۔ لڑائی کے لیے آئے تھے
قرآن پاک کو جادو اور انسانی کلام کہا تھا۔ اور کفر و شرک پر جتنے ہے تھے۔ ان سے سوال ہوگا، مَا
سَلَكُوكُمْ فِي سُقْرٍ آج تم کو اس سفر، اس جہنم میں کس چیز نے ڈالا۔ اصحاب الیمین یعنی جنت
والے دوزخیوں سے پوچھیں گے کہ تمہیں یہ سزا کیوں ملی، اُن کا جواب اگلی آیات میں آئے گا۔

تَبٰرَكَ الَّذِی ۲۹

المدثر

درس ششم ۶

(آیت ۴۳ تا ۴۸)

قَالُوا لَمَنْ نُّكَ مِنَ الْمَصْلُوبِ ۖ (۴۳) وَلَمْ نَكُ نَطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۖ (۴۴)
 وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَالِصِيْنَ ۖ (۴۵) وَكُنَّا نَكْذِبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۖ (۴۶)
 حَتّٰی اٰتٰنَا الْیَقِيْنَ ۖ (۴۷) فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشُّفَعٰی ۖ (۴۸)

ترجمہ :- جواب دیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہیں تھے (۴۳) اور ہم مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے (۴۴) اور ہم باطل میں گھسنے والوں کے ساتھ گھس جاتے تھے (۴۵) اور ہم انصاف کے دن کو جھٹلاتے تھے (۴۶) یہاں تک کہ ہمارے پاس یقینی بات (موت) آگئی (۴۷) پس ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش کوئی کام نہیں دے گی (۴۸)

گزشتہ سیم ہوست

قرآن کریم کے پروگرام کی مخالفت کرنے والے لوگوں کو تنبیہ کی گئی۔ اس کے بعد اسلام کی ترقی اور اس کے حد کمال تک پہنچنے کا ذکر ہوا۔ اور اس کے بعد نتائج اعمال کا ذکر آتا ہے "كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ" یعنی ہر نفس نے جو کچھ کمایا ہے وہ اس میں رہن رکھا ہوا ہے۔ اس میں پھنسا ہوا ہے، اس نے جو بھی نیک و بد عمل کیا ہے وہ اس میں ماخوذ ہے۔ "اِلَّا اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ" سوائے دابنے ہاتھ والوں کے، جو اس قید سے نکل جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقام تک پہنچ جائیں گے۔ باقی سب اپنے عمل کے نتیجہ میں مقید رہیں گے۔

دابنے ہاتھ میں اعمال نامہ حاصل کرنے والوں کو جنت کی راحت نصیب ہوگی۔ اور وہاں پہنچ کر انہیں مجرمین کا خیال آئے گا "فِیْ جَنَّتٍ یَّتَسَلَّلُوْنَ عَنْ الْمَجْرِمِیْنَ" اور وہ ان سے براہِ راست پوچھنے لگے گا "سَلِّکُمْ فِیْ سَقَرٍ" تم کو سقر یعنی دوزخ میں کس چیز نے ڈالا۔ یہ مقام تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مقام ہے۔ تم یہاں کیسے پہنچ گئے۔

اصحاب الیمین کا دوزخیوں سے سوال

دوسری جگہ موجود ہے۔ کہ اگر کوئی جنتی شخص دوزخی سے بات کرنا چاہے گا، تو باوجود ایک دوسرے سے کروڑوں میل کی دوری کے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے اور کلام بھی کر سکیں گے۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں موجود ہے۔ کہ بہشت میں آرام کرنے والا شخص جب اپنے ساتھی کا تصور کرے گا کہ دنیا میں وہ میرا ساتھی تھا۔ تو وہاں یہ آتا ہے۔ کہ وہ ساتھی دوزخی تھا فَاطَّلَعَ فَاٰهٌ فِیْ سَوَآءٍ الْجَحِیْمِ اُس نے جھانک کر دیکھا تو دوزخ کے درمیان میں پڑا ہوا تھا۔ پھر اُس نے کہا کہ اللہ نے مجھ پر مہربانی کی، ورنہ تم تو مجھے بھی ہلاک کر ڈالتے۔ تمہاری حالت ایسی تھی۔ میں بھی تمہاری بات سے متاثر ہو جاتا، مگر اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور مجھے بچا لیا۔ اس طرح گویا آپس میں مکالمہ کریں گے، گفتگو کر سکیں گے اور ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے۔

جرم کے بغیر سزا
نہیں دی جاتی

”مَا سَلَكَكُمْ فِیْ سَقْدٍ“ میں سوال کا لفظ بتا رہا ہے کہ مجرم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اُسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ اگر اُسے جرم کا علم ہی نہ ہو، تو سزا دینا زیادتی کے مترادف ہوگا۔ دینی قانون بھی یہی ہے۔ کہ کسی شخص کو اس پر جرم واضح کئے بغیر سزا نہیں دی جاتی۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے۔ کہ کسی شخص کو شبہ کی بنا پر گرفتار تو کیا جاسکتا ہے۔ مگر تفتیش کے بعد اُسے روکنے کی اجازت نہیں۔ اگر وہ مجرم ثابت ہوتا ہے تو اُسے سزا دو، ورنہ رہا کر دو۔ انگریز کا وضع کردہ سیفٹی قانون سخت خبیث قانون ہے۔ جس کے تحت بغیر جرم عاید کیے سالہا سال تک محض شبہ کی بنیاد پر قید و بند میں رکھا جاتا ہے۔

الغرض وہاں ایسا قانون نہیں ہوگا۔ بلکہ مجرمین کو معلوم ہوگا۔ کہ انہیں کن جرائم کی سزا دی جا رہی ہے۔ وہاں پر سب سے ایک والا قانون نہیں چلے گا۔ کہتے ہیں کہ امیر امان اللہ خاں (مجرم) جب کابل میں تخت نشین ہوا۔ تو حلال آباد کا جیل خانہ دیکھنے کے لیے گیا۔ جب ایک قیدی کے پاس سے گذرا، تو وہ قیدی رونے لگا۔ امیر نے وجہ پوچھی تو اس نے عرض کیا، حضور! اڑھائی سال سے اس جیل خانہ میں سب سے ایک کے جرم میں پڑا ہوں۔ امیر حیران ہوا کہ سب سے ایک کون سا جرم ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ یہ قیدی دھوبی ہے۔ اڑھائی سال قبل یہ بیچارہ اپنے گدھے پر کپڑے لادے جا رہا تھا۔ اسی

راستے پر پولیس والے بعض مجرموں کو لے جا رہے تھے۔ راستے میں وہ ایک چشمتے کے کنارے ٹھہرے، وہاں ایک مجرم بھاگ گیا۔ اور اکیس میں سے بیس رہ گئے۔ انہوں نے اکیسواں پورا کرنے کے لیے گدھے والے کو پکڑ کر شامل کر لیا۔ اور اس طرح انہوں نے بہت دیک یعنی اکیس کی گنتی کو پورا کر لیا۔ اور وہ دھوبی بغیر جرم کے اڑھائی سال تک قید کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا۔

قیامت کے روز اس قسم کا کوئی قانون نہیں ہوگا۔ جس کے تحت کسی کو بلا جرم سزا دی جائے۔ بلکہ ہر مجرم کو بتایا جائے گا کہ اُسے کس جرم کی پاداش میں سزا دی جا رہی ہے۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں ایک شخص کو شبہ کی بنا پر گرفتار کیا گیا۔ مگر تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ بے گناہ ہے۔ لہذا چھوڑ دیا گیا۔

دوزخیوں کا جواب

جب جہنمی مجرمین سے پوچھیں گے کہ تم کس جرم کی بنا پر دوزخ میں پہنچے تو وہی لوگ جو دنیا میں قرآن پاک کو جھٹلاتے تھے، کہتے تھے یہ جادو ہے، انسان کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ سَأُصْلَبُ سَقَرًا کہ میں ان کو دوزخ میں ڈالوں گا۔ چنانچہ ان کو واصل جہنم کر دیا۔ تو اب یہ لوگ خود ہی اپنے جرائم کی تفصیل بیان کریں گے قَالُوا جَوَابَ دِیْنِ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہیں تھے۔ یہ ہمارا جرم تھا نیز یہ کہ وَلَمْ نَكُ نَطْعُهُ الْمَسْكِينِ ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ تیسرا جرم یہ بتائیں گے وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ہم باطل میں گھسنے والوں کے ساتھ باطل میں گھس جاتے تھے۔ اور چوتھی بات یہ کہ وَكُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّیْنِ ہم انصاف کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ یہ چار جرائم ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم جہنم رسید ہوئے۔

نماز کی اہمیت

پہلا جرم یہ ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ نمازیوں کی جماعت میں شامل ہونا تو درکنار ہم ان کی مخالفت کرتے تھے، انہیں ٹھٹھا کرتے تھے۔ حالانکہ نماز ایک ایسا پروگرام ہے جس کی وجہ سے اتحاد فکر پیدا ہوتا ہے۔ اتحاد فکر، اجتماعیت، طہارت، وقت کی پابندی، اذیتیں، تقسیم اور اس قسم کے بیسیوں فوائد ہیں، جو نماز سے حاصل ہوتے ہیں۔ جہنمی کہیں گے افسوس کہ ہم نے اس پروگرام کو نہ اپنایا۔ جس میں تعلق باللہ جیسی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے عقیدے کی طہارت سے لے کر ہر قسم کی ظاہری طہارت منجملہ لباس، مکان، بدن، قلب، روح، خوراک، غرض ہر چیز کی

طہارت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ایسی اعلیٰ و ارفع باتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے حالانکہ یہ چیزیں مسلمانوں کو فطرۃً حاصل ہیں۔ نماز پنجگانہ اور جمعہ کے اجتماعات مسلمانوں کی اجتماعیت پر دلالت کرتے ہیں۔ اور یہی اجتماعیت ہمدردی کا درس دیتی ہے۔

امیر حبیب اللہ خان مرحوم دہلی آیا۔ نماز کے لیے گیا تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ آکر شریک ہو گیا۔ وہاں ایک بہشتی بھی تھا۔ پانی کی مشک ادھر رکھی اور وہ بھی امیر کے ساتھ نماز میں شامل ہو گیا۔ لوگوں نے روکنا چاہا کہ امیر کے ساتھ کھڑا نہ ہو۔ مگر امیر نے ڈانٹ دیا کہ غلطی میری ہے۔ کہ میں پہلے آکر اگلی صف میں نہیں پہنچ سکا۔ اب اس بہشتی بیچارے کو کیوں روکتے ہو۔ یہ اسلام کی برکت ہے کہ کابل کا بادشاہ اور ایک بہشتی شانہ بشانہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ اسی مساوات کا نتیجہ ہے۔ کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

نماز کے ذریعے
تعلق باللہ

جب انسان نماز پڑھتا ہے۔ اور روحانی ترقی حاصل کرتا ہے۔ تو اس کے قلب میں کسی درجے تک اللہ تعالیٰ کی تجلی پڑتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کی اصطلاح میں یہ تجلی اصل میں روح اعظم کی تجلی ہوتی ہے، اس کا عکس پڑتا ہے۔ اور اس کے واسطے سے انسان کا تعلق خدا کی تجلی اعظم کے ساتھ قائم رہتا ہے تو قابلِ غور یہ بات ہے کہ جس نمازی کا تعلق اللہ کے ساتھ درست ہو گا چاہے وہ کسی بھی درجہ میں ہو کیا ایسا شخص کسی دوسرے پر زیادتی کر سکے گا۔ وہ تو اللہ کے بندوں کو اپنے جیسا ہی سمجھے گا۔ کسی کا حق تلف نہیں کرے گا، بلکہ مخلوق خدا کی خدمت کرے گا۔ اپنے آپ کو ان کا خادم سمجھے گا۔ وقت ضائع کرنے والا نہیں بنے گا۔

امام رازیؒ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ دین کا خلاصہ دو چیزیں ہیں یعنی التَّعْظِيمُ لِرَحْمَةِ اللَّهِ وَالشَّفَقَةُ عَلَى خَلْقِ اللَّهِ ایک اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعظیم اور دوسری اللہ کی مخلوق پر شفقت۔ یہ دونوں چیزیں نماز سے حاصل ہوتی ہیں۔ دل میں خدا تعالیٰ کی عظمت، اعضاء و جوارح سے ادب اور زبان سے حمد و ثنا۔ یہ تینوں چیزیں نماز کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ نماز میں اجتماعیت کی بنا پر مساوات کا تصور اور اللہ کی مخلوق پر شفقت پیدا ہوگی۔ اور جب دل و دماغ میں یہ بات آگئی کہ

تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ تمام مومن جسد واحد کی طرح ہیں کسی کو ایک دوسرے پر برتری حاصل نہیں۔ نہ گورے کو کالے پر اور نہ امیر کو غریب پر، تو شفقت علی خلق اللہ خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ یہ نماز کی بہکات ہیں۔
العرض مشرک اور کافر لوگ دوزخ میں کہیں گے، افسوس! ہم نے قرآن پاک کے پروگرام پر عمل نہ کیا، جماعت میں شریک نہ ہوئے، افسوس! ہم نماز کی حقیقت کو نہ پاسکے۔

نماز کے
دنیوی فوائد

نماز کے دنیوی فوائد میں وقت کی پابندی اور طہارت جیسی چیزیں ہیں۔ کافر گندے پہنتے ہیں۔ ان کا لباس پاک نہیں رہتا۔ وضو اور استنجا نہیں ہوتا۔ جسم پاک نہیں ہوتا۔ نمازی مومن کو طہارت، اجتماعیت، اور مساوات کا سبق ملتا ہے۔ دنیا کی دیگر اقوام کو وڑوں روپے خرچ کر کے بھی اجتماعیت کی وہ روح حاصل نہیں کر سکتیں، جو مسلمان کو ہر روز نصیب ہوتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے دکھ درد میں اس اجتماعیت کی وجہ سے شریک ہوتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم نے نماز کی حقیقت کو نہیں پایا۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "قَوْلٌ لِلْمُصَلِّينَ" ایسے نمازیوں کے لیے تباہی ہے۔ یہ بادی اور ہلاکت ہے الدین "هُمُ يَرْكَبُونَ" جو رکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔ "وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ" اور ایک دوسرے کو برتنے کی چیزیں بھی مینے کے لیے تیار نہیں۔ ان میں ہمدردی کا ذرہ بھی باقی نہیں رہا۔ ایسے بد بختوں نے نماز کی روح کو نہیں پایا۔ ایسے نمازی "هُمُ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ" اپنی نماز سے غافل ہیں۔ انہیں نماز کی ہوا تک نہیں ملتی۔ وہ تو محض ایک عادت پوری کر رہے ہیں۔ اگر نماز کی حقیقت کو پالیتے، تو ان میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا۔ ظلم کو مٹاتے۔ کیونکہ تعلق باللہ کا لازمی نتیجہ خدمت خلق اور عدل و انصاف کی بالادستی ہے۔

قرآن پاک کا
کل غلط پروگرام

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کا کل عالمی پروگرام یہ ہے۔ "قَوْلٌ بِأَنْذَرُ" یعنی چار بنیادی چیزیں عدالت، اخبات، طہارت اور سماحت ہیں۔ ہمارے دین کے یہ چار بنیادی اخلاق کبھی منسوخ نہیں ہوئے اور نہ کبھی منسوخ ہوں گے۔ اسلام کا عالمی پروگرام یہی تعلیم دینا ہے۔ نماز کے بارے میں عینی باتیں میں نے عرض کیں وہ سب اس پروگرام کے تحت آتی ہیں۔ یہ پروگرام قرآن پاک نے دنیا کی تمام اقوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ تاکہ اس پر عمل پیرا ہوں۔ اس پروگرام میں سب سے

پہلا نمبر نماز کا ہے۔ جس کے ذریعے یہ ساری چیزیں نصیب ہوتی ہیں۔ دوسرا نمبر تعلق باللہ اور مخلوق کے ساتھ شفقت کا ہے۔

مسکین کو کھانا کھلانا

دو چیزوں نے اپنا پہلا جرم تو یہ بتایا کہ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ دوسرا جرم یہ کہا کہ کُونُكَ نَطَعُ الْمَسْكِيْنَ۔ ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ جہنم میں آنے کی دوسری وجہ یہ ہے۔ معلوم ہوا۔ کہ انسانوں کے ساتھ ہمدردی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسے معمولی بات نہیں سمجھنا چاہیے۔ محض اپنے عیش و آرام میں زندگی نہیں گزار دینی چاہیے۔ بلکہ محتاجوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ اَيُّ الْاِسْلَامِ خَيْرٌ کسی نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اسلام کی باتوں میں افضل بات کون سی ہے۔ آپ نے چند چیزیں بیان فرمائیں۔ ان میں پہلی بات یہ ہے اَنْ تَطْعَمَ الطَّعَامَ کہ محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے۔ کہ نطعم المسکین کا یہ معنی ہر گز نہیں۔ کہ بھکاری پیدا کئے جائیں۔ بلکہ مقصد یہ ہے۔ کہ مسکین کی ہر جائز ضرورت کا خیال رکھا جائے۔ آپ ناداروں کی تعلیم کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ انہیں روزگار دیا کر سکتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو کر قوم کے معزز افراد میں شامل ہو سکیں۔ اگر ہماری قوم کے افراد ذلیل و رسوا ہوں گے، تو بحیثیت مجموعی قوم کو عزت نصیب نہیں ہوگی۔ لہذا مسکین کو کھانا کھلانے سے مراد ان کی ضروریات زندگی کا مہیا کرنا ہے۔ بھیک مانگنا تو ویسے ہی حرام ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔ کہ اکساب حصارہ یعنی مصتر پیشوں میں چوری، ڈاکہ اور گداگری بھی شمار ہوتی ہے۔ چند شرط کے ساتھ مقصود سے وقت کے لیے سوال کرنا اسلام نے جائز رکھا ہے۔ مگر اس کو پیشے کے طور پر اپنالینا کسی صورت جائز نہیں۔ بلکہ حرام ہے۔ مُحْتًا يَاكُلُهَا صَاحِبُهَا جو شخص غنی ہے، کام کاج کرنے کے قابل ہے۔ معذور نہیں ہے، مجبور نہیں ہے۔ ایسا شخص اگر بھیک مانگتا ہے۔ تو حرام ہے۔ اس کے لیے سوال کرنا بھی جائز نہیں۔

دو رخ میں سزا کی ایک اور وجہ بھی پہلے گزر چکی ہے۔ اِنَّهُ كَانَ لَا يُعْمِلُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ یعنی وہ اللہ پر ایمان نہیں لایا تھا۔ اُس کا تعلق باللہ درست نہیں تھا، توحید نہیں تھی۔ فکر پاک

نہیں تھی۔ اور دوسری بات یہی کہ ”وَلَا يَخْضُّ عَلَى طَعَامِ الْمُسْكِينِ“ مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتا تھا۔ انسانی ہمدردی مفقود تھی۔ جن کی وجہ سے دوزخ کا مستحق ٹھہرا۔

یہودہ باتوں
میں شمولیت

دوزخ میں جانے والے اپنا تیسرا جرم یہ بیان کریں گے۔ کُنَّا نَخْوُضُ مَعَ الْخَالِصِينَ یعنی ہم یہودہ اور غورباتوں میں گھسنے والوں کے ساتھ گھس جاتے تھے۔ ہر کھیل تماشے میں شامل ہو جاتے تھے۔ مسلمان کے لیے یہ نمایاں شان نہیں کہ وہ ایسی فضولیات کی طرف توجہ دے۔ وہ تو ایسا کام کرتے جو دنیا و آخرت میں اس کے لیے مفید ہو۔ وہ کھیل تماشے کو پسند نہیں کرتا۔ غیبت، عیب جوئی، پھیل خوری سے اجتناب کرتا ہے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ یہ ریڈیو اور ٹیلیوژن کیا ہے۔ خبروں اور بعض محدود باتوں کو چھوڑ کر باقی سب یہودہ گانے، کتیریوں اور فلم ایکٹریسوں کے ناچ، عربانی اور فحاشی ہے تھیٹروں اور سینما گھروں میں کیا ہو رہا ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ داروں میں بیٹھتے تھے۔ اس زمانے میں یہ لعنت ہر گھر میں پہنچ گئی ہے۔ ہر شخص اس میں شریک ہو گیا ہے الا ما شاء اللہ۔ کُنَّا نَخْوُضُ مَعَ الْخَالِصِينَ کا یہی مطلب ہے۔ کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم فسق و فجور میں دوسروں کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔

انکارِ آخرت

چوتھی بات یہ کہ کُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّينِ کہ ہم قیامت کے دن یعنی انصاف کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ یوں کہتے تھے۔ کوئی قیامت نہیں آئے گی۔ کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا۔ کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ دنیا میں ہم جو جی میں آتا کرتے تھے۔ قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ یہ ہمارے جرائم ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم دوزخ میں داخل کئے گئے۔

محاسبہ کا تصور

قرآن پاک تمام اقوام عالم میں قیامت کی فکر پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ فکر ہے جس سے محاسبہ اور باز پرس کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اگر قیامت کا تصور باقی نہ ہے۔ تو محاسبہ کا تصور خود بخود ختم ہو گیا۔ اور انسان اس دنیا میں شتر بے ہمار کی طرح جدھر چاہا، چلا جائے گا۔ انگریز نے اسی تصور کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ چاہا کہ انہیں کھیل کود کی طرف راغب کر دو۔ فحاشی اور عیاشی میں مبتلا کر دو۔ فلم ہی دیکھتے رہیں۔ ریڈیو اور ٹیلیوژن سے دل بھلاتے رہیں۔ ان کا سارا وقت لہو و لعب میں گزر جائے اور یہ محاسبہ کے تصور سے بے نیاز ہو جائیں۔

تو کافر یہی کہیں گے کہ ہم یوم الدین کی تکذیب کرتے ہیں۔ حَتَّىٰ أَتَا الْيَقِينَ یہاں تک

کہ موت کا وقت آگیا۔ ہم اسی وہم میں ہیں۔ کہ یہ زندگی اس دنیا تک محدود ہے۔ کوئی قیامت نہیں۔
کوئی باز پرس نہیں۔ ہم یہی سوچ رہے تھے۔ کہ یقینی بات یعنی موت آگئی اور دنیا کا دور ختم ہو گیا۔

شفاعت کا تصور

فَرَمَا يٰۤاٰمَنُوْنَ تَنفَعُكُمْ شَفَاعَةُ الشَّفِيعِيْنَ پس ایسے لوگوں کو سفارش کرنے والوں کی سفارش
کوئی کام نہیں دے گی۔ اول تو کوئی سفارش کرنے والا ہی نہیں ہوگا۔ اور اگر سارے نبی اور سارے مومن
بھی سفارش کریں۔ تو ان کی سفارش کوئی فائدہ نہیں دے سکے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ کہ
کافر و مشرک کے حق میں کوئی سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔ مومن، نبی، شہید، گنہگاروں کے حق میں سفارش کریں گے۔ اور
انہیں جہنم سے رہائی حاصل ہو جائے گی۔ مگر آخر میں یہ چار قسم کے مجرمین رہ جائیں گے۔ ان کے بارے
میں کوئی سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔ لَا تُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ کیونکہ سفارش کے لیے شرط
ہے۔ کہ ایمان ہو، تعلق باللہ ہو، تکذیب نہ ہو اور قیامت کے دن کو برحق تسلیم کیا جائے۔ چونکہ ان
لوگوں نے ان شرائط کو پورا نہ کیا۔ لہذا یہ دائمی جہنمی ٹھہرے۔ ان کے حق میں کوئی شفاعت مفید نہ ہوگی۔

تَبْرَكَ الَّذِي ۲۹

المذشر ۴۲

درس ہفتم

(آیت ۴۹ تا ۵۶)

فَمَّا لَهُمْ عَنِ التَّذْكَرَةِ مُعْرِضِينَ ۴۹ كَانَتْ لَهُمْ حُجُورٌ مُّتَشِيرَةٌ ۵۰ نَزَلَتْ مِنْ قُتُوبَةٍ ۵۱ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِنْهُمْ أَنْ يُؤْتَى صُحُفًا مُنشِئَةً ۵۲ كَلَّا بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۵۳ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ۵۴ فَمِنْ شَاءَ ذَكَرَهُ ۵۵ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۵۶ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَى وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۵۷

تذکرہ ۱۶

تو جس :- پس ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ نصیحت سے اعراض کرنے والے ہیں ۴۹ جیسے کہ وہ جنگلی گدھے ہیں ۵۰ جو بھاگ رہے ہیں شیر سے ۵۱ بلکہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلا ہوا صحیفہ دیا جائے ۵۲ ہرگز نہیں بلکہ یہ لوگ آخرت سے بے خوف ہیں ۵۳ ہرگز نہیں یہ قرآن تو سرسری نصیحت ہے ۵۴ جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے ۵۵ اور لوگ نصیحت حاصل نہیں کر سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے وہی ہے اہل تقویٰ اور اہل مغفرت ۵۶

گزشتہ سے پیوستہ

مومنین جنت میں پہنچ کر خیال کریں گے کہ دوزخ والوں کا حال دریافت کیا جائے اور ان سے دریافت کیا جائے کہ تمہیں کون سی چیز دوزخ میں لائی ہے جیسا کہ گزشتہ درس میں گزر چکا ہے۔ دوزخ والے جواب دیں گے کہ چار جرائم کی وجہ سے وہ یہاں آئے۔ وہ چار جرم یہ ہیں۔ کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہیں تھے۔ مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ ہم لالچنی باتوں کے اندر گھستے تھے، اور ہم قیامت کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ یہ ہمارا قصور ہے جس کی وجہ سے جہنم واصل ہوئے۔ دنیا میں اس قسم کی باتوں میں مبتلا تھے یہاں تک کہ موت آگئی۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان کے بارے میں سفارش کرنے والوں کی سفارش مفید نہیں ہوگی

نصیحت اعراض

ابتداءً سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے انذار کی بات کی تھی یعنی یَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ اے لحاف اوڑھنے والے اٹھ اور ان کو ان کے بُرے انجام سے ڈرا۔ اب سورۃ کے آخری حصہ میں انذار کا دوبارہ ذکر ہو رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ فَمَّا لَهُمْ عَنِ التَّذْكَرَةِ مُعْرِضِينَ ان لوگوں کو کیا

ہو گیا ہے۔ کہ یہ نصیحت سے اعراض کرنے والے ہیں۔ اللہ کا نبی تو تذکرہ نصیحت اور قرآن پیش کرتا ہے۔ جو نہایت پاکیزہ باتیں ہیں۔ اور فطرت کے عین مطابق ہیں۔ ان میں انسانیت کی بھلائی ہے۔ مگر یہ لوگ ان باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ نہایت افسوس کا مقام ہے۔ انہیں تو اس پر وگرم کو تسلیم کر لینا چاہیے تھا۔ مگر نہ معلوم یہ اس سے کیوں اعراض کرتے ہیں۔

قرآن پاک یاد دہانی
کراتا ہے

جب ان باتوں میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو قرآن یاد دلاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق درست کرو۔ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی کرو۔ قیامت کے محاسبے کو پیش نظر رکھو۔ قرآن پاک تذکرہ ہے۔ قرآن پاک کے جہاں اور نام مثلاً ذکر، شفاء، ہدایت اور بیان ہیں، منجملہ ان کے تذکرہ بھی ہے۔ آج کل جدید عربی میں تذکرہ گاڑی وغیرہ کے ٹکٹ کو بھی کہتے ہیں۔ یہ جو ڈائری لکھی جاتی ہے۔ اس کو بھی تذکرہ کہا جاتا ہے۔ کہ یہ بھی یاد دہانی ہوتی ہے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ نصیحت سے اعراض کرنے والے لوگ ایسے ہیں کَاٰثِمُوۡہُمْ
حٰمِرٌ مُّسْتَنْفِرٌ جیسے جنگلی گدھا ہوتا ہے۔ فَذَرْتُ مِنْ قُسُوۡدٍ جو شیر کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے
قُسُوۡرَہِ شِرِّہِ کو کہتے ہیں۔ جنگلی گدھا اگر شیر کو دیکھ پائے تو جس طرح وہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ نصیحت سن کر دوڑ پڑتے ہیں۔ گویا قرآن ان کے سامنے ایسا ہے جیسے شیر ہو جس کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوں۔ قسور کا لغوی معنی شور کرنا یا گر جانا ہے۔ چونکہ شیر میں گر جتنے کی صفت پائی جاتی ہے۔ اس لیے حبشی زبان میں اسے شیر کہتے ہیں۔ عربی میں اس کا متبادل لفظ اسد ہے۔

اعراض کی
وجہات

اعراض کی کئی وجوہات ہیں۔ یا تو یہ نا فہمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کہ انسان نا فہم ہے جس طرح بچے نا فہمی کی وجہ سے تعلیم سے اعراض کرتے ہیں۔ انہیں علم نہیں ہوتا، فہم و ادراک نہیں ہوتا کہ تعلیم کس قدر اچھی چیز ہے۔ یا پھر اعراض طبعی نفرت کی بنا پر ہوتا ہے۔ جس طرح بیمار دوائی پینے سے نفرت کرتا ہے۔ حالانکہ یہ اس کے لیے مفید ہوتی ہے۔ اور شفا کا سبب ہوتی ہے۔ مگر وہ طبعی نفرت کی وجہ سے اعراض کرتا ہے۔

بعض اوقات انسان کسی چیز سے نفرت محض وہم کی بنا پر کرتا ہے۔ کسی بیمار کا فصد کھتے ہیں، خون نکالتے ہیں۔ تو اسے وہم ہو جاتا ہے۔ کہ خون نکالنے سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ اُس پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ حالانکہ خون کا نکالنا، اُسے بیماری سے نجات دلانے کے لیے

ہوتا ہے۔ اُس کی زندگی کی بقا کی خاطر کیا جاتا ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ مشرکین کیوں اعراض کرتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہیں جیسے جنگلی گدھے ہوں جو شیر کا نام سن کر بھاگ جائیں، انہیں تو چاہیے تھا کہ قرآن کی بات تسلیم کر لیتے، نہ کہ اس سے دور بھاگتے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کفار کی ایک اور ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ کیا فَمَا يَكُلُ يَدُ کفار کی ہٹ دھرمی كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ بلکہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے۔ اَنْ يُؤْتِيٰ صُحُفًا مِّنْهُ کہ اُسے کھلا ہوا صحیفہ دیا جائے۔ بعض کافر ہٹ دھرمی کی وجہ سے کہتے تھے لَنْ نُؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں تک کہ ہمیں ایسی کتاب نہ دی جائے۔ جیسی اللہ کے رسول پر کتاب نازل ہوتی ہے۔ یعنی ہر شخص کے ہاتھ میں ایک نوشتہ دیا جائے۔ بس میں یہ حکم موجود ہو کہ تمہیں نبی کی بات کو مان لینا چاہیے۔ ایک اور جگہ وضاحت بیان کیا کہ یہ کفار چاہتے ہیں کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَا اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ یعنی ہمیں بھی ویسے ہی کتاب دی جائے جس طرح اللہ کے رسولوں کو دی جاتی ہے۔ بعض کفار یوں کہتے تھے کہ ہم اُس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ ہمارے سامنے کتاب نازل نہ کریں۔ آپ ہمارے سامنے آسمان پر جائیں، وہاں سے کتاب اتاریں، تب ہم مانیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ بات ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کیا ہر شخص رسولوں کی طرح ہے، کہ اُسے کتاب دی جائے۔ اُس پر وحی نازل کی جائے۔ ہر شخص تو اس کی استعداد ہی نہیں رکھتا۔ کہ اُسے براہِ راست مخاطب کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان کے — انکار کی اصل وجہ یہ ہے بَلْ لَا يُخَافُوْنَ النَّارَ کہ یہ لوگ آخرت سے بے خوف ہیں۔ اس پر یقین نہیں رکھتے۔ جیسا کہ پہلی آیت میں گزر چکا ہے۔ وَكُنَّا نَكْذِبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ یعنی ہم قیامت کے دن کی تکذیب کرتے تھے، ساری خرابیوں کی اصل وجہ یہی ہے۔ جب انسان کی نگاہ محلہ کے عمل پر نہ ہو، تو پھر وہ من مانی کرتا ہے۔ ان کے انکار کی اصل وجہ یہی ہے۔ کہ یہ یومِ آخرت کو تسلیم نہیں کرتے۔ مگر اب مطالبہ یہ پیش کر رہے ہیں کہ ہم پر بھی کتاب اتاری جائے جس طرح رسولوں پر اتاری جاتی ہے۔ فرمایا ایسا کرنا فطرت کے خلاف، عقل اور عقل کے خلاف ہے۔ ہر ایک آدمی کو اُس کی مرضی کے مطابق صحیفہ نہیں دیا جاسکتا۔

قرآن کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ كَلَّا اِنَّكَ تَذْكُرُوْهُ ۚ فَمِنْ شَأْنِ ذِكْرِهِ

ہر شخص پر کتاب نہیں اتاری جاتی

قرآن پاک تو ایک یاد دہانی اور نصیحت ہے جو شخص چاہے اس کو تسلیم کر لے ہر شخص کے لیے علیہ علیہ صحیفہ اس لیے بھی ممکن نہیں کہ صحیفہ کا مقصد تو امت کی اجتماعی تعلیم و تربیت ہو تا ہے اور ہوسامی کے ہر شخص کو فرداً فرداً تعلیم نہیں دی جاسکتی بلکہ یہ کام تو جماعت بندی کے ذریعے اجتماعی صورت میں انجام دیا جاسکتا ہے۔ کافر چاہتے ہیں کہ ہر شخص کو الگ الگ صحیفے کے ذریعے اس کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے، یہ ناممکن ہے۔

ہدایت کا مدار
طلب پر ہے

اس نصیحت یعنی قرآن پاک کے متعلق فرمایا۔ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ صِحَّتِ یہ ہے کہ لوگ قرآن پاک سے نصیحت حاصل نہیں کر سکے مگر یہ کہ اللہ چاہے اور اللہ تعالیٰ کے چاہنے کے متعلق قرآن پاک میں اصول بھی بیان کئے گئے ہیں کہ جو شخص اپنی مرضی اور اختیار سے ہدایت کا طالب ہو گا اُسے ہدایت حاصل ہوگی۔ اور جو شخص اپنی خواہش سے ہدایت طلب نہیں کریگا اُسے یہ نعمت میسر نہیں آئے گی اُسے یہ یاد دہانی مفید نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس کے اندر طلب اور خواہش نہیں پائی جاتی۔ ہدایت کے حصول کے لیے طلب، خواہش اور ارادے کا پایا جانا ضروری ہے۔ ورنہ ہدایت مفید نہیں ہوگی۔

دوسری جگہ فرمایا وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِتْنَةً لَّهُمْ سَبَلَنَا وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَاتَّبَعُوا تَشَاهُؤَهُمْ مطلب یہ کہ جو ہدایت کی طرف آنا چاہے ہم اُس کے لیے راستہ کھول دیتے ہیں اور ان کے لیے ہدایت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اور تقویٰ سے سرفراز کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے جو لوگ عناد، ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ بِكُفْرِهِمْ فَالْأَنسَاءُ اللَّهُ تَعَالَى ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں کو بند کر دیتے ہیں۔ متذکر یہ کہ طالبان ہدایت کے لیے ہدایت کے راستے کھلے ہیں اور جو شخص اس کی خواہش ہی نہ رکھے۔ اُسے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اہل تقویٰ اور اہل
معصرت

ہدایت کا یہ اصول بیان کرنے کے بعد فرمایا هُوَ أَهْلُ التَّقْوَى وَأَهْلُ الْغُفْرَةِ یعنی وہی ہے اہل تقویٰ اور اہل مغفرت۔

مفسرین نے اس کی تفسیر دو طرح سے بیان کی ہے۔ عام تفسیر تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ہی اہل

تقویٰ اور اہل مغفرت ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے اَنَا اَهْلٌ اَنْ اُتَقَىٰ
یعنی میں ہی اس کا اہل ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے۔ اور تقویٰ اختیار کیا جائے۔

فَمَنْ اتَّقَىٰ فَلَوْ جُعِلَ مَعِيَ اِلٰهًا فَاَنَا
اَهْلٌ اَنْ اَعْفَلَہُ پس جب بندہ مجھ سے تقویٰ اختیار کرے گا۔ مجھ سے ڈرے گا شرک نہیں کریگا
تو میں اس کا اہل ہوں کہ اُسے بخش دوں، معاف کر دوں۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی انہیں لوگوں پر ہوتی
ہے، جو شرک نہیں کرتے اور اس کی سزا سے ڈرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اہل تقویٰ اور اہل مغفرت
سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے۔

بعض کہتے ہیں۔ کہ ہُو کا مرجع اللہ کی طرف نہیں بلکہ انسانوں کی طرف ہے۔ یہ انسان دو قسم
کے ہیں۔ بعض اہل تقویٰ ہیں۔ جو نیکی اور عدل کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے
غنیۃ الطالبینؒ میں تقویٰ کی تعریف اس آیت سے کی ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ
وَ اِیْتَاہِ ذِی الْقُرْبٰی یعنی تقویٰ سے مراد یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے قرابت داروں
کے حقوق کی نگہداشت کا حکم دیتا ہے۔ اور تین چیزوں سے منع کرتا ہے۔ وَ یَنْہٰہِیْ عَنِ الْفَحْشَیِّ
وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ فحش، منکرات اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔ مقصد یہ کہ اہل تقویٰ وہ لوگ ہیں جو عدل
پر عمل پیرا ہیں۔ اور اہل مغفرت وہ ہیں، جن سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ ان میں بھی دو قسم کے لوگ
ہیں۔ ایک تو وہ جن سے گناہ سرزد ہوا اور پھر وہ اُس پر جھبے ہے۔ ایسے لوگوں کی فلاح کی کوئی صورت
نہیں۔ اُن کا ٹھکانا جہنم ہے۔ انہوں نے پوری زندگی اصلاح کی کوشش نہ کی حتیٰ کہ انہیں موت آگئی۔
دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں۔ جن سے غلطی ہوئی، گناہ سرزد ہوا۔ مگر وہ سنبھل جاتے ہیں۔
فوراً تائب ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد اعمال صالح کرنے لگتے ہیں۔ بُرے اعمال پر نادم ہوتے
ہیں۔ اور اس کی تلافی کرتے ہیں۔ جیسے کہ ارشادِ باری ہے اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوا وَاَصْلَحُوا یعنی جن لوگوں
نے توبہ کی اور پھر اچھے عمل کئے، اپنے گناہ پر اصرار نہیں کیا۔ خدا تعالیٰ سے معافی مانگی ایسے ہی لوگ
اہل مغفرت ہیں۔

حضرت ابوسفیانؓ اپنے خاندان کے لوگوں کو ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے بڑی کوتاہیاں کی ہیں انیس سال تک اسلام کی مخالفت کرتے رہے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے دین کی نعمت عطا فرمائی تو سابقہ کوتاہیوں پر نادم ہوئے۔ اور عمر بھر اس کی تلافی کرتے رہے۔ اپنے خاندان کو بھی تلقین کرتے رہے۔ اور خدمت اسلام کی طرف راغب کرتے رہے۔ اور انہیں اسلام کی صفِ اول میں خدمت کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ خود ہمیشہ جہاد و قربانی میں پیش پیش رہے۔ جہاد میں ایک آنکھ بھی جاتی رہی مگر بوڑھا ہونے کے باوجود معرکہ یرموک میں شریک ہوئے۔ تلوار تو چلانہیں سکتے تھے۔ مگر مجاہدین کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، ان کو ہایت دیتے رہے۔ جرات اور بہادری کا جذبہ پیدا کرتے رہے۔ کہتے تھے۔ کہ بھائی آج تم جس جگہ بھڑے ہو۔ لَہْ مَا بَعْدَہُ اس دین کو لوگ تاریخ میں یاد رکھیں گے۔ چنانچہ اس معرکہ میں شام فتح ہوا۔ ایسے ہی لوگ اہل مغفرت ہیں۔

الْعَرَضُ اہل تقویٰ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ابتداء سے عدالت اور نیکی پر قائم رہتے ہیں۔ اور اہل مغفرت وہ ہیں۔ کہ کوتاہی ہوتی مگر تائب ہو کر اصلاح کر لی اللہ تعالیٰ اشارۃً یہ بات سمجھا رہے ہیں۔ کہ کفر و شرک کرنے والے اب بھی باز آجائیں تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے دروازے کھلے ہیں۔ انکی غلطیاں معاف ہو جائیں گی۔ اگر یہ لوگ اہل تقویٰ میں شامل نہیں ہو سکے تو حکم از کم اہل مغفرت میں تو شامل ہو جائیں۔ قرآن پاک سے اعراض کسی صورت بھی مفید نہیں، بلکہ ناکامی کا ذریعہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

79.



تَبْرُكَ الَّذِي ۲۹

الْقِيَمَةُ ۷۵

درس اول ۱

(آیت ۱۵ تا ۱۵)

سُورَةُ الْقِيَمَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اَرْبَعُونَ آيَةً فِيهَا اَرْبَعُونَ حَرْفٌ

سورۃ قیامت مکی ہے اور یہ چالیس آیتیں ہیں اور اس سورت میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

لَا اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیَمَةِ ① وَلَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللّٰوَامَةِ ② اَیَحْسَبُ
 الْاِنْسَانُ اَنْ لَّنْ جَمْعٌ عِظَامُهُ ③ بَلٰی قَدَرِیْنِ عَلٰی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهُ ④
 بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِفُجْرِ اِمَامِهِ ⑤ یَسْئَلُ اَیَّانَ یَوْمِ الْقِیَمَةِ ⑥ فَاِذَا
 بَرَقَ الْبَصَرُ ⑦ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ⑧ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ⑨
 یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفْرُ ⑩ کَلَّا لَا وَزَرَ ⑪ اِلٰی
 رَبِّکَ یَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ⑫ یُنَبِّئُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ
 وَاَخَّرَ ⑬ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهِ لَصِیْرٌ ⑭ وَلَوْ اَلْقٰ
 مَعَاذِیْرَهُ ⑮

ترجمہ:- میں قسم اٹھاتا ہوں قیامت کے دن کی ① اور میں قسم اٹھاتا ہوں نفس لواامہ کی ②
 کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو ہرگز کٹھا نہیں کریں گے ③ کیوں نہیں۔
 ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کے پورے پورے کو برابر کر دیں ④ بلکہ انسان چاہتا ہے کہ ڈھٹائی کرے
 اس کے سامنے ⑤ وہ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کہاں آئیگا ⑥ پس جب آنکھیں چنڈھیا جائیں گی
 ⑦ اور چاند بے نور ہو جائے گا ⑧ اور سورج اور چاند کو یکجا کر دیا جائے گا ⑨ انسان کے
 گا اس دن کہ اب بھاگ کر کہاں جائے ⑩ خبردار اب بچاؤ کی کوئی جگہ نہیں ⑪ ٹھہرنے کی جگہ اس دن
 تیرے رب کی طرف ہی ہوگی ⑫ اس دن انسان کو اس سے خبردار کر دیا جائیگا جو اس نے آگے بھیجا تھا اللہ
 جو نیچے چھوڑا تھا ⑬ بلکہ انسان اپنے نفس پر خوب بصیرت رکھتا ہے ⑭ اگرچہ وہ اپنے کتے ہی جیسے بہانے کرے ⑮

مگر اس سورۃ میں قیامت کی ابتدا اور انتہا دونوں بیان کر دیں۔ مثلاً ابتداء میں فرمایا "فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ" یعنی قیامت کی ابتداء اس وقت ہوگی جب آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ جب اللہ تعالیٰ کی تجلی نازل ہوگی تو حالات درہم برہم ہو جائیں گے، ہر شخص حیرت و استعجاب کے دریا میں ڈوبا ہوا ہوگا۔ اور حالت یہ ہوگی کہ "وَجُوهٌ لُّيُومِئِذٍ نَّاصِرَةٌ ۖ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ"۔ اُس دن بعض چہرے تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہوں گے۔ نیز "وَجُوهٌ لُّيُومِئِذٍ يَّاسِرَةٌ" بعض چہرے اداس اور ترش ہوں گے۔ اس قسم کی حالت اُس دن ہوگی۔ سورۃ مدثر میں صور پھونکنے کا ذکر کیا، جس سے کان متاثر ہوں گے۔ اس سورۃ میں "بَرِقَ الْبَصَرُ" کہہ کر آنکھ متاثر ہونے کا ذکر فرمایا، یعنی جب قیامت کے حیرت انگیز مشاہدات اس کی نگاہ کے سامنے آئیں گے تو انسان حیرت اور خوف و دہشت کے عالم میں کہے گا۔ "أَيُّنَ الْمَفْرُوقِ" کہاں بھاگ جائے اور کہاں پناہ حاصل کرے۔ الغرض اس سورۃ مبارکہ میں بھی وقوع قیامت کے منکرین اور عزیزانے عمل کے منکرین کا ذکر فرمایا۔ اور ان کا رد فرمایا۔

اس سورۃ مبارکہ کی ابتدا قسم سے کی گئی ہے۔ اور اس میں دو چیزوں کا ذکر ہے۔ لہٰذا یا تو قسم کی تاکید کے لیے آتا ہے۔ اور یا اس کا معنی "نہیں" ہوتا ہے یعنی لا نفی کا ہوتا ہے۔ اس مقام پر "لَا أَقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِيَامَةِ" کا معنی یہ ہے کہ میں قسم اٹھاتا ہوں، قیامت کے دن کی۔ کسی چیز کی قسم اٹھانے سے مراد اُس چیز کو گواہ بنانا ہوتا ہے یا قسم اٹھاتے سے اس چیز کا مشاہدہ پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس جگہ قسم سے تعظیم والا معنی مراد نہیں ہے۔ کیونکہ شریعت میں اللہ تعالیٰ کے سوائے کسی دوسری چیز کی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے شرک میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی شان جدا ہے۔ وہ جب کسی چیز کی قسم اٹھاتا ہے، تو اس چیز کو بطور گواہ پیش کرتا ہے۔ اور یہاں پر لا تاکید کے لیے ہے یہ کہ کسی چیز میں تاکید اور پختگی پیدا کرنے کے لیے آتا ہے۔ ایسا ہی قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے۔ جس سے مراد نفی نہیں بلکہ تاکید ہے، جیسے "لَا أَقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ" "فَلَا أَقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ" اسی طرح "لَا أَقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِيَامَةِ" وغیرہ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ لا کافیہ ہی ہے۔ نہ کہ تاکید قسم کے لیے۔ اس مقام پر

لفظ لا
کی تشریح

مطلب یہ ہے کہ یہ نفی کفار کے اس خیال کی ہے کہ قیامت یا جزائے عمل کوئی چیز نہیں۔
اللہ تعالیٰ اُن کے اس خیال باطل کی تردید فرماتے ہیں کہ نہیں! ایسی بات ہرگز ہرگز نہیں، جو یہ لوگ
خیال کرتے ہیں۔ بلکہ قیامت ضرور بالضرور واقع ہونے والی ہے۔ تو ان معنوں میں یہ لانا فہم ہی ہے۔

الغرض ابتدائے سورۃ میں دو چیزوں کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی لَا أُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیَمَةِ
میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ اور میں قسم کھاتا ہوں نفسِ لوامہ
کی کہ یہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ قیامت ضرور واقع ہو کر ہے گی۔ آگے اس کا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ نفس کی تین حالتیں ہیں۔ پہلی حالت نفسِ امارہ کی ہے۔
یہ حالت عام طور پر بچپن کی ہوتی ہے۔ جب انسان کھیل کود اور لہو لعب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ زیادہ
تو انسان کا دھیان باطل باتوں کی طرف ہوتا ہے۔ اس کو نفسِ امارہ کہتے ہیں۔ جب شعور کی منزل
آتی ہے۔ تو انسان کا نفس کبھی نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور برائی کی ملامت کرتا ہے۔ اور بعض اوقات
برائی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ملامت کرنے والی منزل نفسِ لوامہ کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ہر نفسِ نفسِ
لوامہ بن جائے گا۔ نیکو کار بھی اپنے آپ کو ملامت کرے گا کہ دنیا میں اور زیادہ نیکی کیوں نہ کر لی اور بدکار
بھی اپنے نفس کو ملامت کرے گا کہ دنیا میں برائی کو کیوں نہ چھوڑا۔ اگر میں نے نیکی کو اختیار کیا ہوتا تو
آج یہ جہنم نہ ہوتا۔ مقصد یہ کہ نفسِ لوامہ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ نیکی کی طرف رجحان ہوتا ہے۔ اور
برائی پر نفسِ ملامت کرتا ہے۔

نفس کی تیسری حالت نفسِ مطمئنہ ہے۔ اگر نفس میں وہ کیفیت پیدا ہو جائے جس سے اُسے
اطمینان حاصل ہو جائے، قوانینِ الہی کے ساتھ تعلق پیدا ہو جائے اور برائی سے ہٹ جائے۔ نہ تو دوسرے
شیطان اُسے برائی کی طرف مائل کرے اور نہ خواہشاتِ نفسانی ہی اُسے برائی پر آمادہ کر سکیں، تو یہ نفسِ
مطمئنہ کہلاتا ہے۔

اس مقام پر یہ سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ نفسِ لوامہ کو قیامت کے ساتھ کیوں جمع کیا ہے۔

نفس کی
تین حالتیں

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں انسان کی تنبیہ کے لیے ہیں اور برائی سے روکنے کا ذریعہ ہیں قیامت کے ذکر کرنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ کہ انسان اس کی ہولناکی سے ڈر جائے اور برائی سے بچ جائے۔ اور اسی طرح نفس لوامہ بھی انسان کو برائی اختیار کرنے پر تنبیہ کرتا ہے۔ گویا انسان کو برائی سے روکنے اور نیکی پر چلنے میں یہ دونوں چیزیں مدد دیتی ہیں، لہذا ان دونوں کا اکٹھا ذکر کیا ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے۔ کہ جدید تمدن نے انسان کی اخلاقی قدروں کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ اذہان کو کھیل تماشے، لہو و لعب، ریڈیو، ٹیلیوژن، فلم اور آرٹ گیلری میں اس طرح محو کر دیا ہے کہ نیکی کی طرف دھیان دینے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ ایسی ہی حالت میں انسان کا نفس لوامہ اُسے ملامت کرتا ہے۔ گویا قیامت اور نفس لوامہ دونوں انسان کو آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔ لہذا ان کو اکٹھا ذکر کیا ہے۔

بعث بعد الموت

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ لَّنْ جَمْعَ عِظَامِهٖ۔ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے۔ کہ ہم اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کریں گے۔ جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے۔ کہ منکر اور کافر کہتے ہیں۔ اِذَا كُنَّا عِظَامًا مَّخْزُوَةً جب ہماری ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی۔ یا یوں کہتے ہیں۔ اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ جب ہم زمین میں رُل مل جائیں گے ہمارے ذرات منتشر ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے! اَهِمَّاتٌ هِيَ مَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ یہ تو بڑی بعید سی بات ہے۔ عقل نہیں مانتی۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے۔ بَلٰی کَیۡوَلٰی قَدَرِیۡنَ عَلٰی اَنْ تَسُوۡیَ بِنَاۡئِهٖ ہم اس پر قادر ہیں۔ کہ اس کے پور پور کو درست کر دیں۔ یہ پور پور کا لفظ یہاں پر محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جس طرح کوئی کتا ہے۔ کہ میرے جوڑے جوڑے میں دروہور رہا ہے۔ تکلیف ہو رہی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اس کے پور پور کو درست کر دیں گے۔ یعنی انسان کو بالکل اُسی حالت میں دوبارہ لے آئیں گے، جس طرح یہ دنیا میں تھا۔ قیامت کے روز انسان کا جسم انہیں اجزاء کا مرکب ہوگا، جن کا وہ دنیا میں تھا۔ کوئی دوسرا جسم عطا نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ایسا کرنا انصاف کے خلاف ہوگا۔ کہ کمرے کوئی اور بھرے کوئی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ انسان کو انہیں عناصر کے ساتھ دوبارہ زندہ کرے گا۔ باقی رہی یہ بات کہ کیسے جمع کرے گا۔ تو اس کے دلائل مختلف سورتوں میں بیان ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ علیم کل ہے اور قادر مطلق ہے۔ اُسے علم ہے۔ کہ کسی انسان کے جسم کا کوئی ذرہ کہاں پر ہے۔

اور پھر وہ انہیں اکٹھا کرنے پر بھی قادر ہے۔ لہذا انسان کو بالکل اسی حالت پر دوبارہ قائم کر دینا اللہ تعالیٰ کے لیے نہایت آسان ہے۔ اُس نے فرمایا ہے کہ میں اس کا جوڑ جوڑ ٹھیک کر دوں گا۔

وقوع قیامت

فرمایا حقیقت ہے کہ بَلْ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ انسان چاہتا ہے کہ قیامت کا انکار کر کے دنیوی زندگی میں ڈھٹائی اور بے حیائی کرتا ہے۔ اگر قیامت کے وقوع کا عقیدہ ہوگا تو پھر برائی سے رکتا پڑے گا، مگر یہ تو چاہتا ہے کہ اس کی برائی کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، اور وہ جو چاہے کرنا پھرے۔ اور اب یہ بے حیائی سے پوچھتا ہے۔ يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ کہ قیامت کب آئے گی۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ جب قیامت آئے گی فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ تو آنکھیں چندھیا جائیں گی وَحُشِفَ الْقَمَرُ اور چاند بے نور ہو جائے گا۔ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ سورج اور چاند کو بچھا کر دیا جائے گا۔ ان کے بے نور ہو جانے پر معاملہ درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ آپس میں ٹکرا جائیں گے۔ اور پھر کیا ہوگا۔ يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفْزُؤُ انسان کہے گا کہ اب بھاگ کر کہاں چلا جائے۔ فرمایا كَلَّا خَيْرٌ لَّكَ اور اب بچاؤ کی کوئی جگہ نہیں۔ بلکہ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ کہ جائے مستقر صرف تیرے رب کی طرف ہی ہے۔ وہیں جا کر ٹھہرنا ہے۔ اور کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ اب رب تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے۔

اعمالِ مہینہ
کیا جائے گا

اس کے بعد انسان جس چیز کا مستحق ہوگا، اسی کی طرف جانا ہوگا، يَتَّبِعُوا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ كَمَا قَدَّمُوا وَآخَرُ۔ اس دن انسان کو اس چیز سے خبردار کر دیا جائے گا، جو اُس نے آگے بھیجا ہے۔ اور جو پیچھے چھوڑا ہے۔ اچھائی، برائی، نیکی، بدی ہر چیز اس کے سامنے ہوگی۔ جو اچھی بُری رسم پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ وہ بھی سامنے آجائے گی۔ کفر و شرک اور بدعت جو کچھ بھی پیچھے چھوڑ کر آیا ہے۔ سب حاضر کر دیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بِصِيرَةٍ انسان اپنے نفس پر بصیرت رکھتا ہے۔ وہ اپنے اعمال سے باخبر ہوگا۔ وَلَوْ أَنفَىٰ مَعَاذِيہُ اگرچہ وہ کہتے ہی جیلے بہانے کرے۔ اُسے معلوم ہوگا کہ کیا کام کر کے آیا ہے لہذا اُسے کہا جائے گا اقْرَأْ كِتَابَكَ کفایتِ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا۔

(آیت ۱ تا ۳۰)

لَا تَحْرُكُ بِهِ لِسَانَكَ لِتُجْلِبَ بِهِ ۖ ۱۶ ۚ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۚ ۱۷ ۚ فَإِذَا قَرَأْتَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۚ ۱۸ ۚ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۚ ۱۹ ۚ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۚ ۲۰ ۚ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۚ ۲۱ ۚ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۚ ۲۲ ۚ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ ۲۳ ۚ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بِاسِرٍ ۚ ۲۴ ۚ تَطُنُّ أَنْ يَفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۚ ۲۵ ۚ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۚ ۲۶ ۚ وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ ۚ ۲۷ ۚ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ۚ ۲۸ ۚ وَالتَّتِيتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۚ ۲۹ ۚ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ۚ ۳۰ ۚ

الحشر

ترجمہ: آپ اپنی زبان اس قرآن پاک کے ساتھ نہ چلائیں تاکہ آپ اس کو جلدی سیکھ لیں ۱۶ بیشک اس کا آپ کے دل میں جمع کرنا اور آپ کی زبان سے اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے ۱۷ پس جب ہم اس کو پڑھیں (یعنی ہمارا فرشتہ) تو اس کے پڑھکر فارغ ہونے کے بعد آپ پڑھیں ۱۸ پھر بیشک اس کا بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے ۱۹ خبردار! بلکہ تم دنیا کو پسند کرتے ہو ۲۰ اور چھوڑتے ہو تم آخرت ۲۱ اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے ۲۲ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہوں گے ۲۳ اور اس دن کئی چہرے اداس ہوں گے ۲۴ انہیں یقین ہوگا کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک کیا جائیگا ۲۵ خبردار جب انسان کی روح مانسی کی ہڈی تک جا پہنچتی ہے ۲۶ اور کہا جاتا ہے کون ہے راق (یعنی جھاڑ پھونک کر نبوالا) ۲۷ اور انسان گمان کرتا ہے کہ اب جدائی کی گھڑی آپہنچی ہے ۲۸ اور پنڈلی پنڈلی کے ساتھ لپٹ جاتی ہے ۲۹ اس دن تیرے رب کی طرف چلنا ہوتا ہے ۳۰

اس سورق کی ابتداء میں قیامت کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متکبرین قیامت کا رد فرمایا اور ان لوگوں کی توجہ دلائی جو بعثت بعد الموت اور جزائے عمل کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ قیامت اور نفسِ لوامہ کی قسم اٹھا کر فرمایا کہ ہم انسان کی ہڈیوں کو جمع کریں گے اور اس بات پر قدرت رکھتے ہیں کہ اس کے پور پور کو برآمد کر دیں۔ درمیان میں قرآن حکیم کے متعلق کچھ ارشادات ہیں اور اس کے بعد

گذشتہ پیر

پھر قیامت کا ذکر ہے "كَلَّا بَلْ تُحِثُّونَ الْعَاجِلَةَ" یعنی تم جلدی کی زندگی پسند کرتے ہو "وَتَذُرُونَ
 الْآخِرَةَ" اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔ یہ آیات اور اس کے بعد والی آیات قیامت سے متعلق ہیں۔
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے قرآن پاک کے متعلق فرمایا لَا تُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَكَ
لَتَعْبَلَ بِهِ یعنی آپ اپنی زبان قرآن پاک کے ساتھ جلدی نہ چلاویں کیونکہ إِنَّ عَلَيْكُمْ جَمِيعَهُ
وَقَدْ آتَاهُ اس کا جمع کرنا اور آپ کی زبان سے اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔ فَإِذَا قُضِيَهُ
إِلَيْهِمْ جب ہم یعنی ہمارا فرشتہ پڑھے تو آپ اس کے ساتھ ساتھ پڑھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ فَاتَّبِعْ
قُرْآنَهُ اس کے پڑھ کر فارغ ہو جانے کے بعد آپ پڑھیں، کیونکہ اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔
 اس میں سے کوئی چیز چھوٹنے نہیں پائے گی اور نہ ہی آپ بھولیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ثُمَّ
إِنَّ عَلَيْكُمْ لَبَيِّنَاتٍ اس کا بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ یعنی اس کے معنی اور مطالب بھی آپ
 کی زبان سے بیان کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

حفاظت قرآن
 کی ذمہ داری

وقوع قیامت اور
 حفاظت قرآن میں
 مناسبت

بظاہر وقوع قیامت اور حفاظت قرآن میں مناسبت معلوم نہیں ہوتی، مگر حقیقت میں
 ان دونوں کے درمیان ربط ہے۔ وقوع قیامت کے متعلق منکرین بڑی ڈھٹائی کے ساتھ پوچھتے
 تھے کہ قیامت کب آئے گی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جس قیامت کی خبر دے رہے ہیں، وہ جلدی
 آجائے۔ گویا جلد بازی کرتے ہیں۔ مگر جب قیامت آئے گی تو حالات خطرناک ہو جائیں گے۔ آنکھیں
 چندھیا جائیں گی، چاند بے نور ہو جائے گا، سورج اور چاند کو اکٹھا کر دیا جائے گا اور پھر انسان
 کہے گا کہ اب بھاگنے کی کون سی جگہ ہے۔ تاکہ بھاگ کر اپنی جان بچائے مگر اس وقت کوئی
 جائے پناہ نہیں ہوگی۔ اور انسان کے سامنے ہر چیز پیش کر دی جائے گی یعنی جو کچھ بھی اس
 نے آگے بھیجا ہے اور جو کچھ پیچھے چھوڑا ہے۔

لَا تُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَكَ کا تعلق بھی جلد بازی سے ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن
 پاک یاد کرنے میں جلدی کرتے تھے جب جبرائیل علیہ السلام قرآن پاک پڑھتے تھے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ
 وسلم بھی دل میں جلدی جلدی پڑھنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ اسے یاد کر لیں، کوئی چیز چھوٹنے نہ

پائے اور کوئی چیز بھول نہ جائے۔ چونکہ یہ ایک مشقت کا کام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ اپنی زبان کو جلدی جلدی حرکت نہ دیں۔ کیونکہ قرآن پاک کو حرف بحرف جمع کر دینا اور اسے آپ کی زبان پر چڑھا دینا ہماری ذمہ داری ہے۔ لہذا آپ جلد بازی نہ کریں۔ بعض فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ علیم کل اور قادر مطلق ہے اور اس کا اعلان ہے کہ انسان کی بوسیدہ ہڈیوں کو جمع کر دے گا۔ اور انسان کے منتشر اجزاء کو اکٹھا کر دے گا اور اس کے پور پور کو درست کر دے گا۔ تو وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ وحی آسمانی کے الفاظ کو محفوظ کر دے۔ اور اس کا کوئی لفظ یا کوئی حرف چھوٹنے نہ پائے۔ لہذا آپ جلدی نہ کریں۔ تو گویا حفاظت قرآن کو وقوع قیامت کے ساتھ یہی جلد بازی کی مناسبت ہے۔

قبول ہدایت میں
جلدی کی خواہش

بعض فرماتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ خواہش بھی تھی کہ لوگ جلدی سے ہدایت قبول کر لیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، آپ جلد بازی نہ کریں۔ کیونکہ ہدایت تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ ”إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يُشَاءُ“ یعنی اے نبی کریم! آپ اپنی پسند کے مطابق کسی کو ہدایت پر مجبور نہیں کر سکتے بلکہ ہدایت دینا تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت سے نواز دے۔ حقیقی مربی اور ہادی تو ذات خداوندی ہی ہے۔ لہذا تربیت کے سلسلے میں جلد بازی بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ انسان فطرۃً تدریج پسند ہے اہستہ اہستہ بات کو سمجھتا ہے۔ اور پھر اس کو اختیار کرتا ہے۔ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق تربیت حاصل کرے گا اور ہدایت پائے گا۔ لہذا آپ جلد بازی نہ کریں۔ دوسری جگہ یہ بھی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن پاک پڑھنے میں جلدی نہ کریں ”مَنْ قَبِلَ أَنْ يَقْضِيَ إِلَيْكَ وَحْيُهُ“ قبل اس کے کہ وحی پوری ہو جائے۔ ”وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا“ اور یہ دعا کریں کہ اے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن پاک کو پڑھنے والا بمنزلہ اُستاد ہوتا ہے۔ اور بوقت تعلیم شاگرد کو غور سے سننا چاہیے، درمیان میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی اشکال باقی رہ جائے تو بعد میں گفتگو کرنی چاہیے۔ درمیان میں مخل نہیں ہونا چاہیے۔

حفاظت قرآن کی تائید میں سورۃ اعلیٰ میں فرمایا ”سَنَقُوكَ فَلَا تَكْشَىٰ ۚ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ“ کہ آپ ہرگز نہیں بھولیں گے۔ سوائے اس چیز کے کہ جسے اللہ بھلانا چاہے۔ یعنی کوئی ایسی بات

جس کو اللہ تعالیٰ منسوخ کر دے۔

حفظ قرآن کے ذرائع

حفاظت قرآن پاک کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ”إِنَّا نَحْنُ نُحْفِظُ الْقُرْآنَ وَنُحْفِظُ مَا لَمْ يَحْفَظُوهُ“ یعنی قرآن حکیم کو ہم نے ہی نازل کیا ہے۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ اسباب حفاظت کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فتح الرحمہ جمالی میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا سبب قرآن پاک کا جمع کرنا ہے۔ قرآن پاک کی تدوین شیخینؒ کے زمانہ میں ہوئی جب کہ اسے کتابی صورت میں لایا گیا۔ حفاظت کا دوسرا بڑا سبب اس کا مسلسل پڑھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں قرآن پاک کے حافظ اور قاری پیدا کئے۔ جہاں تک اسے یاد کرنے کا تعلق ہے۔ اسماء الرحمہ جلالی لکھتے ہیں کہ دس ہزار صحابہؓ کو قرآن پاک زبانی یاد تھا۔ اس کے بعض حصص تو ہر مسلمان کو یاد تھے اور ابتدائے اسلام کے اس دور میں کوئی بھی مسلمان ایسا نہ تھا، جسے قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ یاد نہ ہو، تاہم ایک کثیر تعداد مکمل حفاظ کی بھی موجود تھی۔ اس کے بعد جوں جوں اسلام کے پیرو کاروں میں اضافہ ہوتا گیا، حفاظ کی تعداد میں اسی نسبت سے اضافہ ہوتا رہا۔

جہاں تک قرآن پاک کے بیان کا تعلق ہے، اس کے معانی و مطالب اور معارف و وضاحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں مفسرین کرام کو مقرر فرمایا، جنہوں نے اس کے معارف کو کھول کھول کر بیان کیا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ اس طور پر پورا کیا کہ ہر زمانے میں مفسرین کرام کی ایک جماعت موجود رہی ہے۔ اور اس زمانے میں بھی موجود ہے۔ جنہوں نے مختلف زبانوں میں قرآن پاک کی تفسیر بیان کی۔ گویا قرآن پاک کے الفاظ اور اس کی تجوید بھی محفوظ ہے اور اس کے معانی و مطالب بھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ جلد بازی نہ کریں اس کا جمع کرنا اور آپ کی زبان سے پڑھانا ہماری ذمہ داری ہے۔

اس کے بعد فرمایا ”فَإِذَا قَرَأْتَهُ فَاسْتَمِعْ“ یعنی جب ہم پڑھیں یعنی ہمارا فرشتہ جبرائیل قرآن پاک کو پڑھے۔ تو اس کے بعد آپ اس کا اتباع کریں۔ حقیقت میں معلم اور مربی تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، فرشتہ تو ایک ذریعہ ہے، وہ معلم نہیں بلکہ درمیان میں پیغام رسانی کا

فانی کی بجائے باقی رہنے والی چیز کو ترجیح دو۔ دنیا سے زیادہ محبت نہ کرو، یہ فانی ہے۔ اسے محض قبول کر لو، زیادہ محبت نہ کرو۔ مگر بالکل ترک بھی نہ کرو اللہ ﷻ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَدَ هَمِّتَنَا وَلَا مَبْلَغَ عَلَيْنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا وَلَا تَسْلُطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَرْحَمُنَا یعنی محض دنیا کو ہی مقصود نہ بنا لینا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ یاد رکھو! دنیا اور آخرت دو سوکنوں کی مانند ہیں۔ اگر ایک کو راضی کرے گا تو دوسری ناراض ہو جائے گی لہذا دنیا کے انہماک اور اس کی محبت کی اجازت نہیں دی گئی۔ فرمایا اَسْ كُلْ خَطِيئَةً حُبُّ الدُّنْيَا يَعْنِي هَرَبًا إِلَى طَرَفٍ دُنْيَا كِي مَحَبَّتِ اس حد تک نہیں چلی جانی چاہیے کہ دین، شریعت، آخرت اور موت یاد ہی نہ رہے۔ ایسا انہماک ناجائز اور قبیح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ مجاہد دنیا کی ترجمانی اس طرح فرمائی کہ وہ کہتے ہیں رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطْنَآ قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ یعنی ہم آخرت کو کچھ نہیں جانتے ہمیں جو کچھ دین ہے اسے پورا کر دو گا۔ ایسے ہی دنیا داروں کے متعلق فرمایا کہ وہ کہتے ہیں رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا۔ اے ہمارے پورا کر دو گا! ہمیں دنیا میں ہی جو کچھ دینا ہے دے دے۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔ یہ لوگ دنیا کی جلد بازی کی زندگی پسند کرتے ہیں لہذا یہ آخرت کے منکرین وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ اور چھوڑتے ہو تم آخرت۔

مگر یاد رکھو! جب آخرت آئے گی تو وَجْوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِيَةٌ کئی چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے۔ کہیں فرمایا سفید ہوں گے، نورانی ہوں گے۔ اِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ اپنے پروردگار کی طرف دیکھنے والے ہوں گے، اُن کو رویت الہی بھی نصیب ہوگی۔ جو انتہائی خوشی اور مسرت کی بات ہوگی۔ اہل سنت والجماعت متفقہ طور پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ جنت میں پہنچنے والوں کو دیدار الہی نصیب ہوگا۔ اس کا ذکر صحیح احادیث میں موجود ہے۔ قرآن کریم کی یہ آیات بھی اس بات پر شاہد ہیں۔ کافروں کے متعلق فرمایا كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَّحْجُوْنٌ اُن کو اس دن حجاب میں رکھا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ مومن حجاب میں نہیں رہیں گے۔ اُن کو رویت

الہی نصیب ہوگی۔ اس عقیدے کا انکار کرنے والے گمراہ ہیں۔

اس کا انکار یا تو شیعہ کرتے ہیں یا معتزلہ۔ اُن کا ایشکال یہ ہے کہ اگر خدا کو دیکھیں گے تو خدا محدود ہو جائے گا (العیاذ باللہ) اور جہت کے اندر ہوگا، کیونکہ دیکھنا جہت کے اندر ہوتا ہے۔ مگر اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ دیدار الہی ہوگا۔ البتہ وہ اس کے ساتھ ایک لفظ کا اضافہ کرتے ہیں کہ دیدار ہوگا، مگر بے کیفیت یعنی اس کی کیفیت کوئی نہیں جانتا کہ کس طرح ہوگا۔ یہ دیدار کسی عام چیز کو دیکھنے کی مانند نہیں ہوگا۔ یہاں تو آگے پیچھے، دائیں بائیں جہت ہوتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ جہت سے بے نیاز ہے۔ تاہم دیدار ضرور ہوگا، مگر بے کیفیت۔

منکرین قیامت کی
ماریوسی

اس کے بعد فرمایا وَوُجُوہٌ یُّوَصِّیْذُ بِاِسْمِیَّ اُس دن کئی چہرے اُداس اور ترش رو ہوں گے۔ دوسری جگہ فرمایا، ان یمرکرو غباراً چرٹھا ہوا ہوگا یا وہ سیاہ ہوں گے۔ اور اُن کی حالت یہ ہوگی اَنْ یَّفْعَلَ بِہَا فَاِقْدَةً انہیں یقین ہوگا کہ اُن کے ساتھ کچھ توڑ سلوک کیا جائیگا۔ فاقہ کمر کے حمرے کو کہتے ہیں۔ وہ یقین کریں گے کہ اب اُن کے ساتھ بہت ہی بُرا سلوک ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے قیامت اور جزائے عمل کا انکار کیا۔ فرمایا آج تو یہ جلد بازی سے کام لے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی۔ کوئی قیامت نہیں۔ یہ اساطیر الاولین یعنی پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ مگر کسی کو واپس آتے ہوئے نہیں دیکھا۔

راق کا مفہوم

فرمایا کَلَّا اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ خبردار! جب انسان کی روح اور جان ہانسلی کی ہڈی تک جا پہنچتی ہے۔ اور انسان اس مونیاسے جانے لگتا ہے۔ تو پھر وَقِیْلَ مَنْ سَلَاقِی اور کہا جاتا ہے، کون ہے راق مفسرینِ کریم نے راق کے دو معنی بیان کیے ہیں۔ اس کا ایک معنی ارقیہ سے ہے یعنی جھاڑ پھونک کر نیوالا یا تعویذ گنڈا کر نیوالا مقصد یہ کہ جب انسان کی جان اس حد تک پہنچ جاتی ہے۔ کہ لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اور طبیب تو ناکام ہو گئے، اُن کا کوئی حیلہ کارگر ثابت نہیں ہو رہا ہے۔ اب کسی جھاڑ پھونک والے کو تلاش کرو۔ کوئی دم کرنے والا دم ہی کرے۔ کسی کے تعویذ گنڈے سے مریض کو فائدہ پہنچے۔ کسی طرح اس کی جان بچ جائے۔ تو گو یا راق سے مراد وہ جھاڑ پھونک کرنے والے ہیں۔ جو مریض کی آخری سیٹج پر طلب کیے جاتے ہیں۔ تو "راق" سے مراد انسان کی وہ حالت ہے، جب اُس کے بچاؤ کے تمام ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ لفظ راق، رقیہ سے نہیں بلکہ رقی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہوتے ہیں۔ گویا راق سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسان کے پاس آخری وقت میں آتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ اس شخص کی روح کو لے کر کون اوپر جائے گا۔ یعنی عذاب ولے فرشتے اس کو لے جائیں گے یا رحمت والے۔ اُس وقت دونوں قسم کے فرشتے وہاں پر موجود ہوتے ہیں۔ اگر مرنے والا مومن ہے۔ تو اُسے علیین والے فرشتے لیجاتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ موجود ہے کہ علیین ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے، جہاں بہشت ہے۔ پس نیکو کار انسان کی براہ راست وہاں حاضری ہوتی ہے۔ اس کے بعد اُسے واپس برزخ یا عالم قبر میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مرنے والا کافر یا منافق ہے۔ تو فرشتے اس کی روح کو اوپر لے جاتے ہیں۔ مگر وہ آسمان دنیا سے ہی پلٹا دیا جاتا ہے۔ اوپر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کو بحیثیت میں لے جایا جاتا ہے جو ساتوں زمینوں کے نیچے جہنم کے طبقات میں سے ایک طبقہ ہے۔ تو گویا اس لحاظ سے راق سے مراد اوپر چڑھنے والے فرشتے ہیں۔ خواہ وہ عذاب کے فرشتے ہوں یا رحمت کے۔

مجرمین کے زندگی کے آخری لمحات

وَضَلَّ اور انسان گمان کرتا ہے۔ یہاں پر ظن معنی یقین ہے یعنی مرنے والے کو یقین ہو جاتا ہے اِنَّهُ الْفِرَاقُ کہ اب جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ وَالْتَفَتَ السَّاقِ بِالسَّاقِ اور پیٹلی پیٹلی کے ساتھ مل جاتی ہے۔ یعنی جب جان نکل جاتی ہے۔ تو پھر اس میں حرکت کی قوت باقی نہیں رہتی۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کفن میں جوڑ دیا جاتا ہے یہ جدائی انسان کے لیے دطرح سے باعث تکلیف ہوتی ہے اولاً یہ کہ جس مال و متاع اور اولاد و اقارب میں وہ مبتلا تھا، انہیں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اور ثانیاً یہ کہ آگے برزخ میں نامعلوم کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔ دنیا میں تو عیش کرتے رہے۔ اب آگے کیا صورت حال ہو گی۔ اس طرح گویا یہ جدائی کا وقت انسان کے لیے دوسری اذیت کا باعث ہوتا ہے۔

اس کے بعد انجام کار یہ ہے کہ اِلَىٰ رَبِّكَ يُوَفِّدُ الْمَسَاقِ۔ اُس دن اپنے رب کی طرف چلنا ہوتا ہے۔ چنانچہ مرنے کے ساتھ ہی انسان کی دوسری زندگی کی پہلی منزل شروع ہو جاتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ آج تم جلد بازی کرتے ہو۔ انکار اور استہزار کرتے ہو مگر آگے یہ سلسلہ پیش آنے والا ہے۔ جس وقت تمہاری جان ہانسی کی ہڈی تک پہنچ جائے گی تو پتہ چل جائے گا کہ کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

(آیت ۳۱ تا ۴۰)

درس سوم

فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّىٰ ۝ (۳۱) وَلَكِنْ كَذَبَ وَتَوَلَّىٰ ۝ (۳۲) ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ
يَتَمَطَّىٰ ۝ (۳۳) أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ ۝ (۳۴) ثُمَّ أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ ۝ (۳۵) اِيْحْسِبْ
الْإِنْسَانَ أَنْ يُتْرَكَ سُدَّتْ ۝ (۳۶) أَلَمْ يَكُنْ نَظْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ تُمْنَىٰ
۝ (۳۷) ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ (۳۸) فَعَلَ مِنْهُ الذَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ
وَالْأُنثَىٰ ۝ (۳۹) أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۝ (۴۰)

۲۶

ترجمہ :- پس نہ تو اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی ۝ (۳۱) بلکہ اس نے تکذیب کی اور
اعراض کیا ۝ (۳۲) پھر اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا گیا ۝ (۳۳) ہلاکت ہے تیرے لیے پھر
ہلاکت ہے ۝ (۳۴) پھر ہلاکت ہے تیرے لیے پھر ہلاکت ہے ۝ (۳۵) کیا انسان گمان کرتا ہے
کہ اسے بیکار چھوڑ دیا جائے گا؟ ۝ (۳۶) کیا انسان ایک قطرہ منی نہیں تھلے رحم کے اندر ٹپکا
دیا جاتا ہے؟ ۝ (۳۷) پھر وہ جما ہوا خون تھا پس خدا نے اس کو پیدا کیا اور ٹھیک کھاک بنایا
۝ (۳۸) پھر بنایا اس سے جوڑا نر اور مادہ ۝ (۳۹) تو کیا وہ خدا اس بات پر قادر نہیں کہ مردوں
کو دوبارہ زندہ کرے ۝ (۴۰)

گزشتہ سے پیوستہ

پہلی آیات میں منکرین قیامت کا رد اور ان کے برے انجام کا ذکر کیا گیا تھا۔ ان آیات
میں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منکرین قیامت کے بارے کچھ دلائل اشارتاً
بیان فرماتے ہیں۔ اور ان کی کوتاہی اور مہٹ دھرجی کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ منکرین قیامت
بڑی دھمائی کے ساتھ کہتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی، اور اس کو بعید سمجھتے ہیں، یہ غفلت میں
پڑے ہوئے ہیں۔ اور اس غفلت کا سبب بالعموم ان کے مال و اسباب ہیں، پہلی سورتوں میں
بھی بیان ہو چکا ہے۔ اور یہاں بھی ذکر ہو چکا ہے ”كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ“
یعنی انکار قیامت کی وجہ یہ ہے کہ تم جلد بازی یعنی دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہو۔
اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔ یہ دنیوی زندگی میں انہماک اور اس کے مال و اسباب کی محبت ہی انسان
کو آخرت سے غافل کرتی ہے۔ اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ موت آجاتی ہے۔ اور

اگلی منزل یکایک سامنے آجاتی ہے۔

صدق کا معنوم

فرمایا فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى افسوس کا مقام ہے کہ منکرین قیامت نے نہ تو تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ صَدَق سے مراد تصدیق کرنا ہے۔ یعنی انہوں نے اُن باتوں پر یقین نہیں کیا، جن پر یقین کرنا ضروری ہے اور ان میں ایک قیامت بھی ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، انبیاء علیہم السلام کی رسالت، ملائکہ، کتب سماویہ یہ تمام شرائع الہیہ ہیں جن کی تصدیق کرنا ضروری ہے اگر یہ شخص تصدیق کرتا تو صحیح اعتقاد اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور جو صحیح اعتقاد لے کر جاتا ہے، آخرت میں فرشتے بھی اس کے حق میں گواہی دیتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام بھی اُن کے سفارشی بنتے ہیں۔ قرآن بھی اُن کا شفیع ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بھی اُن پر مہربانی فرماتے ہیں۔

مگر صورت حال یہ ہے کہ اُس نے تو تصدیق ہی نہیں کی فَلَا صَدَقَ نبی کو سچا ہی نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کی باتوں کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ اساطیر الاولین ہیں۔ یہ اُنے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں ان میں کوئی صداقت نہیں۔ نہ کوئی قیامت ہے نہ کوئی جزائے عمل ہے۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ صَدَق کا معنی صدقہ خیرات کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى کہ نہ اُس نے صدقہ خیرات کیا نہ نماز پڑھی۔ جیسا کہ دوسری آیت میں "فَاَصَّدَقَ" وَاَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ گنہگار کہے گا کہ اے اللہ! مجھے محضوڑی سی مہلت دے دے تاکہ میں صدقہ خیرات کر کے نیکو کاروں میں شامل ہو جاؤں۔ مگر جب موت کا وقت آجاتا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ مؤخر نہیں کرتے۔

صدقہ میں زکوٰۃ بھی شامل ہے۔ جیسا کہ پچھلی سورت میں گذر چکا ہے۔ کہ انسانی ہمدردی جس میں صدقہ خیرات شامل ہے۔ اور معاویہ بنیادی چیزیں ہیں۔ وہاں ذکر آیا تھا کہ جنت والے لوگ دوزخ والوں سے سوال کریں گے "مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ" تمہیں اس جہنم میں کون سی چیز لائی۔ تو وہ کہیں گے۔ "لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصْطَلِينَ" یعنی ہم نمازیں نہیں پڑھتے تھے۔ وَلَمْ نَكُ نَطْعِمُ الْمُسْكِينُ اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ کھانا کھانا نوع انسانی خاص طور پر ہم مذہبوں کے

ساتھ ہمردہ دی کرنا ہے۔ جس میں اول نمبر پر زکوٰۃ ہے۔ تو گویا تعلق باللہ کے لیے نماز ضروری تھی، وہ نہ پڑھی اور بتی نوع انسان کے ساتھ تعلق کے لیے صدقہ خیرات ضروری تھا، وہ بھی نہ کیا، نہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہوا۔ اور نہ لوگوں کے ساتھ رابطہ قائم ہوا۔ کیونکہ مسکین پروری نہ کی۔

صدقہ اور نماز کی اہمیت

اسی لیے فرمایا فَلَا صَدَقَٰتِہٖ اُنْہُ نے صدقہ خیرات کیا وَلَا صَلَی اور نہ نماز پڑھی۔ یہاں
اُنْہُ نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ نماز ایک ایسی چیز ہے جس کے متعلق حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ
والسلام نے فرمایا: اَوَّلُ مَا یُحْكَاسَبُ بِہِ الْعَبْدُ الصَّلٰوۃُ یعنی سب سے پہلی چیز جس کے متعلق
انسان سے پوچھا جائے گا، وہ نماز ہے۔ محاسبے میں پہلا نمبر نماز کا ہے۔ نماز پڑھی ہے یا نہیں
نماز مومن اور کافر کے درمیان علامت فارقہ ہے۔ بَیْنَ الْعَبْدِ وَبَیْنَ الْمَثْرُۃِ وَالْکُفْرِ تَرْلُ
الصَّلٰوۃُ ہمارے اور مشرکین کے درمیان فیصلہ کن چیز نماز ہے۔ جس نے نماز ترک کی، اُنْہُ نے
کفر میں قدم رکھ دیا۔ اگر بالکل انکار کر دیا، تو کافر ہو گیا، ورنہ فاسق تو ہے ہی۔ نماز اور زکوٰۃ دو ایسی
علامتیں ہیں جن کے ذریعے انسان کا ایمان ثابت ہوتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مومنین
کی جماعت کا آدمی ہے۔ سورۃ توبہ میں فرمایا فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَآتَوْا الزَّکٰوۃَ
فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ اگر یہ لوگ کفر و شرک سے توبہ کر لیں، نماز پڑھنے لگ جائیں، زکوٰۃ دینے
لگیں، تو تمہارے بھائی بن گئے۔ جھگڑا ختم ہو گیا۔ تمام حقوق جو تمہیں حاصل ہیں انہیں بھی مل گئے۔ دوسری
آیت میں فرمایا فَخَلَّوْا سَبِیْلَہُمْ پھر چھوڑ دو انہیں۔ ان سے لڑائی نہ کرو۔ گویا نماز اور زکوٰۃ
دو ایسی علامتیں ہیں جن سے مسلمان کی پہچان ہوتی ہے۔ ایمان تو باطنی چیز ہے، جو نظر نہیں آتی۔
مگر ظاہری علامات یہی ہیں۔

نماز کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ توجہ الی اللہ کا ذریعہ ہے جس طرح کوئی بھاگا ہوا غلام اپنے مالک کے سامنے دست بستہ حاضر ہو جائے تو اس کا غصہ کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے غضب کو کم کرنے کے لیے نماز کی حالت میں اس کے حضور دست بستہ حاضر ہو جانا بہت کافی ہے۔

تکذیب اور لعن

الغرض نہ تو اس نے نماز پڑھی اور نہ صدقہ کیا۔ کہ جس کی وجہ سے تعلق باللہ درست ہوتا۔ اور مخلوق خدا کے ساتھ بھی تعلق پیدا ہوتا بلکہ وَلَٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ کیا یہ کہ رسول، قرآن پاک اور قیامت کی تکذیب کی۔ اور نماز پڑھنے کی بجائے منہ پھیر لیا۔ اعراض کر لیا۔ گویا رحمت خداوندی سے مزید دور ہو گیا۔

منکرین کی اکثر

پھر کیا ہوا ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا یا انکڑاٹائی لیتا ہوا گیا۔ مطاط رُڑ کو کہتے ہیں جس کے کھینچنے سے تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے اِذَا مَشَتْ اُمَّتِي الْمُطِطِيَّاءُ جب میری امت کے لوگ اکثر والی چال چلیں گے۔ اہنائے فارس اور اہنائے روم ملوک اُن کی خدمت کرنے لگیں گے۔ اس وقت میری امت پر مصیبت اتر آئے گی یہ اکثر والی چال اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو تو عاجزی پسند ہے۔ اسی لیے اپنے بندوں کی تعریف میں فرمایا وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا۔ یعنی رحمن کے بندے وہ ہیں۔ جو زمین پر وقار اور آہستگی سے چلتے ہیں۔ اکثر والی چال نہیں چلتے۔ اگر اکثر والی چال چلو گے تو اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طَوْلًا۔ تمہارا سر آسمان سے نہیں ٹکرا جائے گا۔ بلکہ وہی پانچ چھوٹ کے انسان رہو گے۔ نہ زمین بھٹ جائے گی اور نہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ جاؤ گے۔

فرمایا۔ پھر وہ اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا گیا۔ جیسا کہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے کر آیا ہے۔ اُسے تو شرم اور مذمت ہونی چاہیے تھی کہ اس نے اللہ کے نبیوں کو جھٹلایا۔ نماز پڑھتے اور اپنے مالک کے حضور حاضر ہونے کی بجائے اس نے الٹی اکڑ دکھائی۔ اور منہ موڑ کر سرکشی اور بدبختی پر اترتا ہوا اپنے متعلقین کی طرف لوٹا۔

منکرین کی ہلاکت

ارشاد ہوتا ہے اَوَّلٰی لَكَ هَلٰكٌ تِیرے لیے فَاوَلٰی پھر ہلاکت ہے۔ ثُمَّ اَوَّلٰی لَكَ فَاوَلٰی پھر ہلاکت ہے، پھر ہلاکت ہے، چار مرتبہ ذکر کیا۔ لفظ اَوَّلٰی اگر ولی سے ہو، تو اس کا معنی ہے قریب ہونا۔ ساتھ لگنا تو اس کا پورا مطلب یہ ہوا اَوَّلٰی الْهَلٰكِ یعنی ہلاکت تیرے قریب ہو اور اگر اَوَّلٰی کا مادہ ذیل سے ہے تو اس کا معنی تباہی اور بربادی ہو گا۔ گویا چار مرتبہ فرمایا تیرے لیے تباہی اور بربادی ہے۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ لفظ ہلاکت کا چار مرتبہ دہرانا، انسان کی چار کوتاہیوں کی وجہ سے ہے۔ کہ اولاً اس نے تصدیق نہ کی یا صدقہ خیرات نہ کیا۔ ثانیاً اُس نے

نماز نہ پڑھی، ثالثاً اس نے تکذیب کی اور رابعاً یہ کہ اُس نے اعراض کیا۔ اسی طرح اگر اولیٰ کا مادہ
 ”اَوَّلُ“ سے ہو تو اس کا معنی ”انجام“ ہے۔ تو اس لحاظ سے بھی مطلب یہ ہوگا کہ تیسرا انجام تباہی و بربادی ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے وقوع قیامت کے متعلق دو دلائل بھی اشارۃً بیان فرمائے۔ ارشاد
 ہوتا ہے۔ اَيَحْسِبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى کیا انسان گمان کرتا ہے۔ کہ اُسے بیکار چھوڑ
 قیامت کے روز لازماً
 باز پرس ہوگی

دیا جائے گا سُدًى کا معنی اھمل اور بیکار ہے۔ مقصد یہ کہ کیا انسان پر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی جائے گی
 اُس سے کوئی پائیس نہیں ہوگی۔ اگر اُس کا خیال ایسا ہی ہے۔ تو یہ باطل خیال ہے۔ انسان کی فطرت،

سرشت یا مزاج میں ملکیت اور سہمیّت کی کشمکش پائی جاتی ہے۔ اور اس کا تقاضا ہے کہ انسان
 مکلف ہو۔ اور جو مکلف ہوگا اس کے ساتھ جزائے عمل کا ہونا لازمی ہے۔ تو مقصد یہ ہوا کہ انسان

کو اھمل نہیں چھوڑا جائے گا۔ اسے قانون کا پابند بنایا جائے گا۔ اس پابندی کے بغیر انسان ترقی کی طرف
 قدم نہیں اٹھا سکتا۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ آیا ہے۔ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ“

یا یوں ارشاد ہے لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ یعنی فلاں کام کرو۔ فلاں سے رک جاؤ۔
 اگر قانون کی پابندی نہیں کرو گے تو حظیرۃ القدس یعنی پاک مقام کی طرف تمہارا قدم نہیں اٹھے گا۔

اور تم کامیابی کی منزل سے ہم کنار نہیں ہو سکو گے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں عقل و شعور، قویٰ
 ظاہر و باطنہ اور دیگر تمام اسباب سے کر قانون کا پابند بنایا ہے۔ یہی پابندی انسان کے لیے ترقی

کا ذریعہ ہے۔ اگر انسان پابندی نہیں کرے گا۔ تو تنزل کا شکار ہو جائے گا۔ ہلاکت کے گڑھے میں
 گر جائے گا۔ جہنم میں پہنچ جائے گا۔ لہذا انسان کو اھمل نہیں بلکہ مکلف بنایا گیا ہے۔ اور اس

کا محاسبہ ہوگا۔

وقوع قیامت کی دوسری دلیل اللہ تعالیٰ نے انسان کے مادۂ تخلیق کو بنایا ہے انسان
 سمجھتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کی ہڈیوں اور اعضا کو دوبارہ جمع نہیں کریں گے مگر اس نے اعلان

فرمادیا کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ انسان کے پورے پورے کو برابر کر دیں۔ اس مرحلہ پر انسان کی توجہ اُس
 کی تخلیق کی طرف دلائی گئی۔ فرمایا اَلَمْ يَكُ نَظْفَةً۔ کیا انسان ایک قطرہ آب نہیں تھا۔ نطفہ

شفاف پانی کو کہتے ہیں، جس میں ملاوٹ نہ ہو۔ انسان کے نطفے میں بھی ملاوٹ نہیں ہوتی۔
 اس لحاظ سے یہ خالص ہوتا ہے۔ فرمایا اَلَمْ يَكُ نَظْفَةً مِّن مَّيِّیِّ تَمَّیِّیِّ کیا یہ مٹی کی ایک لونڈ

انسانی کی تخلیق حقیر
 قطرہ آب سے

نہیں تھی جسے رحم کے اندر پکا دیا جاتا ہے۔ یعنی انسان ایک حقیر فضلے کی پیدائش نہیں ہے۔ جیسا کہ۔
 اگلی سورۃ میں آئے گا "وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ" کیا تم کو ہم نے ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں
 کیا ایسا ناپاک پانی کہ کپڑے کو لگ جائے تو وہ بھی ناپاک ہو جائے۔ نگاہ پڑے تو آدمی نفرت کرے۔
 اطباء کہتے ہیں کہ مادہ منویہ مضم کا چوتھے درجے کا فضلہ ہے۔ جب کوئی آدمی غذا کھاتا ہے۔
 تو پہلے معدے میں وہ کیلوس بنتا ہے۔ پھر آنتوں میں پہنچ کر کمیوس بنتا ہے۔ وہاں سے چل کر جب
 جگر میں پہنچتا ہے تو خون بنتا ہے۔ جب ہر ہر عضو میں خون کی تقسیم ہوتی ہے۔ تو اس عضو کا مطلوبہ
 مادہ بنتا ہے۔ چنانچہ خون جب اعضائے تناسل میں پہنچتا ہے تو مادہ منویہ بنتا ہے۔ یہ فضلہ کا چوتھا
 درجہ ہے۔ یہ ایسا عجیب و غریب مادہ ہے کہ سفید ہے مگر دودھ جیسا نہیں۔ کیونکہ دودھ ایک
 پاکیزہ چیز ہے اور نشوونما میں کام آتی ہے۔ یہ پھل سے مثلاً بھی نہیں کہ پھل درخت کا خلاصہ اور پھوٹ
 ہوتا ہے۔ اور اگر اسے درخت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ تو زندگی سے بعید ہو جاتا ہے۔ جیسے اگر مٹنی درخت
 سے کاٹ دی جائے تو وہ بے جان ہو کر سوکھ جاتی ہے۔ مگر اس مادہ منویہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ
 خاصیت رکھی ہے کہ اپنے اصل سے کٹ کر بھی انسان جیسی اشرف المخلوقات چیز کی پیدائش کسب بنتا ہے
 قطرہ آب ٹپکائے جانے کے بعد کیا ہوا۔ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً پھر وہ لہو کے ایک ٹکڑے میں تبدیل
 ہوا۔ چالیس دن تک یہ قطرہ آب اسی حالت میں رہتا ہے۔ اس کے بعد تبدیلی شروع ہوتی ہے
 اللہ تعالیٰ اس کو خون کی شکل میں تبدیل کرتے ہیں۔ مزید چالیس دن کے بعد اسے گوشت میں
 تبدیل کیا جاتا ہے۔ اگلے چلے میں اس میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور الثانی ڈھانچہ بچھا جاتا ہے۔
 اس طرح جب چار چلے پورے ہو جاتے ہیں۔ تو ادھر سے روح آسمانی آ جاتی ہے۔ جو روح حیوانی
 سے مل کر پورا انسان بنتا ہے۔ اسی لیے فرمایا ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً وہ جما ہوا خون تھا۔ فخلق پس
 غذائے اس کو پیدا کیا فسوی اور ٹھیک ٹھاک بنایا۔ اس کے تمام ظاہری و باطنی اعضاء کمال درجے
 کے بنائے۔ پھر اس حقیر قطرہ آب سے پیدائش ہوئے انسان سے اللہ تعالیٰ نے نہ اور مادہ کا جوڑا
 بنا دیا فجعل منہ الزوجین الذکر والانثی۔

انسانی نشوونما کے
مختلف مدارج

یہ جنسی تفریق کس طرح ہوتی ہے۔ بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر بھی حیران ہیں۔ کہ یہ کیسے ہو جاتا
 ہے۔ وہ اس کی توجہ بیان نہیں کر سکتے۔ مگر یہ اللہ تعالیٰ کی کمال حکمت ہے کہ ایک مرحلہ

ایسا آتا ہے۔ جب بچے کو نر یا مادہ بنا دیا جاتا ہے۔ فرمایا وہ ذات خداوندی جس نے انسان کو قطرہ
آب سے تیار کیا اور پٹیاں مے کر پیدا کیا۔ اَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَدِيرٍ عَلٰی اَنْ يَّخْلُقَ الْمَوْتٰی کو کیا
وہ خدا اس بات پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کرے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش
کو دلیل کے طور پر پیش فرمایا کہ جو خداوند کریم ایک حقیر قطرہ آب سے انسان جیسی عظیم مخلوق پیدا کر
سکتا ہے۔ اُس کے لیے یہ کون سی بعید بات ہے کہ وہ مرنے کے بعد انسان کو پھر وہی شکل و صورت
مے دے۔ اللہ تعالیٰ پر نہ پہلی تخلیق دشوار تھی، نہ قیامت کو دوبارہ جلا اٹھانا بعید ہوگا۔

مقام غرور و فکر

ان دلائل سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی ابتدائی تخلیق پر غور کرنا چاہیے۔ ایسا
کرے گا تو اسے ایک طرف خدا تعالیٰ کی وحدانیت سمجھ میں آئے گی۔ اور دوسری طرف قیامت کے
وجود کا انکار نہیں کر سکے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ تلاوت قرآن پاک کے وقت جب انسان
اس مقام پر پہنچیں، تو کہیں سُبْحَانَكَ فَبَلٰی یعنی اے پروردگار! تو پاک ہے۔ ایسا کیوں نہیں
ہو سکتا۔ بے شک تو اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کرے۔ صرف بلی کہہ دینا
بھی کافی ہے۔ سورۃ قیامت کی یہ آخری آیت خواہ نماز کے دوران پڑھی جائے یا بغیر نماز کے سُبْحَانَكَ
فَبَلٰی کہنا چاہیے۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ اگر نماز کے دوران کہے تو آہستہ سے کہے، زور سے
سے کہنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ سورۃ ملک کے آخر میں اَللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کہے۔ اور
جیسا کہ اگلی سورۃ آرہی ہے۔ اس میں بھی جب یہ آیت پڑھی جائے فَبَلٰی حَدِیْثٌ بَعْدَہٗ
یَقُضٰی لَوْ کُنَّا حَاضِرِیْنَ۔ اَمَّا بِاللّٰہِ۔



الدَّهْرُ ۷۱
(آیت ۱ تا ۶)

تَبْرُکَ الَّذِی ۲۹
حُورِ اَوَّل ۱

سُورَةُ الدَّهْرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اَحَدُ ثَلَاثُوْنَ اَيْتٍ وَفِيهَا رُكُوعَانِ
سورة دھر مکی ہے اور یہ اکتیس آیات اور اس میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

هَلْ اَتَى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنَ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ①
اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِیْعًا
بَصِیْرًا ② اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا ۖ وَاِمَّا كَفُوْرًا ③
اِنَّا عْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ سَلَیْلًا ۖ وَاَعْلًا ۖ وَسَعِیْرًا ④ اِنَّ الْاَوْبَرَ
یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاسٍ ۖ كَانَ مِنْ اَمْزَجِهَا كَافُوْرًا ⑤ عِیْنًا یَّشْرَبُ
بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَ وَتُهَا تُفَجِّرُ ⑥

ترجمہ : تحقیق آیا ہے انسان پر ایک وقت نہ جانے میں سے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ
تھا ① بیشک ہم نے انسان کو ایک لمبے لمبے قطرہ آب سے پیدا کیا تاکہ ہم اس کو آزمائیں
پس ہم نے اسے سننے والا دیکھنے والا بنایا ② بیشک ہم نے اسے (ٹھیک) راستے
کی طرف راہنمائی کی، یا وہ شکر گزار ہو گا یا ناشکر گزار ③ بے شک ہم نے تیار کر رکھی ہیں
کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ ④ بے شک ابھاریں گے اے
پیالے سے جس میں کافور کی ملاوٹ ہوگی ⑤ یہ ایک چشمہ ہے اس سے اللہ کے (خاص)
بندے پئیں گے اللہ کے وہ بندے (اپنی مرضی سے جہاں چاہیں گے) اس چشمہ کو چلائیے ⑥

اس سورۃ کا نام سورۃ الدھر ہے۔ دھر زمانے کو کہتے ہیں، اس کی پہلی آیت میں زمانے
کا ذکر ہے۔ اسی سے اس سورۃ کا نام سورۃ الدھر ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس صورت

وجہ تسمیہ

کے متعذر نام ہیں۔ دہر کے علاوہ سورۃ ہکل اُتی جو کہ اس سورۃ کے پہلے لفظ سے موسوم ہے اس کا نام سورۃ امشاج بھی آتا ہے۔ جو کہ دوسری آیت میں مذکور ہے، اسے سورۃ انسان بھی کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کی تخلیق کا ذکر ہے۔

اس سورۃ کے مکی یا مدنی ہونے کے متعلق مفسرین کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ مدنی زندگی میں نازل ہوئی۔ بعض دوسرے فرماتے ہیں کہ یہ مکی سورۃ ہے، ہجرت مدینہ سے پہلے نازل ہوئی۔ بعض کہتے ہیں کہ پہلا رکوع مکی زندگی میں نازل ہوا، اور دوسرا مدنی زندگی میں۔ تاہم اکثر مفسرین کے مطابق یہ سورۃ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ اس کی اکتیس آیات دو رکوع، دو سو چالیس الفاظ ہیں اور یہ ایک ہزار پچانوے حروف پر مشتمل ہے۔

موضوع اور پہلی سورۃ کے ساتھ ربط

اس سورۃ مبارکہ کا موضوع پہلی سورۃ قیامت کے ساتھ ملتا ہے۔ پہلی سورۃ میں بھی قیامت کا ذکر ہے۔ تو اس سورۃ کا بھی زیادہ تر حصہ قیامت سے متعلق ہے۔ البتہ پہلی سورۃ میں جو بات اجمال کے ساتھ بیان ہوئی، اس سورۃ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ اس سورۃ میں قیامت کے ذکر کے ساتھ دو گروہوں یعنی شکر گزار اور ناشکر گزار کے انجام سے متعلق تفصیل بیان کی گئی ہے۔ لہذا اس اعتبار سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سورۃ کا موضوع (SUBJECT) ابرار اور اشرار کا انجام ہے۔

پہلی سورۃ میں ابتدائے قیامت کا حال تفصیل سے بیان کیا گیا تھا اس سورۃ میں تھا
فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ یعنی جب قیامت کا وقوع عمل میں آئے گا، تو آنکھیں
چندھیا جائیں گی اور چاند بے نور ہو جائے گا۔ سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے، ایک
عظیم ہنگامہ ہوگا اور پھر یَقُولُ الْإِنْسَانُ أَيْنَ الْمَفْعَدُ انسان کے گا کہ بھاگے سرکے کدے
ہے۔ یہ گویا ابتدائے قیامت کا حال تھا۔ اس سورۃ میں وقوع قیامت کے آخر میں اشرار اور
ابرار کا حوالہ انجام ہوگا، اس کی تفصیل ہے۔ اشرار اپنے مرکز یعنی جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ اور
ابرار اپنے مقام جنت میں پہنچیں گے، جو رحمت کا مقام ہے۔ وہاں پر ان کو حاصل ہونے

والے انعام و اکرام کا ذکر ہے۔

پہلی سورۃ میں بھی انسان کی تخلیق کا ذکر تھا کہ دیکھو! انسان کو اللہ تعالیٰ نے قطرۂ آب سے پیدا کیا۔ نہ اور مادہ بنائے۔ اس کے باوجود اَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اُسے مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔ اُس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ اور دنیا میں اُس کو مکلف نہیں بنایا جائے گا۔ آخرت میں اس سے کوئی سوال و جواب نہیں ہوگا۔ انسان کا یہ گمان غلط ہے۔ یہاں بھی انسان کی تخلیق کے ذکر کے بعد فرمایا بُتَكِيْدُ ہم اُن کو آزمائش میں ڈالتے ہیں وہاں تھا مہمل نہیں چھوڑا جائے گا، اور یہاں ہے کہ آزمائش میں ڈالا جائے گا۔ پہلی سورۃ میں ابرار کے متعلق تھا وَجُوْهُ يُّوْمَئِذٍ نَّاضِيَةٌ اُس دن بعض چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اور یہاں پر ہے۔ وَلَقَدْ هُمُ نَضِيَّةٌ وَسُوءًا يَعْنِي ہم انہیں تروتازگی اور سرور عطا کریں۔

پہلی سورۃ میں فضائل قرآن پاک کے متعلق تھا اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْاٰنَهُ یعنی قرآن پاک کا جمع اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ اور اس سورۃ کے آخر میں بھی ہے اِنَّا نَخْتُمُ نَزْلَنَا عَلَيْكَ الْفُتُوٰنَ تَنْزِيْلًا یعنی قرآن پاک ہم نے ہی آپ پر نازل کیا۔ الغرض ان دونوں سورتوں میں مذکورہ مضامین میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ تاہم زیادہ تر ذکر قیامت کا ہی ہے اس سورۃ کی فضیلت کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ جمعہ کے دن حضور علیہ السلام سورۃ دھیر اور سورۃ سجدہ فجر کی نماز میں تلاوت فرماتے تھے۔ اس ضمن میں سورۃ ص کا ذکر بھی آتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں جو شخص ان سورتوں کو جمعہ کے روز صبح کی نماز میں پڑھے گا۔ تو اُس کو زیادہ اجر ملے گا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام اس سورۃ مبارکہ کی تلاوت فرماتے تھے۔ اور بھی کئی حضرات پاس بیٹھتے تھے۔ ان میں سے ایک نباء رنگ کا آدمی تھا۔ جب نبی علیہ السلام نے اس سورۃ میں واقع جنت کا حال تلاوت فرمایا تو اُس سیاہ رنگ کے حبشی نے زور سے ایک ہچکلی لی اور اُس کا دم نکل

فضیلت سورۃ

گیا حضور علیہ السلام نے فرمایا اَخْرِجْ نَفْسَ صَاحِبِكُمُ الشَّوْقُ إِلَى الْجَنَّةِ یعنی تمہارے بھائی کی جان جنت کے شوق میں نکل گئی۔ حدیث کے ایک راوی صالح المرئی قاضی ہیں جب وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ تو اس میں اس قدر جذب ہوتا تھا۔ کہ انسانوں پر دہشت طاری ہو جاتی تھی۔ (یہاں تک کہ بعض آدمی ہلاک ہو جاتے)

الغرض سورۃ دہر سورۃ النان سورۃ ہل آئی اور سورۃ امشاج سب اسی سورۃ کے اسمائے مبارکہ ہیں۔

انسان کی حیثیت

سورۃ کی ابتداء لفظ ہل سے ہوئی ہے یہ ہل استفہام کے لیے بھی آتا ہے۔ اور تحقیق کے لیے بھی۔ ہل آئی یعنی قَدْ آتَى تَحْقِيقَ آيَاہِ عَلٰی الْاِنْسَانِ انسان پر حینِ الدَّہْرِ ایک وقت زمانے میں سے لے کر یَکُنْ شَيْئًا مَّذْکُورًا کہ انسان کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ انسان سے مراد خاص انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام بھی لیا جاسکتا ہے کہ آپ تمام بنی نوع انسان کے جد امجد ہیں۔ اور انسان سے مراد عام انسان بھی ہیں۔ کہ یقیناً ہر انسان پر ایک ایسا دور آیا ہے جب یہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ کیونکہ موجودہ نسل انسانی تو بعد میں شروع ہونے والا سلسلہ ہے اس سے پہلے انسان کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ نہ ان کے خاندان تھے، نہ ان کے سلسلے تھے اور نہ یہ مکانات تھے۔ اگر کچھ ہوتا تو باقی مخلوق کے ذہن میں ان کا کچھ وجود ہوتا، وہ بھی جانتے۔ مگر یہ انسان کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ بلکہ معدوم تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں تخلیق انسان کا ہی ذکر فرمایا ہے پھر انسان کو مکلف بنانے کا ذکر ہے۔ کہ اسے قوانین و شرائع کا پابند بنایا۔

اس کے بعد فرمایا اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ہم نے انسان کو پانی کی ایک ایسی بوند سے پیدا کیا جو ملا جلا ہوتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ امشاج، منسج کی جمع ہے جس کا معنی خلط ملط ہونا ہے۔ نطفہ شفاف پانی کو کہتے ہیں۔ چونکہ انسان کی تخلیق میں مرد اور عورت کا پانی ملا جلا ہوتا ہے۔ اس لیے اسے نُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ فرمایا۔ کہ اس سے انسان کو پیدا کیا۔

امام زمخشری فرماتے ہیں کہ امشاج کا لفظ مفرد ہے۔ اس کی کوئی جمع نہیں ہوتی۔ جیسے

لفظ قوم مفرد ہے مگر جمع کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظ امتناع بھی مفرد ہونے کے باوجود جمع کے معنوں میں مستعمل ہے۔ گویا امتناع کا ایک معنی تو یہ ہوا کہ اس میں مرد اور عورت کا مادہ تولید ملا ہوا ہوتا ہے۔ اور دوسرا معنی یہ کہ اس پانی میں وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جو انسانی جسم میں موجود ہوتے ہیں۔

انسانی جسم
کے عناصر

یونانی فلسفیوں کے ایک گروہ کا خیال تھا کہ انسان چار عناصر آگ، پانی، ہوا اور مٹی سے مرکب ہے۔ بعض نے پانچ اور بعض نے سات عناصر بتائے۔ تاہم چار عناصر زیادہ مشہور ہوئے۔ موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ سائنس دانوں کا تجزیہ یہ ہے کہ انسانی جسم کے عناصر چار یا سات نہیں بلکہ بہت زیادہ ہیں۔ اب تک ایک سو دس سے زیادہ عناصر تجربہ گاہوں میں دریافت ہو چکے ہیں۔ عنصر ایک بسیط چیز ہے۔ خارجی دنیا کے تمام عناصر جن میں آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، گولڈ، سلور، سیلیکا، دریت) وغیرہ انسانی جسم میں پائی جاتی ہیں۔ انسان کی تخلیق باقی تمام مخلوق سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ جنت کی تخلیق میں صرف دو عناصر آگ اور ہوا شامل ہیں جبکہ ملائکہ کے وجود میں صرف ایک عنصر ہے۔ اسی طرح کسی مخلوق میں تین عناصر پائے جاتے ہیں۔ مگر انسان ایک واحد مخلوق ہے جس کے جسم میں تمام خارجی عناصر پائے جاتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام سطح ارض کی مٹی اکٹھی کر کے اس سے آدم علیہ السلام کا خمیر بنایا۔ چونکہ مختلف جگہ کی مٹی مختلف ہے کہیں ریت والی ہے، کہیں چکنی ہے، کہیں کھردری، کہیں سیاہ ہے، کہیں سرخ ہے۔ اسی لیے نسل انسانی کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ بعض لوگ سخت مزاج ہیں، بعض نرم اخلاق والے ہیں۔ بعض گورے ہیں۔ بعض کالے ہیں۔ غرض تخلیق انسانی میں ان تمام عناصر کا اثر موجود ہے۔ جو اس میں شریک ہیں۔ اسی طرح مختلف لوگوں کی صفات، ان کی صلاحیتیں اور قوتیں وغیرہ بھی مختلف ہیں۔ یہ سب مختلف عناصر کی وجہ سے ہے۔

مقصد تخلیق انسانی

جیسا کہ بیان ہوا، انسان کی تخلیق کا مقصد نبی کی یعنی اس کو آزمانا ہے۔ اُسے امتحان

میں ڈالنا ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم انسان کو خیر و شر کے ذریعے آزماتے ہیں۔ انسان کی پیدائش کا تقاضا ہے۔ کہ اسے امتحان میں ڈالا جائے۔ تاکہ وہ اپنی زندگی کے اچھے یا بُرے اعمال کی جزایا سزا حاصل کر سکے۔ آگے فرمایا **فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا** کہ ہم نے انسان کو سننے اور دیکھنے والا بنایا یعنی اس کو قوائے سماعت و بصارت سے نوازا، فہم و بصیرت عطا کی تاکہ وہ اس بات پر غور کرے کہ انسان کی پیدائش کس حقیقت پر ہے۔ دوسری جگہ فرمایا **لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ** یعنی ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا۔ ایسی امتیازی اور حسین صورت جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی اور پھر اسے سمیع اور بصیر بتایا۔ اسی لیے فرمایا کہ ایسی حسین و جمیل شکل و صورت اور عقل و شعور جیسی صفات سے موصوف انسان کو یونہی چھوڑ دیا جائے گا، **أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى**۔ نہیں بلکہ ہم اپنی عطا کردہ نعمتوں کا حساب لیں گے۔ اور اسے آزمائش میں ڈالیں گے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ **تَبْتَلِيهِ** سے مراد آزمائش نہیں بلکہ پلٹیاں دینا ہے شاہ عبدالقادرؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ ہم نے بے جلع قطرہ آب کو پلٹیاں دے دے کر اس سے سمیع و بصیر ہستی کو پیدا کیا۔ کہ انسانی جسم میں روح الہی پھونکنے جانے تک کے عرصہ میں انسان چالیس مراحل سے گزرتا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ اسے عظیم انسانی ہستی میں ظاہر کرنا ہے۔ یہ تو اس کا مادی پہلو ہے۔ جہاں تک روحانی پہلو کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہمہ صفت موصوف بنایا۔ اس میں وہ تمام صفات و کمالات رکھ دیے جو انسان کے لیے باعث فخر اور اس کی نجات کا ذریعہ ہیں۔ اگر وہ ان اوصاف حمیدہ سے فائدہ اٹھا کر اس جسم کو انسانیت کے کمال تک پہنچاتا ہے۔ تو یقیناً انسان کہلانے کا حقدار ہے۔ اور اگر وہ ان اخلاق حسنہ سے اعراض کر کے اخلاق رذیلہ کو اختیار کرتا ہے۔ تو پھر یقیناً وہ خسارے میں ہے۔

بعض احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت حضرت عمرؓ کے سامنے پڑھی گئی تو وہ یکن **شَيْئًا مَّذْكُودًا** یعنی انسان کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا تو آپ فرمانے لگے **كَيْتَهَا تَمَّتْ كَاش**

کہ یہی صورت حال رہتی یعنی ہم عدم سے وجود میں نہ ہی آتے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں سے عمدہ برآمد نہ ہو سکیں۔ اس لیے کہ ”يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا“ والی حالت میں ہی ہوتے تو اچھا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ ایک لکڑی کا ٹکڑا یا ایک تنکالے کو فرمایا کاش کہ میں یہ تنکا ہوتا یا گھاس کا ایک ادنیٰ پتہ ہوتا تاکہ آزمائش سے بچ جاتا۔ بحیثیت انسان شاید ہم اپنے فرائض کو ادا نہ کر سکیں۔ اگر مقصد تخلیق کو پورا نہ کر سکے تو سخت مشکل میں پڑ جائیں گے۔ میر تقی میر نے بھی کہا ہے۔

خوشا حال اُس کا جو معدوم ہے

کہ احوال اپنا تو معلوم ہے

الغرض! رب العزت نے فرمایا کہ ہم نے انسان کو طے جلے قطرہ آب سے پٹیاں دے دیں کہ پیدا کیا اور پھر اسے سمیع و بصیر بنایا تاکہ ہم اس کی آزمائش کریں۔ اس پر قانون کی پابندی لازم قرار دی تاکہ اس کے نتائج اس کے سامنے آئیں۔

تخلیق انسانی کے مختلف مدارج بیان فرمائے۔ اور اُسے سمیع و بصیر کے بلند مرتبے تک پہنچانے کے بعد فرمایا اِنَّا هَدَيْنَا السَّبِيلَ ہم نے اُسے (ٹھیک) —————

انسان کے لیے
ہدایت کی فرمائی

راستے کی طرف ہدایت دی یا اُسے راستہ سمجھا دیا۔ لہذا اب انسان کا کام یہ ہے کہ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُورًا۔ چاہے تو وہ شکر گزار بن جائے، چاہے تو ناشکر گزار ہو جائے۔ دوسرے الفاظ میں خواہ ابرار کی صف میں شامل ہو جائے یا اشرار کی صف میں۔ راستہ ہم نے بتا دیا ہے۔ اگر صحیح راستے پر چلے گا تو شکر گزار بن کر ابرار میں داخل ہو جائے گا۔ اگر اس راستے سے روگردانی کرے گا۔ تو ناشکر گزاروں میں شامل ہو گا۔ دوسری جگہ فرمایا ”وَهَدَيْنَا السَّبِيلَ“ ہم نے انسان کو خیر و شر کی دو گھاٹیاں یا دو راستے سمجھا دیے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک دفعہ حضرت کعب بن عجرہ سے فرمایا کہ اے کعب اللہ تعالیٰ تمہیں بے وقوفوں یعنی سفہاء کی حکومت سے بچائے۔ انہوں نے عرض کیا۔ حضور! سفہاء کی حکومت سے کیا مراد ہے۔ فرمایا۔ میرے بعد ایسے لوگ آئیں گے، جو

میری ہدایت کو اختیار نہیں کریں گے۔ اور میری سنت کو نہیں پکڑیں گے۔ ظلم و زیادتی کریں گے۔
 فرمایا۔ جس شخص نے ایسے لوگوں کے ظلم پر ان کی اعانت کی، ان کے جھوٹ کو سچ سمجھا، وہ مجھ سے
 نہیں ہے۔ اور میرے حوض پر نہیں آئے گا۔ اور جس نے ان کی تصدیق نہ کی، اعانت نہ کی، وہ
 مجھ سے ہے۔ اور میرے حوض پر آئے گا۔ پھر فرمایا اے کعب! یاد رکھو الصَّوْمُ جُنَّةٌ رَوْزَہِ ایک
 ڈھال ہے۔ یعنی دنیا میں گناہوں کے سامنے ڈھال کی مانند ہے جس کی وجہ سے انسان گناہوں
 سے بچ جاتا ہے۔ اور صدقہ غلٹیوں کو مٹاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ج طرح

پانی آگ کو بجھاتا ہے۔ پھر فرمایا وَالصَّلَاةُ قُرْبَانٌ ایک روایت میں قربان کا لفظ آتا ہے۔ اور
 دوسری میں قربان آتا ہے۔ یعنی نماز مومن کے ایمان دار ہونے کی دلیل ہے۔ یا بزرگ اور آخرت
 میں کامیابی کی دلیل ہے۔ قُرْبَانٌ سے مراد تقرب الہی کا ذریعہ ہے۔ یعنی اس کی بدولت انسان
 اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ پھر فرمایا۔ اے کعب! یاد رکھو کُلُّ لَحْمٍ وَدَمٍ نَبْتًا مِنْ
 سُحْتٍ فَالْتَّارُ اَوْ لَیْہِ۔ جو جسم مال حرام سے پتا ہے، دوزخ کی آگ اس کے ساتھ زیادہ حقدار
 ہے مقصد یہ کہ مال حرام سے پرورش پانے والا جسم دوزخ میں جانے کا زیادہ مستحق ہے۔ پھر فرمایا
 اے کعب! یاد رکھو ہر انسان صبح کرتا ہے۔ اور اپنے نفس کو بیچتا ہے۔ اور بیچنے کا معنی یہ ہے کہ
 اگر اس نے ایمان اور نیکی کو خریدنا تو فلاح میں چلا گیا۔ اور اگر اس نے بُرائی، کفر، شرک اور غلطیوں کو
 خریدا تو وہ ناکامی کی طرف چلا گیا اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُورًا کا یہ مطلب ہے۔

ایک دوسری روایت میں یوں آتا ہے کہ حضور نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا ہر آدمی جو
 روزمرہ اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ وہ دو جھنڈوں میں سے کسی ایک کے نیچے ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے
 آپ کو اللہ تعالیٰ کی مرغیات اور پسندیدہ کاموں میں لگاتا ہے۔ تو دروازے سے نکلنے کے بعد
 ایک فرشتہ جھنڈا لیے کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ کے فرشتے
 کے جھنڈے میں چلا جاتا ہے اور اگر وہ شخص اپنے آپ کو خدا کی نامرغیات اور ناپسندیدہ کاموں
 میں لگاتا ہے۔ تو شیطان بھی جھنڈا لیے دروازے میں کھڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ شیطان کے جھنڈے

کے نیچے چلا جاتا ہے۔ غرض ہر انسان یا تو شکر گزار ہو گا یا ناشکر گزار۔

اشرار کا انجام

اب آگے انجام کا ذکر ہے۔ جو پہلی سورۃ کا موضوع ہے۔ فرمایا۔ یاد رکھو! اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَكِينًا۔ بے شک ہم نے تیار کر رکھا ہے۔ سلاسل یعنی زنجیروں جن کی تفصیل پچھلی سورۃ میں آچکی ہے ستر ستر گز لمبی زنجیریں ہوں گی۔ بڑی بڑی آہنی زنجیریں جن کے ساتھ جکڑ کر جہنم میں گھسیٹ جائے گا۔ نیز فرمایا فَاَعْلَازٌ اور گلے میں طوق ہوں گے جب کہ ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ اور اُدْخِرُوا سَعِيدًا بھڑکتی ہوئی آگ ہوگی جس میں انہیں ڈالا جائے گا۔ یہ ہے اشرار کا انجام۔ جو کہ اجمال کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ابراہیم کی عبادت

اب ابراہیم کا ذکر تفصیل سے ہوتا ہے۔ فرمایا اِنَّ اِلٰهَکَ اِبْرٰہِیْمٌ اِلٰہٌ یُّنٰبِتُ اِلَیْہِ شَکَیْمٌ وہ ہو گا جو اچھے کاموں کے ساتھ موسوم ہو گا۔ جس میں توحید اور ایمان ہو گا اور جس کا عقیدہ درست ہو گا۔ اعمال صالحہ انجام دیتا ہو اور مرضیات الہی پر چلنے والا ہو۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں۔ ابراہیمؑ لوگوں کو کہا جاتا ہے، جو اپنے نفس کے حقوق، مخلوق کے حقوق اور اپنے خالق کے حقوق ادا کرتے ہوں۔ فرمایا اِنَّ اِلٰهَکَ اِبْرٰہِیْمٌ اِلٰہٌ یُّنٰبِتُ اِلَیْہِ شَکَیْمٌ ابراہیمؑ کے لیے پیالے سے کانا مِزَاجُہَا کَا فُوْءٌ جس میں کافور کی ملاوٹ ہوگی۔ جو لوگ دنیا میں رنج و الم برداشت کرتے رہے، تکلیفیں جھیلے رہے، خدا کی توحید، اس کی محبت اور ایمان کو سینوں سے لگاتے رکھا، آخرت میں ان کا یہ انجام ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ان کو شراب طہور کے جام پلائیں گے۔ اس دنیا میں بھی جو لوگ شراب پیتے ہیں، اس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے یخیں شفاف پانی یا خوشبو وغیرہ ملا کر لے کر شراب ریختی بنتے ہیں۔ مگر آخرت کی شراب تو پاک ہوگی۔ اس میں سرور پیدا کرنے کے لیے کافور ملا یا جلتے گا یہ دنیا والا ٹھنڈا کافور نہیں بلکہ کوئی اعلیٰ درجے کا کافور ہو گا۔ یہاں صرف اس کی مثال بیان کی گئی ہے۔

آگے کافور کی تفصیل بتائی کہ یہ کیا ہے۔ فرمایا۔ عِیْنُہٗ اِیْکَ حِشْمَہٗ یَشْرَبُ بِہَا عِبَادُ اللّٰہِ اس سے اللہ کے بندے پئیں گے۔ وہ بہت ہی اعلیٰ مرتبہ والا ہو گا۔ اور اعلیٰ درجے کا سرور والا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اسی کافور کے چشمہ سے پانی پلائیں گے۔ اور جو ابراہیمؑ ہوں گے ان کے شراب طہور میں بھی یہ کافور ملا ہوا ہو گا۔ تاکہ لطف دو بالا ہو جائے

اور سرورِ حاصل ہو جائے۔ البتہ اللہ کے خاص بندے جو اس کافر کے چشمہ سے پئیں گے ان کا تو کیا ہی کسنا۔ وہ تو بڑے عالی مرتبت ہوں گے۔ اور پھر کیا ہو گا یَفْجَرُوْهُمْ كَافَجِدًا وہ اللہ کے بندے اس چشمہ کو چلا ہیں گے۔ دراصل وہ چشمہ کیا ہو گا شرابِ طہور کی نہریں ہوں گی۔ جیسا کہ سورۃ قتال میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور اہم سیوطیؒ نے درمنثور میں بھی بیان کیا ہے۔ کہ جنت کی نہروں کا حال عجیب و غریب ہو گا۔ جو آج انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ایک تو یہ بات ہے کہ جنت کی نہریں سطحِ ارضی پر چلیں گی، مگر پانی میں گڑ بڑ نہیں ہوگی۔ دوسری یہ کہ اہل جنت کے ہاتھوں میں سولے کی چھڑیاں ہوں گی، اور مومن جس طرف اشارہ کرے گا، نہر اسی طرف رُخ پھیر لے گی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ یہاں جس نہر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا منبع حضور علیہ السلام کا قصر مبارک ہو گا۔

کا محل ہو گا جس سے یہ چشمے نکل کر مومنوں کے گھروں میں پہنچیں گے۔ مومن جس طرف چاہے گا، نہر اسی طرف مڑ جائے گی۔ جیسا کہ سورۃ قتال میں فرمایا۔ کہ یہ ایسا پانی ہو گا جو گلنے سہڑنے والا نہ ہو گا۔ یہ دودھ اور غسلِ مصفا کی نہریں ہوں گی۔ اور ابراہیمؑ کے اشلے پر یہ نہریں رُخ بدل لیں گی۔

اشترارہ اور ابراہیمؑ کے انجام کے بعد آگے ابراہیمؑ کی بعض صفات کو بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ کون لوگ ہیں۔

يُؤْفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ⑤ وَيُصْعِقُونَ
الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ⑥ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ
لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ⑦ إِنَّا نَخَافُ
مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ⑧ فَوَقَّهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَلِكَ
الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ⑨ وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً
وَّحَرِيرًا ⑩

ترجمہ :- وہ اپنی نذر پورا کرتے ہیں اور وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی برائی پھیلی
ہوئی ہوگی ⑤ وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت پر مسکین، یتیم، اور قیدی کو ⑥
(اور وہ کہتے ہیں) بے شک ہم تم کو _____ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کھلاتے
ہیں ہم تم سے بدلہ مانگتے ہیں اور نہ شکریے کے طالب ہیں ⑦ بیشک ہم اپنے رب سے اس دن
کا ڈر رکھتے ہیں۔ جو بڑا تر شر اور سخت ہوگا ⑧ پس بچالے گا اللہ تعالیٰ ان کو اس دن کے
شر سے اور دے گا ان کو تر و تازگی اور خوشی ⑨ اور ان کے صبر کی وجہ سے انکو جزائے گا، جنت
اور ریشمی لباس ⑩

سورۃ دہر کی پہلی آیات میں انسان کی تخلیق کا ذکر فرمایا ہے، اور اس کے بعد ابرار اور
اشرار کا انجام بیان کیا ہے۔ اس سے پہلی سورۃ میں بھی دونوں گروہوں کا ذکر ہے۔ مگر وہاں
زیادہ تفصیل نہیں ہے۔ تاہم اس سورۃ میں ابرار کے انجام کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ یعنی
جب ابراہم اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچیں گے، تو وہاں ان کو کیا انعامات ملیں گے اس سے
پہلے ایک ہی آیت میں اشرار کا ذکر اجمالاً کیا ہے۔

پہلے درس میں بیان ہو چکا ہے کہ ابرار کے متعلق فرمایا "إِنَّ الْأَبْرَارَ يَكْتُمُونَ مِنْ كَاسٍ
كَانَ مِنْهَا جُحُومًا كَافُورًا" یعنی ابرار اُس پیالے سے پئیں گے۔ جس میں کافور کی ملاوٹ ہوگی
یہ دنیا والا ٹھنڈا اور خوشبودار کافور نہیں بلکہ فرمایا کہ کافور جنت میں چہرہ ہے جس کا پانی اللہ تعالیٰ

کے خاص الخاص بندے ہیں گے۔ تاہم ابرار کو بھی اس کا کچھ حصہ ضرور نصیب ہوگا۔ جس سے اُنکی خوشی دو بالا ہو جائے گی۔ یہی نہیں بلکہ ”يُفَجِّرُوهَا تَفْجِيرًا“ ابرار کے ہاتھوں میں سونے کی چھڑیاں ہوں گی، وہ حد صراشارہ کہیں گے، چٹھے کا پانی اُسی طرف بہنے لگے گا۔

ابرار کی صفات

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ابرار کی بعض صفات بیان فرمائی ہیں۔ اور ان انعامات کا ذکر کیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہاں اُن کو ملنے والے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں اُن کی چند ایک علامات بیان کی ہیں۔ پہلے نمبر پر فرمایا کہ ابرار کی نشانی یہ ہے کہ ”يُؤْفُونَ بِالنَّذْرِ“ یعنی وہ اپنی نذر کو پورا کرتے ہیں اور دوسرے کہ ”وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيعًا“ وہ اُس دن سے ڈرتے ہیں جس دن کی برائی پھیلی ہوئی ہوگی۔ تیسری علامت یہ بیان کی کہ ”وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ وَهِيَ كَمَا كُھَلَاتِ“ اس کی محبت پر مسکینا ویتجا و اسیسا مسکین، یتیم اور قیدی کو۔ چوتھی صفت ابرار کی یہ بیان کی کہ ”انما نطعمكم لوجه الله“ کہ ہم کھانا جو کھلاتے ہیں یہ محض اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں لا نريد منكم جزاء ولا شكورا ہم نہ تم سے بدلہ مانگتے ہیں۔ اور نہ شکر یہ کے طالب ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ”انا نخاف من ربنا یوما“ ہم اپنے رب سے اُس دن سے ڈرتے ہیں جو عبوساً قنطریلاً بڑا ترش رو اور سخت دن ہوگا۔ ہمیں اُس دن کا خطرہ لاحق ہے۔ کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی گرفت میں نہ آجائیں۔ تو بہر حال اللہ تعالیٰ نے ابرار کی یہ صفات بیان کی ہیں۔ جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔

پہلی صفت نذر کو پورا کرنے سے متعلق ہے۔ نذر منت کو کہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے نذر کا معنی کہ کوئی ایسا کام انسان خود اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ جو شریعت یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر فرض یا واجب نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص کہتا ہے کہ اگر میرے فلاں بیمار کو شفا ہوگی تو میں اللہ تعالیٰ کے لیے ایک بکرا یا گائے ذبح کروں گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضروری نہیں تھا۔ مگر اُس شخص نے خود اپنے اوپر لازم کر لیا۔ اسے نذر یا منت کہتے ہیں۔ اور اس کا پورا کرنا اصل کام کے ساتھ مشروط ہوتا ہے مثلاً اگر بیمار شفا پاے ہو گیا، تو بکرا یا گائے ذبح کرنا واجب ہو گیا۔ نذر سے متعلق احادیث میں تفصیلات موجود ہیں۔ نذر جائز بھی ہوتی ہے۔ اور ناجائز بھی، صحیح بھی ہوتی ہے، اور غلط بھی حلال بھی حرام بھی۔ فقہائے کرام نے اس کی تفصیلات فقہ

کی کتابوں میں بیان کی ہیں۔

نذر کا مسئلہ

نذر یا منت کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے لَا تَنْذِرُوا نَذْرَ
 نَهْمَانَا كَرِهُوا۔ کیونکہ اِنَّ النَّذْرَ لَا يُغْنِيْ عَنْ الْقَدْرِ شَيْئًا یعنی نذر اللہ کی تقدیر میں سے کسی چیز
 کو نہیں روکتی۔ وَانَّمَا يُسْتَخْرِجُ بِهِ مِنَ الْبَخِيلِ اور اس نذر کے ذریعے بخیل آدمی
 سے مال نکالا جاتا ہے، اکثر بخوس لوگ ہی منت مانا کرتے ہیں۔ کوئی مقدمہ پیدا ہو گیا یا کوئی بیماری
 آگئی یا کوئی اور حادثہ پیش آگیا تو گھبرا کر منت مانتے ہیں۔ تو اس طرح اللہ تعالیٰ بخیل سے مال نکالتے
 ہیں۔ ویسے یہ پسندیدہ فعل نہیں کیونکہ یہ سودے بازی بن جاتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کام کریں
 تو ہم اُس کی رضا کے لیے فلاں عبادت کریں گے۔ یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی
 عبادت خالص اُس کے لیے بغیر معاوضہ کے کرنی چاہیے۔ تاہم اگر کوئی شخص منت مان ہی لیتا ہے
 تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مَنْ نَذَرَ اَنْ يَّطِيعَ اللَّهَ فَلْيُطِعهُ جس نے منت مانی ہے
 کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو اُس کو وہ جائز کلام انجام دینا چاہیے۔ جائز نذر کو پورا کرنا چاہیے۔
 پھر فرمایا وَمَنْ نَذَرَ اَنْ يَّعْصِيَہُ اور جس شخص نے یہ نذر مانی کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرے گا یعنی
 ناجائز منت مانی فلا یُعْصِہُ تو اس کو نافرمانی نہیں کرنی چاہیے۔ یعنی اس نذر کو پورا نہیں کرنا چاہیے
 توڑ دینا چاہیے۔ اس پر عمل کرنا حرام ہے۔ اور اس نذر کے بدلے وہی کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ جو قسم
 توڑنے کا کفارہ ہے

ناجائز اور
حرام منت

اس زمانے میں اکثر لوگ ناجائز اور حرام منت مانتے ہیں۔ مثلاً اگر فلاں کام ہو گیا، تو ہم
 وانا صاحب کی قبر پر چادر چڑھائیں گے۔ یا وہاں دیگ دیں گے یا بجاؤں گے۔ اس قسم کی
 منت غیر اللہ کی منت بن جاتی ہے اور شرک ہے۔ اگر شرک نہ بھی ہو۔ اور اس سے
 وانا صاحب یا غیر اللہ کا تقرب مراد نہ ہو تو وہاں پر صرف مجاوروں کو کھلا نا بھی جائز نہیں کیونکہ
 مجاور اکثر مالدار ہوتے ہیں۔ اور وہ نذر کا مال کھانے کے اہل نہیں ہوتے۔ اس کے حقدار تو مساکین ہوتے
 ہیں۔ جو لوگ زکوٰۃ و صدقات لینے کے حقدار ہیں۔ وہی نذر کا مال کھانے کے مستحق ہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ داتا صاحب کی قبر پر نذر پوری کرنے سے ان کا تقرب مراد نہیں بلکہ محض ان کی خوشنودی اور رضا مطلوب ہے۔ تو یہ شرک اور قطعی طور پر حرام ہے۔ ایسی منت کا پورا کرنا درست نہیں، اسے توڑ دینا چاہیے، اور قسم کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔

ناجائز منت کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ ناجائز منت واقع ہی نہیں ہوتی تاکہ اس کو پورا کرنا ضروری ہو بلکہ اگر اس نے مانی ہے تو اس کا توڑنا ضروری ہے۔ اور اس کا کفارہ بھی ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ اور بہت سے دیگر فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ حدیث شریف کے مطابق جس شخص نے معصیت کی نذر مانی، وہ اسے توڑے اور **وَكْفَارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِينٍ** اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ جو وہ ادا کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک عورت نے نذر مانی کہ وہ بہنہ سر پیدل حج کرے گی بشرطیکہ اس کا فلاں کام ہو جائے۔ جب حضور علیہ السلام کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے فوراً منع فرما دیا۔ اور فرمایا کہ عورت کو سر کھولنا حرام ہے۔ اگر اس کا چوتھائی سر کھلا ہے تو تنہائی میں بھی اس کی نماز نہیں ہوتی۔ باقی رہی دوسری بات پیدل چلنے والی، تو آپ نے فرمایا کہ وہ پیدل چلنے کی طاقت نہیں رکھتی، لہذا اس کو سوار ہونا چاہیے۔ سر بھی ڈھانپنا چاہیے کہ عورت کے سب بال ستر میں داخل ہیں۔ اور اللہ کے راستے میں ایک جانور قربانی کرے۔

اگر کوئی جائز منت مانے تو اس کا پورا کرنا فرض ہے۔ مثلاً کسی نے کہا کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو حج کروں گا یا عمرہ کروں گا یا سو رکعت نفل ادا کروں گا۔ تو جب وہ کام ہو گیا تو اب نذر کا پورا کرنا بھی واجب ہو گیا۔ ایسی چیزیں منت ماننے والا خود اپنے اوپر لازم قرار دے لیتا ہے، قدرت کی طرف سے اس کا التزام نہیں ہوتا۔

ابراہیم کی پہلی صفت
نذر پورا کرنا

تو فرمایا کہ ابراہیم کی پہلی صفت یہ ہے کہ **يَقُولُ يَا لَيْتَنِي** وہ جائز نذر کو پورا کرتے ہیں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب وہ اپنے اوپر خود ایک کام کو لازم کر لیتے

۱۔ بعض سے امام مالکؒ و شافعیؒ مراد ہیں دیکھئے ترمذی ص ۲۳۹ ۲۔ ترمذی ص ۲۳۹ ۳۔ ابو داؤد ص ۱۱۱

مسلم ص ۴۵ ترمذی ص ۲۳۹ ۴۔ سنن دارمی ص ۱۰۴ ۵۔ ابو داؤد ص ۱۱۱ ۶۔ روح المعانی ص ۱۵۵

ہیں اور پھر اُس کو پورا کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض و واجبات بدرجہ اولیٰ پورا کر دیں گے۔ مقصد یہ کہ ابراہیم تمام فرائض و واجبات اہتمام کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ جنت کے مستحق ہوتے ہیں۔ اور انعام و اکرام پاتے ہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ ابراہیم وہ لوگ ہیں۔ جو اپنے نفس کا حق، اللہ کا حق اور بندوں کا حق ادا کرتے ہیں۔

ابراہیم کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی **وَيَخَافُونَ يُكُفِّرُونَ كَانِ شَيْءٌ مُسْتَقْبِلًا** اور اُس دن سے ڈرتے ہیں، جس دن کی برائی پھیلی ہوئی ہوگی۔ یعنی اُس کے خوف و شرم سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہوگا۔ ہر آدمی پر دہشت طاری ہوگی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا: حشر کے میدان میں ایسا وقت بھی آئے گا جب اللہ کے نبی بھی **رَبِّ سَلَّمَ**، **رَبِّ سَلَّمَ** پکاریں گے یعنی اے اللہ! آج بچالے آج بچالے۔ جب انبیاء کی یہ حالت ہوگی تو عام مخلوق کا کیا حال ہو گا۔ مقصد یہ کہ ابراہیم اُس دن سے ڈرتے ہیں۔ خدا کی معصیت اور ناراضگی سے وہی شخص بچنے کی کوشش کرے گا، جس کے دل میں خوف ہوگا اور وہ اسی ڈر کی وجہ سے فرائض و واجبات کو پورا کرے گا۔ یہ ابراہیم کی دوسری صفت ہے۔

دوسری صفت
خوفِ آخرت

ابراہیم کی تیسری صفت یہ ہے **وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ** وہ کھانا کھلاتے ہیں **عَلَى حُبِّهِ** اُس کی محبت کے ساتھ۔ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی لوٹ سکتا ہے اور طعام کی طرف بھی۔ تو معنی یہ ہوگا کہ وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کھانے کی محبت کے ساتھ کہ کھانے کی خود بھی ضرورت ہے۔ اُس کے ساتھ محبت ہے۔ مگر دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا مفہوم اس طرح بھی ہے **كُنْتُمْ تَأْكُلُونَ لَبْسًا حَتَّى تَبْفِقُوا مِمَّا تَحِبُّونَ** تم اعلیٰ درجے کی نیچی کو نہیں پاسکتے، جب تک اپنی محبوب اور پسندیدہ چیز خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو۔ کھانے کے ساتھ محبت ہے، اپنا بھی دل چاہتا ہے۔ مگر اپنا پیٹ کاٹ کر دوسروں کو کھلاتے ہیں مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کا خیال رکھتے ہیں۔

تیسری صفت
کھانا کھلانا

اگر ہا کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لٹائی جائے۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ کھانا کھلاتے ہیں **عَلَى حُبِّهِ**

اللہ کی محبت کے ساتھ۔ یعنی اُن کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت موجود ہے۔ اور اس محبت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے کھلاتے ہیں مَسْكِينًا قَاتِلًا مسکینوں یتیموں اور اسیروں کو۔

مسکین وہ شخص ہے جس کے پاس تھوڑا بہت مال ہو، مگر اُس سے اُس کی جائز ضرورت بھی پوری نہ ہوتی ہوں۔ مثال کے طور پر اس زمانہ میں ایک مزدور کے دس بچے ہیں، اور اس کو پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ تو اُس کے بچوں کا خرچہ پورا نہیں ہوتا۔ اُن کی بنیادی ضرورت وال روٹی اور کپڑا بھی دیا نہیں جاتا۔ تو اس قسم کا شتمن مسکین ہے۔ اور فقیر وہ ہوتا ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو یعنی کم از کم ایک وقت کا کھانا بھی میسر نہ ہو۔

یتیم وہ نابالغ بچہ ہوتا ہے جس کا سرپرست فوت ہو گیا ہو، اور جس کا کھانے والا کوئی نہ ہو۔ یتیمی کا اطلاق سن بلوغت سے پہلے پہلے ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے لَا يَتِمُّ لِعَدُوِّ الْبُلُوغِ یعنی کوئی فرد بلوغت کے بعد یتیم نہیں رہتا، بلکہ خود اپنا سرپرست بن جاتا ہے۔ اور اس پر تمام فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔

اسیر سے مراد قیدی ہے، خواہ مسلمان ہو یا کافر، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اکثر قیدی غیر مسلم ہی ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ قبیلہ غطفیل کے ایک قیدی کو دشمن سمجھ کر پکڑ لائے۔ اور اُسے زنجیروں میں جکڑ دیا۔ حضور علیہ السلام کا اُدھر سے گزر ہوا، تو اُس قیدی نے آپ کو آواز دی اور عرض کیا، حضور! میں تو عمرہ کرنے کے لیے جا رہا تھا کہ آپ کے ساتھیوں نے مجھے پکڑ لیا، میرا کیا قصور ہے۔ مجھے کیوں گرفتار کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ تجھے تیرے حلیفوں کے جرم میں پکڑا گیا ہے۔ انہوں نے ہمارے آدمی مارے ہیں۔ اُس جرم میں تمہیں گرفتار کیا گیا ہے۔ اُس نے کہا میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ آپ نے فرمایا، اگر اسلام کا اظہار گرفتاری سے پہلے کرتے تو ہمارے ساتھی تمہیں قید نہ کرتے۔ اب تمہارا اسلام تو قبول ہو گا، مگر تمہیں رہائی نہیں ملے گی، بلکہ ضابطے کی کارروائی ہوگی۔

حضور علیہ السلام واپس ہوئے تو اُس قیدی نے دوبارہ آواز دی، اور عرض کیا مجھے رہا

کر دیں۔ آپ نے فرمایا، نہیں۔ اُس نے تیسری دفعہ آواز دی اور آپ پھر متوجہ ہوئے۔ اچھا مجھے کھانا ہی کھلا دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بڑے مہربان تھے، اس کی بات سنتے ہی فرمایا، ہاں! یہ تیرا حق ہے۔ تجھے کھانا ضرور کھلایا جائے گا۔

غرضیکہ قیدی خواہ کافر ہو یا مسلمان، اس کو کھانا کھلایا جائے گا۔ قیدی اگر ظالم بھی ہے، جیسے اُس نے قتل کیا ہے۔ اور اسیر ہے۔ تو اُس کو قتل کی سزا ملے گی، وہ قصاص میں قتل کیا جائے گا، اُس کو پچھانسی دی جائے گی یا سولی پر لٹکایا جائے گا، تاہم اس کو بھوکا نہیں رکھا جائے گا۔ اور بنیادی طور پر یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ کہ قیدیوں کے کھانے کا بند و بست کرے۔ جنگ بدر کے موقع پر جو کفار قید ہو کر آئے تھے انہیں مختلف مسلمانوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ کسی مسلمان کی ذمہ داری میں ایک قیدی تھا، کسی کے پاس دو تھے۔ ہر قیدی کی حفاظت اور اس کا خورد و نوش سپردار کے ذمہ تھا۔ صحابہ کا حال یہ تھا۔ کہ خود بھوکے ہتے تھے مگر قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔

اطعام طعام
یع معنوں میں

حدیث شریف میں آتا ہے، کھانا کھلانا کوئی معمولی بات نہیں، کھانے کا مطلب یہ نہیں کہ کسی کو ایک وقت کا یا دو وقت کا کھلا دیا بلکہ کھانا کھلانے کا مقصد یہ ہے کہ سوسائٹی کے نادار افراد کی دستگیری کی جائے، انہیں سوسائٹی کا اچھا رکن بننے میں مدد دی جائے۔ اور جب تک ایسے لوگ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ ہو جائیں، ان کی جائزہ ادا و جاری رکھی جائے۔ کھانا کھلانے سے محض بھکاری بنانا مقصود نہیں۔ بھیک مانگنا تو ویسے بھی ناجائز اور حرام ہے۔ اصل مقصد غریبار و مساکین کو سوسائٹی میں ان کا جائزہ مقام دلانا ہے۔ کیونکہ اگر سوسائٹی کے ارکان تباہ ہو گئے تو ایسی سوسائٹی بحیثیت مجموعی تباہ حال ہوگی۔ اور اسے عزت کا مقام حاصل نہیں ہوگا۔ آج کی دنیا میں ترقی یافتہ قومیں اپنے بیکار باشندوں کو گزارہ الاؤنس دیتی ہیں۔ برطانیہ جیسے ملک میں جب تک کسی شخص کو کام مہیا نہیں کر دیا جاتا، اُسے گزارہ الاؤنس ملتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی سوسائٹی کو تباہ ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ کسی کی مدد کر کے اُس پر احسان مت جتلاؤ۔ بلکہ اس کے ساتھ عزت کے ساتھ احسان کرو، یہ تمہارا فرض ہے۔

حضرت علیؑ کے پاس کوئی محتاج آکر سوال کرتا تھا۔ تو خوش ہو کر فرماتے تھے: مَرْحَبًا لِمَنْ
تَحْتَمِلُ زَادًا بِغَيْرِ أَجْرٍ خوش آمدید اُس آدمی کے لیے جو ہماری آخرت کا توشہ ہمارے طلب کرنے
 کے بغیر ہی اٹھا کر لے جا رہا ہے۔ کسی محتاج کو دینا، اپنے لیے آخرت کا توشہ بھیجنا ہے۔ بخاری شریفؒ
 اور مسلم شریفؒ کی حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا اَنِّیْ خِصَالِ الْاِسْلَامِ خَیْرٌ
 حضور! اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا اطعم الطعم یعنی محتاجوں کو کھانا کھلانا
 بہترین خصلت ہے۔ غرضیکہ ابراہار کی یہ صفت ہے کہ وہ اپنی ضرورت اور محبت کے باوجود،
 محتاجوں، یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

چوتھی صفت
 خالص اللہ کی رضا
 کی طلب

ابراہار کا یہ خاصہ ہے کہ وہ کھانا کھلاتے ہیں اور ساتھ یہ بھی کہتے ہیں اِنَّمَا نَطْعُمُكُمْ
لِوَجْهِ اللّٰهِ یعنی ہم کھانا صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں۔ لَا نَرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً
وَلَا شُكُورًا ہم نہ اس کے لیے کوئی بدلہ چاہتے ہیں، اور نہ شکر گزاری کے خواہشمند ہیں۔
 ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے متعلق روایت ہے کہ کسی محتاج کو صدقہ یا خیرات بھیجی
 تھیں تو فرماتی تھیں، پتہ کر دو، انہوں نے کیا کہا۔ اگر ان لوگوں نے شکریہ ادا کیا، تو آپ ان کے لیے بھی
 دعا کرتی تھیں۔ تاکہ آخرت کا اجر خالص اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ آپ لِوَجْهِ اللّٰهِ کا اتنا
 اہتمام کرتی تھیں کہ کہیں اس میں احسان کا عنصر نہ پایا جائے۔

خوف خدا اور اُس
 کے بدلے انعامات

ابراہار یہ بھی کہتے ہیں اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَبِّنا یَوْمًا عِیُوسًا قَمَطَرِیًّا ہم اپنے پروردگار
 سے اس دن سے ڈرتے ہیں، جو بڑا ادا اس، ترش رو اور سخت ہوگا۔ قمطر یہ سخت کو کہتے ہیں
 اگر اونٹنی دودھ پینے سے انکار کر دے، تو دم اٹھا لیتی ہے، اور جسم کو سیکڑ لیتی ہے، تو کہتے
 ہیں یہ قمطر یہ ہو گئی ہے۔ بڑی سخت ہو گئی ہے۔ اسی طرح ابراہار کہتے ہیں کہ ہم اس دن سے
 ڈرتے ہیں، جو بڑا سخت ہوگا۔

آگے فرمایا فَوْقَهُمُ اللّٰهُ شَرُّ ذٰلِكَ الْیَوْمِ بچا لے گا اللہ تعالیٰ ان کو اس
 دن کے شر سے جو ایسے نیک ہیں وَلَقَبَهُمْ لُضِیَّةً و سُرُورًا اور مے گا ان کو تروتازگی

اور خوشی۔ یعنی چہروں پر تروتازگی ہوگی اور ان کے دل میں خوشی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان کو دونوں چیزیں عطا کرے گا۔ کامل الایمان آدمی کے چہرے پر نور ہوگا، رونق ہوگی۔ برخلاف اس کے ہر فاسق و فاجر کے چہرے پر سیاہی ہوگی جیسا کہ قرآن پاک میں مذکور ہے۔ وَجَزَاءُ سَیِّئٍ سَیِّئًا اور ان کے صبر کی ان کے لیے جزا ہوگی جَنَّةٌ وَحَدِیثٌ جنت اور ریشمی لباس مطلب یہ کہ ان لوگوں نے اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال کر محتاجوں کی ضروریات کو مقدم رکھا اور اس پر صبر کیا، لہذا اس صبر کی جزاء کے طور پر انہیں جنت عطا کی جائے گی اور نہایت عمدہ ریشمی لباس پہنایا جائے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو سکرانعامات اور ان کی کیفیت کا ذکر کیا ہے۔

درس سوم ۳

(آیت ۱۳ تا ۲۲)

مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمَهْرِيرًا ⑬
 وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا وَذُلَّتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ⑭ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ
 بِانِيَّةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرًا ⑮ قَوَارِيرًا مِّنْ فِضَّةٍ
 قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ⑯ وَلْيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا
 ⑰ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّى سَلْسَبِيلًا ⑱ وَيُطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ
 مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنشُورًا ⑲ وَإِذَا رَأَيْتَ
 ثُمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُكَاكِيمًا ⑳ عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ سُنْدُسٌ خُضْرٌ وَ
 اسْتَبْرَقٌ وَحُلُوفٌ أَسَاوِرٌ مِّنْ فِضَّةٍ وَسَقَمُ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا
 ㉑ إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُورًا ㉒

ترجمہ:- بہشت میں تکیے لگائے ہوئے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔ دھوپ کی شدت
 یا سخت سردی اس میں نہیں دیکھیں گے ⑬ اور جھلکے ہوئے ہوں گے ان پر درختوں کے سائے
 اور لپٹ کر لے جائیں گے درختوں کے پھل لٹاکر ⑭ اور ان پر چاندی کے برتن پھرے جائیں
 گے اور آنکھوں پر جو شیشے کے ہوں گے ⑮ اور شیشہ چاندی کا ہوگا اور وہ اہل بہشت یا
 خدام اس کا اندازہ کریں گے اندازہ کرنا ⑯ اور انہیں اس میں (بہشت میں) ایسے
 پیالے پلائے جائیں گے جن میں زنجبیل کی ملاوٹ ہوگی ⑰ وہ ایک چشمہ ہے اس میں جس کو سلسبیل
 کہتے ہیں ⑱ اور ان کے سامنے بچے پھریں گے جو ہمیشہ رہیں گے۔ جب تو انہیں دیکھے
 گا تو انہیں بکھرے ہوئے موتیوں جیسا خیال کریگا ⑲ اور جب تو دیکھے گا اس مقام پر تو
 دیکھیں گے گا بڑی نعمت اور بڑی بادشاہی ⑳ اہل جنت اور پسرانِ رنگ کے باریک ریشم کی پوشاک
 ہوگی اور موٹے ریشم کی۔ اور ان کو چاندی کے کنگی پہنائے جائیں گے اور سیراب کرے گا ان کو ان کا
 پیرور و گار شراب طہور سے ㉑ بیشک تمہارے کیے کی جزا ہے اور جو محنت تم نے (دنیا میں)
 کی اس کی قدر دانی کی گئی ہے ㉒

گذشتہ سے
پیوستہ

پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ابرار کا ذکر فرمایا، ان کی صفات اور بدلے کا ذکر کیا جو ان کو اللہ کے ہاں حاصل ہوگا۔ فرمایا کہ ابرار وہ لوگ ہیں جو فرائض اور واجبات کو پورا کرتے ہیں۔ کھانے کی محبت کے باوجود محتاجوں کو کھلاتے ہیں۔ انہیں کسی بدلے یا شکر گزارہی کا لالچ بھی نہیں ہوتا، بلکہ محض روز قیامت — کے خوف کے سبب ایسا کرتے ہیں۔ ایسا دن جو بڑا تمہش رُؤ اور سخت ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ابرار کو اس دن کی سختی سے بچائے گا اور انہیں وہاں تڑپائیگی اور سرور حاصل ہوگا۔ یہ ان کے صبر کا بدلہ ہوگا۔ کہ انہیں جنت اور اس میں ریشمی لباس پہنایا جائے گا۔ گویا جو لوگ دنیا میں مصائب پر صبر کرتے ہیں، تکالیف کو برداشت کرتے ہیں، وہ آخرت میں کامیابی کی منزل سے ہم کنار ہوں گے۔

برائے تختوں پر بڑے
آرام سے بیٹھنے
والے ہونگے

اب ان آیات میں اس اچھے صلے کی کچھ تفصیل ہیں، جو ابرار کو اللہ کے ہاں حاصل ہوگا جن لوگوں نے دنیا میں طرح طرح کی تکالیف برداشت کیں وہاں وہ نہایت آرام اور سکون سے رہیں گے۔ فرمایا مَثَبِکَیْنِ فِیْہَا عَلٰی الْاَرَآئِکَ بہشت میں تیسے لگائے ہوئے تختوں پر بیٹھے ہوں گے، اراک، اریجہ کی جمع ہے جس کے معنی ڈولی کے ہوتے ہیں، اوپر پر وہ لگا ہوتا ہے۔ اور بیچ یا عمدہ قسم کا صوفہ جو اس زمانہ میں ہوتا ہے۔ ان پر تکیہ لگا کر بیٹھے ہوں گے، اور انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ یا اس کی مثال ایسی ہے، جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھا ہو۔ جنت میں جانے والا ہر شخص بادشاہ ہوگا، اس کو ایسی سہولتیں اور آرام و سائش میسر ہونگے جو دنیا میں کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی حاصل نہ ہوں۔ اور یہ نعمتیں بغیر کسی خدشے کے حاصل ہوں گی، دینیوی انعامات کے تو ختم ہو جاتے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مگر وہاں کی نعمتیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ جنت میں ایک ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کے لیے بھی ایک ہزار خدام ہوں گے، بعض جگہ اسی ہزار کا ذکر بھی ملتا ہے۔ کم از کم ایک ہزار نو کر چاکر ہوں گے، ہر کوئی اپنا اپنا فرض ادا کر رہا ہوگا۔ اپنے کام میں مشغول ہوگا۔ الغرض کسی انسان کے عیش و آرام کے لیے جس قدر لوازمات بھی چاہئیں، وہ سب وہاں میسر ہوں گے۔

دھوپ اور سخت
سردی سے
محفوظ ہونے

فرمایا لَا يَكُونُ فِيهَا شَمْسٌ وَلَا زَمَهَرٌ اور ابراہیم جنت میں دھوپ کی شدت یا سخت
سردی نہیں دیکھیں گے۔ سورج قریب ہو تو تپش میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور انسان تنگ ہو جاتا ہے
اور اگر سورج دُور منطقہ بارہ میں چلا جائے، تو سردی بڑھ جاتی ہے۔ سردی کی لہر بھی ناقابلِ برداشت
ہو جاتی ہے۔ فرمایا جنت میں یہ دونوں تکالیف نہیں ہوں گی۔ گرمی کی لہر سے بھی جانوں اور فضلوں کا
نقصان ہوتا ہے اور کڑا کے کی سردی بھی زندگی اور پھلوں کے اتلاف کا باعث بنتی ہے مگر جنت
کا موسم نہایت معتدل ہوگا، نہ سخت سردی ہوگی اور نہ سخت گرمی۔

اُن پر سایہ ہوگا

نیز یہ بھی فرمایا وَدَانِيَةٌ عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا قریب ہوں گے، جُھکے ہوئے ہوں گے اُن
پر سائے۔ ظلالِ ظل کی جمع ہے جس کے معنی سایہ کے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب جنت
میں سورج ہی نہیں ہوگا جیسا کہ پڑھ چکے ہیں لَا يَكُونُ فِيهَا شَمْسٌ تو پھر سائے کا کیا مطلب۔
فرمایا اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ ظلال کا اطلاق درختوں پر کیا گیا ہے، نہ کہ درختوں کے سائے پر۔ اس
لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اہل جنت پر درخت جُھکے ہوئے ہوں گے یا اُن کے قریب ہوں گے تاکہ
جنتیوں کو اُن کے پھل حاصل کرتے ہیں وقت نہ ہو۔ دوسرا جواب یہ دیا کہ سورج کی عدم موجودگی کا
یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں کوئی دوسرا روشن اجسام بھی نہیں ہوں گے۔ سورج کے علاوہ بھی تو
اجسام تیرہ ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے سایہ کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ جیسے عرش الہی کا سایہ۔ اگرچہ
اس کا سایہ سورج کی مانند نہیں ہوگا، مگر سایہ تو ہوگا۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ حضور
علیہ السلام نے فرمایا افضل صدقہ کون سا ہے، فرمایا ظِلُّ فُسطَاطٍ اسی طرح جب مجاہدین جہاد کے
لیے نکلتے ہیں تو ان کے سفر و حضر میں خیمہ کا سایہ مہیا کرنا افضل صدقہ ہے۔ اسی لیے ایک حدیث
میں ایسے لوگوں پر لعنت کی گئی ہے جو سائے والی جگہ پر بول و بدازہ کریں۔ سایہ خواہ کسی مکان کا ہو،
یا چھت کا ہو۔ ایسی جگہ پر گندگی پھیلانے سے منع فرمایا گیا، کیونکہ گرمی میں وہاں لوگ آرام کرتے ہیں۔
مگر بہشت میں نہ تو سورج ہوگا، اور نہ اس کی تپش، تو وہاں سائے سے کیا مراد ہوگا مفسرین
کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی طبیعت کو ہمہ گیر بنایا ہے۔ اس کے دل میں مختلف الاتواع

اشیا کی خواہش کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ یعنی بغیر ضرورت کے بھی اگر کسی جنتی کی خواہش ہوگی کہ وہ سائے میں بیٹھے۔ تو اس کیلئے سایہ موجود ہوگا۔ اسی لیے فرمایا وَدَانِيَّةٌ عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا اُنْ پر سائے چھکے ہوئے ہوں گے۔

نیز فرمایا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا اور پست کر دیے جائیں گے، تابع کر دیے جائیں گے۔ قریب کر دیے جائیں گے۔ درختوں کے پھل درختوں سے پھل اتارنے میں جس طرح دنیا میں مشقت کرنی پڑتی ہے، اس طرح وہاں نہیں کرنی پڑے گی۔ کھجور کے درخت سے پھل اتارنے کے لیے نہ پیٹی باندھنے کی ضرورت ہوگی اور نہ سیڑھی لگائے گی، بلکہ وَدَانِيَّةٌ عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا۔ درخت کا سایہ ان اہل جنت پر ہوگا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا۔ اور درختوں کے پھل اُن پر چھکے ہوئے ہوں گے جنتی خواہش کرے گا تو درخت جھک کر سائے آجائے گا۔ اور وہ حسبِ خواہش پھل توڑ کر استعمال کر سکے گا۔ اور پھر لطفت کی بات یہ ہے کہ۔ پھل توڑنے سے پھلوں میں کمی واقع نہیں ہوگی بلکہ اُسی جگہ دوسرا پھل موجود ہوگا۔ الغرض فرمایا کہ پھل قریب کر دیے جائیں گے۔ ٹہنیاں جھکی ہوئی ہوں گی، جس حالت میں کوئی جنتی خواہش کرے گا، بیٹھے بیٹھے، لیٹے ہوئے، چلتے پھرتے ہر حالت میں بغیر مشقت اٹھائے اُسے مطلوبہ چیز میسر ہو جائے گی۔

اُن پر پھل چھکے ہوئے ہونگے

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِانِيَّةٍ مِّنْ فَضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ اور اُن پر چاندی کے برتن پھیرے جائیں گے اور گلاس یا آبجورے کانت قَوَارِيرًا جو شیشے کے ہوں گے۔ قَوَارِيرًا مِّنْ فَضَّةٍ اور شیشہ چاندی کا ہوگا قَدَرٌ وَّهَا تَقْدِيرًا اور اہل بہشت یا خدام اس گلاس کا اندازہ کریں گے اندازہ کرنا۔ یعنی جنتی کی خواہش کا اندازہ کریں گے اس کے مطابق انہیں گلاس میں مشروب پیش کیا جائیگا کمی بیشی نہیں ہوگی۔ اور برتن چاندی کے ہوں گے، دوسری جگہ سونے کا ذکر بھی آتا ہے۔ یعنی مختلف درجات کے مطابق سونے کے برتن بھی ہوں گے۔ تاہم یہاں صرف چاندی کا بیان ہے۔ اور پھر عجیب بات یہ کہ وہ چاندی شیشے کی ہوگی یعنی شیشے کی طرح شفاف ہوگی۔ گویا ان برتنوں میں چاندی اور شیشے کی خصوصیات بیک وقت موجود ہوں گی، ایسے مرکب کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔ یہ جنت میں ہی میسر ہوں گے۔

چاندی کے برتن

اس دنیا میں سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا منع ہے۔ مسلم شریف

کی حدیث میں ہے کہ سونے چاندی کے برتن استعمال کرنے والا شخص اِنَّمَا يُجْرُجُ فِي بَطْنِهِ نَازَجَهَنَّكَ پینے پیٹ میں دوزخ کی آگ ڈال رہا ہے۔ البتہ عورت سونے چاندی کے زیور استعمال کر سکتی ہے۔ مرد کے لیے صرف چاندی کی ایک انگوٹھی جو ایک مثقال سے کم یعنی تقریباً تین ماشہ کی ہو۔ استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ اور سونا مطلقاً حرام ہے۔ سونے چاندی کے برتن کسی صورت میں بھی استعمال نہیں ہو سکتے۔ حتیٰ کہ سلائی اور پانڈان بھی استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے سونا، اور ریشم ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے مردوں کے لیے اسے حرام قرار دیا ہے۔ اور عورتوں کے لیے جائز ہے۔ تاہم بہشت میں یہ چیزیں سب کو میسر آئیں گی۔

زنجبیل کے مشروب

ابراہیم کے دیگر العامات کے متعلق فرمایا وَ يُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا اور انہیں ایسے پیالے پلائے جائیں گے کَانَ مِنْ أَجْهَانِ زَنْجَبِيلٍ جن میں زنجبیل کی ملاوٹ ہوگی۔ زنجبیل سونٹھ کو کہتے ہیں یہ جو اور ک خشک ہو کر سونٹھ بن جاتی ہے۔ یہ بہت عمدہ چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں کمال درجے کی خصوصیات رکھی ہیں دماغ اور جسم کی حرارت غریزی کو ابھارتی ہے۔ لطافت پیدا کرتی ہے، حافظہ پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔ حکیم اور ڈاکٹر اس کے بے شمار فوائد سے خوب واقف ہیں۔ پہلی آیت میں کافور کا ذکر آیا تھا، اُس کی خوشبو، لطافت اور بہودت کا بیان تھا، اس آیت میں زنجبیل کا ذکر ہے۔ اُس آیت میں کافور سے مراد وہ چشمہ تھا، جس کا پانی گلاس میں ملا کر جنتوں کو دیا جائے گا، یہاں زنجبیل کا بیان ہے۔ کہ ان پیالوں میں زنجبیل کی ملاوٹ ہوگی۔ مگر زنجبیل سے مراد سونٹھ نہیں ہے۔ بلکہ عیناً فیہا ایک چشمہ مراد ہے تِسْمِي سَكْبِيْدٌ جس کو سببیل کہتے ہیں۔ جس طرح کوثر ایک چشمہ ہے تسنیم ایک چشمہ ہے، اسی طرح سببیل بھی ایک چشمہ کا نام ہے جس کی خاص خصوصیات ہوں گی۔ ابراہیم کو جب مشروبات پیش کئے جائیں گے۔ تو ان میں سببیل کی ملاوٹ ہوگی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دنیا میں شربت کا گلاس بنایا جاتا ہے تو اس میں روح کیوڑہ یا کوئی دوسری خوشبودار چیز ملا دی جاتی ہے۔ اسی طرح کافور، زنجبیل یا سببیل کا پانی ملا دیا جائے گا، جس سے مشروب کی لطافت دو بالا ہو جائے گی۔۔۔

دنیا میں جس قدر مشروبات استعمال کئے جاتے ہیں، وہ پیاس بجھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اور وہ شخص دنیا میں پیاس کی شدت برداشت کرتا ہے۔ اُسے اللہ تعالیٰ بہشت میں ایسا مشروب پلائے گا، جس سے اُس کا سرور و وبال ہو جائے گا۔ مثلاً کوئی شخص روزہ کی حالت میں پیاس برداشت کرتا ہے۔ یا نماز کی حالت میں پیاس محسوس ہوتی ہے۔ مگر وہ اسی حالت میں نماز پوری کرتا ہے۔ یا کسی وقت پانی کی نایابی کی وجہ سے پیاس کو برداشت کرتا ہے، تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کے ہاں زنجبیل یا ہلبیل کے چٹھے کا مشروب حاصل ہوگا، جس سے دنیا کے مشروبات کا کوئی مقابلہ نہیں ہوگا۔

خدمتگار بچے

منجملہ انعامات کے فرمایا دیکھو: وَلَدَانِ تَحْتَكَانِ اَنْ كَسَا مَنَ بَنِي بَحْرِي گے، جو ہمیشہ وہیں رہیں گے۔ اور یہ بچے جنتیوں کی خدمت کریں گے۔ اور ان کا نقشہ یہ ہوگا۔ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَبْ تُوَانْ كُو دِيْخْے گاحسبتہم لَوَلُوْا كَمَنْشُوْرَا تو انہیں بھرے ہوئے موتیوں جیسا پائے گا۔ یہ نہایت حسین و جمیل بچے جنتیوں کی خدمت پر مامور ہوں گے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ بچے کون ہوں گے۔ کوئی دنیا کی مخلوق ہوگی یا انہیں اللہ تعالیٰ نے بہشت میں ہی پیدا کیا ہے۔ تو اس کے متعلق دو قسم کی روایات پائی جاتی ہیں۔ ایک تصویر یہ ہے کہ کفار کے وہ نابالغ بچے جو سن بلوغ تک پہنچنے سے پہلے مر جاتے ہیں ایہ وہ ہوں گے کیونکہ وہ مکلف نہ ہونے کی وجہ سے دوزخ میں تو نہیں جائیں گے، لہذا انہیں جنت میں خدمت پر مقرر کر دیا جائے گا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو بہشت میں ہی پیدا کرے گا اور اہل ایمان کی خدمت پر مامور کر دے گا۔

ملک اور حکومت

وَ اِذَا رَاَيْتْ اور جب تو دیکھے گا تھو اس مقام پر رَاَيْتْ نِعِمَّا وَّمُلْكًا بَكِيْرًا تو دیکھے گا بڑی نعمت اور بڑی بادشاہی یعنی بہشت میں ہر شخص بادشاہ ہوگا جس کی اپنی حکومت ہوگی۔ اور بادشاہوں والی تمام نعمتیں اُسے میسر ہوں گی۔ نِعِمَّا وَّمُلْكًا کَبِيْرًا کہہ کہ اللہ تعالیٰ نے بتلادیا کہ ہر جنتی کو ہر قسم کا آرام و راحت اور ہر قسم کی نعمتیں حاصل ہوں گی جیسے کہ بادشاہوں کو دنیا میں حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً انسانی خواہشات کی تکمیل کیلئے وَزَوْجُهُمْ مِّمَّ جُورِ عِيْنٍ ہم حور عین کے ساتھ ان کا نکاح کر دیں گے۔

حکومت کرنے اور عرصہ نکالنے کا جذبہ انسان میں فطری طور پر موجود ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہر جنتی کے پاس ہزار ہا نوکر چاکر ہوں گے۔ جن سے خدمت لے گا اور ان پر حکم

چلاتے گا۔ اس کے علاوہ انسان کے لیے ذہنی اور خیالی تصور بھی ہوا کرتا ہے، جس کو حب مال اور حب جاہ کہا جاتا ہے۔ جب یہ بڑھ جاتا ہے، تو ملک بن جاتا ہے۔ تاہم یہ ذہنی تصور بھی انسان کے لیے بہشت میں پورا کیا جائے گا۔

روحانی نعمتیں

اس کے علاوہ جنت میں کمال درجے کی روحانی نعمتیں بھی حاصل ہوں گی، انبیاء، صدیقین اور صلحا کی رفاقت نصیب ہوگی "فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ" انکو پاکیزہ لوگوں کی مجلسیں نصیب ہوں گی۔ اور سب بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت نصیب ہوگی۔ اُس کی تجلیات کا مشاہدہ ہوگا اور یہ عروج ہمیشہ جاری رہے گا، اس میں کبھی رکاوٹ نہیں آئے گی۔ الغرض بہشت میں مادی اور روحانی ہر قسم کی نعمتیں میسر ہوں گی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ وہاں تک پہنچنا بڑا دشوار ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو بھائی اللہ کا سودا بڑا مہنگا ہے۔ اس کو تلاش کرو، اس کے حصول کے لیے کوشش کرو۔ یہ سودا بہشت کا سودا ہے۔ وہاں پہنچ کر حظیرۃ القدس کا نمبر بن جانا بڑی بات ہے۔ دنیا میں لوگ پارلیمنٹ کی نمبریں کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی حظیرۃ القدس کا نمبر بن جانا ہے۔ اصل کامیابی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "فَمَنْ دُخِلَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ" جس کو دوزخ کی آگ سے بچا لیا گیا اور بہشت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہو گیا۔ حقیقی کامیابی یہی ہے۔ اس سے کم تر کوئی کامیابی نہیں۔

ریشمی لباس

ابرار کے لیے لباس کا حال اس طرح بیان فرمایا عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ سُنْدُسٌ اُن کے اوپر باریک ریشم کی پوشاک ہوگی خُصْصِيْ جو سبز رنگ کی ہوگی وَاسْتَبْرَقٌ اور موٹے ریشم کی۔ انسان کا مزاج متنوع واقع ہوا ہے۔ کبھی باریک کپڑا پسند کرتا ہے، کبھی موٹا۔ ریشم دنیا میں اگرچہ مرد کے لیے حرام ہے۔ مگر بہشت میں یہ بھی حاصل ہوگا۔ ہاں یہ مصنوعی ریشم (ARTIFICIAL SILK) جائز ہے۔ کیونکہ یہ دوسرے مادوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ مردوں کے لیے بھی منع نہیں ہے۔ وہ

اصلی ریشم حرام ہے۔ جو ڈوڑی سے بتایا جاتا ہے۔ ریشم کا کپڑا خوراک کھا کہ جو لعاب نکالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ریشم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ پھر اس سے طرح طرح کے کپڑے تیار کئے جاتے ہیں، کوئی گاڑھا ہوتا ہے۔ کوئی باریک اور کوئی موٹا۔

چاندی کے
کنگن

فرمایا وَحُلُّواْ اَسَاوِدَ مِنْ فِضَّةٍ اور ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ دوسری جگہ سونے کا بھی ذکر آیا ہے، مگر وہ مقربین کے لیے ہیں۔ فرمایا مقربین کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور موتیوں کے ہار ان کے گلے میں پڑیں گے۔ کنگن کا رواج اگرچہ موجودہ دور میں نہیں ہے، تاہم یہ قدیم زمانے کا رواج ہے۔ کہ بڑے لوگ بادشاہ وغیرہ یہ زیور پہنتے تھے۔ تصور وہی ہے، بادشاہی والا عرب بھی اس سے واقف تھے۔ چنانچہ نبی علیہ السلام نے حضرت عدی بن حاتم طائی کو جو جلیل القدر صحابی تھے، فرمایا تھا کہ وہ وقت آئے گا جب کسریٰ کے کنگن تمہارے ہاتھ میں ڈالے جائیں گے۔ چنانچہ یہ پیشگوئی پوری ہوئی جب ایران فتح ہوا۔ تو تھوڑی دیر کے لیے یہ کنگن حضرت عدی کو پہنائے گئے الغرض قدیم زمانے میں مردوں کے زیور پہننے کا تصور پایا جاتا تھا۔ مگر بہشت میں یہ کنگن ہر شخص کو نصیب ہونگے۔

وَسَقْمَرٌ لَهُمْ شَرَابٌ طَهُورٌ اور سیراب کرے گا انکو انکا پور دگر شراب طہور سے اِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً اللہ تعالیٰ اہل بہشت سے فرمائیں گے یہ تمہارے کئے کی جزا ہے۔ تمہارے اس ایمان اور نیکیوں کا بدلہ ہے۔ جو تم نے دنیا میں اختیار کیا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا لَمَّا اسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ یعنی گزشتہ دنوں میں جو نیکیاں تم نے کیں، یہ ان کا بدلہ ہے۔ وَكُلٌّ فِي دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا ہر ایک کے عمل کے مطابق اس کا درجہ ہو گا۔ بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان دنیا میں ایمان کی دولت حاصل کرے، اعمال صالحہ کا ذخیرہ کر لے اور آخرت میں ان کا بدلہ حاصل کر لے فرمایا وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا اور جو کوشش اور محنت تم نے دنیا میں اللہ کے دین کی خاطر کی، اس کی قدر دانی کی گئی ہے۔ تمہاری نیکیوں کو رائیگاں نہیں جانے دیا گیا۔ تم نے اعمال صالحہ اختیار کرنے میں جو سعی و کوشش کی، یہ انعامات اس کے نتیجے میں ہیں۔

عزائے عمل

إِنَّا خَزْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا ۚ (۲۳) فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَطْعُ مِنْهُمْ إِثْمًا أَوْ كُفُورًا ۚ (۲۴) وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۚ (۲۵) وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۚ (۲۶) إِنَّ هُوَ كَذَّابٌ يَجْحَدُ الْعَاجِلَةَ وَيَذُرُونَ وَذَاءَ هُوَ يُومًا ثَقِيلًا ۚ (۲۷)

ترجمہ: بے شک ہم نے آپ پر قرآن پاک کو آہستہ آہستہ اتارا ہے (۲۳) پس آپ اپنے رب کے حکم کے سامنے صبر کریں آپ ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکر گزار کی بات نہ مانیں (۲۴) اور صبح و شام اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیں (۲۵) اور رات کے وقت اپنے رب کے سامنے سجدہ ریت ہوں اور رات کے ایک لمبے حصے میں اس کی تسبیح بیان کریں (۲۶) بیشک یہ لوگ دنیا کی زندگی سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے (قیامت کا) بوجھل دن چھوڑ رہے ہیں (۲۷)

گذشتہ سے پیوستہ

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا ذکر فرمایا، اور اس کے بعد ہدایت کے راستے کا اجمالاً ذکر کیا "إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا" فرمایا چونکہ انسان کی آزمائش مطلوب ہے، اس لیے ہم نے اُسے سمیع و بصیر بنا کر اُس پر ہدایت کا راستہ واضح کر دیا۔ کہ یا تو انسان شکر گزار بن جائے یا ناشکر گزار۔ اگر ہدایت کا راستہ اختیار کیا اور اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کیا، تو شکر گزار بن گیا، ورنہ بصورتِ دیگر ناشکر گزاروں کی فہرست میں شامل ہوا۔

اس کے بعد ناشکر گزاروں کا انجام اجمالی طور پر بیان فرمایا "إِنَّا عَتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلًا وَأَغْلَالًا وَسَعِيرًا" یعنی ایسے لوگوں کے لیے ہم نے زنجیریں، طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے پھر ہدایت یافتہ افراد کا ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ پہلے رکوع میں "إِنَّ الْأَبْدَانَ لَشَيْءٌ خَفِيٌّ" کے ساتھ ذکر کیا جو نیک لوگوں کو اللہ کے ہاں حاصل ہونے والی ہیں۔ اور آخر میں فرمایا کہ یہ تمام انعامات تمہاری نیکی اور ایمان کا بدلہ ہیں۔ تمہاری کوشش ٹھکانے لگی۔ اور اُس کی قدر دانی کی گئی۔ وہ رائیگاں نہیں گئی۔ اس کے بعد مانتے والوں اور نہ مانتے والوں دونوں کے حق میں تنبیہ

ہے۔ نبی علیہ السلام اور آپ کے ماننے والوں کے لیے تسلی کا سامان ہے۔ اور حکم ہے کہ حالات کیسے بھی ناخوشگوار ہوں آپ اپنا فریضہ ادا کرتے رہیں۔

تنتزلی قرآن

چونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ناموافق حالات سے گزر رہے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تسلی کے طور پر سب سے پہلے قرآن پاک کا ذکر فرمایا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا بے شک ہم نے آپ پر قرآن پاک کو آہستہ آہستہ اتارا ہے۔ جس کی ایک خاص حکمت ہے۔ لہذا آپ مشرکین کے اعتراضات کی پروا نہ کریں اور قرآن پاک کے پروردگار پر عمل کرتے رہیں۔

پچھلی سورتوں میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ جب نبی علیہ السلام اللہ کا کلام پیش کرتے تھے تو مشرک اور کافر طرح طرح کے اعتراض کرتے تھے کوئی کتابی شاعری کرتے ہیں کوئی کہتا کہ نعوذ باللہ آپ کا ہن میں کوئی کتاب کہہ رہے ہیں اس طرف سے کلام گھڑ کر لائے ہیں یعنی اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتِرٌ آپ افتر کرتے ہیں حالانکہ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ اللہ نے کسی انسان پر کوئی وحی نازل نہیں کی۔ آپ خواہ مخواہ جھوٹ بولتے ہیں، اور محض اپنی چودھڑاٹ چاہتے ہیں مشرکین آپ سے ٹھٹھا مذاق بھی کرتے تھے۔ اللہ کے کلام کو بھی جھٹلاتے تھے۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جب کفار آپ کی زبان مبارک سے قرآن پاک سنتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ، جبرائیل اور خود حضور علیہ السلام کو گالیاں دیتے تھے۔ ایسے حالات میں نبی علیہ السلام کھلے بندوں نماز بھی نہیں پڑھا سکتے تھے، چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل کی یہ آیات نازل ہوئیں وَلَا تَجْهَرْ بِكَلِمَاتِكَ وَلَا تَخَافُ يَهُوَّ إِنَّهُ يَعْلَمُ كُفْرَهُمْ كَذِبًا کہ گالیاں دیں، اور نہ اتنا آہستہ پڑھیں کہ آپ کے صحابہ بھی نہ سن سکیں، وَابْتَغِ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا بلکہ آپ درمیانی راہ اختیار کریں۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ ایک دفعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑ کے کسی درے میں نماز ادا کر رہے تھے۔ کوئی مشرک وہاں سے گزر رہا تھا کلام پاک

سُن کہ وہ لڑنے مارنے پر آمادہ ہو گیا۔ حضور علیہ السلام نے ماموں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ وہاں موجود تھے۔ اُن کے قریب اونٹ کے جھڑے کی ہڈی پڑی تھی، انہوں نے وہی اٹھا کر کافر کوڑے ماری جس سے وہ زخمی ہو گیا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مقصد یہ کہ اس قسم کے حالات تھے، جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کا ذکر بیان کر کے آپ کو اور آپ کے صحابہؓ کو تسلی دی۔ اور فرمایا کہ قرآن پاک کوئی من گھڑت کلام نہیں ہے۔ بلکہ اسے ہم نے آہستہ آہستہ اتارا ہے۔ دوسری جگہ اسی بات کو یوں بیان کیا تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ یعنی یہ کلام تمام جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ اور مشرکین کے اعتراضات لغو اور بیہودہ ہیں مشہور روایت ہے کہ قرآن پاک لوح محفوظ سے ایک ہی دفعہ نازل ہوا۔ آسمانوں میں بیت المحکم ایک باعزت مقام ہے وہاں موجود رہا، اور وہاں سے زمین پر آہستہ آہستہ ۲۳ برس میں نازل ہوا۔ اس کی ابتداء رمضان المبارک میں ہوئی، جیسا کہ سورۃ بقرہ میں ہے شَهِدَ مَظَانِ الَّذِي اُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ یعنی رمضان کا وہ مبارک مہینہ ہے جس میں نزول قرآن کی ابتدا ہوئی اور پھر بتدریج مکتوبہ تھوڑا اتارا گیا۔

بتدریج نزول
کی حکمت

سورۃ فرقان میں قرآن پاک کے بتدریج نزول کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے: "لَنُنَزِّلَ بِهٖ فُوَادًا وَذَلَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا" تاکہ اس کے ذریعے آپ کے دل کو بچتہ کر دیں اور یہ اچھی طرح یاد ہو جائے۔ کیونکہ جو چیز بتدریج حاصل ہوتی ہے۔ وہ مستحکم ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے سابقہ کتابیں ایک دم نازل ہوتیں، تو وہ اتنی مستحکم نہ ہوتیں بلکہ قرآن انسانوں کے قلوب و اذان میں بتدریج نازل ہونے کی وجہ سے زیادہ مستحکم ہوا۔ قرآن پاک حضور علیہ السلام پر نازل ہوا۔ آپ نے اپنے صحابہؓ کو آہستہ آہستہ اس کی تعلیم دی اور اس طرح یہ اولین مخاطبین کے ذہنوں میں اچھی طرح راسخ ہو گیا۔ اور پھر اُن کی معرفت آئندہ نسلوں تک پہنچا۔

امام جلال الدین سیوطیؒ تفسیر القان میں لکھتے ہیں۔ یاد رکھو! کہ آخرت کے معاملے کو سمجھنے کے لیے انسان عام طور پر طفل مکتب ہیں جس طرح چھوٹے بچوں کو اگر ساری کتاب ایک نشست میں پڑھا دی جائے تو کچھ پلے نہیں پڑتا، اور اگر تھوڑا تھوڑا سبق دیں گے تو وہ یاد کر لیتے

ہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور معاد کو سمجھانے کیلئے قرآن پاک محض اور تھوڑا نازل کیا گیا۔ تاکہ مخاطبین کے ذہن نشین ہو جائے۔ کیونکہ اس معاملہ میں پوری نوع انسانی طفل مکتب کی مانند ہے۔ اگر پورا قرآن پاک بیک وقت پیش کر دیا جاتا، تو ان کے ذہن اُسے دل و دماغ میں راسخ کر لینے کی قوت نہ پاتے۔ اسی لیے فرمایا "وَأَوْحِي إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ" ہم نے یہ قرآن آپ پر وحی کے ذریعے نازل کیا۔ یہ گویا قرآن پاک کی صداقت اور حقانیت کا بیان ہے۔

قرآن پاک ذریعہ ہدایت ہے

پہلے جتنی آیات گزر چکی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن پاک ذریعہ رشد و ہدایت ہے۔ اسی کے ذریعہ انسان حق و ناحق کو پہچانتا ہے۔ اور کھڑے کھوٹے میں تمیز کر سکتا ہے۔ فرمایا ہم نے انسان کی تخلیق کی، پھر اس کو مکلف بنایا۔ اس کو آزمائش میں ڈالا اور اس کے سامنے ہدایت اور گمراہی دونوں راستے واضح کر دیے تاکہ وہ ان میں سے اپنی پسند کا راستہ اختیار کر لے۔ یہ سب چیزیں قرآن پاک سے ہی معلوم ہوتی ہیں۔ پھر اس کا انجام بھی بیان کر دیا۔ کہ ناشکر گنہگار کے لیے زنجیریں، طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ ہوگی اور نیکو کاروں کے لیے "نَضِيَّةٌ وَسُجُودٌ" تو تازگی اور خوشی کی خوشخبری ہے۔ انہیں جنت میں بہترین لباس پہنایا جائے گا۔ شراب ظہور کے جام پیش کئے جائیں گے۔ تو یہ باتیں اس قرآن کے ذریعے سے ہی حاصل ہوتی ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ لہذا اگر فلاح مطلوب ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قرآن پاک کا دامن تھام لو، کہ یہی ذریعہ رشد و ہدایت ہے۔

حدیث، قرآن پاک کی تشریح ہے

ہدایت کے سلسلے میں قرآن پاک کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس کی تشریح حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ فرمایا "فَصَلِّتُ الْيَتِي" اس کی آیات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ہر صحیح حدیث قرآن پاک کی تشریح ہے۔ جب کہ خود قرآن پاک تنہا ہے تفصیل کے سلسلے میں حضور علیہ السلام کے ارشادات، آپ کا عمل مبارک اور پھر آپ کے صحابہؓ خصوصاً خلفائے راشدینؓ کا عمل حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر قرآن حکیم کی حقیقت کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ اور نہ اس پر عمل کے راستے واضح ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجتہدین کا اجتہاد بھی تفصیل قرآن پاک میں شامل ہے۔ زمانے کے حوادث غیر محدود ہوتے ہیں۔ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ نئے نئے مسائل کا پیدا ہونا بھی لازمی ہے۔ تو جو چیز حدیث نبوی اور خلفائے راشدینؓ کے اقوال سے

معلوم نہ ہو سکے، اُسے اقوال مجتہدین سے تلاش کرنا ہوگا۔ اور اس لحاظ سے یہ اجتہاد قرآن پاک کی تشریح میں شامل ہوگا۔ گو یا قرآن پاک کے ذریعے ہی اچھے انجام تک پہنچا جاسکتا ہے۔

اشاعت قرآن
السانی فریضہ

اشاعت قرآن کے سلسلے میں دو قسم کے فرائض عاید ہوتے ہیں۔ یعنی فرائض عام اور فرائض خاص۔ عام فرائض ہیں قرآن کریم اور اسلام کی ترویج شامل ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ** جو چیز آپ پر نازل کی گئی، اُسے پہنچادیں۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: **بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً** میری طرف سے پہنچا دو، اگرچہ ایک آیت بھی ہو۔ گو یا قرآن پاک کی تعلیم اور دین کی تبلیغ تمام انسانیت کے لیے عام فریضہ ہے۔ شاہد ولی فرماتے ہیں کہ دنیا میں کسی شخص نے جس قدر قرآن کریم کی اشاعت میں حصہ لیا ہوگا، اُسی قدر اُسے نبی کریم کے حوض کوثر سے پانی نصیب ہوگا۔ دنیا میں قرآن پاک اور آخرت میں حوض کوثر دونوں مربوط چیزیں ہیں۔ لہذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ حتی الامکان قرآن پاک کی اشاعت میں حصہ لے۔ قرآن پاک خود پڑھیں و پڑھیں کو پڑھائیں اس کے مطابق عقیدہ درست کریں اور دوسروں تک بھی اس کو متعدی بنائیں۔

تکالیف پر صبر کریں

آگے فرمایا: **فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ** آپ اپنے رب کے حکم کے سامنے صبر کریں۔ رب کا حکم یہ ہے کہ قرآن کریم کی نشر و اشاعت میں حصہ لیں۔ اس سلسلہ میں آپ کو مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑے گا، کیونکہ **إِنَّا سَنُلْقِيْكَ عَلَيْهِمْ قَوْلًا ثَقِيلًا** ہم ایک بوجھل بات آپ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے لیے پہلے سے تیاری کریں۔ بوجھل بات قرآن پاک پر عمل اور اسے دوسروں تک پہنچانا ہے اور اس راستے میں مشکلات پیش آنے پر صبر کی تلقین کی جا رہی ہے۔ کفار کی بدزبانی ان کے یہودہ اعتراضات، ان کے ساتھ لڑائی، قرآنی پروگرام کی ناکامی کی کوشش وغیرہ ایسے امور ہیں جن کے لیے صبر و استقامت کی ضرورت ہے سورۃ عصر میں فرمایا: **إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصُوا بِالحَقِّ وَتَوَّصُوا بِالصَّبْرِ** آخرت میں خسار نہ پہنچنے کیلئے یہ چار نعمتی اصول بتائیے یہ اصول رہائی کے ہول کا طرح مستقل میں حیرت رانی کا اصول غلط ثابت نہیں ہوتا، دو اور دو چار ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ چار اصول یعنی ایمان، اعمال صالحہ، حق کی تلقین اور صبر بالکل اٹل ہیں۔ انہیں

میں صبر ایک اصول ہے۔ جو غلط نہیں ہوتا۔ لہذا ہر مصیبت پر صبر کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اُمّی النَّاسِ اَشَدُّ بِلَاءً قَالَ اَلْاَنْبِیَاءُ یعنی سب سے زیادہ مصیبتیں اللہ کے نبیوں پر آئیں۔ اور اس کے بعد ان پر جو نبیوں کے قریب تھے۔ جتنا کسی کو نبی کی اتباع میں حصہ ملا اسی قدر اسے تکالیف آئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے یُفْتَنُ الرَّجُلُ عَلَى قَدْرِ دِينِهِ ہر شخص کو اس کے دین کے مرتبے کے مطابق آزمایا جاتا ہے۔ جو آدمی دین میں مضبوط ہوتا ہے، اس پر آزمائش بھی سخت آتی ہے۔ اگر کوئی دین کے معاملے میں کمزور ہے تو اس پر آزمائش بھی کم آتی ہے۔ الغرض اشاعت دین ایک متحدی فریضہ ہے اور ملت ابراہیمی کا ایک اہم اصول ہے۔

منکرین کی بات
نہ مانیں

فرمایا کہ اس اعلیٰ و ارفع اصول کے مقابلے میں وَلَا تَطْعَمْنَهُمْ اِثْمًا اَوْ كُفْرًا آپ ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکر گزار کی بات نہ مانیں۔ ابوہریر، ولید ابن مغیرہ، عتبہ جیسے لوگ آپ کو تبلیغ دین سے باز رکھنا چاہتے ہیں، سورۃ نون میں ذکر ہے "وَدُّوا لَوِ تَدْهِنُ فِیْ دِهْنُوْنَ" وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ان معبودوں کو برا بھلا نہ کہیں۔ شرک و کفر کی تردید نہ کریں۔ آپ اپنی پوجا پاٹ کرتے رہیں۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ اس قسم کی پارٹی کی بات نہیں ماننی اسلام کے پروگرام کو ترک نہیں کرنا، توحید کی اشاعت لازمی ہے۔ کفر کے ساتھ کسی صورت بھی مصالحت نہیں کرنی۔ لہذا گنہگار اور ناشکر گزار، کوئی چھوٹا بویا بڑا، دین کے اصولوں پر سمجھوتا نہیں کرنا ہے۔ خدا تعالیٰ نے ولید ابن مغیرہ جیسے لوگوں کو مال و دولت عطا کی ہے، لاکھوں میں کھیلے ہیں، مگر پھر بھی وہ شکر گزار ہونے کی بجائے اللہ کے دین کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہذا اے نبی کریم! آپ ان تمام مصائب پر صبر و شکر کریں اور ایسے کسی گنہگار، پاپی یا ناشکر گزار کے کہنے میں نہ آئیں۔

اشاعت قرآن کے متعلق فریضہ عام بیان کرنے کے بعد فریضہ خاص کا ذکر کیا جس کا تعلق خاص اپنی ذات سے ہے۔ فرمایا وَ اذْكُرْ اِسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاٰخِرًا صبح و شام اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیں یہ تمام پریشانیوں اور مصائب کا علاج ہے۔ نیز فرمایا وَمِنْ

صبح و شام
ذکر الہی کریں

النَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ اور رات کے وقت اپنے رب کے سامنے سجدہ ریزہ ہوں۔ اس آیت کو مفسرین کرام دو معنوں پر محمول کرتے ہیں۔ اس کا ایک معنی تو پانچ نمازیں ہیں بُكْرَةً وَأَصِيلًا یعنی صبح اور پچھلے پہر۔ اس میں صبح، ظہر اور عصر کی تین نمازیں آتی ہیں۔ وَمِنَ النَّيْلِ میں مغرب، عشاء اور ہتجد کی نمازیں آتی ہیں۔ تہجد کی نماز اگرچہ امت کے لیے فرض نہیں مگر سنت اور سب سے مقدس نماز ہے تو فرمایا کہ نماز ادا کرتے رہیں تاکہ اللہ کے ساتھ تعلق قائم رہے۔ جب تعلق باللہ درست ہو جائے گا۔ تو مصائب ہلکے ہو جائیں گے، پریشانیاں کم ہو جائیں گی اور آپ تکالیف کا مقابلہ اچھے طریقے سے کر سکیں گے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ یعنی صبر و نماز کے ساتھ مدد چاہو۔ جب بھی کوئی تکلیف پہنچے، اس کا مقابلہ صبر اور نماز کے ساتھ کرو۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے۔ جس میں خدا تعالیٰ کا سب سے زیادہ ذکر ہے۔ اسی لیے فرمایا أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔ نماز، دل، زبان اور اعضا کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی یاد ہے۔ انسان طہارت کے ساتھ مودب ہو کر اللہ کے حضور کھڑا ہو کر اس کی حمد و ثنائیاں کرتا ہے تو اس کا دل اللہ کی تعظیم سے لبریز ہوتا ہے۔ اگر یہ چیزیں تم میں پیدا ہو جائیں تو مصائب کا مقابلہ بہتر طریقے پر کر سکو گے نماز ام العبادات المقربہ ہے۔ یہ انسان کو اللہ کے سب سے زیادہ قریب کرنے والی عبادت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری وقت میں فرمایا الصَّلَاةُ وَمَا مَلَكَتْ يَمَانُكُمْ یعنی نماز کا خیال رکھنا اور غلام اور کمزور طبقے کا خیال رکھنا، ان پر ظلم نہ کرنا، یہ آپ کی آخری وصیت تھی۔ گویا نماز میں اللہ کا ذکر، تسبیح اور تعظیم ہوتی ہے۔ انجبات اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سحر و جادو ہوتا ہے۔ اور یہ اعلیٰ درجہ کی روحانیت ہے۔ اس کے علاوہ نماز کے دنیوی فوائد بھی ہیں۔ مجملہ ان کے مساوات، طہارت، وقت کی پابندی، اتحاد و فکر جیسے فوائد حاصل ہیں۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لہذا نماز ایک بہت بڑی چیز ہے۔

وَاذْكُرْ سَمَ دَرِيكَ کا دوسرا مفہوم مفسرین یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد صرف نمازیں نہیں، بلکہ عام ذکر مراد ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس زمانے میں یہ سورتیں نازل ہوئیں، اس

زمانے میں پانچ نمازیں تو فرض نہیں تھیں۔ فجر، عصر اور رات کی صرف تین نمازیں تھیں۔ پانچ نمازیں معراج کے موقع پر نبوت کے دسویں سال میں فرض ہوئیں۔ لہذا ذکر سے مراد خدا تعالیٰ کا عام ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کرنا خود خدا تعالیٰ کا ذکر ہے، خدا تعالیٰ کی ذات تو بلند و بڑا ہے۔ انسان کی براہ راست اس تک رسائی نہیں لہذا اس کا نام اور اس کی صفات کے ذکر کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے اِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ اِسْمًا مَّا اِلَّا وَاحِدَةٌ مِّنْ اَحْصٰهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ننانویں اسمائے پاک ہیں۔ جس نے ان کو یاد کیا، ان کا ورد کرنا رُحمت میں داخل ہوگا۔

قرآن پاک میں آتا ہے کہ کافر لوگ رحمان کے نام سے بدکتے ہیں۔ کہتے ہیں وَمَا الرَّحْمٰنُ رحمان کون ہے، وہ اللہ کے لفظ سے تو واقف تھے مگر رحمان سے ناواقف تھے۔ قرآن پاک میں آتا ہے وَكَلِمَةُ الْاِسْمِ الْحُسْنٰی اللّٰهُ تَعَالٰی کے بہت سے اسمائے حسنہ ہیں۔ اُسے جس نام سے بھی یاد کرو گے، وہ راضی ہوگا۔ رحیم، کریم، مہربان، بخشنے والا، رزاق، رحمان بہت سے اسمائے پاک ہیں۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد اس کی رضا کا ذریعہ ہے۔ ذاتی نام صرف اللہ ہے، باقی سب صفاتی نام ہیں۔ تو فرمایا، پچھلے پہر بھی صبح بھی اور رات کی گھڑی میں بھی اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کرو۔ جس کے متعلق قرآن پاک میں تفصیل موجود ہے۔

ہر عبادت کی کوئی نہ کوئی حد (LIMIT) ہوتی ہے۔ مثلاً نماز خاص وقت پر ادا ہوگی اور رے مقررہ مہینہ میں فرض ہیں، حج کا وقت معین ہے، زکوٰۃ کا نصاب مقرر ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک ایسی عبادت ہے جس کے لیے زمان و مکان کی کوئی حد مقرر نہیں یہ ہر وقت ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ارشادِ باری ہے اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا۔ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو۔ منہ شریف کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر کثرت سے یاد کرو کہ دیکھنے والے پاگل کہنے لگیں حضور علیہ السلام ایک سفر پر تھے۔ ایک پہاڑ کو دیکھ کر فرمایا۔ سَيْرُوْا هٰذَا جَبْدًاۙ یعنی یہ جہان پہاڑ ہے سَبَقَ الْمُفْرِدُوْنَ چلے چلو!

مفرد لوگ سبقت لے گئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! مفرد لوگ کون ہیں۔ فرمایا مُسْتَهْتَدُونَ فِي ذِكْرِ اللَّهِ یعنی اللہ کے ذکر میں فریقہ ہونے والے یعنی کثرت سے ذکر الہی کرنے والے۔ قیامت کے روز کثرت ذکر بوجھ کو ہلکا کر دے گا۔ ایسے لوگ ہلکے پھلکے گزر جائیں گے۔ اللہ کے ذکر سے روگردانی کرنے والے اپنے آپ کو سخت بوجھل محسوس کریں گے۔

ایک اور حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ مَا مِنْ شَيْءٍ أَحْبَبَ إِلَى اللَّهِ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ اللہ کے نام سے نجات دینے والی چیزوں میں سب سے بڑھ کر اللہ کا ذکر ہے۔ ایک دوسری حدیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر وہ مجلس جس میں مومن اللہ کا ذکر نہیں کرتا اور آپ پر درود نہیں پڑھتا، وہ مجلس اُس کے لیے قیامت کے روز حسرت کا باعث ہوگی۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی مجلس کی ابتداء بھی اللہ کے ذکر سے ہوتی تھی اور اس کا اختتام بھی اُس کے ذکر سے ہوتا تھا۔

اسی لیے فرمایا کہ صبح و شام اپنے رب کے نام کا ذکر کریں۔ اور رات کے وقت اس کو سجدہ کریں۔ رات کے وقت میں تہجد کی نماز بھی داخل ہے اگرچہ یہ فرض نہیں ہے۔ تاہم نفل نمازوں میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے بہت سے فضائل ہیں۔ سورۃ منزل میں تفصیل موجود ہے اس کے بعد فرمایا وَسَبِّحْهُ كَثِيرًا وَأُولَئِكَ رِجَالُ الَّذِينَ لَا مُجَازَاةَ لَهُمْ اس کی تفسیر بیان کریں۔ نیند میں زیادہ وقت صرف نہ کریں۔ بلکہ اپنے رب کی تسبیح اور پاکی بیان کرتے رہیں اس کا نتیجہ آخرت میں نکلے گا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی والدہ فرماتی تھیں يَا بَنِيَّ لَا تَكْثُرُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ یعنی رات کو نیند زیادہ نہ کیا کرو۔ کیونکہ قیامت کے روز زیادہ نیند انسان کو محتاج بنا دے گی۔ ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس شخص کی مثال گدھے کی ہے۔ جو رات کو غروب آفتاب کے ساتھ سو گیا حتیٰ کہ سورج طلوع ہو گیا۔ نہ بیدار ہوا، نہ اللہ کا ذکر کیا، نہ نماز پڑھی۔ اگر رات کو اٹھ کر نماز پڑھتا، ذکر الہی کرتا، اُسی تسبیح بیان کرتا تو اس کے لیے

کفایت ہوتی۔

دنیا کی محبت ہر برائی
کی جڑ ہے

اس کے بعد وہ وجہ بیان کی جس کی بنا پر مشرکین اور منکرین اسلام کے پروگرام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اسے قبل کرنا چاہتے ہیں فرمایا اِنَّ هَؤُلَاءِ يَخْتَصِمُونَ الْعَاجِلَةَ یہ لوگ دنیا کی زندگی سے محبت رکھتے ہیں۔ مابعد جلد ہی آنے والی چیز کو کہتے ہیں۔ دنیا چونکہ آخرت کی نسبت جلدی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لیے اسے عاجلہ کہا گیا ہے فرمایا وَيَذُرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا یہ لوگ اپنے پیچھے قیامت کا بوجھل دن چھوڑ رہے ہیں۔ دنیا کی ایسی محبت جو انسان کو صحیح عقیدے، فرائض اور عمل سے غافل بنائے، وہ مہلک ہے۔ یہی تشریف کی روایت میں ہے حُبُّ الدُّنْيَا دَأْسٌ كُلِّ خَطِيئَةٍ ہر گناہ کی جڑ اور بنیاد دنیا کی محبت ہے۔ انسان ہر وقت حب دنیا میں منہمک ہے اسے قیامت کی فکر ہی نہیں۔ اس زمانے میں دنیا کا عام ماحول یہی ہے۔ دنیا کے پیچھے بھاگ رہے ہیں متمدن ممالک ہوں یا غیر متمدن، روس اور چائنا ہوں یا امریکہ اور فرانس ہر جگہ دنیا کی محبت کا فرما ہے آخرت کا کسی کو فکر نہیں۔ بلکہ جدید تمدن نے ایسا کام خراب کر دیا ہے۔ کہ انسان جو بیس گھنٹے کھیل تماشے میں مشغول ہے۔ اور آخرت کا تصویر تک اذہان سے نکل چکا ہے۔ ٹیلیوژن، سینما، پچھرا آرٹ گیلری کی طرف رجوع ہے۔ فحش گانے، یہودہ باتیں اور لغویات اس کے ذہن پر سوار ہیں۔ آخرت سے غافل ہے۔ یہ جدید تہذیب ترقی کی بجائے تنزل کا پیش خیمہ ہے۔ یہ تمدن خدا فراموشی کا تمدن ہے۔ اکثر لوگ دنیا کی ایسی ہی محبت میں مبتلا ہیں۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمًّا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا اس دنیا کو ہمارا بڑا مقصود اور مبلغ علم نہ بنا۔ دنیا کی مثال تو ایک گزر گاہ یا پل کی ہے۔ جس نے یہاں پر نیچی اور ایمان کا سودا خریدا اور آگے کی فکر کی، اسے کامیابی حاصل ہوگی۔ جو دنیا کی محبت میں منہمک ہو گیا، وہ ناکام ہو گیا۔

دنیا کی محبت کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اگر انہیں محاسبے کا یقین ہو کہ ایک دن باز پرس ہوگی تو یہ لوگ مخالفت سے باز آجائیں اور آخرت کی فکر کرنے لگیں۔

درس پنجم ۵

(آیت ۲۸ تا ۳۱)

نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَلَهُمْ تَبْدِيلًا ۚ (۲۸)
 إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمِنْ شَاءِ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۚ (۲۹) وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا
 أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۚ (۳۰) يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ
 وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۚ (۳۱)

ترجمہ

ترجمہ :- ہم نے ہی انسانوں کو پیدا کیا اور ان کی جوڑ بندی کو مضبوط کیا۔ اور جو ہم چاہیں
 گے ان کی جگہ ان جیسے اور لے آئیں گے (۲۸) بیشک یہ یاد دلانے والی باتیں ہیں۔ پس جو چاہے اپنے
 رب کی طرف راستہ پکڑ لے (۲۹) اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ — کہ اللہ چاہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ
 علیم اور حکیم ہے (۳۰) اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اپنی رحمت — میں داخل کرتا ہے۔ اور
 ظالموں کے لیے اُس نے عذاب الیم تیار کیا ہے (۳۱)

اس پہلے یہ بیان ہوا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا۔ اور یہ کلام الہی ہے
 اس کے منکرین متعصب اور عنادی لوگ ہیں جو محض ضد اور عناد کی وجہ سے مخالفت کرتے ہیں۔ لہذا
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والوں کو صبر کا پیغام دیا گیا۔ اور حکم ہوا کہ کسی گنہگار اور
 ناشکر گنہگار کی بات نہ مانیں، کیونکہ وہ قرآن کریم کے پر وگرم کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ آپ اپنے رب
 کے نام کا ذکر کرتے رہیں۔ اُس کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور اس کی تسبیح بیان کریں۔ ایسا کرنے
 سے آپ کا دل مضبوط ہوگا۔ اور اللہ کے ساتھ تعلق درست ہوگا، روحانی ترقی حاصل ہوگی، اللہ
 تعالیٰ کا قرب نصیب ہوگا۔ اور اس کے مقابلے میں تمام تکالیف ہیچ نظر آئیں گی۔

منکرین کے انکار کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا اِنَّ هَؤُلَاءِ يُحِبُّوْنَ الْعٰلٰجِلَةَ یہ دنیا سے
 محبت کرنے والے لوگ ہیں یہ محض دنیوی زندگی کو دیکھتے ہیں اور اُسی کو پسند کرتے ہیں، دنیا
 کی محبت ان کے دلوں میں رچی بسی ہے اور آخرت پر ایمان بالغیب نہیں رکھتے یہی وجہ ہے۔ کہ
 توحید انبوت قرآن اور قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ دنیا کی محبت انسان کو آخرت سے غافل بنا
 دیتی ہے۔ نیز فرمایا کہ ان کا انکار کچھ معنی نہیں رکھتا۔ یہ بالکل بے وقوفی کی بات کرتے ہیں۔ قیامت

کا وقوع بالکل ایسا ہی ممکن ہے جیسا مشاہدے میں آنے والی چیزیں لپٹنی ہوتی ہیں۔ فرمایا تم اپنی پیدائش سے کیوں انکار نہیں کرتے۔ جب کہ اپنے وجود کو خود محسوس کر رہے ہو۔ پہلے کچھ نہ تھے۔ پھر پیدا ہوئے۔ بڑے ہوئے، مگر دو واپس کی تمام چیزیں تمہارے سامنے ہیں۔

انسان اپنے سامنے تمام حوادث کو دیکھ رہا ہے۔ ایک موسم میں زمین خشک ہوتی ہے دوسرے موسم میں بارش ہوتی ہے۔ زمین سیراب ہوتی ہے۔ سبزی اور اناج پیدا ہوتا ہے پودے اور درخت اُگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اشارتاً سمجھائی کہ ان تمام چیزوں کا مشاہدہ کرنے کے باوجود انسان قیامت کا کیوں انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی پیدائش کا انکار نہیں کرتے۔

پھر دیکھو! اللہ تعالیٰ نے کس طرح انسان کو وجود بخشا "فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ" خدا تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ جس نے انسان کو حقیر قطرہ آب سے پیدا کیا۔ اس مضمون کو مختلف مقامات پر بیان فرمایا۔ اس سورۃ کے آغاز میں بھی آیا ہے "إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ" ہم نے انسان کو مرد و زن کے ملے جلے مادے سے پیدا کیا۔ اگلی سورۃ میں "مِنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ" آ رہا ہے یعنی حقیر قطرہ آب سے تخلیق کیا۔ اسے سمیع و بصیر بنایا تو کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اسے دوبارہ لوٹائے "بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلْقُ الْعَلِيمُ" کیوں نہیں؟ وہ تو عظیم خالق ہے۔ جب چاہے گا، انسان کو لوٹائے گا۔ بالکل اسی طرح "کَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ" جس طرح ابتداء میں مخلوق کو پیدا کیا۔ قیامت کے روز یہی لوگ اسی وجود اور انہی عناصر کے ساتھ موجود ہوں گے۔ جزائے عمل قطعی طور پر لپٹنی ہے۔

فرمایا "نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ" ہم نے انسانوں کو پیدا کیا۔ اور جب چاہیں گے دوبارہ اٹھا دیں گے۔ کافر کہتے ہیں کہ اگر قیامت حقیقت ہے۔ تو پھر آتی کیوں نہیں؟ ہم نے تو مر کر کسی کو دوبارہ جی اٹھتے نہیں دیکھا۔ تو یہ ان کی نا سمجھی کی بات ہے۔ ہر چیز اپنے وقت اور موسم پر پیدا ہوتی ہے "قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا" اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔ اُسی کے مطابق تمام کام انجام پاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کہے کہ موسم بہار سے پہلے درخت کیوں نہیں پھوٹتے ان کے پتے اور شاخیں کیوں نہیں نکلتیں، تو یہ اس کی بیوقوفی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت برپا کرنے کے لیے بھی ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ "لَا يُجِئُهَا لَوْقْتُهَا إِلَّا هُوَ" اُسے وہ اپنے وقت پر ہی ظاہر کرے گا۔ قبل از وقت کوئی کام نہیں ہوگا۔ جس طرح ایک فرد

اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے

واحد کی پیدائش اور اس کی موت کا وقت مقرر ہے۔ اسی طرح تمام عالم کی موجودگی اور پھر اس کے فنا کا وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آئے گا۔ تمام جہان فنا ہو جائے گا۔ اور پھر جب اللہ کا حکم ہوگا، دوبارہ قائم ہو جائے گا۔

فرمایا خَنْ خَلَقْتَهُمْ ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا، کوئی اور پیدا کرنے والا نہیں ہے۔
 ”اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ“ ہر چیز کا خالق اللہ ہے۔ یہ تو کافر اور مشرک بھی تسلیم کرتے ہیں۔ آپ ان سے پوچھیں کہ انسان کو اور ساری کائنات کو کس نے پیدا کیا، کہیں گے، اللہ نے پیدا کیا۔ ہندو کہے گا۔ بھگوان نے یا ایشور نے پیدا کیا۔ ہر مذہب کا پیروکار اپنی اپنی زبان میں خدا کا نام لے گا۔ اس لحاظ سے تمام مذاہب والے متفق ہیں۔ سوائے دہریوں کی ایک قلیل تعداد کے، جو اللہ تعالیٰ کی مہمتی کو بھی نہیں مانتے تاہم باقی تمام ملل والے اللہ تعالیٰ کو خالق مانتے ہیں۔

انسانی جسم کی جوڑ بندی

فرمایا انسان کو پیدا کیا وَشَدَدْنَا أَسْوَہُمْ اور ان کی جوڑ بندی کو مضبوط کیا۔ اُسے کا معنی ضبط، اگر فٹ یا کچڑ ہوتا ہے۔

اسیر اسی لیے قیدی کو کہا جاتا ہے۔ کہ اُسے کچڑ لیا جاتا ہے۔ بٹیریاں ڈال دی جاتی ہیں یا رسیوں سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اُسے عربی زبان میں پیشاب بند ہو جانے کی بیماری کو کہتے ہیں۔ تو اس کا معنی ہے باندھنا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا دیکھو! ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور ان کی جوڑ بندی مضبوط بنائی ہے۔ یعنی اس کے اعضاء، اعصاب، پٹھے اور اس کے رباط کمال درجے کے پیدا کئے ہیں ہر جوڑ کو دوسرے کے ساتھ باندھنے کے لیے کمال درجے کے تسھے بنائے ہیں۔ انسانی جوڑ بندی میں ایسا مادہ رکھا ہے، جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ یہ مٹینیں ہیں۔ کچھ عرصہ تک ان کے پرزے چلتے ہیں، پھر گھس جاتے ہیں، ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور مٹین ناکارہ ہو جاتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جسم انسانی کی ایسی مٹیری تیار کی ہے جو اسی سال، سو سال بلکہ بعض اوقات ڈیڑھ سو سال تک چلتی رہتی ہے۔ انسانی اعضاء آپس میں اس قدر مربوط اور مضبوط ہوتے ہیں کہ لمبے عرصہ تک کام کرنے کے باوجود ان میں خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ ان کے درمیان گریس نما مادہ پیدا کیا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ الغرض تمام انسانی قوی کمال اعتدال کے ساتھ پیدا کئے ہیں۔

انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص رات گزار کر صبح کرتا ہے۔

اور صحت و سلامتی کے ساتھ اٹھتا ہے، اس کے ہر ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہوتا ہے۔ انسان کے جسم میں کل تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، ہر جوڑ دوسرے کے ساتھ بندھا ہوا ہے، ایک ہڈی دوسرے کے ساتھ مرتبط ہے۔ پھر فرمایا، ہر آدمی اگر ایک ایک پیسہ فی جوڑ بھی صدقہ کرے تو ہر روز کتنا خرچ کرنا ہوگا۔ جس کی ہر انسان طاقت نہیں رکھتا۔ فرمایا جب کوئی انسان کوئی پاکیزہ کلمہ زبان سے نکالتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔ تسبیح کہتا ہے۔ سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر یا لا الہ الا اللہ کہتا ہے، کوئی نصیحت کی بات کرتا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتا ہے تو یہ سب اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے، اگر یہ بھی میسر نہ ہو، تو فرمایا چاشت کے وقت دو نفل ہی پڑھ لیں، وہ بھی صدقہ بن جائیں گے۔ چاشت کا وقت تو دس بجے کا وقت ہوتا ہے جب دھوپ خوب اٹھ جاتی ہے۔ سورج نکلنے کے جلدی بعد جو نوافل ادا کئے جاتے ہیں، انہیں اشراق کہا جاتا ہے۔ تاہم چاشت کا وقت بعد میں ہوتا ہے۔ اسے صبحی کا وقت بھی کہتے ہیں۔ اسی کو صلوٰۃ الاولیٰ بھی کہا جاتا ہے۔ الغرض یہ دور کعت پڑھ لینا، تمام اعضا کا صدقہ بن جاتا ہے۔ انسان کو پیدا کرنے اور اس کی جوڑ بندی کرنے والے خداوند قدوس کا ارشاد ہوتا ہے۔

بعث بعد الموت

قَدْ أَشْتَنَّا جِبْہِمَ چاہیں گے بَدَلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا۔ ان کی جگہ ان جیسے اور لے آئیں گے۔ یعنی جب انسان مر کر فنا ہو جائیں گے۔ تو ان جیسے وجود دوبارہ لے آئیں گے، ان کے عناصر بھی ایسے ہی ہوں گے، اسی طرح کا ظاہر باطن ہوگا، گویا بعث بعد الموت کا وعدہ پورا ہو جائے گا اگر انسان کی تخلیق اور اس کی جوڑ بندی ہمارا کام ہے، تو اتنیں دوبارہ زندہ کر دینا بھی ہماری قدرت کاملہ میں ہے۔ ہم ان کو ضرور دوبارہ لے آئیں گے یہ خواہ مخواہ قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس انکار کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

بُرے لوگوں کے
بدلے اچھے لوگ

بَدَلْنَا أَمْثَالَهُمْ کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے۔ کہ اگر یہ کفار و مشرکین اپنی رفیل حرکتوں سے یاز نہ آئے، تو ہم ان لوگوں کی جگہ دوسرے اچھے لوگ پیدا کر دیں گے۔ دوسری قوموں کو کھڑا کر دیں گے۔ جو فرمانبردار ہوں گی۔ یہ لوگ جن کو آج مال و دولت، اہل و اولاد اور جاہ و اقتدار نصیب ہے، یوں نہ سمجھیں کہ یہ ہمیشہ اسی طرح رہیں گے، بلکہ فرمایا جب ہم دیکھیں گے کہ ان کے ظلم حد سے بڑھ رہے ہیں۔ تو ان کی جگہ دوسروں کو تبدیل کر دیں گے۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ

نے سورۃ قتال میں یوں بیان فرمایا "وَأَن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبَدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَلَكُمْ" یعنی اگر تم روگردانی کرو گے ہدایت کے راستے سے ہٹ جاؤ گے۔ تو ہم تمہاری جگہ دوسری قوم کو لا کھڑا کریں گے۔

چنانچہ ایسے ہی ہوا، مکے کے قریش جو اسلام کے بدترین دشمن تھے، اُن کو اللہ تعالیٰ نے نابود کر دیا اور اُن کی جگہ انصارِ مدینہ کو کھڑا کر دیا، جو اسلام کے سچے شیدائی تھے۔ عربوں کی جگہ غمیوں کو پیدا کیا جب عربوں میں صلاحیت باقی نہ رہی تو اقتدار سلجوقیوں کے پاس منتقل کر دیا، جب وہ بھی اس امانت کا بار اٹھانے کے قابل نہ رہے تو ترک آگئے اور اسلام کا جھنڈا ختم لیا۔ تو فرمایا، قوموں کا یہی حال ہے۔ جب ایک قوم اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے، تو اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔

افراد کا بھی یہی حال ہے۔ جو افراد، انفرادی طور پر حق کی مخالفت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی بجائے بہتر افراد کو لے آتا ہے۔ مکہ کے لوگوں میں سے بعض سخت دشمن تھے جن میں ابو جہل سرفراز ہے۔ ولید ابن مغیرہ بھی سخت کینہ پرور تھا۔ اللہ نے اُسے بڑا دولت مند بنایا تھا۔ کروڑوں روپے کا کاروبار تھا، ہزاروں جانور تھے، طائف میں باغات تھے، دس جوان بیٹے تھے جن پر فخر کرتا تھا۔ خاندان قریش میں عتبہ بھی نامور شخص تھا، جو جنگ بدر میں مارا گیا۔ اُس کی جگہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے بیٹے خذیفہؓ کو مامور کیا۔ جو مہاجرین اولین میں سے ہے۔ اعلیٰ درجے کا فریوردار اور مطیع تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو اسلام کا شیدائی بنایا۔

ولید ابن مغیرہ کی جگہ اس کا بیٹا خالدؓ آیا۔ یہ وہی خالد بن ولید ہے۔ جسے حضور علیہ السلام نے سَيْفٌ مِّنْ سَيُوفِ اللّٰهِ یعنی اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار کا خطاب دیا۔ انہوں نے یرموک اور قادسیہ کی جنگوں میں فتح حاصل کی۔ اسلام کے اس قدر فدائی تھے کہ ساری جائداد اللہ کے راستے میں وقف کر دی اور اپنے لیے کچھ باقی نہ رکھا، اس قسم کے جذبہ ایمان کے حامل تھے۔ ابو جہل جیسے دشمن اسلام کا بیٹا عکرمہؓ ایمان لایا تو ہر معاملہ میں پیش پیش تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں جو جنگیں ہوئیں، اُن میں حضرت عکرمہؓ اول نمبر پر تھا۔ آخر کار قادسیہ کے بعد ایک معرکہ میں جام شہادت نوش کیا۔

بَدَلْنَا أَمْثَلَهُمْ كَمَا مَنُومَ يَهِي هُوَ سَكُنَا هَبْ كَمَا شَكَلِيں نِي تَبْدِلُ اِنَا نِي شَكَلُوں كِي تَبْدِلُ

کہہ دیتا ہے۔ قرآن پاک میں مذکور ہے کہ جب کوئی قوم نافرمانی میں حد سے تجاوز کرتا جاتی ہے، تو یہاں اوقات اللہ تعالیٰ ان کی شکلیں تبدیل کر دیتا ہے۔ بنی اسرائیل کا حال پڑھ لیں "وَأَسْأَلُهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِيَةَ الْبَحْرِ دِرْيَاسًا سِتَّةً وَالْوَلَدُ كَيْسٌ سَلَمٌ" کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا سلوک کیا تھا۔ وہ لوگ بڑے سازشی اور نافرمان تھے۔ بنیوں کے مخالف اور قانون خداوندی کو توڑنے والے تھے۔ ان کا کیا حشر ہوا "فَلَمِنْهُمْ الْقَرْيَةُ وَالْخَنَازِيرُ" ان کو بندروں اور سوروں کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ اس امت میں بھی ایسا ہی ہو گا، مگر نہایت قلیل۔ حضور علیہ السلام نے قیامت کی نشانیوں میں ایسے واقعات کی نشاندہی فرمائی۔ نیز فرمایا کہی انسان زمین میں دھنس جائیں گے جیسا قارون دھنس گیا تھا۔ اور اسی طرح شکلیں بھی تبدیل ہوں گی۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب انسان شتر ثالث میں داخل ہو جائیں گے، تو شکلیں تبدیل ہونا شروع ہو جائیں گی۔ شتر ثالث سے مراد یہ ہے کہ ظاہر و باطن دونوں خراب ہو جائیں۔ شتر تین قسم کے ہیں۔ شتر اول معمولی نوعیت کا ہے۔ ہم لوگ اوسط طبقے کے شتر ہیں مبتلا ہیں اور جب شتر ثالث آئے گا تو شکلوں کی تبدیلی میں بھی دیر نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے بعض واقعات کی نشاندہی فرمائی اور حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں بھی بعض ایسے ہی واقعات پیش آئے اور یہ آئندہ بھی آسکتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا "وَإِذَا شِئْنَا بِدَلٍّ كُنَّا أَهْلًا لَهُمْ تَبْدِيدًا" جب ہم چاہیں گے، ایسے دشمنان کی شکلیں بھی تبدیل کر دیں گے۔

سورۃ کے آخری حصہ میں قرآن پاک کا ذکر کیا۔ اور فرمایا "إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ يَوْمَ يَدْعُوكَ" والی یا نصیحت کی باتیں ہیں ہذہ کا اشارہ ان آیات کی طرف ہے۔ جو اس سورۃ مبارکہ میں نازل کی گئی ہیں۔ یا جو باقی سورتوں میں نازل ہوئیں۔ یہاں تَذْكِرَةٌ کا لفظ آیا ہے، کہیں فرمایا "هَذِهِ بَصَائِرٌ" یعنی یہ بصیرت پیدا کرنے والی چیزیں ہیں ان آیات کو پڑھ کر دل و دماغ میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ ایمان کی دولت اور کمال درجے کی روحانیت نصیب ہوتی ہے۔ فرمایا یہ آیت کسی قوم کا رسم و رواج یا بردار کی باتیں نہیں ہیں بلکہ تَذْكِرَةٌ یعنی یاد دلانے والی نصیحت کی باتیں ہیں۔ آج کل عربی زبان میں ہذا کہہ ریل یا بس کے ٹکٹ کو کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی یاد دہانی

قرآن پاک
یاد دہانی ہے

ہوتی ہے۔ کہ یہ شخص بس یا ریل میں سفر کر سکتا ہے۔ ایک قسم کی سند ہوتی ہے۔

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مبادیٰ معاد اور وسط تینوں چیزوں کا ذکر فرمادیا۔ مبادیٰ سے مراد انسان کی ابتداء ہے۔ کہ انسان ”لَوْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا“ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا۔ اور پھر اسے سمیع و بصیر بنایا۔ تو انسان یا تو شکر گزار بن کر جنت کی نعمتوں سے مالا مال ہوتا ہے۔ یا ناشکر گزار بن کر کے ازنجیروں، طوق اور بڑھکتی ہوئی آگ کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں اس قرآن پاک میں نازل فرمائی تاکہ انسان نصیحت پکڑے۔

مجملہ ان کے اللہ تعالیٰ نے اور بھی کئی پاکیزہ اصول بیان فرمائے۔ ابراہیم کی صفات کے طور پر فرمایا ”يُطْعَمُونَ الطَّعَامَ“ وہ غریب پروری کرتے ہیں۔ یہ اصول ایک طرف دینی ترقی کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف قرب خداوندی کا ذریعہ ہے۔ محض خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتا، ان کے ساتھ مہردی کرنا کمال درجے کا اصول ہے۔ اسی طرح ایک اور اصول بیان فرمایا ”وَإِذْ كُنَّا نَسْمُرُ بِكَ“ یعنی اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہو یہ بہت بڑا وظیفہ ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ”وَلَذِكُرُّهُ اللّٰهُ اَكْبَرُ“ اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے۔ نیز فرمایا ”وَادْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ“ خدا تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔ تاکہ نجات حاصل کرو۔ اسی طرح تسبیح بیان کرنے کا اصول بھی بتلادیا۔ یہ سب شریعت یا وسط ہے۔ تو گویا اس سورۃ میں مبادیٰ معاد اور وسط تینوں چیزوں کا ذکر آگیا ہے۔

غیر اللہ کو سجدہ
حرام ہے

تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا ہے۔ سبحان اللہ کہنا یعنی اللہ تعالیٰ ہر عیب، نقص، ضعت، کمزوری، اولاد اور تمام چیزوں سے پاک اور مبرا ہے۔ سبحان اللہ کا لفظ جگہ جگہ قرآن پاک میں آتا ہے۔ جیسے ”سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْمٰی بَعْدَہٗ“ یا ”سَبَّحُوْہُ بِحَمْدِہٖ“ ”وَاصْبِرْ“ یعنی صبر و شام اللہ کی تسبیح بیان کرو۔ خدا تعالیٰ کو منزه اور مبرا سمجھنا اس کی توحید کا تقاضا ہے۔

اسی طرح نماز کا اصول بتایا ”وَمِنَ اللَّیْلِ فَاسْجُدْ لَہٗ“ اور رات کو اپنے رب کے لیے سجدہ کرو۔ اگلی سورۃ میں رکوع کا ذکر بھی آئے گا۔ سجدہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا آخری اور انتہائی فعل ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی تعظیمی فعل نہیں۔ اسی لیے اللہ کے سوا غیر کو سجدہ کرنا حرام ہے۔

ایک صورت میں کفر ہے اور دوسری میں حرام ہے۔ اگر غیر اللہ کو سجدہ تعظیم کے لیے کیا تو کفر لازم آیا۔ اور اگر غیر تعظیم کے محض ہوا وہی میں کیا یا رواج کے طور پر سجدہ کیا، تو بھی حرام کام مرتکب ہوا۔ لہذا کسی انسان یا کسی اور چیز کے سامنے سجدہ روا نہیں۔ یہ اصول ”قَسَّجْدُكَ“ میں واضح کیا گیا ہے۔

قرآن پاک
کا خلاصہ

سورۃ دہر درمیانے درجے کی سورۃ ہے۔ اس سے پہلے بڑی بڑی سورتیں تھیں، اور اس کے بعد بالکل چھوٹی چھوٹی سورتیں بھی آرہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں میں دین کا خلاصہ اور قرآن پاک کی تعلیمات کو مجملہ بیان فرمادیا، مبدا، شریعت اور معاد کے تمام اصول واضح کر دیے۔ قرآن پاک نازل فرما کر تمام پروگرام سمجھا دیے۔ نماز صرف اللہ کی تعظیم اور اس کے ذکر کے لیے ہے۔ فرمایا اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي۔ ہر سورۃ میں آپ کو قرآن پاک کا خلاصہ ملے گا کہ کیا کرنا چاہیے، کیا نہیں کرنا چاہیے۔ کن چیزوں سے بچنا ضروری ہے جیسے ناشکر گزاری، شرک، کفر اور معصیت وغیرہ۔ اسی طرح اللہ کی اطاعت کی تلقین کی گئی۔ عقیدہ درست کرو۔ مبدا اور معاد کو سمجھو، نماز پڑھو، تسبیح کرو۔ رب کا نام یاد کرو، انسان کے ساتھ ہمدردی کرو۔ یتیموں، مسکینوں اور اسیروں کے ساتھ احسان کرو تاکہ اللہ کے ہاں تہ و نازگی اور سرور حاصل ہو۔ یہ تمام اصول اس سورۃ مبارکہ میں بتلا دیے گئے ہیں۔

فرمایا یہ تذکرہ اور نصیحت فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ ذِيهِ سَبِيلًا پس جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ پکڑے۔ اس میں جبر و اکراہ نہیں بلکہ یہ انسان کے اپنے فائدے کی بات ہے ہاں البتہ اتنا ضرور بتا دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والا راستہ پکڑو گے تو کامیاب و کامران ہو جاؤ گے۔ اگر ناشکری کا راستہ پکڑو گے، تو جہنم میں جاؤ گے۔

انسان کا اختیار
اور اضطرار

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حد تک فعل میں مختار بنایا ہے اس پر دین ٹھونسا نہیں جائے گا۔ بلکہ اگر وہ اپنے اختیار اور ارادے سے ایمان لائے تو اسے قبول کیا جائے گا، جو کام انسان اپنے ارادے سے کرتا ہے اُسی پر مواخذہ ہوتا ہے۔ جبر و اکراہ یا اضطراری صورت میں کئے گئے فعل پر باز پرس نہیں ہوتی کیونکہ ایسی حالت میں انسان مجبور ہوتا ہے۔ رعشہ کامریض جس کا ہاتھ خود بخود کچڑا پیتا رہتا ہے اگر اس سے کوئی برتن گر کر ٹوٹ جائے تو قابل مواخذہ نہیں۔ البتہ کوئی تندرست اور صحیح سلامت شخص اپنے اختیار اور ارادے سے کوئی نقصان کچھ

گا۔ تو اس سے مواخذہ ہوگا، تاوان وصول کیا جائے گا۔ اسی لیے فرمایا فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا یہ انسان کے اپنے ارادے اور خواہش پر منحصر ہے۔ کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے اگر انسان یہ سمجھنے لگ جائے کہ وہ ہر طرح سے خود مختار ہے۔ تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ انسان خالق نہیں بلکہ مخلوق ہے۔ خود انسان کو اور اس کے اعمال کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے۔ انسان کا کام کسب ہے۔ جیسے فرمایا مَا كَسَبْتُمْ كَامَ تَوَّالِیٰنَ كَرْتَاہِ۔ مگر اس میں نفع ڈالنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ کسب کا معنی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی طاقت انسان کو دی ہے اس کے مطابق انسان عزم کرے صحیح راستہ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ فہم و بصیرت عطا کر دیتے ہیں اور اگر کوئی شخص غلط راستہ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرمیں "تَوَلَّیْہِ مَا تَوَلَّی" ہم اُسے اُدھر ہی جانے کی توفیق دے دیتے ہیں۔ بھٹکتا پھرے۔ بہر حال توفیق دینا اللہ کا کام ہے "وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ" نیک کام کی بھی توفیق منجانب اللہ ہے۔ اور اگر کوئی شخص برا ارادہ کرتا ہے تو بھی توفیق اللہ کی طرف سے ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ خالق اللہ کی ذات ہی ہے۔ انسان کو صرف کسب کی حد تک اختیار ہے۔

فرمایا یہ نہ سمجھو کہ ہم نے انسان کو بالکل ہی خود مختار بنا دیا ہے، بلکہ انسان کو اختیار ایک خاص حد تک دیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس کی مثال انسان کے سانس جیسی سمجھو کہ سانس لینے میں اختیار بھی پایا جاتا ہے اور اضطراب بھی۔ انسان اپنے اختیار سے سانس کو چھوٹا بڑا کر سکتا ہے۔ جوگی مشق کر کے پندرہ پندرہ منٹ تک سانس روکے رکھتے ہیں۔ بعض اوقات تین تین اور چھ چھ ماہ تک سانس روکے رکھتے ہیں اور زندہ بھی رہتے ہیں۔ اس کے باوجود انہیں اصل سانس پر اختیار حاصل نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان سویا ہوا ہوتا ہے، مگر اُس کی سانس بغیر ارادی طور پر جاری رہتی ہے۔ گویا اصل پر اختیار حاصل نہیں الغرض کسی چیز کی مشیت انسان کے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور جو فعل انسان اپنے عزم اور ارادہ سے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر مواخذہ ہے۔

نیک و بد کا انجام

فرمایا وَمَا تَشَاءُ وَنْ اور تم نہیں چاہو گے اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ مگر یہ کہ اللہ چاہے اِنَّ اللّٰہَ كَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا بے شک اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔ یعنی وہ سب چیزوں کو جانتا ہے۔ اور یہ سارا نظام کمال حکمت سے قائم کیا ہے۔ اگر کوئی شخص برا کام کر رہا ہے

تو اللہ نے اپنی حکمت کے ساتھ اس میں ایسا مادہ رکھا ہے۔ کہ وہ اللہ کے عطا کردہ اختیار کو خراب کرنے کے دوسرا راستہ اختیار کر رہا ہے۔ اُسے اس کا نتیجہ لازمی بھگتنا پڑے گا۔

فرمایا یَدْخُلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اپنی رحمت یعنی بہشت میں داخل کرتا ہے۔ اور چاہت اُسی کے لیے ہوگی جو اس کے عطا کردہ اختیار کو درست طور پر استعمال کرے گا۔ مشیت الہی اُسی کے حق میں ہوگی۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ اس بات کو یوں واضح کیا گیا ہے وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا جو ہماری طرف آنا چاہتے ہیں۔ ہم ضرور اُن کے لیے راستہ واضح کر دیتے ہیں اور جسے صحیح راستہ کی ضرورت ہی نہیں، ہدایت کا خواہمزد ہی نہیں تو ہم کہتے ہیں اجدھر تمہارا جی چاہے، چلے جاؤ۔ ہم اُسی طرف کی توفیق دیتے رہیں گے یہی نہیں بلکہ جب وہ غلط راستے پر پختہ ہو جاتے ہیں تو طبع اللہ علیہا بِكَفَرِهِمْ اللہ تعالیٰ اُن کے بعض وعما کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے خَتَمَ اللہُ عَلٰی قُلُوبِهِمْ وہ کفر و شرک پر اصرار کرتے ہیں۔ صحیح راستے کی طرف آنے کی اُن میں خواہش ہی پیدا نہیں ہوتی۔

لَئِنِ اللہُ تَعَالٰی ان پر ٹھپہ لگا دیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا وَالظَّالِمِينَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيمًا۔ ایسے ظالموں کے لیے عذاب الیم تیار کیا گیا ہے۔ ظالم سے مراد وہی کافر اور مشرک ہیں جیسا فرمایا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ شُرک بہت بڑا ظلم ہے۔ نیز فرمایا وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ کافر ہی ظالم ہیں انہی لوگوں کے لیے سخت ترین سزا مقرر کی گئی ہے۔



سُورَةُ الْمُرْسَلَاتِ مَكِّيَّةٌ تَرْفَعُ خَمْسُونَ آيَةً فِيهَا كَوْنُ عَانَ

سورۃ مرسلت مکی ہے۔ اور یہ پچاس آیتیں اور اس سورۃ میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو رحیم مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا ① فَالْعَصْفِ عَصْفًا ② وَالنُّشْرَاتِ نَشْرًا ③
فَالْفُرْقَاتِ فَرْقًا ④ فَالْمُلْقَاتِ ذِكْرًا ⑤ عِذْرًا أَوْ نَذْرًا ⑥ إِنَّكَ
تُوعِدُونَ لَوَاقِعَ ⑦ فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ ⑧ وَإِذَا السَّمَاءُ فُرْجَتْ ⑨
وَإِذَا الْجِبَالُ سُفِتْ ⑩ وَإِذَا الرَّسُلُ أُقْتَتْ ⑪ لَا يَوْمَ أُجِّلَتْ ⑫
لِيَوْمِ الْفَصْلِ ⑬ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمِ الْفَصْلِ ⑭ وَيْلٌ لَّيَوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِينَ ⑮

ترجمہ : ① قسم ہے ان ہواؤں کی جو چھوڑی گئی ہیں نرمی سے ② پھر قسم ہے ان ہواؤں
کی جو تیز چلتی ہیں ③ اور قسم ہے ان ہواؤں کی جو (بادلوں کو) اٹھا کر پھیلاتی ہیں ④ پھر
قسم ہے ان ہواؤں کی جو بادلوں کو پھاڑ کر جدا کر دیتی ہیں ⑤ پھر قسم ہے ان ہواؤں کی جو
نصیحت کی بات ڈالتی ہیں۔ ⑥ عذر دور کرنے کے لیے یا مجرمین کو ڈرانے کے لیے ⑦
بے شک جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے ⑧ پس جب ستارے
مٹا دیے جائیں گے ⑨ اور جب آسمان بھٹ جائے گا۔ ⑩ اور جب پہاڑوں کو اڑا دیا جائے
گا ⑪ اور جب رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا ⑫ کس دن کے لیے مہلت دی گئی ہے
⑬ فیصلے کے دن کے لیے ⑭ اور آپ کو کس نے بتایا کہ فیصلے کا دن کیا ہے ⑮
اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے ⑮

وجہ تسمیہ نازل
اور کوالف

اس سورۃ کا نام سورۃ المرسلات ہے۔ اس کی پہلی آیت میں مرسلات کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ اسی سے اس سورۃ کا نام لیا گیا ہے۔ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ مکمل سورۃ مکی ہے یعنی ہجرت مدینہ سے پہلے نازل ہوئی۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس کی بعض آیات مدنی زندگی میں بھی نازل ہوئیں۔ تاہم راجح خیال یہی ہے کہ یہ سورۃ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم حضور علیہ السلام کے ساتھ منیٰ میں مقیم تھے۔ اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک غار میں تشریف فرما تھے۔ ہم آپ کے ارد گرد جمع تھے، اس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اور ہم اسے تازہ بہ تازہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ مبارک سے سُن رہے تھے۔ اور اس کو یاد کر رہے تھے۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

اس سورۃ کی چھوٹی چھوٹی پچاس آیتیں ہیں۔ دو رکوع، ایک سو اکیاسی الفاظ، اور آٹھ سو سو ۸۱۶

حروف ہیں۔

موزی جانور کو
مارنے کا حکم

اسی منیٰ کے قیام کا ذکر ہے کہ کسی غار میں سے پتھروں کے درمیان سانپ نکلا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے مارنے کا حکم دیا۔ فرمایا اگر تم ایسے موزی جانور کو تھیں مار دو گے، تو وہ تم پر حملہ کر کے تمہیں ہلاک کر دے گا۔ اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ پانچ چیزیں موزی ہیں انہیں حرم میں بھی قتل کر دو اور احرام کی حالت میں بھی ہلاک کر دو۔ جب اور جہاں بھی موقع ملے انہیں مارنے میں تامل نہ کرو۔ ان پانچ چیزوں میں سانپ اور بچھو بھی شامل ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد کی تعمیل میں سانپ کو مارنا چاہا، مگر وہ بھاگ کر کسی سوراخ میں گھس گیا اور اپنی جان بچا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وَ قِيتُ شَرِّكُمْ كَمَا وَ قِيتُ شَيْءَهَا لَعْنِي وَ تَمَارَے شَرِّے بچا لیا گیا۔ جس طرح تم اُس کے شر سے بچا لیے گئے۔ شر اضافی چیز ہے۔ ویسے سانپ بھی اللہ کی مخلوق ہے اور وہ بھی اپنے جسم میں جان رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے مصلحت اور حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے۔ کائنات میں اُس کی بھی ضرورت ہے۔ مگر انسان کی نسبت اس کا وجود شر پر مشتمل ہے۔ اس کا شر تو یہی تھا کہ مارا جاتا

تو شر میں مبتلا ہوتا کیونکہ ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے میں مبتلا ہوتا ہے اور تمہارا اس کے شر سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ اُسے حملہ کرنے کا موقع نہیں ملے۔ اگر وہ کسی کو کاٹ ڈالتا تو تم شر میں مبتلا ہو جاتے۔ لہذا تم اس کے شر سے محفوظ رہتے اور وہ تمہارے شر سے بچا رہتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ جلیل القدر صحابہ میں سے تھے۔ حضور علیہ السلام کی خواہش تھی آپ کے چچا یعنی عبداللہؓ کے باپ حضرت عباسؓ مسلمان ہو جائیں۔ چنانچہ وہ مسلمان ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی عزت بخشی۔ حضور علیہ السلام نے ان کے لیے اور ان کی اولاد کے لیے خصوصی دعائیں پڑھائی۔ آپ خطبہ میں ہمیشہ ان کے لیے دعائیہ جملہ سنتے ہیں۔ یہ آپ کی دعا کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اولاد میں ساڑھے چھ سو سال تک خلافت قائم رکھی۔ دنیوی لحاظ سے یہ سب سے بڑا اعزاز تھا جو ان کو حاصل ہوا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے خلافت کی یہ دولت عباسیوں سے لے کر سلجوقیوں کو دے دی۔ اور پھر یہ امانت ترکوں کے پاس آئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگر قریش میں دو اشخاص بھی صاحب صلاحیت ہوں گے تو حکومت انہیں میں رہے گی مگر معلوم ہوتا ہے کہ حالات بگڑ چکے تھے انحطاط پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۶۵۶ یا ۶۵۷ ہجری میں تاتاریوں نے حملہ کیا۔ اور عباسیوں کی خلافت ختم ہو گئی۔ اس حملے میں ایک کمرہ مسلمان مارا گیا، تمام کتب خانے درہم برہم ہو گئے۔ انہیں دریائے دجلہ میں پھینک دیا گیا۔ تاتاری بڑے وحشی قسم کے لوگ تھے مگر خدا کی قدرت ایک دوسلیں بھی نہ گنہگار تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

حضرت عبداللہؓ اور
حضرت عباسؓ

ام فضلؓ

الغرض انہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ ان کی والدہ اور آپ کی چچی ام فضلؓ جو کہ نہایت پارسا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیہ ہیں، ان کے سامنے حضرت عبداللہؓ نے سورۃ مرسلات کو تلاوت کیا، تو وہ کہنے لگیں یٰبُنَّی لَقَدْ ذُکِّرْتَ بِقُرْآنِكَ هَذِهِ السُّورَةُ یعنی اے بیٹے! یہ سورۃ تلاوت کر کے تم نے مجھے یاد دلایا ہے۔ کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو آخری سورۃ سنی، وہ یہی سورۃ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طے مغرب کی نماز میں تلاوت فرمایا۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام کی زبان سے قرآن پاک کا کوئی حصہ نہیں سن سکی۔ حتیٰ کہ آپ

رحلت فرما گئے۔

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ مغرب کی نماز میں مختصر تلاوت کا حکم ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس نماز میں تخفیف ہی فرماتے تھے حضرت ام فضلؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نماز مغرب میں پوری سورۃ پڑھی مگر ہو سکتا ہے کہ کسی موقع پر پوری سورۃ پڑھی ہو اور کسی موقع پر اس کا کچھ حصہ بہر حال یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

اگلی اور پچھلی
آپس میں

یہ سورۃ اور اس سے پہلی اور اس کے بعد والی سورتوں کا آپس میں ربط ہے۔ اس سے پہلے سورۃ جن میں متکبرین کو تنبیہ کی گئی تھی کہ دیکھو! تم انسان ہونے کے باوجود خدا تعالیٰ کا کلام نہیں سمجھتے، حالانکہ جنات حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے قرآن پاک سن کر ایمان لے آئے مگر ملک عرب اور خاص طور پر مکہ کے باشندے ہم جنس انسان ہو نیچے باوجود ایمان نہیں لائے، وہ کفر و شرک میں ہی ڈوبے ہوئے ہیں کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ گویا اس انداز میں کفار کو تنبیہ تھی۔

اس کے بعد سورۃ منزل میں اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کی تکمیل کا ذکر فرمایا **يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ أَلَيْسَ** یعنی اے بنی علیہ السلام رات کو قیام کریں اور خدا کی بارگاہ میں مناجات کریں، نماز پڑھیں تاکہ نفس کی تکمیل ہو اور پھر اسی تکمیل نفس کے اعتبار سے قیامت کا ذکر فرمایا۔ اس سے اگلی سورۃ مدثر میں دوسروں کی اصلاح کا بیڑا اٹھانے کا حکم دیا گیا **يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ** یعنی اے لحاف اوڑھنے والے۔ آپ اٹھ کھڑے ہوں۔ اور مخلوق خدا کو ان کے بُرے انجام سے ڈرائیں، خبردار کریں۔ وہاں پر اس اعتبار سے قیامت کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے اگلی سورۃ قیامت میں بھی خاص طور پر قیامت کا ہی ذکر ہے۔ اور اس سورۃ میں انسان کے مختلف نفوس کا اعتبار کیا ہے۔ یعنی انسان میں تین قسم کے نفوس پائے جاتے ہیں، نفسِ لوامہ، نفسِ مطمئنہ اور نفسِ امارہ۔ فرمایا وہاں ہر نفس، نفسِ لوامہ بن جائے گا۔ انسان خود اپنے آپ کو ملامت کرے گا کہ افسوس میں نے ایمان کیوں نہ قبول کیا۔ نیکی کا راستہ کیوں نہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس لحاظ سے قیامت کا ذکر ہے۔

اس کے بعد سورۃ دہر میں ابرار اور فجار کے اعتبار سے قیامت کا ذکر ہے کہ دونوں قسم

کے لوگوں کا کیا انجام ہوگا۔ اور قیامت کے روز کیا معاملات پیش آئیں گے۔ ابراہیم کے انعامات کا خاصہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ منکرین کا شکوہ کیا گیا ہے اور قرآن پاک کے کلام الہی ہونے کا بیان ہے۔

سورۃ کا موضوع

سورۃٴ مرسلات کا مرکزی نقطہ یا موضوع (SUBJECT) نبیوں کے وقت مقرر کرنے کے اعتبار سے قیامت کا ذکر ہے۔ یعنی جب نبیوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا، اور وہ اپنی امتوں کے ہمراہ حاضر ہوں گے جیسا کہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَجَاءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ" اور شہید (گواری) مینے والے) لائے جائیں گے "وَقَضَىٰ بَيْنَهُمُ بِالْحَقِّ" اور ان کے درمیان حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ تو گویا اس سورۃ میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لیے وقت مقرر کئے جانے کے اعتبار سے قیامت کا ذکر ہے۔ یعنی اس قیامت والے دن کی تفصیلات بیان ہو رہی ہیں۔ جس دن تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں حاضر ہونگی اور اس دن تکذیب کرنے والوں کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا۔ ان مکذبین نے اللہ تعالیٰ کی جس نعمت کا انکار کیا تھا۔ اس کا نام لے لے کر کہا گیا ہے "وَيَلُومُهُ لِّلْمُكْذِبِينَ" یعنی اس دن مکذبین کے لیے تباہی و بربادی ہے۔ اس آیت کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح سورۃ الرحمن میں خدا تعالیٰ کی مختلف نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد پچھری سورۃ میں اکتیس^۳ مرتبہ اس آیت کو دہرایا گیا ہے "فَإِنِّي آتٍ بَكُمْ مَتَكْذِبَانِ"۔

مختلف اعتبارات سے قیامت کا ذکر

اس سے اگلی سورۃ میں کاشتکاروں کی ذمہ داری کے اعتبار سے قیامت کا ذکر ہے۔ جس طرح وہ بڑتے ہیں، پھر کاٹتے ہیں اور فصل آتی ہے۔ اس کا ذکر کر کے قیامت کا حال بیان ہوا ہے۔ اس سے اگلی سورۃ میں ایک نہایت ہی گہری (DEEP) بات کا ذکر ہے۔ دانش و حکمت کی رو سے قانون جذب و کشش کے پیش نظر قیامت کا ذکر ہے۔ پھر اس کے بعد سورۃ عبس میں انسان کے رشتہ داروں اور متعلقین کے اعتبار سے قیامت کا بیان ہے۔ پھر اس سے اگلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ کائنات پر قیامت کون سے اثرات مرتب ہوں گے۔ اس کے بعد انسان کے باطن پر قیامت کے اثرات کا ذکر ہے۔ اور پھر تاجروں کے نقطہ نظر سے قیامت کا حال ہے۔ الغرض بے شمار موضوعات کے اعتبار سے افراد کی مختلف کیفیتوں کے پیش نظر قیامت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سورۃ کے ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسم اٹھا کر قیامت کا حال بیان کیا ہے۔

ہوا کی اہمیت

ارشاد ہوتا ہے۔ وَالْمُرْسَلَاتُ عِدْفًا قسم ہے چھوڑی ہوئی ہواؤں کی۔ پہلی پانچ آیات کے الفاظ مرسلات، عاصفات، ناشرات، فارقات اور مقلیات کے متعلق مفسرین کی دو رائیں ہیں۔ بعض نے ان الفاظ سے ہوائیں مراد لیا ہے، جب کہ دیگر مفسرین نے ان سے فرشتے مراد لیا ہے۔ عام تفسیر میں ان الفاظ کا معنی ہوائیں ہی کیا گیا ہے۔

عرف کا معنی پے درپے یا مسلسل ہے۔ عرف کا لفظ گھوڑے کی گردن کے بالوں پر بھی بولا جاتا ہے جس کی جمع اعراف آتی ہے۔ گھوڑے کی گردن کے بال آپس میں جڑے ہوئے اور پے درپے ہوتے ہیں، اس لیے انہیں اعراف کہا جاتا ہے۔ عرب اپنی بہادری پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

ثُمَّ قُتِلْنَا إِلَى جُرْدٍ مُّسَوَّمَةٍ
أَعْدَا فُحْنٍ رَّادِيْدٍ مِّنَادِيْلٍ

ہم نے گوشت بھون کر کھایا کھڑے ہو گئے اور گھوڑے کی گردن کے بالوں سے ہاتھ صاف کر لیے کہ ہمارا بہترین رومال یہی تھا۔ گویا عرب اپنی بہادری اور جفاکشی کا ذکر کر رہا ہے۔ کہ کھانا کھانے کے بعد وہ پانی سے ہاتھ متہیں دھوتے بلکہ گھوڑے کی گردن کے بالوں سے ہی ہاتھ صاف کر لیتے ہیں۔ الغرض عرف کے لغوی معنی گھوڑے کی گردن کے بال ہیں اور اس جگہ پر اس سے مراد ہوائے مسل ہے جو ایک لطیف چیز ہے جو ہر ذی جان کی حیات کے لیے ضروری ہے۔ ہوا بسیط نہیں بلکہ مرکب ہے اور

اس میں بہت سے عناصر شامل ہیں۔ اس میں وہ لطیف عنصر آکسیجن بھی موجود ہے۔ جو حیات انسانی اور خون کی صفائی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ہر سانس کے ساتھ آکسیجن انسان کے جسم میں داخل ہوتی ہے جس کے ذریعہ خون صاف ہوتا ہے اور انسان کو تازہ زندگی نصیب ہوتی ہے۔ اسی سانس کے ذریعے کاربن ڈائی آکسائیڈ انسانی جسم سے باہر نکلتی ہے، جو کہ ثقیل اور دھاتی گیس ہے۔ اگر یہ گیس انسان کے جسم میں رُک جائے تو دم گھٹ جائے۔ چنانچہ سعدی صاحب گلستان کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔ انسان کو ہر سانس کے ذریعے دو نعمتیں نصیب ہوتی ہیں اور ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے۔ علامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ جو بیس گھنٹے میں انسان کو چوبیس ہزار نعمتیں سانس کے ذریعے حاصل ہوتی

ہیں۔ انسان تو صرف سانس کی ان نعمتوں کا ہی شکر ادا نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ آنکھ، کان، قلب، دماغ اور دیگر تمام اعضائے ظاہرہ اور باطنہ کا شکر یہ ادا کرے۔ "إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ" انسان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔

ہوا کے خواہ

ہوا جب آہستہ آہستہ چلتی ہے۔ خصوصاً مشرق یا شمال کی جانب سے تو نہایت خوشگوار ہوتی ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری مدد مشرقی ہوا کے ذریعے فرمائی۔ غزوہ خندق کے موقع پر جب مشرقی ہوا چلی تھی۔ تو کنار کے خیمے اکھڑ گئے تھے۔ وہ درہم بہم ہو گئے اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ قوم عاد کو اللہ تعالیٰ نے مغرب کی گرم ہواؤں کے ذریعے ہلاک کیا۔ تاہم جب یہی ہوا آہستہ آہستہ چلتی ہے تو اس کے ایک ایک جھونکے کی قیمت ادا نہیں کی جاسکتی۔ موسم گرما میں ہم ہوا کے لیے طرح طرح کے مصنوعی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ کبھی دستی پنکھوں کا سہارا لیتے ہیں۔ کبھی بڑا سا پنکھا چھت میں باندھ کر زیادہ مقدار میں ہوا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں مختلف نوع کے بجلی کے پنکھوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ مگر قدرتی طور پر چلنے والی ہوا خاص طور پر صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے مقابلے میں مصنوعی طریقوں سے حاصل کردہ ہوا کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہی ہوا جب ساٹھ ستر میل کی رفتار سے چلتی ہے، تو طوفان برپا کر دیتی ہے درختوں کو اکھاڑ دیتی ہے۔ چھتوں کو اڑا دیتی ہے، عمارتوں کو گرادہتی ہے۔ اور انسانوں کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔

غزوہ تبوک کے موقع پر حضور علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ رات کو طوفان آنے والا ہے۔ ریگستانی علاقے میں سخت ہوا چلے گی۔ حضور علیہ السلام نے اعلان کیا۔ کہ رات کو سخت آندھی آنے والی ہے۔ کوئی آدمی کھڑا نہ ہو۔ اپنی چیزوں کو بھی سنبھال کر رکھیں اور جانوروں کو بھائے رکھیں۔ اتفاق سے صحابہ میں سے ایک شخص اس حکم پر عمل نہ کر سکا۔ شاید وہ مجھول گیا یا اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پہنچا ہی نہیں۔ جو یہی وہ آندھی کے دوران اٹھ کر کھڑا ہوا تو آندھی نے اُسے اٹھا کر طی کے پہاڑوں میں پھینک دیا جو کہ وہاں سے سینکڑوں میل دور تھے۔ وہ بیچارہ ایک ماہ کا سفر طے

کر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ ہوا اتنی تند و تیز تھی۔ ریگستانی علاقوں میں تو ہوا کے جھلے اور بھی سخت ہوتے ہیں۔ ریت کے تودے اڑتے چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اونٹ ان تودوں میں دب کر رہ جاتے ہیں اسی ہوا کی مختلف کیفیتوں کی مثال دے کر آگے قیامت کا حال بیان کیا جا رہا ہے۔ فرمایا آج جو تمہارے گرد و پیش میں چھوٹے چھوٹے خوشگوار واقعات پیش آ رہے ہیں، اور جن کاموں پر تم خوش ہو رہے ہو یہی امور آگے چل کر قیامت کا پیش خیمہ ثابت ہونگے جس طرح نرم ہوا آندھی کی شکل اختیار کر کے طوفان برپا کر دیتی ہے۔ اسی طرح جن امور پر آج خوش ہو رہے ہو، یہی کام قیامت کے روز طوفان برپا کر دیں گے، حالات الٹ پلٹ ہو جائیں گے اور سخت مشکل وقت ہو گا۔

ہوا اور قیامت
میں باہمی ربط

تند و تیز ہوائیں

پہلے فرمایا تھا وَالْمُرْسَلَاتُ عُرْفًا قسم ہے چھوڑی ہوئی ہواؤں کی جو آہستہ آہستہ چلتی ہیں اس کے بعد فرمایا فَالْعَصْفُ عَصْفًا قسم ہے اُن ہواؤں کی جو تیز چلتی ہیں، یعنی جب آندھی آتی ہے اور سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا وَالنَّشَارُ نَشْرًا قسم ہے اُن ہواؤں کی جو ابھارنے والی ہیں اٹھا کر۔ جو گرد و غبار کو اٹھاتی ہیں یا تیز چل کر بادلوں کو اڑا دیتی ہیں فَالْفَرْقُ فَرْقًا قسم ہے بھاڑنے والی ہواؤں کی۔ جو بادلوں کو بھاڑ کر جدا کر دیتی ہیں۔ اور انہیں جدا کر لیا جانا مقصود ہوتا ہے، اس کے مطابق بادلوں میں تحریک و تخریب پیدا کر دیتی ہیں فَالْمُلْقَاتِ ذُكْرًا قسم ہے اُن ہواؤں کی جو نصیحت کی بات ڈالتی ہیں۔ ہوا کے تغیر و تبدل پر اگر انسان غور کرے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کو سمجھنے کی کوشش کرے تو یہی ہوائیں اُس کے لیے نصیحت کا باعث بن سکتی ہیں۔ گویا یہ نصیحت لانے والی ہوائیں ہیں۔

آیات کا مفہوم ایک
دوسرے انداز سے

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ ان الفاظ سے مراد ہوائیں نہیں بلکہ فرشتے ہیں۔ چنانچہ اس انداز سے وَالْمُرْسَلَاتُ عُرْفًا کا مطلب یہ ہو گا، قسم ہے اُن فرشتوں کی جن کو بھیجا گیا ہے عُرْفًا یعنی لانے کے لیے۔ فرشتے نیچے کا پیغام الٰہی لاتے ہیں اور مخلوق تک پہنچاتے ہیں۔ فرشتوں کی قسم اٹھا کر قیامت کا مسئلہ سمجھایا گیا۔ کہ اس کے لیے وقت مقرر ہو گا۔ رسول حاضر ہوں گے، اُن کی امتیں حاضر آئیں گی حساب کتاب ہو گا، لہذا تکذیب سے بچ جاؤ، ورنہ اُس دن تباہی و بربادی

کاشکار ہو جائے۔ اسی طرح فَالْعَصِفَتِ عَصْفًا وَالنَّشْرَتِ نَشْرًا۔ کا مطلب ہوگا۔ قسم ہے اُن فرشتوں کی جو ہلاک کرنے، موت طاری کرنے یا انقلاب لانے کے لیے تیزی سے چلتے ہیں۔ فَالْفِرْقَتِ فِرْقًا کا معنی یہ ہوگا کہ قسم ہے اُن فرشتوں کی جو اللہ کے حکم سے بانٹتے ہیں اور جدا کرتے ہیں۔ فَالْمَلِیْقَتِ ذِکْرًا۔ اور قسم ہے اُن فرشتوں کی جو نصیحت کی بات ڈالتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لا کر اور انقلاب برپا کر کے انسان کے لیے نصیحت کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

عذر کا ارتقاء

فرمایا یہ نصیحت عذراً یعنی عذر دور کرنے کے لیے ہے۔ تاکہ کوئی کافر، مشرک یا گنہگار کل کو عذر پیش نہ کر سکے کہ اُسے کوئی سمجھانے والا نہیں آیا یا اُس کے سامنے کوئی نشانی ظاہر نہیں ہوئی۔ نیز یہ نصیحت اس لیے بھی ہے کہ اَوْ نَذَرًا تاکہ مجرمین کو ڈرایا جاسکے۔ کل کو کوئی یہ نہ کہہ سکے "مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ" کہ ہمارے پاس خوشخبری مینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ حالانکہ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ تمہارے پاس خوشخبری مینے والا بھی آگیا ہے۔ اور ڈرسانے والا بھی آگیا ہے۔ یہ تند و تیز اور تلخ ہوائیں بمنزلہ نذیر کے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے بنی اور اُن کے قائم مقام بھی نذیر ہیں بہت سے حوادث بھی نذارت کا کام دیتے ہیں۔ تاکہ کوئی شخص یہ عذر نہ کر سکے کہ اس کے پاس ڈرانے والا نہیں آیا۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے عذر کو رفع کر دیا ہے۔

وقوع قیامت

ان چیزوں کی قسم اٹھانے کے بعد فرمایا اَلْمَا تُوْعَدُونَ كَوَاقِعٍ اللہ تعالیٰ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ واقع ہونے والا ہے۔ یعنی قیامت برپا ہونے والی ہے اور جو کام تم دنیا میں کرتے ہو یا جو اعتقاد رکھتے ہو اُس کا بدلہ ضرور ملنے والا ہے۔ اگر تم نے دنیا میں نیکی کا راستہ اختیار کیا ہے تو اُس کا بھی بدلہ ملنے والا ہے۔ اور اگر کفر کا راستہ اختیار کیا ہے۔ تو اس کے انجام کو پہنچنے والے ہو۔ یہ سب کچھ قیامت کو پیش آئے گا۔

قیامت کب آئے گی۔ یہ دین کیا ہوگا۔ فرمایا اِذَا الْجُوهُ طُسْتُ جَب سَارے مٹا دیے جائیں گے۔ دوسری جگہ یوں فرمایا، جب سارے میلے ہو جائیں گے، گدے ہو جائیں گے یا درہم برہم ہو جائیں گے۔ وَ اِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ اور جب آسمان پھٹ جائے گا۔ در اُڑیں بن جائیں گی اور عالم بالا کی چیزیں نظر آنے لگیں گی۔ انسان کی نگاہ بھی تیز ہو جائے گی۔ وَ اِذَا الْجِبَالُ كُسِفَتْ اور جب پہاڑوں کو اڑا دیا جائے گا۔ پہاڑ اپنی جگہ مضبوطی سے جھے ہوئے ہیں۔ مگر جب قیامت آئیگی

تو یہ ذرہ ذرہ ہو جائیں گے۔ ان کو گرد و غبار بنا کر اڑا دیا جائے گا۔ وَإِذَا السُّلُُّ اقْتَتَّ اور قیامت کا دن وہ ہو گا۔ جب رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا۔ اُس مقررہ وقت پر اللہ کے نبیوں کو حاضر کیا جائے گا۔ اُن کی امتوں سے باز پرس ہوگی۔

یوم الفصل

فرمایا لَا يَوْمَ أُجِّلَتْ کس دن کی مہلت دی گئی ہے۔ یعنی وہ کون سا دن ہے جب تک کے لیے مجرمین کو مہلت دی گئی ہے۔ کہ اُس دن اُن سے لازمی باز پرس ہوگی۔ پھر خود ہی فرمایا لَيَوْمَ الْفَصْلِ فیصلے کے دن کے لیے انہیں مہلت دی گئی ہے۔ حقیقی فیصلہ دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ فصل کا لغوی معنی جدا جدا کرنا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں۔ کہ حقیقت میں سب چیزوں کو جدا جدا کرنے کا وقت قیامت ہی ہے۔ اس سے پہلے کسی نہ ہو گا۔ اس دنیا میں کسی بڑے سے بڑے جج کے فیصلے کو بھی سو فیصدی درست نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں کئی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ مگر جب قیامت آئے گی تو ہر چیز جدا جدا کر دی جائے گی۔ کوئی بات غلط نہیں ہوگی۔ نیکی اور بدی الگ الگ کر دی جائے گی۔ نیکو کار اپنے مرتبے کو پہنچیں گے۔ اور بدکار اپنے انجام کو پائیں گے۔ لہذا حقیقت میں جدائی اور تفصیل کا دن قیامت کا دن ہی ہو گا۔

فرمایا وَمَا أَدْرَاكَ اور آپ کو کس نے بتلایا يَوْمَ الْفَصْلِ کہ فیصلے کا دن کیا ہے۔ وَيَلْ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ اس دن تباہی و بربادی ہے۔ اُن لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی توحید اُس کے انبیا اس کی کتابوں اور قیامت کے دن کو جھٹلاتے ہیں۔ نہ پوچھو کہ اس دن ان کا کیا حشر ہو گا۔

(آیت ۱۶ تا ۴۰)

درس دوم ۲

- اَلَمْ نَهْدِكَ الْاَوَّلِينَ ۱۶ ثُمَّ نَتَّبِعُهُمُ الْاٰخِرِينَ ۱۷ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ۱۸
 وَاِیْلَ یَوْمِیْذِ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۱۹ اَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِیْنٍ ۲۰ جَعَلْنٰهُ فِیْ
 قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۲۱ اِلٰی قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۲۲ فَتَدْرَنٰی ۲۳ فَنَعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۲۴
 وَاِیْلَ یَوْمِیْذِ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۲۵ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۲۶ اَحْیَآءٌ وَّ اَمْوَاتًا
 ۲۷ وَجَعَلْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ شٰخِیْثٍ وَّاَسْقٰیْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ۲۸ وَاِیْلَ یَوْمِیْذِ
 لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۲۹ اِنۡطَلِقُوْا اِلٰی مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكٰذِبُوْنَ ۳۰ اِنۡطَلِقُوْا اِلِیْ ظِلٍّ
 ذِی ثَلٰثِ شُعَبٍ ۳۱ لَا ظِلِّیْلٌ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ اَللَّهَبِ ۳۲ اَلِهَآتُنَّ فِیْ بُشُرٍ
 كَالْقَصْرِ ۳۳ كَاَنَّهُ جِبِلَّتٌ صُفْرًا ۳۴ وَاِیْلَ یَوْمِیْذِ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۳۵
 هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ ۳۶ وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فِیْعَتٌ ۳۷ وَلَا یُزَادُ لَهُمْ
 لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۳۸ هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ ۳۹ جَمَعْنٰكُمْ وَاَلٰوِلٰییْنَ ۴۰ فَاِنْ كَانَ
 لَكُمْ كِیْدٌ فَاِیْدُوْنَ ۴۱ وَاِیْلَ یَوْمِیْذِ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۴۲

ج ۲۱

ترجمہ :- کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا ۱۶ پھر ہم ان کے پیچھے پھلوں کو لگاتے ہیں ۱۷

ہم مجرمین کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں ۱۸ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے

والوں کے لیے ۱۹ کیا ہم نے تم کو حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا ۲۰ پھر ہم نے اس کو

ایک مضبوط ٹھکانے میں رکھا ۲۱ ایک مقررہ مدت تک ۲۲ پھر ہم نے اندازہ کیا پس ہم خوب

اندازہ کرنے والے ہیں ۲۳ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے ۲۴ کیا

ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا ۲۵ زندوں کو اور مردوں کو ۲۶ اور ہم نے زمین میں اپنے

اپنے بہار رکھ دیے ہیں ہم نے تمہیں پیاس بجھانے والا پانی پلایا ۲۷ اس دن تباہی و بربادی ہے

جھٹلانے والوں کے لیے ۲۸ چلو اس چیز — کی طرف جس کو تم جھٹلاتے تھے ۲۹ چلو

تین شاخوں والے سائے کی طرف ۳۰ نہ گھٹنی چھاؤں والا ہوگا اور نہ پیش سے بچائے گا ۳۱

بیشک وہ محل جتنی (بڑی بڑی) چنگاریاں پھینکے گا ۳۲ گویا وہ زرد رنگ کے اونٹ — ہیں ۳۳

اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے (۳۳) یہ وہ دن ہے جس دن لوگ بولیں گے
 نہیں (۳۵) اور نہ انہیں اجازت ہوگی کہ کوئی عذر پیش کر سکیں (۳۶) اس دن تباہی و
 بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے (۳۷) یہ فیصلے کا دن ہے ہم نے اکٹھا کیا ہے تمہیں اور تم
 سے پہلوں کو بھی (۳۸) پھر اگر تمہارے پاس کوئی دافعیج ہے تو اُسے مجھ پر آزما لو (۳۹) اس
 دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے (۴۰)

تکذیب کا مفہوم اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ مبارکہ میں قیامت کا ذکر اس لحاظ سے کیا ہے کہ اللہ کے تمام نبی اور
 رسول اُس دن وقت مقررہ پر حاضر ہوں گے۔ اُن سب کی امتیں بھی حاضر ہوں گی۔ اُس دن جھٹلانے
 والوں کے لیے تباہی اور ہلاکت ہے۔ نیز دنیا میں جو انعامات انسانوں کو عطا کئے گئے ہیں، اُن کا تذکرہ
 ہے۔ اور اُن انعامات کے پیش نظر قیامت کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت میں پیش آنے
 والی مختلف کیفیتوں کو بیان فرمایا ہے۔ اور اس کی نشانیوں کو جھٹلانے والوں کے لیے وعید سنائی ہے۔
 بعض لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی تکذیب کی۔ اُس کے ساتھ شرک کیا۔ اور جب اُن
 کے پاس رسول آئے تو انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ تم تو ہمارے جیسے انسان ہو۔ تمہیں
 نبی نہیں مانتے۔ اللہ تعالیٰ نے کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے۔ تو ان لوگوں نے اُن کو بھی جھٹلایا۔ ان
 کے منزل من اللہ ہونے کا انکار کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی زبان سے بعثت اور الموت
 کی خبر دی کہ ہم تمہیں دوبارہ زندہ کریں گے کَمَا بَدَا اَوَّلَ خَلْقٍ لَّعِيدَہ اور یہ بھی کہا وَعْدًا
 عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فَعِلٰیْن کہ یہ ہمارا پکا وعدہ ہے۔ اور یہ پورا ہو کر رہے گا۔ مگر مشرکین اور کفار
 نے روز قیامت کو بھی جھٹلادیا۔ انہوں نے کہا کہ قیامت وغیرہ کچھ نہیں۔ اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِیْرُ
 الْاَوَّلٰیْنَ یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔ کبھی کسی کو مر کر واپس آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ سب جھوٹ
 ہے۔ اسی کے ساتھ شریعت کے جو قوانین ہیں اُن کو بھی شامل کر لیں کہ ایسے لوگوں نے ان قوانین کو
 تسلیم نہ کیا۔ یہ سب تکذیب کی مختلف صورتیں ہیں۔

ہلاکت کی مختلف صورتیں

ایک مرتبہ ہلاک کرنے کے بعد قیامت کو دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا
 اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلٰیْنَ کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا تھے نَتَّبِعُهُمُ الْاٰخِرِیْنَ پھر ہم اُن کے پیچھے پچھلوں کو لگا
 دیں۔ اگلوں کو ہلاک کرنا ہی مطلب محض عذاب کے طور پر ہلاک کرنا ہی نہیں بلکہ طبعی موت بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً جو لوگ

آج سے پچاس یا سو برس پہلے موجود تھے، وہ اب نہیں ہیں۔ وہ ہلاک ہو گئے اور ان کی جگہ موجودہ لوگوں نے لے لی۔ اسی طرح کچھ عرصہ بعد یہ لوگ بھی نہیں رہیں گے اور دوسرے لوگ ہوں گے۔ تو ہلاکت کا یہ سلسلہ مسلسل ہے۔ جسے ہم دیکھ رہے ہیں اور جس سے کوئی بھی عقل مند انکار نہیں کر سکتا۔ ہلاکت کا آخری سرا مجرین پر ختم ہو گا جن پر قیامت قائم ہو گی۔ یہ اس وقت ہو گا، جب ہر طرف کفر و شرک غالب ہو گا۔ اور اللہ کا نام لینے والا کوئی باقی نہیں ہے گا۔

انگوں کو ہلاک کرنے کا مضموم یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ہم نے نافرمانوں کو مختلف طریقوں سے عذاب میں مبتلا کر کے ہلاک کر دیا۔ کسی پر طوفان بھیجا کسی کو پانی میں ڈبویا۔ کسی پر آگ برساتی اور کسی پر تند و تیز آندھی بھیج دی۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ عرب اور دوسرے مجرم کس بات پر غرور کر رہے ہیں۔ قوم تبع جو بڑے ساز و سامان والے، مہذب اور شائستہ لوگ تھے، سلطنتوں کے مالک تھے انہیں بھی اللہ نے ہلاک کر دیا۔ اسی طرح ہم ان مجرین کو بھی ہلاک کر دیں گے، چنانچہ قریش مکہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد میں تباہ کیا۔ بڑے بڑے سرداروں کو میدانِ بدر میں جمع کیا۔ اور پھر ان کے سارے سر غنہ ہلاک کر دیے گئے اور پھر زور ٹوٹ گیا۔ فرمایا تباہی اور بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے جس دن رسولوں کے چلتے مقرر کیا جائے گا۔ كَذَلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ہم مجرین کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

وَيَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی و بربادی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے مختلف درج بیان کر کے ان پر وقوعِ قیامت کی دلیل قائم کی۔ فرمایا۔ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ کیا ہم نے تمہیں حقیر قطرہ آب سے پیدا نہیں کیا۔ مہین حقیر، محنت "خدمت اور مشقت" کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ انسان معمولی لباس میں محنت مزدور ہی کرتا ہے لہذا مہین یعنی حقارت والا مادہ اس لیے کہا جاتا ہے۔ کہ ایک تو وہ بذاتہ ناپاک چیز ہے اور دوسرے کہ پیشاب کے راستے خارج ہوتا ہے اور پیشاب بلاشبہ ناپاک شے ہے۔

پیدائش کے مختلف
درج

فَجَعَلْنَاهُ فِي قَدَرٍ مَّكِينٍ پھر ہم اس قطرہ آب کو جھے ہوئے ٹھکانے یعنی رحم میں پہنچا دیتے ہیں۔ قرار کے معنی سکون والی جگہ کے ہیں۔ إِلَىٰ قَدَرٍ مَّعْلُومٍ اور ایک مقررہ وعدہ تک یعنی ایک خاص مدت تک ٹھراتے ہیں۔ فَقَدَرْنَا پھر ہم اندازہ کرتے ہیں۔ فَنَحْنُ الْقَادِرُونَ اور ہم خوب اندازہ کرنے والے ہیں۔ کہ کس کو کیسا بتانا ہے، یعنی کس وقت اور کس شکل و صورت میں تیار کرنا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

نہک یہ قطرہ آب اسی حالت میں رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ بستر خون میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ عمل دوسرے چلے میں مکمل ہوتا ہے۔ تیسرے چلے میں یہ بستر خون گوشت میں تبدیل ہوتا ہے۔ اور پھر چوتھے چلے میں اس میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور روح انسانی کا تعلق جوڑ دیا جاتا ہے۔ فرشتے رجسٹرے کر حاضر ہوتے ہیں۔ اور عرض کرتے ہیں کہ اے پروردگار! اس شخص کے متعلق ہم کیا لکھیں۔ یہ شقی ہے یا سعید، نیک بخت ہوگا یا بد بخت۔ اس کی عمر اور روزی کتنی ہوگی اور اس کا خاتمہ کس طرح ہوگا۔ اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ بتاتے ہیں اور فرشتے رجسٹر میں درج کر لیتے ہیں۔

الغرض مقصد یہ ہے کہ انسان کو حقیر قطرہ آب سے پیدا کر کے اُسے عظیم الشان ہستی بنایا۔ عبادت بصارت سے نوازا، عقل و شعور عطا کیا تو اس کے لیے قیامت کا انکار کیونکر ممکن ہے۔ وہ قیامت کی تکذیب کس بنا پر کرتا ہے۔ فرمایا وَيَلَّيْكَ كَذِبِينَ اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی و بربادی ہے۔ اس طرح گویا انسان کی تخلیق اور پہلی قوموں کے حالات کے پیش نظر قیامت کی حقیقت سمجھائی گئی۔ مجرمین کا حال بیان کر کے اُس پر قیامت کی دلیل قائم کی۔ انسان کی توجہ اپنی پیدائش کی طرف دلائی گئی فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ یعنی انسان ان تمام حوادث پر غور کرے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر ایمان لائے۔ تو اُسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ جو مالک الملک یہ تمام امور سرانجام دے سکتا ہے۔ وہ قیامت بھی برپا کر دے گا۔

زمین کے فوائد

اس کائنات میں انسان کے لیے پیدا کر دہ انعامات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا لَا يَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا انسان! ذرا غور تو کر، کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟ کفاتا کا معنی سمیٹنا، جمع کرنا یا اپنے اندر ملا لینا ہے۔ کس کو سمیٹنے والی! فرمایا أَحْيَاءٌ قَامُولًا یہ زمین زندوں کو بھی سمیٹتی ہے اور مردوں کو بھی۔ مگر انسان کا کردار یہ ہے کہ زمین جیسی کارآمد شے کو حقیر سمجھتا ہے۔ اسپر گندگی پھینکتا ہے۔ اُس کو اکھیڑتا ہے، کھودتا ہے۔ مگر زمین انسان کے لیے زندگی کا ٹھکانا مہیا کرتی ہے۔ اسی پر چلتا ہے۔ اسی پر مکان بناتا ہے۔ سڑکیں اور نہریں چلاتا ہے۔ کاشتکاری کرتا ہے، کارخانے لگاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ساخت اس طرح بنائی ہے کہ انسانی زندگی

کا ہر مفاد زمین سے وابستہ ہے۔ اگر زمین نہ ہو تو انسان کی کوئی بھی ضرورت پوری نہ ہو۔ پھر ہی نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی انسان کی آرام گاہ زمین ہی ہے۔ سورۃ عبس میں واضح طور پر ارشاد ہے **لَسَدًا مَّهَاتًا فَاقْبَرُہُ** ہم نے انسان کو موت دی اور اُسے قبر میں داخل کر دیا۔ گویا یہ زمین انسان کی زندگی میں بھی اُس کی خدمت گار ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی اُسے جگہ فراہم کرتی ہے۔

معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد انسان کو دفن کرنا طبعی امر ہے۔ غیر مذہب کے لوگ اپنے مردوں کے ساتھ مختلف سلوک کرتے ہیں۔ جو کسی طور پر بھی فطرت کے مطابق افعال نہیں ہیں۔ مثلاً مردوں کے ساتھ نہایت تذلیل کا سلوک کیا جاتا ہے۔ ہندو یا بدعت مت والے مردوں کو جلا ڈالتے ہیں۔ جس پر دلیل یہ قائم کرتے ہیں کہ اس طریقہ سے فضا خراب نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ فعل مردے کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ بلکہ انسانیت کی تذلیل ہے۔ برخلاف اس کے اگر مردے کو دفن کر دیا جائے تو نہ بدبو پیدا ہوتی ہے اور نہ فضا خراب ہوتی ہے۔

مردے کو دفن کرنا
فطرت کے عین مطابق ہے

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے سامنے سرسوتی نے اعتراض کیا کہ مسلمان مردے کو زمین میں دفن کر کے زمین کو خراب کر دیتے ہیں۔ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ذرا یہ تو بتاؤ کہ اگر کوئی شخص کہیں لمبے سفر پر جا رہا ہو تو وہ اپنی اولاد کو دشمن کے سپرد کر کے جائے گا یا دوست کے۔ سرسوتی نے جواب دیا کہ یقیناً وہ دوست کے سپرد کر کے جائے گا۔ تو آپ نے فرمایا کہ انسان کی روح جب جسم سے علیحدہ ہوتی ہے۔ تو وہ اپنے جسم کو زمین کے سپرد کر کے جاتی ہے۔ جو کہ بمنزلہ شفیق مال کے ہے۔ برخلاف اس کے آگ دشمن ہے جو جلا ڈالتی ہے۔ اور زمین سے روئیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے انسان کی خوراک اور دوسری ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لہذا مردے کو زمین کے سپرد کرنا گویا دوست کے سپرد کرنا اور انسانیت کی عزت و تکریم کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا **مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ** ہم نے اسی مٹی سے تم کو پیدا کیا **وَفِيْهَا نُحْيِيْكُمْ** اور اسی میں واپس لوٹائیں گے۔ **وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰی** اور پھر اسی میں سے دوسری بار تمہیں نکالیں گے۔ چونکہ زمین زندہ اور مردہ دونوں حالتوں میں انسان کی خدمت کرتی ہے۔ لہذا مردے کو دفن کرنا فطرت کے عین مطابق ہے۔

مردوں کے متعلق مجوسیوں کا طریق کار بھی غیر فطری ہے۔ وہ اونچا مقبرہ بناتے ہیں۔ اور مردے کو اوپر لیجا کر رکھ دیتے ہیں۔ چلیں اس کا گوشت نوح لیتی ہیں اور ہڈیاں نیچے گر پڑتی ہیں۔ جس سے بدبو پیدا ہوتی ہے۔ اور سارا ماحول مکدر ہوتا ہے۔ انسان کی کس قدر تذلیل ہے کہ اُس کے مردہ جسم کو پرندوں کے حوالے کر دیا جائے۔ کہ وہ اُس کا گوشت نوح کر کھا جائیں۔ باعزت طریقہ یہی ہے۔ کہ اُسے زمین کے اندر رکھ دیا جائے۔ کفیت کا یہی معنی ہے۔

جنات کے شر سے حفاظت

حدیث شریف میں آتا ہے اَكْفُوْا یعنی برتن کے اوپر کوئی چیز رکھ دیا کرو۔ اور کچھ تو اللہ کا نام لے کر ایک تنکا یا لکڑی ہی رکھ دو، تاکہ شیاطین اس میں چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔ یا کم از کم برتن، ہانڈی وغیرہ کو الٹ دو۔ تاکہ ان میں غلط چیزیں داخل نہ ہو سکیں۔ ایک اور روایت میں آتا اَكْفُوْا صُبَا نَكُوْ مغرب کے وقت اپنے بچوں کو گھروں میں روک کر رکھو۔ باہر نہ جاتے دو، کہ اُس وقت شیاطین اور جنات پھیل جاتے ہیں۔ ایک افراتفری کا عالم ہوتا ہے، اور اس کے بُرے اثرات بچوں پر پڑتے ہیں جانور بھی ان بُرے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں۔ لہذا خوب اندھیرا ہونے تک بچوں کو روک لو اس کے بعد بے شک جانے دو۔ گویا کفیت کا معنی روکنا، حفاظت کرنا ہے۔

پھاڑوں کے فوائد

زمین کے بعض خواص بیان کرنے کے بعد فرمایا وَجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شَجَرًا تَمْنُوْنَ ہم نے زمین پر بڑے بوجھل پہاڑ رکھے ہیں۔ بڑے بڑے اونچے پہاڑوں میں انسان کے لیے بے شمار فوائد جمع کیے ہیں۔ یہ ہمالہ اور قراقرم جیسے بلند و بالا پہاڑ انسانی زندگی کے لیے لاتعداد فوائد اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ منجملہ ان کے درخت ہیں۔ پتھر ہیں معدنیات ہیں۔ ان پہاڑوں کی وجہ سے میدانی زندگی پر خوشگوار اثرات پڑتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں۔ تو میدانی زندگی بھی تلخ ہو جاتے۔ الغرض انسانی زندگی کے بے شمار مفاد پہاڑوں سے وابستہ ہیں۔

میٹھا پانی نعمت ہے

اونچے اونچے پہاڑوں سے پانی کے چشمے نکلتے ہیں۔ پھر وہ دریا اور نہروں کی صورت میں میدانی علاقے کو سیراب کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ضروریات زندگی کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ درختوں اور فصلوں کے علاوہ انسانی زندگی کے استعمال کے لیے میٹھا پانی میسر آتا ہے۔ اسی ضمن میں فرمایا

وَأَسْقَيْنَكُم مَّاءً فُرَاتًا ہم نے تمہیں پیاس بجھانے والا پانی پلایا۔ فرات کا معنی میٹھا، خوشگوار اور پیاس بجھانے والا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام جب میٹھا پانی نوش فرماتے تو کہتے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي سَقَنَا مَاءً عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِهِ وَلَمْ يُجْعَلْهُ مِلْحًا اَجَا جًا بِذُنُوبِنَا یعنی اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہمیں میٹھا پانی پلایا اور اسے ہمارے گناہوں کی بدولت کڑوا نہیں بنایا۔

مدینہ طیبہ پیش عام طور پر کھاری پانی میسر تھا۔ میٹھا پانی دور والے کنوؤں سے لانا پڑتا تھا۔ سرِ رومہ کا پانی میٹھا تھا۔ مگر وہ یہودیوں کی ملکیت تھا اور وہ مسلمانوں کو وہاں سے بھرنے نہیں دیتے تھے چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ نے پینتیس ہزار درہم میں وہ کنواں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ اسی لیے حکم ہے کہ پانی کا بے جا استعمال نہ کیا جائے۔ وضو اور غسل میں بے تحاشا پانی نہ بہایا جائے۔ بلکہ میٹھے پانی کی قدر کرنی چاہیے۔ جن علاقوں میں پانی کی کمی ہے۔ یا کھاری پانی ملتا ہے۔ ان لوگوں کو میٹھے پانی کی قدر قیمت اچھی طرح معلوم ہے۔

فرمایا وَيْلٌ لِّیَوْمٍ ذِی الْکُرْدِ بَیْنَ خَرَابِیْہِ اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ اُس دن اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے۔ اِنۡطَلِقُوْا اِلٰی مَا کُنْتُمْ بِہٖ تَکْذِبُوْنَ یعنی جس چیز کو تم جھٹلاتے تھے۔ اس کے انجام کی طرف چلو۔ پھر حکم ہوگا اِنۡطَلِقُوْا اِلٰی ظِلِّ ذِی ثَلَاثِ شُعَبٍ تِینَ شَاخُوْنَ وَاِلٰی سَاۡئِیْہِہٖمُ اِلٰی شَاخِیۡہِہُمُ لَا ظِلِّیۡلَ لَہُمْ فِیہَا وَلَا یُغْنِیۡہُمُ مِنَ اللّٰہِیۡبِ اور تیش سے بچائے گا۔ گویا ایک قسم کا دھواں ہوگا جس کی تین شاخیں ہوں گی اور وہ میدانِ حشر میں پھیل جائے گا۔ خاص خاص لوگ اس کی گرفت میں آئیں گے۔

تین شاخوں کے متعلق امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے اعمال تین قوتوں پر مشتمل ہوتے ہیں یعنی قوت و ہمیہ، قوت غضبیہ اور قوت شہوانیہ۔ انسان کے تمام افعال انہیں تین قوتوں میں سے کسی نہ کسی سے نکلنے ہیں۔ دھوپیں کی تین شاخوں سے مراد یہی تین قوتیں ہیں۔ ہر قوت سے نکلے ہوئے

تین شاخوں۔
والا سایہ

فعل کا بدلہ اُس کے مطابق دیا جائے گا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ میدانِ حشر کے دوران دوزخ سے ایک گروں نکلے گی، جو دو سو سال کی مسافت سے ہر اُس شخص کو پچڑے گی جو دنیا میں اللہ کے ساتھ شرک کرتا تھا، غرور اور تکبر میں مبتلا تھا یا جو ظلم و زیادتی کا مرتکب ہوتا تھا۔

فرمایا یہ تین شاخوں والا دھواں جس کا نہ سایہ ہوگا اور نہ وہ تپش سے بچاسکے گا اِنَّهَا تَرْمِي بِشَرِّ رَکَافٍ قَصِيٍّ وہ محلِ جہنمی بڑی بڑی چنگاریاں پھینکے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آگ سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ عربوں کے ذوق کے مطابق اس کی تشبیہ ایسی ہوگی کَاَنَّهُ جَمَلَتِ صُفْرًا جیسے زرد رنگ کے اونٹ ہوتے ہیں۔ ایسی بڑی بڑی چنگاریاں اس دھوئیں سے نکلیں گی۔ ایسا خوفناک منظر ہوگا۔ فرمایا وَيْلٌ لِّلْمُكْذِبِيْنَ ہلاکت اور تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ فرمایا هَذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُونَ یہ وہ دن ہے جس دن لوگ بولیں گے نہیں۔ میدانِ حشر میں کئی قسم کے معاملات پیش آئیں گے۔ کبھی ایسی دہشت طاری ہوگی، کہ کسی شخص کو بولنے کی طاقت نہیں ہوگی۔ حتیٰ کہ نبی بھی کوئی بات کرنے کی صراحت نہیں کریں گے۔ ایسا زبردست محرکہ ہوگا۔ اور اِیْمَةُ مَوْجِ پَر وَلَا يُؤْخَذُ لَهُمْ فِعْتُذُ رُونَ انہیں یہ اجازت بھی نہیں ہوگی کہ کوئی عذریہ معذرت ہی پیش کر سکیں۔ تاکہ اپنے آپ کو اللہ کے غضب سے بچا سکیں۔ فرمایا وَيْلٌ لِّلْمُكْذِبِيْنَ اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے ہلاکت اور بربادی ہے۔

یوم الفصل

ارشاد ہوتا ہے۔ هَذَا يَوْمُ الْفَصْلِ یہی فیصلے کا دن ہے۔ جب رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا۔ اور سارے امتیوں کو بھی جمع کیا جائے گا جَمْعُكُمْ وَالْوَلِيْنَ یعنی تمہیں بھی اور تم سے پہلوں کو بھی اکٹھا کیا جائے گا۔ نوعِ انسانی، جنات اور یا جوج ماجوج کے تمام افراد جمع ہونگے کسی کو بولنے کی ہمت نہ ہوگی بڑی تنگی ہوگی۔ اسی لیے حضور علیہ السلام فرمایا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الضِّیْقِ الدُّنْیَا وَضِیْقِ یَوْمِ الْقِیَمَةِ یعنی اے اللہ میں تجھ سے دنیا کی تنگی اور قیامت کی تنگی سے پناہ مانگتا ہوں اور قیامت کی تنگی کا یہ حال ہوگا کہ ایک آدمی کو صرف اس قدر جگہ میسر ہوگی جس پر اُس کے قدم ٹک سکیں، اتنی بھڑ ہوگی، کیونکہ تمام اگلے پچھلے لوگ اس دن اکٹھے ہوں گے۔ بڑی تکلیف ہوگی۔ بھوک اور پیاس ہوگی۔ پسینے چھوٹیں گے۔ جیسے جیسے کسی کے

اعمال ہوں گے، ان کے مطابق ان کی حالت ہوگی۔ ان حالات میں فرمایا فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ
فَكِيدُوْنَ۔ اگر تمہارے پاس کوئی دایہ بیج ہے تو اُسے آزما کر دیکھ لو۔ دنیا میں تو بڑے بڑے چیلے بہانے
کرتے تھے۔ دیکھیں آج تمہارا کون سا دایہ کام آتا ہے۔ فرمایا وَيْلٌ لِّلْمُكْذِبِيْنَ یاد رکھو! اس
دن جھٹلاتے والوں کے لیے نیا ہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ آج بھی سمجھ جاؤ۔ قیامت کی تکذیب سے باز آ جا
ورنہ تمہارا انجام نہایت بُرا ہوگا۔

المرسلات

تبرک الذی ۲۹

(آیت ۴ تا ۵۰)

درس سوم ۳

۴۱) وَفَوَاكِهِ مِمَّا يَشْتَهُونَ ۴۲) كُلُوا وَاشْرَبُوا
 هَنِيئًا لِّمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۴۳) اِنَّا كَذَلِكْ جَزَى الْمُحْسِنِينَ ۴۴) وَبَلَّ
 لَّيُومِذِ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۴۵) كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا اِنَّكُمْ جُحُومُونَ ۴۶) وَبَلَّ
 لَّيُومِذِ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۴۷) وَاِذَا قِيلَ لَهُمْ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ۴۸) وَبَلَّ
 لَّيُومِذِ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۴۹) فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ۵۰

ترجمہ: بیشک متقو لوگ سایوں اور چشموں میں ہوں گے ۴۱) اور پھلوں میں ہوں گے
 جس قسم کے وہ چاہیں گے ۴۲) کھاؤ اور پو پو خوشگوار اس کے بدلے۔ جو تم کیا کرتے تھے ۴۳)
 بیشک ہم سچی کرنیوالوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ۴۴) اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے
 والوں کے لیے ۴۵) کھاؤ اور فائدہ اٹھاؤ تھوڑے دنوں تک بے شک تم مجرم ہو ۴۶)
 اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے ۴۷) اور جب انہیں کہا جاتا ہے رکوع
 کرو تو یہ لوگ رکوع نہیں کرتے ۴۸) اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے
 ۴۹) پھر یہ دیکھو کہ کلام کے بعد کونسی بات پر ایمان لائیں گے ۵۰

متقین کے لیے
النعامت

اس سورۃ میں قیامت کا ذکر اس اعتبار سے ہے کہ اللہ کے نبیوں کے لیے وقت مقرر کیا
 جائے گا۔ تمام انبیاء اور ان کی امتیں حاضر ہوں گی، حساب کتاب ہوگا۔ اور اس دن فیصلہ کیا جائے
 گا، اسی لیے اسے یوم الفصل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس دن تکذیب کرنے والوں کا بد حال ہوگا۔ ان
 کی تباہی اور بربادی کی بار بار وعید سنائی گئی ہے

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے متقین کے انعامات کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ تمہیں کے ساتھ
 ساتھ ترغیب کا پہلو بھی ہے۔ فرمایا اِنَّ الْمُتَّقِينَ بے شک متقین یعنی بچنے والے۔ حضرت عبداللہ
 بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق الْمُتَّقِينَ مِنَ الشُّرُكِ وَالْكَفْرِ وَالنِّفَاقِ وَالْمَعَاصِي یعنی

متعین سے وہ لوگ مراد ہیں جو شرک، کفر، لفاق اور گناہوں سے بچتے ہیں۔ ایسے لوگ اس دن فی ظلال
سایوں میں ہوں گے و عیون نیز نہروں اور چشموں میں ہوں گے۔ و قواکد ممایشتہون اور
پھلوں میں ہوں گے جس قسم کے وہ چاہیں گے۔ جو لوگ دنیا میں تقویٰ اختیار کرتے تھے، ان کے لیے آرام
وراحت کے یہ سامان ہوں گے۔

سائے کا مضمون

جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے عرش کا سایہ ہوگا۔ دوسری رحمت
میں آتا ہے کہ پل صراط سے گزرتے وقت نیک لوگوں پر ان کی نیکیوں کا سایہ ہوگا۔ حضور علیہ السلام
کا فرمان ہے اَنْ ظِلَّ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ صَدَقْتُمْ یعنی دنیا میں کیا ہوا صدقہ و خیر و مالکین
پر خرچ کیا ہوا مال قیامت کے دن ایسے لوگوں کے لیے سایہ بن جائے گا۔ یہ سایہ انہیں پل صراط سے
گزرتے ہوئے بھی حاصل ہوگا۔ اور قیامت کی سختی اور تلخی میں بھی مومن کے حق میں فائدہ مند ہوگا۔
جب مومن لوگ بہشت میں پہنچیں گے۔ تو وہاں بھی سائے ہوں گے۔ جیسا کہ پہلے گزیر چکا ہے درختوں
کے گھنے سائے ہوں گے۔ اگرچہ وہاں ترش نہیں ہوگی۔ مگر انسان کی تنوع پسند طبیعت بعض اوقات
دشمنی سے طائے میں جانا پسند کرے گی اس لیے بہشت میں سائے بھی ہوں گے۔ یہ سائے درختوں
کے ہوں گے یا محلات کے ہوں گے۔ اس لیے جمع کا لفظ ظلال ذکر کیا ہے۔

عیون سے مراد اُبلتے ہوئے چٹھے اور نہریں ہیں۔ فواکہ سے مراد ہر قسم کے پھل ہیں۔ جو بھی جنتی خواہش
کرے گا۔ انسان مختلف انواع کی چیزیں پسند کرتا ہے۔ کبھی میٹھے پھل کی خواہش کرے گا، کبھی کھٹے
کی اور کبھی کھٹ میٹھے کی۔ یہ تمام چیزیں حسب خواہش وہاں میسر ہوں گی۔

نیز کہا جائے گا، کُلُوا وَاشْرَبُوا کھاؤ اور پیو، ہَنَیْئًا خوشگوار یعنی اشیائے خورد و نوش
نهایت خوشگوار قسم کی ہوں گی، ان میں بد معنی، گراتی، ثقل، ہیضہ یا تخمہ قسم کی کوئی علامت نہیں
ہوگی۔ بہشت میں کھانسی و جبے پیٹ میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں ہوگی۔ جو چیز جتنی بھی کھا یا گوارہ لطیف بخار کی
شکل میں فوراً مضم ہو جائیگی نہ فضلہ ہوگا نہ پیٹ میں کوئی تکلیف ہوگی۔ ہماکنتم تَصَلُّونَ اسکے بدلے
جو تم کیا کرتے تھے فرمایا اِنَّا كَذَلِكْ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ یعنی ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے
ہیں۔ اعلان ہوگا کہ یہ تمام انعامات تمہارے اعمال صالحہ کا نتیجہ ہیں۔

مکذہین کی مذمت

اس مقام پر زیادہ تر مکذہین کی مذمت مقصود ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ رسولوں کے لیے وقت مقرر فرمائیں گے اور لوگوں کو جمع کیا جائے گا، تو اس دن مکذہین کا پرہیز ہوگا۔ وَيَلَّ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ تَأْيِيدٌ اور ہلاکت ہے اُس دن مکذہین کے لیے۔ وہ ذلیل و خوار ہوں گے۔ فرمایا كُلُّوْا وَتَمَتُّعُوْا کھاؤ اور فائدہ اٹھاؤ قلیلہ کھوڑے دنوں تک اِنَّكُمْ تَجْرِمُوْنَ بے شک تم مجرم ہو اس چند روزہ زندگی میں بیشک کھاپی لو اور مرے اڑالو مگر آئندہ کے لیے تمہیں جیس دوام یا سزائے موت ہے۔ جس طرح دنیا میں آخری سزا سنائے جانے کے بعد حکم ہوتا ہے کہ حسبِ خواہش کھا پی لو اس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں عیش و آرام کر لو، آخرت میں تمہیں سخت سزا ملنے والی ہے۔ سورۃ حجر میں بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ذُرْهُمْ يٰۤاَكْلُوْا وَيَسْتَمْتِعُوْا آپ چھوڑ دیں ان کو کہ کھالیں اور نفع اٹھالیں یہ آگے دائمی سزا میں مبتلا ہوتے والے ہیں۔ فرمایا قَدْ تَمَتَّعَ بِكَفْرِكَ قَلِيْلًا اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ان کا فروں سے کہہ دیجئے کہ ”فائدہ اٹھا لو اپنے کفر کے ساتھ۔ کیونکہ آخر کار تو دوزخ میں جانے والا ہے۔“ اِنَّكُمْ تَجْرِمُوْنَ تم مجرم ہو تم نے تقویٰ کا راستہ نہیں پکڑا۔ تم نے کفر و شرک کا راستہ اختیار کیا۔ معاصی اور جرائم میں ملوث ہوئے۔ تم مجرم ہو۔ وَيَلَّ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِيْنَ اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے خرابی ہے اور اب حال یہ ہے کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ جِبْ اَنْتُمْ جِبْ انہیں کہا جاتا ہے۔ اِرْكَعُوْا رکوع کرو یعنی خدا تعالیٰ کے سامنے جھک جاؤ۔ لَا يَرْكَعُوْنَ تو یہ لوگ نہیں جھکتے۔ اس مقام پر رکوع کا ذکر ہے۔ سورۃ ن میں سجدہ کا بیان ہے۔ رکوع کا ذکر دنیا کے لیے ہے اور سجدے کا بیان آخرت کے موقع پر ہے۔ حقیقت میں رکوع و سجود سے مراد نماز کی ادائیگی ہے۔ یعنی نماز پڑھو۔ اور اس کے لیے پہلے نماز کی شرائط پوری کر دو۔ نماز کی اولین شرط ایمان باللہ ہے۔ اس کے بعد طہارت ہے، اور اس کے بعد نماز کی ادائیگی ہوتی ہے۔ جس کے اہم ارکان رکوع و سجود ہیں۔ اسی لیے فرمایا وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اَلَا اَكْبِرُوْا یعنی جھکنے والوں کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔

یہ لوگ بے نماز تھے

سجدہ انتہائی تعظیمی فعل ہے اور رکوع اس سے کم تر۔ مگر اس میں بھی عاجزی پائی جاتی ہے سورۃ مدثر کی ابتداء میں یہ بات ذکر ہو چکی ہے کہ انسان کے حق میں سب سے اہم ترین بات اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سب سے بڑا جرم تکبر ہے۔ ابلیس نے تکبر کیا۔ اَبٰی وَاَسْتَكْبَرُ

یعنی اس نے اللہ کے حکم کا انکار کیا اور تکبر کیا۔ اللہ کے سامنے عاجزی کی صورت یہ ہے کہ اس کی بڑائی بیان کی جائے۔ اسی لیے حکم ہوا "وَرَبُّكَ فَكَبِّرْ" اُس کے سامنے خشوع کر اور رکوع و سجدہ سے یہی مراد ہے۔

رکوع اور سجدے کی حقیقت

شاہ عبدالعزیزؒ تفسیر عزیزی میں فرماتے ہیں کہ رکوع کا مطلب اللہ تعالیٰ کی امانت کے بوجھ کو اٹھانے کے لیے پشت کو جھکا دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مستقیم القامت بنایا ہے۔ یہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ جانوروں کی طرح ہر وقت رکوع کی حالت میں نہیں ہوتا مگر اس پر انسان کو مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ رکوع کر کے گھوڑے یا گائے کی مانند اپنی پشت کو اس طرح جھکا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو بھی بوجھ اس پشت پر ڈالنا پسند کریں، اس کے لیے تیار ہوں۔ رکوع کی یہی حقیقت ہے کہ اس میں عاجزی پائی جاتی ہے۔ انسان کے ذمہ فرائض ہیں سے ایک اہم فریضہ خدا کے حضور عاجزی کرنا ہے۔ اسی طرح سجدہ انتہائی تعظیمی فعل ہے۔ اسی لیے اللہ کے سوا غیر کے سامنے سجدہ حرام ہے۔ سجدہ عبادت قطعی طور پر ازل سے لے کر حرام چلا آ رہا ہے۔ اور تعظیمی سجدہ ہماری امت پر حرام ہے۔ یہ پہلی امتوں میں روا تھا۔

کیا وجہ ہے کہ نماز میں رکوع ایک ہوتا ہے اور سجدے دو ہوتے ہیں ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ انتہائی تعظیمی فعل یعنی سجدے کو مکرر لایا گیا ہے۔ ایک دفعہ سجدہ کیا۔ اٹھ کر دوبارہ سجدہ کیا۔ اس کی حکمت مفسرین کرام یوں بیان کرتے ہیں کہ پہلا سجدہ اپنی جان کو پیش کرنے کے لیے ہے۔ پہلے سجدہ کے موقع پر انسان یہ تصور کرتا ہے کہ اے پروردگار! میں گنہگار ہوں۔ میری جان حاضر ہے۔ اگر تو چاہے تو میری گردن کاٹنے کا حکم دے دے۔ اس پہلے سجدے میں جان کی وفاداری کا ثبوت پیش کیا گیا۔ پھر دوبارہ سجدہ کیا تو اپنے مال اور لواحقین کی قربانی بھی پیش خدمت کر دی۔ یعنی لے مولا کریم! میری جان بھی تیرے حکم پر فدا ہے۔ اور میرا مال اور اعزہ و اقارب بھی تیری راہ میں حاضر ہیں۔ سورۃ مدثر میں گنہگار چکا ہے کہ جہنمی لوگ مجرمین سے پوچھیں گے "مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ" تمہیں دوزخ میں کس چیز نے ڈالا۔ تو وہ جواب دیں گے "لَمَّا نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ" ہم نماز نہیں

پڑھتے تھے۔ خدا تعالیٰ کے سامنے خشوع و خضوع اور عاجزی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ رکوع و سجود سے کتراتے تھے۔ لہذا دوزخ کے مستحق ٹھہرے۔ فرمایا وَيْلٌ لِّكَ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ اُسْ وِنِ هَلَاكٍ اور تباہی ہے تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

قرآن پاک اللہ تعالیٰ
کی آخری کتاب ہے

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اس بات کو سمجھانے کے لیے اس سورۃ کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا جَاءْنَاكُمْ بِالْحَقِّ كِتَابٍ اہل ایمان نہیں لاتے۔ تو پھر اور کون سی کتاب آئے گی جس پر تم ایمان لاؤ گے، قرآن پاک تو اللہ تعالیٰ کا آخری پر وگرام ہے۔ اس کے بعد کوئی پر وگرام، کوئی کتاب نازل نہیں ہوگی۔ لہذا اگر اس کتاب پر ایمان نہیں لاؤ گے تو دولت ایمان سے محروم رہ جاؤ گے کیونکہ اس کے بعد کوئی اور کتاب نہیں ہے۔ ابن ابی حاتم کی روایت میں آتا ہے کہ جب یہ آیت تلاوت کریں۔ تو یوں کہیں اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَيَمَّا اُنْزِلَ یعنی ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جس کو اللہ نے نازل کیا۔ یا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهُ بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز رحمہ فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ آہستہ سے کہیں خواہ تلاوت نماز کے دوران کہیں یا بغیر نماز کے۔ ہر حالت میں اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَیَمَّا اُنْزِلَ یا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهُ کہیں یہ مستحب ہے۔

(وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

حج پر جانے والے خواتین و حضرات کے لیے انمول تحفہ

احکام حج

مع

زیارات مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ

مرتب

مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

اس کتاب میں حج کی تعریف، فضیلت، اس کا حکم اور اقسام کا بیان ہے۔ حج قرآن، تمتع، افراد اور بدل کے احکام و مسائل، شرائط حج، حدود میقات، حدود حرم، مسائل احرام و حرم، طواف و سعی کا طریقہ اور حج میں پیش آمدہ جدید مسائل کا حل قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ نیز مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اس وقت موجود زیارات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے بلکہ بہت سی چیزوں کو نقشوں سے سمجھایا گیا ہے۔ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب عازمین حج اور زائرین کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے جو کہ صرف ۱۸ روپے میں دستیاب ہے۔

ناشر : ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ، پاکستان

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی مدظلہ کی

مایہ ناز اور مقبول عام تفسیر

معالم العرفان فی دروس القرآن

مکمل طبع ہو گئی ہے

اللہ رب العزت کے کلام پاک کو عوام کے اذہان کے قریب کرنے لیے مفسرین کرام نے بے شمار کوششیں کی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ یہ تفسیر بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم اور مبارک کوشش ہے۔ رواں دواں اور آسان اردو زبان میں قرآن کریم کے الفاظ کا ترجمہ اور سہل انداز میں مستند تفسیر، ضروری مسائل کی توضیح، ضروریات وقت، زمانہ و ماحول کی خرابیوں کی نشاندہی اور ان کا علاج، قرآن کریم کی آیات سے اور پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیان کردہ تفسیر اور صحابہ کرامؓ، ائمہ کرامؒ اور جمہور مفسرین کی اختیار کردہ توضیحات کو ملحوظ رکھتے ہوئے شرک و بدعت اور مذاہب باطلہ اور نظامات فاسدہ کا مختصر طریق پر بہتر رد اس تفسیر کا خاص امتیاز ہے۔ اعلیٰ کتابت و طباعت اور معیاری جلد بندی کے ساتھ بیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اس تفسیر کی قیمت ۳۱۵۵ روپے ہے۔

علماء، طلباء، خطباء، اور عوام الناس کے لیے بے حد مفید اور معلومات افزا ہے۔

ناشر: مکتبہ دروس القرآن، فاروق گنج گوجرانوالہ، فون ۲۱۸۵۳۰

معالم العرفان - دروس القرآن

افادات

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

ریکارڈنگ

بلال احمد ناگی صاحب

مرتب

الحاج لعل دین صاحب (ایم۔ اے علوم اسلامیہ)

زیر انتظام

انجمن مجبان اشاعت قرآن

صدر انجمن

شیخ محمد یعقوب عاجز

جنرل سیکرٹری

بابو غلام حیدر صاحب

خزانچی

محمود انور بٹ ایڈووکیٹ

ناظم مکتبہ (پبلشرز)

محمد منیر صاحب Ph:221943

مکتبہ دروس القرآن گوجرانوالہ